

87



# اسلامی دستور حیات

غلام احمد حریری

پولیمریلیکیشنز







اسلام

دستور حیات

— جامع —

اسلامی تہذیب — سیرت النبیؐ — خلافت راشدہ



— پرانے —

ایف اے علوم اسلامیہ مطابق نصاب جدید پرانے و ماہ ۱۹۸۱ء

— از —

غلام احمد حریری  
ایم۔ اے (علوم اسلامیہ) ایم۔ اے (عربی) ایم۔ او۔ ایل  
فائنل السنہ شہدتیہ۔ فائنل درس نظامی

پبلشرز پبلسٹی کلسٹرز ۱۹، راحت مارکیٹ، ر ۶، طے کاپیٹہ  
چوک اردو بازار، لاہور  
کتاب گزینہ بازار لاہور

ڈان بک ڈپو۔ صدر۔ راولپنڈی



مجلہ حقوق محفوظ ہیں

2974

ع 35

44810

~~17~~

مطبع \_\_\_\_\_ اکیڈمک پریس لاہور

طباعت \_\_\_\_\_ اگست 1969ء

قیمت \_\_\_\_\_ سفید کاغذ 15/0

ناشر \_\_\_\_\_ صنیا الحق قریشی ایم۔ اے

تعداد \_\_\_\_\_ ایک ہزار







# نصاب علوم اسلامیہ برائے ایف۔ اے ۱۹۸۱ء و ما بعد

## پرچہ الف اسلام کا ثقافتی نظام

- ۱۔ اسلام کا نظام تہذیب و تمدن ۵۰ نمبر
  - ۲۔ اسلام کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ  
از آغاز اسلام تا اختتامِ خلافتِ راشدہ ۵۰ کل نمبر
- پرچہ الف کا تفصیلی نصاب حسب ذیل ہے :-

### الف۔ اسلامی تہذیب

- ۱۔ اسلامی تہذیب کا مفہوم
- ۲۔ اسلامی تہذیب کی خصوصیات

### ب۔ فرد

کتاب و سنت اور مفکرینِ اسلام کے افکار کی روشنی میں مندرجہ ذیل اسلامی اخلاق کا مطالعہ ان کی اہمیت۔

۱۔ زہد ۲۔ تدبیر ۳۔ تحمل ۴۔ ذکر ۵۔ شکر ۶۔ صبر ۷۔ عفو ۸۔ عدل ۹۔ احسان ۱۰۔ خدمتِ خلق  
(۵ تا ۹ سرگودھا بورڈ کے نصاب سے خارج)

### ج۔ عائلی زندگی

- ۱۔ عائلی زندگی اور اس کی اہمیت و مقصد۔
- ۲۔ والدین اور اولاد کے حقوق و فرائض (سرگودھا بورڈ کے نصاب سے خارج)
- ۳۔ زوجین کے حقوق و فرائض (خاوند اور بیوی)

### د۔ مکتب و مسجد

- ۱۔ اسلامی معاشرے میں تعلیم کی نوعیت اور اہمیت (اسلامی نظامِ تعلیم)
- ۲۔ اسلامی معاشرے میں مکتب کی اہمیت



۳۔ استاد اور شاگرد کے حقوق و فرائض (سرگودھا بورڈ کے نصاب سے خارج)

۴۔ اسلامی معاشرے میں مسجد کی اہمیت

۵۔ اسلامی معاشرہ

۱۔ اقارب کے حقوق و فرائض (رشتہ دار)

۲۔ ہمسایہ کے حقوق و فرائض

۳۔ شہری کے حقوق و فرائض

۴۔ اسلامی حکومت (ریاست)

ی۔ عالم اسلام

۱۔ امت { (خارج از سرگودھا نصاب)

۲۔ اخوت

۳۔ تبلیغ

۴۔ جہاد

پرچہ الف جزو دوم

اسلام کی سیاسی و ثقافتی تاریخ

۱۔ اسلام کا پس منظر

۱۔ عرب کا جغرافیہ

۲۔ اسلام سے قبل عربوں کی سیاسی سماجی اور تمدنی زندگی

۲۔ سیرت النبیؐ

آنحضرتؐ کی ابتدائی زندگی۔ آپؐ کی بعثت و تبلیغ دین اور ابتدائی مشکلات

ہجرت و غزوات اور فتوحات تعلیمات نبویؐ۔ ایک عظیم مصلح اور بان تہمت اسلام

ہونے کے لحاظ سے آپؐ کی سیرت و اخلاق



### ۳۔ خلافتِ راشدہ

۱۔ حضرت ابو بکرؓ - انتخابِ خلافت - حضرت امامہ کی ہم - فتنہ ارتداد اور باغیوں کی سرکوبی - ایران و روم کی سلطنتوں سے آویزش کی ابتداء - سیرت و اخلاق ، کارہائے نمایاں

۲۔ حضرت عمرؓ - انتخابِ خلافت - عراق و ایران اور مصر و شام میں فروغِ اسلام ، اسلام بحیثیتِ قوتِ سیاسی - شہری اور فوجی نظامِ حکومت کا ارتقاء - غیر مسلموں سے سلوکِ شہادت - سیرت و اخلاق - کارہائے نمایاں -

۳۔ حضرت عثمانؓ - انتخابِ خلافت - اشاعتِ اسلام - شہادتِ سیرت و اخلاق کارہائے نمایاں -

۴۔ حضرت علیؓ - انتخابِ خلافت - انتشارِ امت کا آغاز - انتظامِ حکومتِ شہادتِ سیرت و اخلاق - کارہائے نمایاں -

۵۔ خلفائے راشدین کے عہد میں اسلام کی ترقی اور اس کے سیاسی ، سماجی ، اقتصادی اور تمدنی پہلو -



# فہرِس

-----	تہذیب و ثقافت	باب
۴	اسلامی تہذیب	باب ۲
۴۴	اخلاق و آداب	باب ۳
۵۴	انسانی زندگی کے ارتقائی مراحل	باب ۴
۵۹	خارج لاہور، قمان بورڈ	باب ۵
۶۶		باب ۶
۶۲		باب ۷
۸۲		باب ۸
۹۲	شکر	باب ۹
۱۰۱		باب ۱۰
۱۱۱		باب ۱۱
۱۲۰		باب ۱۲
۱۲۸	احسان	باب ۱۳
۱۳۹	خدمتِ خلق	باب ۱۴
-----	عائلی زندگی	
۱۴۶	کتاب	باب ۱۵
۱۵۶	حقوق والدین و اولاد	باب ۱۶
۱۶۲	حقوق زوجین	باب ۱۷
-----	مسجد و مکتب	
۱۸۲	اسلامی نظام	باب ۱۸
۱۸۹	مکتب	باب ۱۹
-----	انڈوشاگرد کے حقوق و فرائض	
۱۹۶	دین اسلام اور علم	باب ۲۰



۲۰۹	-----	مسجد	باب
۲۱۹	-----	اسلامی معاشرہ	باب
۲۲۶	-----	اقارب	باب
۲۳۵	-----	ہمسایہ	باب
۲۴۵	-----	شہری	باب
۲۵۴	-----	اسلامی حکومت	باب
۲۶۲	-----	خارج از سرگودھا بود	{ اُمت اخوت تبلیغ
۲۶۲			
۲۶۹	-----		
۲۹۱	-----	جہاد	باب
<u>حصہ دوم</u>			
۳	-----	جوئزۃ العرب	باب
۲۳	-----	سیرۃ النبی	باب
۲۸۱	-----	آنحضرت کی لعنت	باب
۴۳	-----	ہجرت مدینہ	باب
۵۴	-----	غزوات النبی	باب
۸۰	-----	صلح حدیبیہ	باب
۹۴	-----	فتح مکہ اور دیگر غزوات	باب
۱۰۶	-----	حجۃ الوداع	باب
۱۲۱	-----	اخلاق النبی	باب

حصہ سوم

		خلافت راشدہ	
۲		حضرت ابوبکر صدیق رضی	باب
۱۳۳		حضرت فاروق اعظم رضی	باب
۸۲		حضرت عثمان غنی رضی	باب
۱۱۲		حضرت علی بن ابی طالب رضی	باب
۱۳۳		خلافت راشدہ پر ایک نظر	



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

باب ۱

## ۱۔ تہذیب و ثقافت

اسلام کا نظام تہذیب و ثقافت ہم سب سے پہلے یہ بتائیں گے کہ تہذیب کچھ کیا چیز ہے؟ پھر یہ حقیقت واضح کی جائے گی کہ اسلامی تہذیب کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں جو اسے غیر اسلامی تہذیب سے ممتاز کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا جائے گا کہ اسلامی تہذیب کن عناصر سے ترتیب پاتی اور کون سے عوامل اس کو جنم دیتے ہیں۔ نیز یہ کہ تہذیب و تمدن کے الفاظ آیا ہم معنی ہیں یا ان میں کوئی فرق و امتیاز بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اب کلمہ کا مفہوم واضح کیا جاتا ہے بعض امور ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں محسوس کیا جاسکتا ہے مگر کلمہ کا لغوی مفہوم ان کی جامع تعریف کرنا بڑا دشوار کام ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر محبت کے لفظ کو لیجئے۔ ظاہر ہے کہ کوئی دل محبت سے خالی نہیں۔ والدین کی اولاد سے محبت۔ مہمان بہنوں کی محبت۔ خاوند بیوی کی محبت۔ مخلص احباب کی محبت۔ خلاصہ یہ کہ محبت کی بے شمار قسمیں ہیں اور ہر دل میں کسی نہ کسی قسم کی محبت کا وجود ناگزیر ہے تاہم محبت کی تعریف آسان نہیں۔ ایک صاحب اولاد جانتا ہے کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ لیکن وہ محبت کی کوئی ایسی تعریف نہیں کر سکتا کہ ایک بے اولاد شخص کو بھی اس کا احساس ہو جائے۔

اسی طرح کلمہ کی جامع مانع تعریف کر کے اس کے مفہوم سے طلبہ کو آگاہ کرنا بھی آسان نہیں۔ دشواری کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کلمہ کا مفہوم بیان کرنے میں خود محققین کے یہاں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم حتی المقدور یہ کوشش کی جائے گی کہ طلبہ پر کلمہ کا مفہوم



دائج ہو جائے۔

کلچر انگریزی زبان کا لفظ ہے اور اس کی اصل (CULTIVATION) ہے۔ جس کے معنی کاشت کرنے اور بونے کے ہیں۔ بدین وجہ لغوی اعتبار سے کلچر کا لفظ ان معانی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

۱۔ کاشت کاری

۲۔ کسی چیز کو سنوارنا اور ترقی دینا۔

۳۔ تعلیم و تربیت سے مہذب و نشائستہ بنانا۔

۴۔ کسی کے اخلاق و عادات کو سنوارنا۔

۵۔ کسی قوم کی تہذیب و ثقافت۔

۶۔ عیوب و نقائص سے پاک کرنا۔

کلچر کے ان لغوی معانی سے یہ حقیقت اُجاگر ہوتی ہے کہ صفائی و نفاست (RE-FINEMENT) کا مفہوم قدرِ مشترک کے طور پر اس لفظ کے ہر معنی میں پایا جاتا ہے۔ خواہ یہ صفائی کسی فردِ واحد کی شخصی (PERSONAL) زندگی میں پائی جاتی ہو یا قومی و اجتماعی طرزِ حیات میں۔ اسی بنا پر جو شخص طرزِ زندگی لباس و خوراک عادات و اطوار اور دیگر امور میں صفائی و نفاست کا خوگر ہوتا ہے اسے کلچرڈ (CULTURED) یعنی مہذب کہا جاتا ہے۔

لفظ کلچر کے یہ معانی لغت کے اعتبار سے ہیں۔ اب کلچر کا اصطلاحی مفہوم سوال یہ ہے کہ کلچر کے اصطلاحی معنی کیا ہیں؟

اصل بات یہ ہے کہ کلچر کی تعریف میں علماء یک زبان نہیں ہیں۔ بخلاف ازیں ہر فن کے علماء نے اپنے مخصوص دائرہ علم کے مطابق کلچر کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ مثلاً مورخین کے نزدیک کلچر کی تعریف یہ ہے :-

”تاریخ کے کسی دور میں کوئی قوم مجموعی حیثیت سے آرٹ۔ موسیقی۔ ادب۔ فلسفہ اور مذہب و سائنس وغیرہ میں سے جو کچھ حاصل کر لیتی ہے وہ اس قوم کا کلچر کہلاتا ہے۔“



اس تعریف کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت جب کسی مخصوص خاندان کے کلچر کا جائزہ لینا مقصود ہو تو اس وقت دیکھا جائے گا کہ اس دور کے لوگوں نے ادب و آرٹ، مذہب و سائنس اور موسیقی میں کہاں تک ترقی کی۔ یہی ان کا کلچر ہے۔  
 معاشرتی علوم (SOCIAL SCIENCES) کے علماء کے نزدیک کلچر کی تعریف

یہ ہے :-

”کلچر کسی قوم کے افکار و اعمال اور نتائج کے مجموعے کو کہتے ہیں۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرتی علوم کے ماہرین جب کسی معاشرہ کے کلچر سے متعلق بحث کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ یہ معاشرہ کن افکار و نظریات کا حامل اور ان پر کس حد تک عامل تھا۔ نیز یہ کہ اس سے کیا نتائج برآمد ہوئے۔ بنا بریں ان کے نزدیک کلچر کی خصوصیات یہ ہیں :-

۱۔ معاشرہ کے تمام افراد کلچر میں شریک ہوتے ہیں اور وہ کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں ہوتا۔

۲۔ کلچر ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا رہتا ہے۔ ہر نسل اسے منتقل کرتے

وقت اس میں سے کچھ حصہ ضائع کر دیتی ہے اور اس پر بعض امور کا اضافہ کرتی ہے۔

۳۔ کلچر جغرافیائی حالات اور دیگر امور کے بدل جانے سے تبدیل ہو جاتا کرتا ہے۔

۴۔ ایک ہی زمانہ میں مختلف مقامات پر مختلف معاشرے اپنا مختلف کلچر رکھتے ہیں

اسی طرح ایک ہی مقام پر مختلف زمانوں میں کلچر مختلف ہوتا ہے

انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایٹھنکس کا مقالہ نگار لکھتا ہے :-

”کلچر کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ انسانی زندگی کے تمام تر مظاہر مثلاً ذہنی، اخلاقی اور

مذہبی امور سب اس میں شامل ہیں۔“

اس تعریف سے کلچر کے لفظ کی وسعت و جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

گویا کلچر اتنی ہمہ گیر چیز ہے کہ انسانی زندگی کا کون گوشہ اس سے باہر نہیں۔ اس میں کسی

قوم کے تمام لوازم حیات مثلاً طرز زندگی، لباس، خوراک، عبادات، رسوم معاملات



سب داخل ہیں۔ لفظ کلچر کے اسی مفہوم کو بعض لوگ (WAY OF LIFE OF A NATION) یعنی کسی قوم کے طرزِ حیات سے تعبیر کرتے ہیں۔

انسٹیٹوٹ پیڈیا آف سوشل سائنسز کے مقالہ نگار نے کلچر کے مفہوم میں اس سے زیادہ وسعت پیدا کی ہے۔ اس کے نزدیک نہ صرف معاشی تنظیم قانون۔ علم کھیل اور زیب و زینت ہی کلچر میں داخل ہے۔ بلکہ مذہب بھی کلچر کا لازمی جزو ہے۔ حالانکہ اب تک مغرب میں مذہب کو ایک پرائیویٹ اور عملی زندگی سے الگ تھلگ چیز سمجھا جاتا تھا۔ مقالہ نگار کا خیال ہے کہ جو چیز بھی فرد یا معاشرہ کی اصلاح و ارتقاء کے لیے مفید ہے وہ کلچر میں داخل ہے۔

”کلچر میں علم، عقیدہ، فن، اخلاق، مذہب، زبان، قانون، رسم اور وہ تمام صلاحیتیں، عادات اور طور طریقے شامل ہیں جو انسان معاشرے کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے اختیار کرتا ہے۔“

ورلڈ سکوپ انسٹیٹوٹ پیڈیا میں لکھا ہے :-

”کلچر کسی قوم کی پختہ عادات و روایات، سماجی رسومات، اخلاقی اقدار اور معاشرتی معاملات میں روحانی، علمی اور فنی رجحانات کا مجموعی نام ہے جو بڑوں سے چھوٹوں کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔“

ان تمام تعریفات کا حاصل یہ ہے کہ کلچر کا مفہوم خاصا وسیع ہے۔ اس میں کسی قوم کا ادب و آرٹ، افکار و اعمال، ذہنی و اخلاقی رجحانات، طرزِ بود و ماندیکہ وہ تمام طور و طریقے شامل ہیں جو کسی معاشرہ کی اصلاح و ترقی میں معاون ہو سکتے ہیں۔ گویا یہ تعریفات متعدد تو ہیں لیکن باہم متضاد نہیں۔ ان سب کا قدر مشترک یہ ہے کہ جو چیز بھی کسی معاشرہ کے ارتقاء میں مفید ہو سکتی ہے وہ کلچر میں داخل ہے۔ سابقہ بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ کلچر کا مفہوم لفظ اقدار (VALUES) سے قریبی مماثلت رکھتا ہے۔ اقدار حیات ہی کسی قوم و معاشرہ کی روح و رواں ہوتی ہیں۔ ان کو اصول و ضوابط بھی کہا جاتا ہے۔ اصول حیات ہی کے زیر اثر عملی زندگی اوج کمال پر فائز ہوتی ہے۔



یہ بات پیش نظر رہے کہ لفظ کلچر کے مفہوم میں یہ وسعت و جامعیت بعد میں پیدا ہوئی پہلے یہ لفظ بڑے محدود معنوں میں استعمال ہوا کرتا تھا۔ دورِ حاضر میں کلچر سے جو مفہوم مراد لیا جاتا ہے۔ اس کے اظہار و بیان کے لیے پہلے سولائزیشن (CIVILIZATION) کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ اس دور میں کلچر کو سولائزیشن کا ایک جز و خیال کیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ کلچر کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوئی اور وہ سولائزیشن کا ہم معنی بن گیا۔ اب کلچر کا لفظ سولائزیشن کے وسیع تر معانی میں استعمال کیا جاتا ہے اور سولائزیشن کی حیثیت اس کے ایک جزو سے زیادہ نہیں۔

**تہذیب کا مفہوم** کلچر کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے عربی سے اردو میں تین الفاظ درآمد کئے گئے ہیں۔ ۱۔ تہذیب ۲۔ تمدن ۳۔ ثقافت۔ اب ہم بتائیں گے کہ ان ہر سہ الفاظ کے اصلی معنی کیا ہیں؟ اور آیا ان میں کوئی معنوی فرق پایا جاتا ہے یا نہیں؟

**تہذیب**۔ تہذیب کا لفظ مصدر ہے اور اس کے معنی کائنات چھانٹ اور اصلاح کے ہیں۔ رفتہ رفتہ اس کے معنی میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی۔ اب یہ لفظ طرز زندگی اور طریق معاشرت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر قوم ایک مخصوص طرز زندگی اور جداگانہ عادات و اطوار کی حامل ہوتی ہے جو اسے دوسری قوموں سے ممتاز کرتے ہیں۔ اسی ظاہری شکل و صورت کو تہذیب کہا جاتا ہے۔ گویا آج کل تہذیب کا لفظ کلچر کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور اس میں بھی وہی وسعت پیدا کر دی گئی ہے جو کلچر کے لفظ میں موجود ہے۔ مفہوم کی اسی وسعت کے پیش نظر ہم اس کتاب میں کلچر کے لئے تہذیب کا لفظ استعمال کریں گے۔

**اچھی اور بُری تہذیب**۔ تہذیب کے لغوی معنی چونکہ کائنات چھانٹ اور اصلاح کے ہیں۔ اس لیے لغوی معنی کا تقاضا یہ ہے کہ یہ لفظ ہمیشہ اچھی تہذیب کے لئے بولا جائے مگر معنوی وسعت کے پیش نظر اس کا اطلاق اچھی اور بُری دونوں کی تہذیبوں پر کیا جاتا ہے۔ اچھی تہذیب وہ ہے جو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ہو



اگلا باب اسلامی تہذیب سے متعلق ہے۔ اس کے مطالعہ سے اچھی اور بڑی تہذیب کا فرق خود بخود نمایاں ہو جائے گا۔

تمدن کے لغوی معنی حسب ذیل ہیں :-  
تمدن ۱۔ شہر میں سکونت اختیار کرنا۔

۲۔ شہری لوازمات اختیار کرنا۔

۳۔ مہذب اور خوش اخلاق ہونا۔ (المجد)

یہ لفظ تمدن کے لغوی معنی ہیں۔ اصطلاحی اعتبار سے تمدن ضروریات زندگی کی پیداوار ہے۔ ایک معمولی پیٹے سے لے کر بھاری مشینوں تک ہر چیز تمدن کا منظر ہے۔ انسانی زندگی میں جن مادی اشیاء کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ رفتہ رفتہ ایک تمدن کو جنم دیتی ہیں۔

تہذیب و تمدن کا فرق یوں سمجھئے  
تہذیب و تمدن کا باہمی فرق کہ تہذیب کا تعلق نظریات سے

ہوتا ہے اور تمدن کا اعمال اور ان کے نتائج سے۔ اعمال اور نتائج چونکہ افکار و نظریات سے جنم لیتے ہیں۔ اس لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب اصل و اساس ہے اور تمدن اس کی شاخ ہے۔ ظاہر ہے کہ شاخیں اگرچہ مختلف سمتوں میں پھیلی ہوئی ہوں لیکن جڑ ایک ہونے کی وجہ سے ان میں قریبی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ مختلف علاقوں میں بسنے والے لوگوں کا تہذیبی ورثہ ایک ہونے کے باوجود ان میں تمدنی اختلاف موجود ہوتا ہے اور یہ اختلاف جغرافیائی حدود کے اختلاف پر مبنی ہوتا ہے۔

تہذیب و تمدن کے فرق کو اس طرح بھی واضح کیا جاسکتا ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے اہل ایران، اہل روم اور اہل مصر نے مادی ضروریات زندگی کے اعتبار سے جو مقام حاصل کیا وہ تمدن ہے۔ اس کے برخلاف سالارِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے انقلابی ارشادات اور حکیمانہ تعلیمات کے ذریعہ جو ذہنی انقلاب برپا کیا اس کا نام



اسلامی تہذیب ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ حقیقت اُجاگر ہوتی ہے کہ لفظ تہذیب (کلچر) مادی ترقی کے مفہوم میں شامل نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں تمدن کا لفظ مادی ارتقاء کے نکتہ شروع کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ چنانچہ ایک معاشرہ جہاں بہترین معاشرتی ادارے ہوں۔ موصلات کا عمدہ انتظام ہو۔ تحفظِ صحت کا اعلیٰ اہتمام ہو۔ صنعت و حرفت رُو بہ ترقی ہو۔ قابلِ تعریف انتظامیہ ہو۔ وہاں تمدن تو اونچے درجے کا ضرور ہے مگر تہذیب کا پایا جانا ضروری نہیں۔ دوسرے لفظوں میں جو لوگ فنونِ لطیفہ سائنس فلسفہ اور مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے وہ کوئی تہذیب نہیں رکھتے خلاصہ یہ کہ معاشرتی و فنی ترقی کا نام تمدن ہے اور روحانی و ذہنی ارتقاء کو تہذیب کہتے ہیں۔

مذکورہ بالا فرق و امتیاز کے باوصف تہذیب و تمدن دونوں کا اطلاق ایک دوسرے پر ہوتا ہے۔ اہل یورپ بھی بعض اوقات ان میں فرق نہیں کرتے۔ وہ تہذیب و تمدن دونوں کے لئے سولائزیشن (CIVILIZATION) کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا دشوار ہے۔ اس لئے کہ کوئی تہذیب ایک درجہ تمدن کے بغیر عالم وجود میں نہیں آسکتی اور کوئی تمدن تہذیب سے بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ لفظ تمدن (CIVILIZATION) کا قریب تر ترجمہ ہے اور کلچر (CULTURE) کا مفہوم تہذیب کا لفظ بہتر ادا کرتا ہے۔

کلچر (تہذیب) کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے ثقافت کا لفظ اردو

ثقافت میں عربی سے درآمد کیا گیا ہے۔ یہ مصدر ہے اور مندرجہ ذیل

معانی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

۱۔ دانش مند ہونا۔

۲۔ ہلکا پھلکا ہونا۔

۳۔ پکڑنا اور پالینا۔



۴۔ قابو پانا۔

۵۔ ذہانت و فطانت (القامرکس و صراح)

اصطلاحاً ثقافت کا لفظ اردو میں کلچر کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ہم اس کے لیے تہذیب کا لفظ بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

تہذیب کے عوامل و عناصر کلچر کی تعریف و توضیح کے بعد قابل غور بات ہے کہ اس کے عوامل و محرکات کیا

ہوتے ہیں؟ بالفاظ دیگر کون سے امور کس تہذیب کو جنم دیتے اور اسے معرض ظہور میں لاتے ہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہر ثقافت کا مرکز و محور کوئی عقیدہ اور یقین ہوتا ہے۔ زندگی اور کائنات کے بارے میں جس قوم کا جو تصور ہوگا۔ اسی تصور کے گرد اس کی تہذیب گردش کرے گی۔ یہ ناممکن ہے کہ عقیدہ کچھ اور ہو اور عمل کچھ اور عقیدہ کی بجائے یہاں موزوں تر لفظ ایمان ہے۔ انسان پہلے ایمان لاتا ہے اس کے بعد عمل کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر عمل ناقص ہو تو اسے ناقص ایمان ہی کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ کسی قوم کی اجتماعی زندگی کی بنیاد کچھ افکار و عقائد پر ہوتی ہے ان نظریات پر ایمان لانے سے اس قوم کے افراد میں ایک خاص قسم کا ذہنی میلان و رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر اس ذہنی میلان کی بناء پر ان سے خاص قسم کے اعمال کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ اعمال ان سے اس حد تک صادر ہوتے ہیں کہ ان کی عادت بن جاتے ہیں۔ یعنی وہ اعمال خود بخود کسی کاوش کے بغیر ان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ بعد ازاں یہ عادت پختہ ہو کر سیرت و کردار بن جاتی ہے۔ یہی ذہنی رجحان و میلان جو کسی قوم کے مخصوص نظریات کی پیداوار ہوتا ہے اور ان میں خاص قسم کی سیرت و کردار کو جنم دیتا ہے۔ اس قوم کی تہذیب کہلاتا ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ حقیقت اُجاگر ہوتی ہے کہ انسان کے اعمال ہمیشہ کسی عقیدے یا ایمان کے تابع ہوتے ہیں اور یہی ایمان و عقیدہ کلچر کی تخلیق کرتا ہے۔ کلچر



در اصل عقیدہ و ایمان کا مظہر ہے۔ زندگی کے ہر چھوٹے بڑے کام پر کوئی عقیدہ ہی اثر انداز ہوتا ہے۔ مثلاً جس قوم کے افراد کا عقیدہ وطن، نسل، زبان یا پیشے پر ہوگا۔ اس قوم کی قومیت کی بنیاد بھی یہی چیزیں ہوں گی اور وہ زندگی کے تمام اعمال کو اسی عینک سے دیکھے گی اور اسی کسوٹی پر پرکھے گی۔ اس کے افراد کے تمام حرکات و سکنات پر یہی عقیدہ اثر انداز ہوگا اور اس کے کردار و عمل کے تمام گوشے اسی عمل کے مظاہر ہوں گے۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ جس طرح ایک شخص کو بانس کی تیلیوں سے چاول کھاتے دیکھ کر آپ فوراً اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ یہ چینی قوم کا فرد ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص چھینک کر الحمد للہ کہے تو آپ بلا تامل یہ فیصلہ کریں گے کہ یہ مسلم قوم کا فرد ہے۔ آپ کسی کا لباس دیکھ کر اس کا طریقہ عبادت دیکھ کر کسی کا رہن سہن دیکھ کر بخوبی یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کا تعلق فلاں قوم سے ہے۔

عقائد و افکار اور کلچر میں وہی نسبت ہے جو بیج اور درخت میں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دو بیج بظاہر یکساں نظر آئیں لیکن درخت بننے کے بعد دونوں کی شکل، مزہ، رنگ، خاصیت وغیرہ میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو جائے کیونکہ دونوں بیجوں کی اندرونی صلاحیت جداگانہ ہے۔ اگرچہ ہر شخص کا ارادہ خیال اور پسند اسی طرح ایک دوسرے سے مختلف ہے جیسے ان کی شکل و صورت۔ تاہم بعض چیزیں ان میں مشترک بھی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے ان کی زندگی میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ طرز زندگی کی یہی مشابہت اس قوم کو دوسری قوم سے ممتاز کرتی ہے۔ اسی کا نام کلچر ہے۔ بلاشبہ بعض چیزیں دنیا کی مختلف قوموں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بہت سی چیزیں ایسی بھی ملیں گی جو ایک قوم کو دوسری سے ممتاز کر دیتی ہیں۔ اگر ان کا رنگ ملتا ہے تو زبان میں فرق ہوگا۔ لباس میں کھانے میں طرز معاشرت میں، مذہبی تصورات میں غرض کہیں نہ کہیں یہ فرق ضرور محسوس ہو جائے گا۔

یہ امر قابل غور ہے کہ کوئی تہذیب یا ایک پیدائشی قوم

قوم کی تہذیب ماضی میں جنم لیتی اور حال کی گود میں پروان چڑھتی ہے۔



اپنے ماضی سے کٹ کر کبھی کسی نئے تمدن کی بنیاد نہیں ڈالی۔ ہر قوم اپنے اصلاحات سے ایک تہذیبی ورثہ حاصل کرتی ہے۔ پھر اپنے مخصوص حالات کے سانچے میں ڈھالتی اور اس میں ضروری تبدیلیاں کر کے اپنے مخصوص تمدن کی صورت میں آنے والی نسلوں کے لیے پھوڑ جاتی ہے۔

مذہب بالابیان اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ تہذیب کسی معاشرے کے عقائد و افکار کا ہم آہنگ شعور ہے جو لوگوں میں معاشرتی وحدت کا یقین پیدا کرتا اور اجتماعی زندگی کا نصب العین متعین کر کے تمدن سیاست علوم و فنون اور عملی زندگی کے بقیہ عناصر کی ترقی کے لیے راہیں ہموار کرتا ہے۔

یہاں کسی تہذیب کے بقا و ارتقا کا انحصار مذہب ذیل امور پر ہے۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ وہ تہذیب کن عقائد و افکار کی پیداوار ہے؟ کن نظریات نے اسے جنم دیا؟ وہ نظریات کس حد تک سچ و صداقت سے ہم آہنگ ہیں؟  
۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس مخصوص تہذیب کے حامل ان نظریات و افکار سے کس حد تک دلچسپی و وابستگی رکھتے ہیں جنہوں نے اس تہذیب کو جنم دیا۔ نیز یہ کہ ان نظریات کو بروئے کار لانے میں ان کے اندر ایثار و قربانی کا جذبہ کس حد تک پایا جاتا ہے؟

۳۔ تیسرے یہ کہ اس تہذیب کی راستے میں انسان کی وجہ تخلیق اور مقصد حیات کیا ہے؟ انسان دنیا میں کس لئے آیا؟ تاکہ یہ معلوم ہو کہ انسان زندگی بھر جس جہد و سعی میں مشغول رہتا ہے۔ آخر اس کا کیا ہے اور وہ کس نتیجے کا منتظر ہے؟  
یہ ہیں وہ عناصر و عوامل جن کے بل تے پر کوئی تہذیب معرض وجود میں آتی اور قائم رہتی یا فنا پذیر ہو جاتی ہے۔

چونکہ کتاب ہذا کا مقصد تالیف اسلامی تہذیب کا ذکر و بیان ہے۔ لہذا اب ہم بیان کریں گے کہ اسلامی تہذیب کن خصوصیات کی حامل ہے اور اس کے عناصر ترکیبی کیا ہیں؟



## سوالات

- ۱۔ کلچر کسے کہتے ہیں؟ مفکرینِ عالم کے نظریات کے مطابق اس کا مفہوم بیان کیجئے۔
  - ۲۔ تہذیب سے کیا مراد ہے۔ تہذیب و تمدن کا فرق واضح کیجئے۔
  - ۳۔ وہ کون سے عوامل و عناصر ہیں جو کسی کلچر کو جنم دیتے ہیں۔
  - ۴۔ کسی تہذیب کی بقا و ارتقاء کا انحصار کن امور پر ہوتا ہے۔ تفصیلاً لکھئے۔
-



## اسلامی تہذیب

اب تک ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ کلچر کا عام معنی و مفہوم کیا ہے؟ ثقافت کسے کہتے ہیں؟ تہذیب و تمدن کے الفاظ آیا ہم معنی ہیں یا ان میں کوئی معنوی فرق و امتیاز پایا جاتا ہے؟

یہ اصل مقصد کی تہذیب تھی۔ اس کتاب کا موضوع و تہذیب کا تصور مقصد اسلامی تہذیب ہے۔ جب تک یہ نہ بتایا جائے

کہ تہذیب بحیثیت عمومی ہے کیا چیز تب تک اسلامی تہذیب اور اس کی خصوصیات پر قلم اٹھانا ممکن نہیں۔

اسلامی تہذیب کی خصوصی علامات کی نشاندہی کرنے سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ کسی قوم یا ملک کی تہذیب کا انحصار و مدار مندرجہ ذیل باتوں پر ہوتا ہے۔

۱۔ سب سے پہلی چیز جس کا کسی تہذیب میں تلاش کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ دنیوی زندگی کے متعلق اس کا تصور کیا ہے؟

۲۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ اس تہذیب کی نگاہ میں انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ انسان کی یہ سب جدوجہد کس لئے ہے؟

۳۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ زیر بحث تہذیب میں انسانی سیرت کی تعمیر کن بنیادی نظریات و عقائد پر کی گئی ہے؟ انسانی ذہن کو وہ کس سانچے میں ڈھال دیتی ہے؟

۴۔ چوتھا سوال یہ ہے کہ وہ تہذیب انسان کو بحیثیت انسان کے کسی طرح کا آدمی بناتی ہے؟ وہ کون سے اخلاقی و اطوار ہیں جنہیں وہ انسان میں پیدا کرنا چاہتی ہے؟

اور اس کی مخصوص اخلاقی تربیت سے انسان کیا بنتا ہے؟

۵۔ پانچواں سوال یہ ہے کہ اس تہذیب میں انسان کے تعلقات اور اس کے حقوق



دوسروں پر اور دوسروں کے حقوق اس پر کیا قرابہ ڈیٹے گئے ہیں؟ اس کو کن حدود کا پابند  
کیا گیا ہے؟ مندرجہ صدر بیان سے معلوم ہوا کہ تہذیب کی تکوین پانچ عناصر سے ہوتی ہے  
۱۔ دنیوی زندگی کا تصور

۲۔ اسلامی تہذیب کا نصب العین

۳۔ بنیادی افکار و عقائد (اجزاء ایمان)

۴۔ ارکان اسلام

۵۔ اخلاق و آداب

دنیا کی ہر تہذیب انہی پانچ عناصر سے بنی ہے اور اسی طرح اسلامی تہذیب کی  
تکوین بھی ان ہی سے ہوتی ہے۔ مندرجہ صدر عناصر خمسہ کا مختصر ذکر و بیان حسب  
ذیل ہے :-

## اسلامی تہذیب کے عناصر خمسہ

۱۔ دنیوی زندگی کا تصور :- مختلف مذاہب میں انسانی زندگی کے مختلف تصورات

بیان کئے گئے ہیں۔ جس کو جو پہلو نمایاں نظر آیا اس نے حیاتِ دنیا کے متعلق یہی نظریہ  
قائم کر لیا اور دوسرے پہلوؤں پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

دیگر مذاہب میں تصورِ حیات :- بعض مذاہب کا خیال ہے کہ انسان ایک

نہایت ہی حقیر چیز ہے۔ یہ تخیل ان کے ذہن پر اتنا غالب آیا کہ انسانی شرف و عظمت  
کا پہلو ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بت پرستی، شجر پرستی  
دورختوں کی پوجا، اور حجر پرستی (پتھروں کی پوجا) کے مرض میں گرفتار ہوئے۔

۲۔ ایک دوسرے گروہ نے دنیا کو اس نظر سے دیکھا کہ اس میں بس فساد ہی

فساد ہے۔ دنیا کے سب معاملات انسان کو پریشانیوں اور مصیبتوں میں پھانسنے والے

پھندے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دنیا سے نفرت کرنے لگے اور انہوں نے اپنے لئے

نجات کی راہ اسی میں دیکھی کہ دنیا سے کنارہ کش ہو جائیں۔



۳۔ ایک اور گروہ نے دنیا کو اس نظر سے دیکھا کہ انسان کے لیے عیش و لذت کے سامان جمع ہیں۔ انسان کے لئے جو کچھ بھی ہے یہی دنیا ہے اور اس کو جو کچھ مزے اُڑانے ہیں اسی دنیوی زندگی میں اڑانے ہیں۔ گویا وہ یہ

بابر : عیش کو شش کہ عالم دوبارہ نیست

کے قائل ہیں۔

۴۔ اس کے مقابلے میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو دنیا اور اس کی لذتوں کو سراسر گناہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی رُوح کے لئے دنیا کی مادی آسائشیں نجاست کا حکم رکھتی ہیں۔

۵۔ ایک اور گروہ نے انسان کو مجبور محض خیال کیا۔ ان کی رائے میں فطرت کے قانون نے اس کو بالکل جکڑ رکھا ہے۔ وہ اس قانون کے خلاف نہ کچھ سوچ سکتا ہے نہ کسی بات کا ارادہ کر سکتا ہے۔

۶۔ اس کے بالکل برعکس ایک گروہ کی نگاہ میں انسان مطلق العنان ہستی ہے اور کسی اعلیٰ طاقت کا فرمانبردار نہیں ہے۔ کوئی بالاتر ہستی اس سے باز پرس کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔

یہ دنیوی زندگی کے متعلق مختلف اہل مذاہب کے جداگانہ تصورات ہیں۔

بخلاف ازیں دین اسلام نے حیات دنیا کا جو تصور

اسلام کا تصور حیات پیش کیا ہے وہ فطرت کے عین مطابق ہے۔ یہاں

ہم دیکھتے ہیں کہ نہ تو دنیا کوئی قابل نفرت چیز ہے اور نہ ایسی چیز ہے کہ انسان اس کا فریضہ اور اس کی لذتوں میں گم ہو جائے۔ نہ وہ بالکل نجاست و آلودگی ہے اور نہ تمام تر پاکیزہ و طیب۔ نہ انسان اتنا حقیر ہے کہ ہر ادنیٰ چیز کے سامنے سر نیار جھکا دے اور نہ اتنا طاقت ور کہ دنیا کی ہر چیز اس کے سامنے سر بسجود ہو جائے۔ نہ وہ اتنا بے بس ہے کہ اس کا ذاتی ارادہ کوئی چیز نہ ہو اور نہ اتنا زبردست ہے کہ بس اسی کا ارادہ سب کچھ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں فطرت اور عقل سلیم کے مطابق ہیں۔



اسلام اس سے آگے بڑھ کر انسان کو اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ تو عام مخلوق کی طرح نہیں ہے۔ بلکہ روئے زمین پر خدا کا فرما دار نائب ہے۔ دنیا اور اس کی طاقتوں کو تیرے لیے مسخر کیا گیا ہے۔ تو سب کا حاکم ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کا محکوم ہے تجھے تمام مخلوقات میں عزت و شرف حاصل ہے۔ مگر عزت کا صحیح استحقاق تجھے اس وقت حاصل ہو سکتا ہے۔ جب تو اس کا فرمانبردار ہو اور اس کے احکام کا اتباع کرے جس نے تجھے خلافت کا منصب عطا کر کے دنیا پر شرف بخشا ہے۔

دنیوی زندگی کا یہ تصور اسلامی تہذیب کی اصل و اساس ہے۔ ایک مسلم جس نے اسلامی تہذیب کے ماحول میں تربیت پائی ہو۔ اس کا عمل خواہ کتنا ہی ناقص ہو لیکن خود داری عزت نفس کا احساس خدا کے سوا کسی کے آگے نہ جھکنا۔ خدا کے سوا کسی کو اپنا مالک و آقا نہ سمجھنا یہ ایسے امور ہیں جو اس کے رگ و ریشے میں سرایت کئے ہوئے ہوں گے۔

### تصورِ حیات کے بعد دوسری اسلامی تہذیب کا نصب العین

یا بُرائی کو جانچنے میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ ہے کہ وہ انسان کے سامنے کونسا نصب العین پیش کرتی ہے۔ اس چیز کی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ انسان اسی کام کے لئے محنت و کادش انجام دیتا ہے جس کو اس نے اپنا نصب العین قرار دیا ہو۔ نصب العین کے بلند یا پست ہونے پر افعال و تخیلات کی بلندی و پستی اخلاق و آداب کی فضیلت و رذیلت اور معیشت کی اچھائی یا بُرائی کا مدار ہے۔ لہذا جب ہم کسی تہذیب کو جانچنا پر کھنا چاہیں تو ہمارے لئے اس کے نصب العین کی جستجو ناگزیر ہے۔

ظاہر ہے کہ ہم دنیوی زندگی کے متعلق جو تصور رکھتے ہیں وہی فطری طور پر زندگی کا ایک نصب العین پیدا کر دیتا ہے اور ہم اپنی تمام قوتیں اسی نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے صرف کرنے لگتے ہیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے انسان کو خدا کا خلیفہ اور روئے زمین پر اس کا نائب قرار دیا ہے تو اس تصورِ حیات سے



جو نصب العین فطری طور پر پیدا ہونا چاہئے۔ اس تک آپ کی عقل خود بخود پہنچ جاتی گی۔ ایک نائب کا اس کے سوا کیا نصب العین ہونا چاہئے کہ جس کا نائب ہو اس کی خوشنودی حاصل کرے اور اس کی نظر میں ایک اچھا وفادار اور فرض شناس خادم قرار پائے۔ یہی وہ نصب العین ہے جو اسلام نے انسان کے سامنے پیش کیا ہے۔ اسلام نے ہر قسم کی دنیوی اور اخروی اغراض کو چھوڑ کر ایک چیز کو زندگی کا نصب العین اور انسان کی تمام کوششوں کا مقصود قرار دیا ہے اور وہ چیز اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی کا حصول ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی تہذیب کو ایک جداگانہ اور مخصوص تہذیب بنانے میں اس کے نصب العین کا کیا حصہ ہے؟ اسی نصب العین نے اسلامی تہذیب کو ایک ایسی مخصوص تہذیب بنا دیا ہے۔ جو بنیادی طور پر دوسری تہذیبوں کے راستے سے الگ ہے۔ زندگی بسر کرنے کے بہت سے طریقے دوسری تہذیبوں کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ لازمہ تہذیب ہیں مگر اسلام ان کو ناجائز مکروہ اور بعض حالات میں حرام قرار دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ان تہذیبوں کے تصور حیات سے عین مطابقت رکھتے ہیں مگر اسلام کے تصور حیات سے ان کو کوئی لگاؤ نہیں۔

بنیادی افکار و عقائد انسان کی عملی زندگی میں ایک قابل اعتماد نظم و ترتیب اسی وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب وہ

ایک مستقل سیرت رکھتا ہو اور سیرت سازی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کا ذہن پر اگندہ خیالی سے پاک ہو اور چند مخصوص خیالات اس میں پختہ ہو جائیں۔ یہ خیالات پختے زیادہ گہرے ہوں گے سیرت اتنی ہی زیادہ مضبوط ہوگی۔ اور انسان کی عملی زندگی اتنی زیادہ منظم ہوگی۔ ان ہی پختہ خیالات کو اسلام کی اصطلاح میں عقائد کہتے ہیں۔

اسلام کے بنیادی عقائد پانچ ہیں۔

۱۔ ایمان باللہ



۲۔ ایمان بالملائکۃ

۳۔ ایمان بالرسول

۴۔ ایمان بالیوم الآخر ۵۔ ایمان بالکتاب

اسلام کے پورے عقائد اور عملی نظام میں پہلی اور بنیادی چیز ایمان باللہ ہے۔ باقی جتنے عقائد و ایمانیات ہیں سب اسی کے زیر اثر ہیں۔ ملائکہ پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کے ملائکہ ہیں۔ کتابوں پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کی نازل کی ہوئی ہیں۔ رسولوں پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے ہیں۔ آخری دن پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کے انصاف کا دن ہے۔ غرض اسلام کی ہر چیز وہ عقیدہ ہو یا عمل اس کی بنا۔ صرف ایمان باللہ پر ہے۔

مذکورہ بالا پانچوں بنیادی عقائد پر ایک نگاہ ڈالیں کہ یہ مل جل کر کس قسم کی تہذیب پیدا کرتے ہیں۔ قبل ازیں بتایا جا چکا ہے کہ اسلامی تہذیب کا سنگ بنیاد دنیوی زندگی کے اس تصور پر رکھا گیا ہے کہ انسان باقی مخلوقات کی طرح نہیں ہے۔ بلکہ خداوند عالم کی طرف سے یہاں نائب بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس تصور سے انسانی زندگی کا یہ نصب العین قرار پایا کہ وہ اپنے خالق اور آقا کی خوشنودی حاصل کرے اور اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھے۔

۱۔ وہ خدا کی صحیح معرفت حاصل کرے۔

۲۔ وہ صرف خدا کو حاکم اور مطاع سمجھے اور اپنے آپ کو احکام خداوندی کے تابع کر دے۔

۳۔ وہ ان طریقوں کے مطابق زندگی بسر کرے جن سے خدا کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے۔

۴۔ وہ خدا کی خوشنودی کے ثمرات اور اس کی ناخوشی کے نتج سے آگاہ ہو۔

مذکورہ صدر پانچ عقائد اس ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔



۴۔ ارکانِ اسلام کسی تہذیب کے بارے میں ایک اہم سوال یہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ تہذیب انسان کو بحیثیت ایک انسان کے کس طرح

کا آدمی بناتی ہے؟ یعنی وہ کس قسم کی اخلاقی تربیت دے کر انسان کو اپنے نظریہ کے مطابق کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کرتی ہے۔ وہ کونسے خصائل و اوصاف ہیں جنہیں وہ انسان میں پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے؟ اور اس کے مخصوص اخلاقی تربیت سے انسان کیسا انسان بنتا ہے؟ گو تہذیب کا اصل مقصد نظامِ اجتماعی کی تعمیر ہے۔ لیکن افراد کی اصلاح کے بغیر اجتماعی اصلاح ممکن نہیں۔

اسلام نے اخلاقی تربیت کے لئے ایک نظامِ عبادات وضع کیا ہے۔ جو شخص یہ ٹریننگ اچھی طرح سے لے گا وہ اسلامی اخلاق کا مجسمہ بن جائے گا۔ ان خاص عبادتوں کو فرض عین قرار دیا گیا ہے اور انہیں ارکانِ دین یعنی دین کے ستون کہا گیا ہے۔ جس طرح ایک عمارت چند ستونوں پر قائم ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلامی تہذیب کی عمارت بھی ان ستونوں پر قائم ہے۔ یہ ارکانِ خمسہ وہ بنیادی امور ہیں جو افراد کو عمدہ تربیت دے کر ان کی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔ ان کی وجہ سے زندگی کے بقیہ اعمال میں حسن و کمال پیدا ہو جاتا ہے۔ جس طرح بنیادی عقائد انسان کی ذہنی دنیا کی بنیاد ہیں۔ اسی طرح ارکانِ اسلام عملی زندگی کی اساس ہیں۔

بنیادی عقائد کی طرح ارکانِ اسلام بھی پانچ ہیں۔

۱۔ کلمہ طیبہ

۲۔ اقامتِ صلوٰۃ

۳۔ زکوٰۃ

۴۔ روزہ

۵۔ حج

ارکانِ اسلام پر بحیثیت مجموعی ایک نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت اُجاگر ہوتی ہے کہ دینِ اسلام میں عمل کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ ارکانِ اسلام دراصل جذبہٴ عمل کی



تکمیل کی ایک صورت ہیں۔ دین اسلام کی تعلیم نے ایمان و عمل کو باہم لازم و ملزوم قرار دیا۔ مگر اصلی زور عمل پر صرف کیا ہے۔ دین اسلام ایمان کو محض ایمان کی بنا پر اہمیت نہیں دیتا بلکہ اس لئے ایمان عمل صالح کے لیے راستہ بتاتا ہے اور اس کی تخم ریزی کے لئے زمین ہموار کرتا ہے۔ مشہور مثل ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ دین اسلام عمل کو ایمان کا پھل قرار دیتا ہے۔ جو شخص ایمان کا مدعی ہے مگر اس کے ارکان پر عامل نہیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ ایمان نے اس کی زبان سے اتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ و بار پیدا نہیں کیا۔ اس سے واضح ہوا کہ ایمان اصل ہے اور عمل اس کی فرع ہے۔ ایمان ملزوم اور اعمال صالحہ اس کے لوازم ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ جس طرح ایمان کے بغیر عمل سرسبز نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے پھل درخت ہے۔

مندرجہ صدر بیان سے واضح ہوا کہ ارکان اسلام اسلامی تہذیب کے وہ عناصر ترکیبی ہیں جن کے امتزاج سے اس کا مجسمہ ترکیب پاتا ہے اور انسانی زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ پانچوں ارکان میں سے ہر رکن لائق عبادت کو اپنے اندر سمونے ہوئے ہے۔ گویا یہ پانچ باب ہیں جن میں بے شمار مضامین عبادت پائے جاتے ہیں یہ فرائض و حقیقت انسان کے تمام نیک اعمال کو پانچ مختلف عنوانات میں الگ الگ تقسیم کر دیتے ہیں۔

۱۔ کلمہ طیبہ تو عیدِ خداوندی اور اثبات رسالت پر مشتمل ہے۔ جس میں جملہ شرعی احکام و اوامر آجاتے ہیں۔

۲۔ بندوں کے وہ تمام اعمال صالحہ جن کا تعلق خالق و مخلوق سے ہے نماز میں داخل ہیں۔

۳۔ وہ تمام اعمال جو ایک انسان دوسرے کی بھلائی اور نفع رسانی کے لئے انجام دیتا ہے زکوٰۃ میں آگئے۔

۴۔ خدا کی راہ میں ہر قسم کی جانی و مالی قربانی کرنا، کسی پاکیزہ مقصد کے لیے مشقت



چھیلنا، نفس کو تن پروری کی نجاست سے پاک رکھنا روزہ ہے۔

۵۔ دنیائے اسلام میں ملت ابراہیمی کی برادری کی تشکیل اسلامی اتحاد کے لئے چہرہ و سعی اور کسب معاش کے لئے کدو کاوش کا سرعنوان حج ہے۔

مذکورہ بالا سطور سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ جملہ اعمال صالحہ و اخلاقِ حسنہ ارکانِ اسلام کے زیر اثر ہیں۔ بنا بریں ارکانِ اسلام اسلامی تہذیب کی تشکیل و تعمیر میں بے حد اہم پارٹ ادا کرتے ہیں۔

کسی تہذیب کو جانچنے کے لئے ایک ضروری سوال یہ بھی

### ۵۔ اخلاق و آداب

ہے کہ اس تہذیب میں انسانوں کے باہمی تعلقات کو کس طرح قائم کیا گیا ہے؛ انسان کے تعلقات اس کے خاندان اس کے ہمسایوں اس کے دوستوں، اس کے ماتحتوں اور اس کے افسروں کے ساتھ کس قسم کے رکھے گئے ہیں؛ اسی کا نام حقوق العباد ہے۔ اس سوال کے ضمن میں اخلاقِ معاشرت قانونِ سیاست اور بین الاقوامی تعلقات کے تمام مسائل آجاتے ہیں اور اسی سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ زیر بحث تہذیب خاندان سوسائٹی اور حکومت کی تنظیم کس ڈھنگ پر کرتی ہے۔

مندرجہ صدر بیانات سے یہ حقیقت روشن ہوتی کہ اسلامی تہذیب کا ڈھنگ

### اسلامی تہذیب کی خصوصیات

پانچ اجزاء ترکیبی سے مل کر بنتا ہے۔ ان پانچ عناصر کا اصل منبع دینِ اسلام ہے۔ ابتدا اسلامی تہذیب کا مرکز و محور دینِ اسلام ہی ہے۔ ہر ملت کی تہذیب اس کے مذہب سے چھوٹی ہے۔ بعد ازاں دیگر عوامل اس پر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی بنیادی اصل بہر حال دین ہی رہتا ہے۔ ہر وہ قوم جس کا مذہب سے کچھ تعلق ہو وہ زندگی کے اطوار و آداب اور رسم و رواج میں اپنے مذہب سے ضرور متاثر ہوتی ہے۔ لباس سوسائٹی کے آداب گھر یلو نظام تعمیرات نظام تعلیم اور نظام حکومت وغیرہ لامحالہ مذہب سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسلام اس حقیقت سے آنکھ بند نہیں کرتا اور اپنے پیروں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تہذیب و تمدن کو اسلامی سانچے میں ڈھالیں۔



جو مذہب تہذیب و تمدن کا محافظ نہ ہو وہ فطری نہیں ہو سکتا۔ اسلام فطری مذہب ہے۔ وہ ایک جامع نظام حیات ہے۔ اس لئے وہ سب شعبہ ہائے حیات کا نگران ہے جو شخص اس نگرانی سے آزاد ہونا چاہے وہ اگر زبان سے دین کی صداقت کا دم بھرتا ہے تو سمجھ لو کہ منافق ہے۔ تہذیب کا سرچشمہ چوکھڑا ہے۔ اس لئے دین کی طرح اس کا بھی خالص ہونا ضروری ہے۔ اگر اس میں کسی اور مذہب کی تہذیب کے اجزا شامل کر دیئے جائیں تو یہ تہذیب خالص نہیں رہے گی۔ جن لوگوں کو اس غیر خالص تہذیب سے محبت ہو جائے دین سے ان کا تعلق کم ہو جائے گا۔ اسلامی تہذیب سے غیر اسلامی تہذیب کا پیوند کبھی نہیں لگ سکتا۔ اس سے مذہبی حس کمزور پڑ جاتی ہے۔ ہزار سال تک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار کی مشابہت سے منع فرمایا ہے۔

اب ہم یہ بتائیں گے کہ اسلامی تہذیب کن خصوصیات کی حامل ہوئی ہے۔ اسلامی تہذیب کے نمایاں خدوخال حسب ذیل ہیں :-

۱۔ توحید اسلامی تہذیب کی بنیاد نظریہ توحید پر استوار کی گئی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند تعالیٰ اصلی حاکم و مطاع ہے۔ اس کے احکام و اوامر کی اطاعت ضروری ہے۔ دینی احکام کا ماخذ و مصدر کتاب و سنت ہے۔ ان دونوں کے علاوہ ایک مسلم پر کسی کی اطاعت فرض نہیں۔ اسلامی تمدن میں بت پرستی اور شرک کی کوئی گنجائش نہیں۔ محرّمات شرعیہ مثلاً شراب بچاؤ وغیرہ اسلامی تمدن میں راہ نہیں پاسکتے۔ توحید کی پانچ بڑی قسمیں ہیں۔

۱۔ توحید ربانی۔ یہ ہے کہ خدا ایک ہے۔ اس کی ذات و صفات میں دوسرا کوئی شخص شریک نہیں۔ وہی ہم سب کا خالق و مالک، رازق و آقا، مختار و پروردگار حامی و ناصر، ممد و معاون حاجت روا اور مشکل کشا ہے۔ اسی کا ہر جگہ اور ہر وقت قبضہ و اقتدار ہے۔ اس کے سوا کسی کا حکم اور زور ہر جگہ اور ہر وقت نہیں چلتا۔

۲۔ توحید انسانی۔ یہ ہے کہ "خَلَقَكَ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ" کے مطابق سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔ سب کو ایک اُمت قرار دیا۔ سب کو حقوق اللہ



اور حقوق العباد کا پابند بنا دیا اور اس طرح حسب نسب گورے کالے اور عربی بھی  
 کا فرق و امتیاز ہمیشہ کے لئے مٹا دیا۔ "إِنَّمَا أَنتُم مِّنْوَآلِ أَخَوْتِ" کا خلعت  
 پہنا کر مسلمانوں کو بھائی بھائی بنا دیا اور اس طرح تمام جغرافیائی حدود کا خاتمہ کر دیا  
 یہاں تک کہ ان کے آغاز و انجام کو بھی ایک ہی سطح پر رکھا یعنی ہر انسان کا خیر مٹی  
 سے اٹھایا۔ مٹی سے ہی اس کی خوراک پیدا کی اور مٹی کی ہی اسے خوراک بنا دیا۔

۴۔ توحید لسانی۔ یہ ہے کہ عباد و معبود کے درمیان صرف ایک ہی زبان یعنی  
 عربی کو واسطہ بنایا گیا۔ اسی میں کلام الہی نازل ہوا۔ اسی میں فرائض عبادات ادا  
 ہوتے ہیں۔ وہی عالم اسلام کی بے بنیاد زبان ہے۔ وہی فرشتوں کی زبان  
 ہے۔ وہی اہل جنت کی زبان ہوگی۔

۵۔ توحید مکانی۔ یہ ہے کہ مسلمانوں کا کعبہ ایک ہے۔ اسی کی طرف رخ کر کے  
 سب نماز ادا کرتے ہیں۔ اسی رخ پر مساجد تعمیر کرتے ہیں۔ اسی رخ پر مسافر آخرت  
 کو ابدی نیند سلاتے ہیں۔ سب کو ایک ہی طول و عرض کی زیر زمین آخری آرام گاہ ملتی  
 ہے اور اس میں سب کو ایک ہی قسم کا لباس پہنا کر داخل کیا جاتا ہے۔

۶۔ توحید ایجابی یہ ہے کہ ہر نومولود کو صفحہ ہستی پر قدم رکھتے ہی پہلے دن اس کے  
 کان میں اذان کہہ کر اسے خدا پر ایمان لانے اور اس کے رب ہونے کی خبر سنائی جاتی اور  
 اسے صلاح و فلاح کی طرف رجوع کرنے کا پیغام الہی دیا جاتا ہے۔ سب اہل اسلام کے  
 بنیادی عقائد ایک ہیں۔ خدا ایک، رسول ایک، قرآن ایک اور خانہ کعبہ ایک ہے۔  
 ارکان دین یعنی نماز روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد یکساں طور سے سب پر فرض ہیں۔ جملہ  
 اسلامی احکام و اوامر اور حلال و حرام میں کسی کی تخصیص نہیں۔

توحید کے یہ اقسام پنجگانہ اہل اسلام کی شیرازہ بندی کر کے اسلامی تہذیب میں جماعتی  
 شان پیدا کرتے ہیں۔

اسلامی نقطہ نگاہ سے زندگی کا اولین مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت  
 ۲۔ ذکر الہی ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا۔



"وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ" (الذاریات) اور میں نے جن و انس کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

اسلام نے جو زندگی کا نصب العین پیش کیا ہے وہ اجازت نہیں دیتا کہ انسان ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو پس پشت ڈال دے۔ دنیوی مال و متاع اپنے اندر بہت کشش رکھتا ہے۔ اپنی ظاہری زیبائی اور رعنائی سے دلوں کو اپنی طرف موہ لیتا ہے کہ آدمی اپنی اصل منزل کو بھول کر اسی کو نصب العین بنا لیتا ہے۔ اس لئے دنیا کے جال سے بچ نکلنا بہت بڑی کامیابی ہے۔ اسی نصب العین کا تقاضا ہے کہ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے چلتے پھرتے غرض یہ کہ زندگی کے تمام مشاغل میں منہمک ہوتے وقت اسلامی ہدایات کو فراموش نہ کیا جائے۔ اسلام کے نزدیک سرِ پا جہد و عمل اور مقصودِ رضائے الہی ہے اس لئے ضروری ہے کہ بزم میں رزم میں، سفر میں، حضر میں، یادِ الہی سے غافل نہ ہوں۔ دینِ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اگر جملہ مشاغل حیات میں اس کی ہدایات کو ملحوظ رکھا جائے تو انسان کی پوری زندگی عبادتِ ربنا بن جاتی ہے حتیٰ کہ وہ امور و افعال جن کو ہم خالص دنیوی تصور کرتے ہیں۔ وہ بھی یادِ الہی کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔

اسلامی تہذیب کی ایک بڑی خصوصیت مساوات ہے۔ اسلام

**۳۔ مساوات** طبقاتی تقسیم قوم و قبیلہ رنگ و نسل کے فرق و امتیاز کا قائل نہیں۔ جس شخص نے کلمہ طیبہ پڑھ لیا وہ بڑے سے بڑے مسلم کے دوش بدوش کھڑا ہونے کا اہل بن گیا۔ چنانچہ اسلامی تہذیب میں امیر و غریب آقا و غلام اور عربی و عجمی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ خلیفہ وقت بھی نماز میں عام مسلمانوں کے برابر کھڑا ہوگا۔ اسلام میں عورت و عظمت، امدار و انحصار خوف خداوندی پر ہے۔ ایک غلام بھی اپنے ذاتی اوصاف کی بناء پر اعلیٰ سے اعلیٰ منصب پر فائز ہو سکتا ہے۔ اس کی مثالیں قرونِ اولیٰ میں تو بہت ہیں۔ ہندوستان میں غلاموں کے ایک پورے خاندان نے حکومت کی ہے جو تہذیب مساوات و یکسانی کی علمبردار نہ ہو وہ دیرپا ثابت نہیں ہو سکتی۔ اسلامی تہذیب کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ



ایک ہی صنف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز  
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بسندہ نواز

۴۔ سادگی اسلامی تہذیب کی ایک اور بڑی امتیازی خصوصیت سادگی اور  
تعیش سے بیزاری ہے۔ اس میں فضول فرجی کو ممنوع قرار دیا گیا  
اور نمود و نمائش کے کاموں سے روکا گیا ہے۔ اسلام نے روزمرہ کی زندگی میں سادگی کو  
مہر فرست رکھا اور تاکید کی ہے کہ سادہ کھاؤ اور سادہ پہنو۔ تکلف فضول فرجی اور  
عیاشی کا شیوہ اختیار نہ کرو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دولت کی فراوانی کو امت  
کے اسباب زوال میں شمار کیا ہے کیونکہ اس سے فخر و غرور اور نخوت کے جذبات کو ہوا  
ملتی ہے۔ متاع دنیا کی حرص قوم موت کا سامنا کرنے ڈرتی اور بزدل ہو جاتی ہے۔ یہاں  
تک کہ میدان جہاد میں شرکت کرنے سے کتراتے ہیں۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ ان خیالات  
کا اظہار کیا گیا ہے۔

اسلامی تمدن کا طرہ امتیاز سادگی ہے۔ خلیفہ وقت بھی معمولی لباس پہنتا  
ہے۔ سادہ کھانا کھاتا ہے اور عام آدمیوں کی طرح بازار میں سودا سلف خریدتا ہے۔  
اس کی سواری کے ساتھ نہ طبل بجاتے ہیں اور نہ سڑکوں کو عام لوگوں سے خالی کر دیا جاتا ہے  
زرق برق لباس اور دیگر فضول سامان آرائش و زیبائش بھی ممنوع ہیں۔ سونے  
چاندی کے برتنوں میں کھانا حرام قرار دیا گیا ہے۔ مردوں کے لئے ریشمی لباس حرام  
ہے۔ سادگی سے ہمدردی کی روح پیدا ہوتی ہے۔ جو لوگ عیش و عشرت کی زندگی  
بسر کرتے ہیں۔ انہیں غریبوں کی زندگی اور دکھ سکھ کا اندازہ کیونکر ہو سکتا ہے اور ان  
میں عوام کی ہمدردی کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔ تہذیب وہی بہتر ہے جو زیادہ اخراجات  
کی طالب نہ ہو۔ اسلامی معاشرہ میں بیاہ شادی اور اظہارِ غم کے موقع پر جو ناراوا  
اخراجات برداشت کیے جاتے ہیں وہ اسلامی تہذیب کی روح کے منافی ہیں۔ پر تکلف  
زندگی بسر کرنے کے لئے رشوت اور "فضل ربی" کا سہارا لینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اسلامی  
معاشرہ سے رشوت کے استیصال کے لئے سادگی ایک نسخہ آکیر ہے۔



پاکیزگی  
دین اسلام میں صفائی و پاکیزگی کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ ظاہری پاکیزگی  
باطنی طہارت کے لئے تمہید کا حکم رکھتی ہے۔ انبیاء خود بھی لطافت پسند  
ہوتے ہیں مگر اس کے باوصف سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو صفائی کا حکم دیا گیا ہے۔  
قرآن حکیم میں فرمایا۔

وَشِيَابَكَ فُطِّمَتْهُ وَأَلْرُجْرَفَا هَجْنٌ اور اپنے کپڑے پاک رکھ اور  
(المداثر) گندگی سے دور رہ۔

جب جسم و لباس پاک صاف ہو تو روح میں از خود پاکیزگی و بالیدگی آجاتی ہے۔ اسی  
لئے اسلامی عبادات انجام دینے سے پہلے جسم و لباس کی طہارت ضروری قرار دی گئی ہے  
ایک نمازی سب سے پہلے پاکیزہ لباس زیب تن کر کے وضو کرتا ہے۔ مسواک کر کے دانتوں  
کی صفائی کا اہتمام کرتا ہے۔ لہسن پیاز اور بدبو دار چیز کھا کر مسجد میں جانے کی اجازت  
نہیں دی گئی۔ خوشبو لگانے کو مستحسن قرار دیا گیا ہے۔ اسلامی تہذیب میں صفائی کو اشد  
عمل و خل حاصل ہے کہ اہل اسلام ہر کام میں طہارت و نفاست کا خیال رکھتے ہیں۔ کھانے  
پینے پھیننے کے علاوہ وہ عمارات کی تعمیر میں بھی اس پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے۔ روشن اور  
ہوادار مکانات صاف ستھرے کمرے اور کشادہ صحن اسلامی تہذیب کے عکاس ہیں۔  
مسجدیں صاف ستھری کشادہ روشن، ان کی صفائی کا یہ عالم ہے کہ جدالانسب یا حضرت  
ابراہیم خلیلؑ اور ان کے نعت جگر حضرت اسماعیل علیہم السلام کو حکم دیا جا رہا ہے کہ  
طَهِّرْ بَيْتِي لِلطَّائِفِينَ ۝ میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لیے  
(البقرہ) پاک صاف رکھیں۔

گویا مساجد کی تطہیر جب انبیاء کے لیے باعث عزت و عظمت ہے تو کسی دوسرے  
کے لئے یہ عمل باعث توہین کیونکر ہو سکتا ہے؟ اسلام میں پاکیزگی کو یہ درجہ حاصل ہے  
کہ وہ "طیب" (پاکیزہ) اشیاء کو حلال اور "خبیث" (ناپاک) چیزوں کو حرام قرار  
دیتا ہے۔



۶۔ اعتدال پسندی  
 دین اسلام افراط و تفریط سے پاک اور میانہ روی کا حامی ہے۔ اس امت کو "امت وسط" درمیانہ امت کا لقب دیا گیا ہے۔ اس کی تعلیمات کا مرکزی نقطہ اعتدال ہے۔ خوشی غمی کھانے پینے کھیلنے کودنے بلکہ جملہ مشاغل حیات میں میانہ روی اختیار کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ غم کبھی حد سے نہ بڑھے۔ ایسا نہ ہو کہ تم نالہ و شیون اور سینہ کو پی پر اتر آؤ۔ خوشی میں بھی اعتدال ملحوظ رہے۔ ایسا نہ ہو کہ راگ رنگ اور موسیقی کی محفلیں منعقد ہونے لگیں جو فحاشی، عریانی اور بے حیائی کی سرحدوں کو چھونے لگیں۔ کھیل کود کی اجازت اسی حد تک ہے جہاں تک یہ جسمانی ورزش کے لئے ضروری ہے۔ اس سے آگے اس کی بھی اجازت نہیں۔ کھانے اور لباس اور دیگر لوازم زندگی میں بھی اعتدال ضروری ہے۔ اسراف ممنوع ہے۔ مردوں کو ریشمی لباس سے اسی لئے روکا گیا ہے تاکہ یہ لباس ان میں تن آسانی اور کبر و فخر کے جذبات نہ پیدا کر دے۔ عبادات میں بھی میانہ روی کا اصول کار فرما ہے۔ عبادت اتنی ہی کی جائے جو بخوشی خاطر ہو اور طبیعت ملال نہ پکڑے۔ ایسی طویل دعا سے بھی منع کیا گیا ہے جس سے طبیعت اکتا جائے۔

۷۔ اخوت  
 اسلامی تمدن کا ایک اہم عنصر اخوت ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ سب مومن بھائی بھائی ہیں۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (الحجرات: ۱۰) سب مومن بھائی بھائی ہیں۔  
 ایک کو تکلیف دے تو سب ترم بے آرام ہو جاتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ سب مومن ایک جسم کی مانند ہیں۔ جس طرہ جسم کا کوئی عضو تکلیف میں مبتلا ہو تو سارا جسم بیقرار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک مومن کی تکلیف دوسرے کو بے چین کر دیتی ہے۔

مولانا ظفر علی خان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۵

اخوت اس کو کہتے ہیں چھبے کا نٹا جو کابل میں  
 تو دلی کا ہراک پیر و جوان بے تاب ہو جائے

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ ارشاد فرماتے ہیں ۵



بنی آدم اعضائے یک دیگر اند  
 کہ در آفرینش زیک جوہر اند  
 چو عضوے بدو آور و روزگار  
 وگر عضو ہارا نماں دستار  
 یہی جذبہ اخوت تھا جس نے حجاج بن یوسف کو مسلمان عورتوں کے ڈاکوؤں کے  
 ہاتھوں گرفتار ہونے کی خبر سن کر محمد بن ناسم کو راجہ داہر کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ یہی وہ  
 جذبہ اخوت ہے جس کے پیش نظر ہم پاکستانی مسلمان اپنے کشمیری بھائیوں کو آزاد  
 کرانے کے لئے بے چین ہیں۔

اسلامی تمدن کی ایک خصوصیت یہ ہے  
 ۸۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کہ اس میں نیکیاں پھلتی پھولتی ہیں اور

برائیاں دب جاتی ہیں۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی بجائے اوری کے لئے اس اُمت کو  
 عالم وجود میں لایا گیا ہے۔ اسی فریضہ کی تکمیل و تعمیل کی بنا پر یہ ملت "خیر اُمت کے  
 بلند پایہ لقب سے نوازی گئی۔ قرآن کریم میں فرمایا ہے :-

"وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ  
 إِلَى الْخَيْرِ يَا مُرُونَ بِالْأَعْيُوفِ وَ  
 يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (آل عمران ۱۰۴)

قرآن کریم میں فرمایا۔

"تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا  
 تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِسْءِ وَالْعَدْوَانِ" مدد کرو اور گناہ اور بغاوت میں کسی

(المائدہ - ۲) سے تعاون نہ کرو۔

اسلامی تمدن میں یہ خصوصیت ہے جس میں کوئی دوسرا تمدن اس کی ہمسری نہیں  
 کر سکتا کہ اسلامی تمدن ایک ایسے ماحول کو جنم دیتا ہے جو نیکی کے لئے بڑا سازگار  
 اور برائیوں کے لئے زہرِ قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ یہ تمدن بد قماش و ادبائش لوگوں کو  
 دندنا تے پھرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس میں ہر شخص کی ناموس و آبرو اور مال و جان  
 محفوظ ہوتی ہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ غیر مسلم تک اس کے سایہ میں بے خوف و خطر



زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ بہر کیفیت یہ تمدن ہر لحاظ سے پُر امن اور سکون بخش ہوتا ہے

یہ ہیں وہ خصوصیات جو اسلامی تہذیب

تہذیب کا بقاء و ارتقاء کی نشاندہی کرتی ہیں۔ گویا تہذیب ایک

آئینہ ہے جس میں کسی قوم کے خدو خال دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس لئے قومی زندگی کی بقاء

کے لئے تہذیب کا رہنا از بس ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ زمان و مکان کی تبدیلی

سے کسی حد تک تہذیب میں فرق آجاتا ہے۔ مگر اس کے بنیادی اصول کبھی نہیں بدلتے۔

کیونکہ تہذیب کا سرچشمہ دین ہے جو ناقابل تغیر ہے۔ مثلاً اسلامی تہذیب کا تقاضا ہے

کہ لباس ایسا پہنا جائے جس میں عریان کا کوئی شائبہ نہ ہو اور عبادات کی بجا آوری

میں مانع نہ ہو۔ اس تقاضا میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی لیکن اس کی مقرر کردہ حدود

کے اندر لباس کی وضع قطع پر کوئی پابندی نہیں۔ اس طرح مختلف ممالک میں بسنے

والے مسلمانوں کا لباس، طرز معاشرت اور لوازم حیات مختلف ہوں گے مگر اس

باوصف روئے زمین کے مسلمانوں کی چند باتیں ایسی مشترک بھی ہوں گی جو ان کو اختیار

زمان و مکان و تنوع رنگ و نسل کے باوصف ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کریں گی۔

کسی ملت کی تہذیب اسی وقت تک زندہ رہتی ہے جب تک اس کی بنیادی خصوصیت

قائم و دائم ہیں۔ تہذیب ملت کا چہرہ ہے۔ اسی سے ملت کی شناخت ہوتی ہے۔

بلکہ یہی ملی امتیاز کی علامت ہے۔ جس ملت کی کوئی امتیازی شان نہ ہو اس کا دنیا

میں کوئی وقار نہیں ہوتا۔ تہذیب ان بنیادی امتیازات میں سے ہے جو قوم کے اندر

اتحاد و یکجہتی کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ یہ احساس قوم میں خود اعتمادی پیدا کرتا ہے

تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ دنیا میں ہمیشہ طاقت ور اور

فاتح قوم کی تہذیب غالب رہی ہے۔ جو قوم احساس کمتری کا شکار ہو کر قوت و

شوکت کی طالب نہیں رہتی وہ اپنی تہذیب کو بھی برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اسی طرح

جو قوم اپنے مانتھوں اپنی تہذیب کو پلایا میٹ کر دے وہ اپنی ملی روح کو بھی قربان کرنے

سے نہیں شرماتی۔ جو قومیں ذہنی غلامی کے مرض میں گرفتار ہوتی ہیں۔ وہ اپنے آقاؤں



کی ہر ادا کو اپنانے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ ان کی نگاہ میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکیں۔ اس لئے تہذیب کو برقرار رکھنے کے لئے ملی غیرت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے اس لئے وہ غالب رہنا چاہتا ہے۔ مغلوب ہونا پسند نہیں کرتا۔ اس لئے تہذیب کی بقا و ارتقا کے لئے کوشاں رہنا اہل اسلام کا اولین فریضہ ہے۔

---



# مباحث متعلقہ ہندیب و ثقافت پر ایک طائرانہ نظر

اب تک ہم نے تفصیلاً جو کچھ بیان کیا ہے۔ اس کا اجمالی خاکہ حسب ذیل ہے۔  
**کلچر کا مفہوم** کلچر انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے مفہوم و معنی کو ظاہر کرنے کے لیے عربی سے ثقافت کا لفظ مستعار لیا گیا ہے۔ ثقافت کے لفظ کو سب سے پہلے نامور ادیب و مفکر مولانا ظفر علی خاں مرحوم مدیر شہیر روزنامہ زمیندار لاہور نے دنیائے علم و ادب میں رائج کیا۔ یہ لفظ متحدہ ہندوستان میں ہندیب و تمدن کے معنوں میں برسوں مستعمل رہا۔ ثقافت اور ہندیب و تمدن کے الفاظ قریب المعنی ہیں۔ اگرچہ ان میں تھوڑا سا معنوی فرق پایا جاتا ہے مگر بسا اوقات اس فرق کو نظر انداز کر کے ان کو ایک دوسرے کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔

کلچر کی تعریف :- مختلف مفکرین نے اپنے اپنے دائرہ فن میں محدودہ کر کلچر کی مختلف تعریفیں کیں۔ ہر فن کے علماء کلچر کی تعریف جداگانہ انداز پر کرتے ہیں۔ مشہور مفکر ٹالکرنے حسب ذیل تعریف کی ہے۔

”کسی قوم کا عقیدہ، مذہب، اخلاق، فن، زبان، رسم و رواج، قانون تمام معاشرتی افکار و آراء و صلاحیتیں اور طریقہ ہائے معاشرت کلچر کے اجزاء شمار ہوتے ہیں۔“

دورِ حاضر کے ایک مشہور مفکر کی یہ تعریف بہت پسند کی گئی ہے کہ  
 ”ثقافت ان لوگوں کی پوری زندگی کا ایک بہترین نمونہ پیش کرتی ہے جو ایک قوم کی حیثیت سے مل جھل کر رہتے ہیں اور جن کو معاشرہ



میں سرایت کر جانے والا ایک ایسا ہمہ گیر نقطہ نظر یا ہم متحد کر دیتا ہے جسے یہ لوگ شعوری طور پر اپناتے یا خاموشی سے قبول کر لیتے ہیں۔ ثقافت کے مندرجہ صدر مفہوم میں ان لوگوں کی تمام سرگرمیاں دلچسپیاں ان کے رسم و رواج، ان کا مذہب اور ان کے معاشرتی اور سیاسی ادارے سب شامل ہیں۔ مسلمان چونکہ عالمگیر مذہب اسلام کے پیرو ہیں اور ان کا وطن پورا عالم ہے۔ اس لیے دوسری قوموں کے کلچر کی طرح اسلامی ثقافت، ملکی آب و ہوا سے متاثر نہیں ہوتی اور نہ وہ جغرافیائی حدود کے اندر محدود ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی روح اور روایات بھی عالمگیر ہیں۔

کلچر کے عوامل و عناصر  
 کلچر از خود عالم وجود میں نہیں آیا بلکہ کچھ عوامل و محرکات اس کو جنم دیتے ہیں۔ بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر کلچر کا ایک محور اور مرکزی نقطہ ہوتا ہے جو اس کے نشوونما کا باعث اور موجب ہوتا ہے۔ یہ محور دراصل کسی قوم کے عقائد و افکار ہوتے ہیں۔ دنیا کی ہر قوم اور ہر معاشرہ کسی نہ کسی مذہب کا حامل ہوتا ہے۔ اس معاشرہ کے افراد اپنے مخصوص افکار و عقائد کی روشنی میں اپنے جملہ اعمال و افعال انجام دیتے ہیں۔ یہ اعمال اس قوم سے اتنی کثرت کے ساتھ صادر ہوتے ہیں کہ ان کے مزاج اور طبیعت میں رچ بس جاتے ہیں۔ افراد کی ان مسلسل و پیہم عادات کی وجہ سے ان کی سیرت کی تشکیل و تکمیل ہوتی ہے۔ پھر اسی سیرت و کردار کے تحت جب افراد مختلف قسم کے رجحانات و میلانات کا اظہار کرتے ہیں تو اس سے کلچر کی تخلیق ہوتی ہے۔

مندرجہ صدر بیان سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ مذہبی عقائد ہی وہ اصل محور ہیں جس کے گرد کسی قوم کا کلچر گردش کرتا ہے۔ جس قدر افعال و اعمال اور افکار و عقائد کلچر کی وسیع فہرست میں شامل ہیں ان کا وجود و شہود کسی اعتقادی نظریے کے تحت ہی ہوتا ہے۔ اس کلچر سے ایک قوم قومیت سے متصف ہوتی ہے۔ اسی سے ان کے جذبات و احساسات ابھرتے ہیں۔ ہر قوم اپنا ایک مخصوص کلچر رکھتی ہے۔ جو اسے دوسری قوموں



سے ممتاز کرتا ہے۔ جب آپ کسی شخص کے سر پر لمبے بال گلے میں کرپان لمبی ڈارٹھی اور ہاتھ میں کڑا دیکھتے ہیں تو آپ فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ یہ سیکھ قوم کا فرد ہے۔ اگر آپ دیکھتے ہیں کہ ایک شخص لمبا سا کرتا اور قبا اور ساتھ ہی سر پر رومال اور عقاب باندھ ہوئے ہے۔ آپ فوراً پہچان جائیں گے کہ یہ عرب ہے۔ اسی طرح جب آپ ایک مخصوص انداز سے قبیلے کی طرف منہ کر کے سینہ پر ہاتھ باندھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک خاص طریقہ سے جھکنے اور زمین بوس ہو جاتے ہیں۔ تو دیکھنے والا فوراً یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ مسلم ہے۔

الغرض کلچر مذہب سے تشکیل پاتا ہے۔ اس کا وجود ماضی میں قائم ہوتا ہے اور تدریج ارتقاء پذیر رہتا ہے۔ ہر قوم کا ایک خاص اندازِ زیارت ہوتا ہے۔ جو اس کے مذہبی افکار کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے۔

ہر قوم اپنے کلچر کی مدح و ستائش میں رطب اللسان ہوتی ہے اور دوسری اقوام کے کلچر کو ناپسند کرتی ہے۔

**اسلامی تہذیب کا مفہوم** تہذیب کسی قوم کے علوم و فنون طرز معاشرت اور انداز تمدن کا نام ہے۔ ہر ملت کی

تہذیب اس کے مذہب سے پھوٹی ہے۔ بعد ازاں زمان و مکان کے اختلافات کسی حد تک اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی بنیاد ہر حال میں مذہب ہی رہتا ہے ہر وہ قوم جس کا مذہب سے کچھ تعلق ہو وہ زندگی کے آداب و اطوار اور رسم و رواج میں اپنے مذہب سے ضرور متاثر ہوتی ہیں۔ لباس سوسائٹی کے آداب گھریلو نظام تعمیرات نظام تعلیم اور نظام حکومت وغیرہ لامحالہ مذہب سے متاثر ہوتے ہیں۔

ملت اسلامیہ کی بھی ایک جداگانہ تہذیب ہے جسے اسلامی تہذیب کہا جاتا ہے اس کا دائرہ فرد سے لے کر جماعت ریاست اور امت تک حاوی ہے۔ اس کے اظہار و بیان کے لئے ہمارے پاس ایک جامع لفظ "نظام حیات" موجود ہے۔ اس کو دین بھی کہتے ہیں۔ اس لئے اسلامی تہذیب وہی ہو سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور



آخرت کی تیاری میں مدد دے۔

اسلامی تہذیب اپنی اصل و اساس کے اعتبار سے خالص اسلامی ہے اور یونانی و رومی تہذیب ہے ماخوذ نہیں ہے۔ اسلامی تہذیب کا قصر مکمل طور پر اسلام کی اپنی تعمیر و تشکیل کا نتیجہ ہے۔

اسلامی تہذیب کے اجزاء ترکیبی اس تہذیب کی تشکیل مندرجہ ذیل  
پانچ عناصر سے ہوتی ہے۔

۱۔ دنیوی زندگی کا تصور

۲۔ زندگی کا نصب العین

۳۔ بنیادی افکار و عقائد (اجزاء ایمان)

۴۔ ارکان اسلام

۵۔ اخلاق و آداب

اسلامی تہذیب ان عناصر سے کیسے ترکیب پاتی ہے۔ اس کا مختصر بیان حسب

ذیل ہے۔

۱۔ دنیوی زندگی کا تصور۔ اسلام نے زندگی کا یہ تصور پیش کیا ہے کہ انسان عام

مخلوقات کی طرح نہیں ہے۔ بلکہ کائناتِ ارضی پر خدا کا نائب ہے۔ دنیا اور اس کی طاقتوں کو انسان کے لئے مسخر کیا گیا ہے۔ انسان سب مخلوقات کا حاکم اور صرف خدا تعالیٰ کا محکوم ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ مگر عزت کا استحقاق انسان کو اس وقت حاصل ہو سکتا ہے۔ جب وہ خدا کا فرماں بردار ہو جس نے اسے یہ شرف بخشا ہے

۲۔ زندگی کا نصب العین۔ انسان کو عبادت خداوندی کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔

اس لئے خدا کی عبادت اس کی زندگی کا مقصد و حید اور نصب العین ہے۔ لہذا انسان کو چاہئے کہ خداوند تعالیٰ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرے۔ اپنی وفاداریاں اس کے لئے وقف کر دے۔ کائنات کی ہر شے سے اپنے آپ کو بلند سمجھے۔ دنیا کی زندگی کو عارضی خیال کرے اور اخروی فلاح و صلاح کے لیے اعمالِ صالحہ انجام دے۔



۳۔ بنیادی عقائد۔ انسان کی عملی زندگی میں نظم و ضبط اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ ایک مستقل سیرت رکھتا ہو۔ سیرت سازی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کا ذہن پر اگندہ خیالی سے پاک ہو اور چند مخصوص عقائد اس میں ٹپختہ ہو جائیں۔ یہ عقائد جتنے گہرے ہوں گے سیرت اتنی ہی زیادہ مضبوط ہوگی اور انسان کی عملی زندگی اتنی ہی زیادہ منظم ہوگی۔ یہ عقائد اسلامی تہذیب کی تشکیل کے لئے اساس و بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ عقائد حسب ذیل ہیں :-

۱۔ ایمان باللہ

۲۔ ایمان بالملائکۃ

۳۔ ایمان بالرسول

۴۔ ایمان بالکتاب

۵۔ ایمان بالیوم الآخر

۴۔ ارکان اسلام۔ یہ ارکان خمسہ وہ بنیادی امور ہیں جو افراد کو عمدہ تربیت دے کر ان کی زندگی کو سانچہ میں ڈھال دیتے ہیں۔ ان کی وجہ سے زندگی کے بقیہ اعمال میں حسن و جمال پیدا ہو جاتا ہے۔ جس طرح بنیادی عقائد انسان کی ذہنی دنیا کی بنیاد ہیں اسی طرح ارکان اسلام عملی زندگی کی اساس ہیں۔ بنیادی عقائد کی طرح ارکان اسلام بھی پانچ ہیں :-

۱۔ کلمہ طیبہ

۲۔ نماز

۳۔ زکوٰۃ

۴۔ روزہ

۵۔ حج

۵۔ اخلاق و آداب۔ جو اوصاف انسان میں رچ بس کر اس کی طبیعت کا جزو بن جائیں ان کو اخلاق کہتے ہیں۔ بُرے کاموں سے نفرت اور اچھے کاموں کی طرف رغبت حسن خلق ہے آداب یہ سکھاتے ہیں کہ انسان ہر شخص کے مرتبہ کو پہچانے اور کسی معاملہ میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ آداب اخلاق کے محافظ ہوتے ہیں اور اخلاق



کے لئے تفصیل کا کام دیتے ہیں۔ آدابِ زندگی میں سلیقہ پیدا کرتے ہیں اور سلیقہ و نفاست کا دوسرا نام کلچر ہے۔

یہ ہیں اسلامی تہذیب کے عناصرِ خمسہ جن سے بل کر اس کی تشکیل ہوتی ہے۔  
اسلامی تہذیب کے نمایاں خدو خال  
اسلامی تہذیب کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

- ۱۔ توحید
  - ۲۔ ذکرِ الہی
  - ۳۔ مساوات
  - ۴۔ سادگی
  - ۵۔ پاکیزگی
  - ۶۔ اعتدال پسندی
  - ۷۔ اخوت
  - ۸۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر
- ان کی تفصیلات پیچھے گزر چکی ہیں۔ وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

## سوالات

- ۱۔ اسلامی تہذیب زندگی کے کن کن دائروں سے مرتب ہوتی ہے۔ (لاہور بورڈ ۱۹۶۲ء)
- ۲۔ اسلامی تہذیب زندگی کے کن کن دائروں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسلام کے ایک کامل نظامِ حیات ہونے کی تفصیل بیان کیجئے۔ (لاہور بورڈ ۱۹۶۴ء)
- ۳۔ کیا یہ درست ہے کہ تہذیب کا سرچشمہ مذہب ہے۔ اس کی تشریح کیجئے اور مثالوں سے اپنے موقف کی وضاحت کیجئے۔ (لاہور بورڈ ۱۹۶۴ء)
- ۴۔ ان عوامل و عناصر کی تفصیل بیان کیجئے جو کسی تہذیب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ نیز بتائیے کہ کسی تہذیب کے قیام میں دین کا کہاں تک تعلق ہے۔ (لاہور بورڈ ۱۹۶۲ء)
- ۵۔ اسلام نے زندگی کا کیا تصور پیش کیا ہے اور اس کا پیش کردہ تصور دیگر مذاہب کے تصورات پر کیا فوقیت رکھتا ہے؟
- ۶۔ اسلامی تہذیب کا نصب العین کیا ہے؟ تفصیلاً بیان کیجئے۔
- ۷۔ بنیادی عقائد سے کیا مراد ہے؟ ان سے اسلامی تہذیب کی تشکیل میں کیا مدد ملتی ہے؟
- ۸۔ ارکانِ اسلام کون کون سے ہیں؟ یہ ارکان اسلامی تہذیب کی تشکیل میں کیا پارٹ ادا کرتے ہیں؟



# اخلاق و آداب

اخلاق کی اہمیت کو کہتے ہیں۔ (المسجد)  
 لفظ اخلاق خلق کی جمع۔ خلق عادت فطرت اور طبیعت  
 امام غزالی فرماتے ہیں۔

"خلق نفس کی ایک ایسی کیفیت راستہ کا نام ہے جس کی وجہ سے اعمال بسہولت اور فکر و توجہ کے بغیر صادر ہوتے جائیں۔ اگر اس کیفیت سے اعمال حسہ صادر ہوں تو اس کا نام "خلق حسن" (خوش اخلاقی) ہے۔ اور اگر بُرے اعمال ظہور پذیر ہوں تو اسے بد اخلاقی کہا جاتا ہے۔"

حقوق اللہ :- دنیوی زندگی میں انسان کا تعلق یا اپنے خالق حقیقی سے ہوتا ہے یا دوسرے انسانوں۔ خدا سے بندے کا تعلق اس قسم کا ہوتا ہے جیسے ایک خادم کا مخدوم کے ساتھ اور ایک آقا کا غلام کے ساتھ۔ خالق اور مخلوق کے باہمی تعلق میں جن حقوق کو پیش نظر رکھا جاتا ہے ان کو حقوق اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اسلامی عبادات و ارکان سب حقوق کی فہرست میں شامل ہیں۔

حقوق العباد :- دیگر بنی نوع انسان کے ساتھ تعلقات استوار کرنے میں بھی باہمی حقوق کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک شخص کے تعلقات تمام انسانوں سے یکساں نوعیت کے نہیں ہو سکتے۔ ایک انسان کا رابطہ دوسرے سے جس قدر گہرا ہوگا اسی قدر گہرائی اور پختگی ان کے باہمی حقوق میں پائی جائے گی۔ والدین و اولاد، میاں بیوی اور بھائی بہنوں کا تعلق جس قدر گہرا ہوگا اسی قدر ان کے باہمی حقوق مستحکم اور پختہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ وہ بعد از موت ایک دوسرے کے وارث قرار پاتے ہیں۔



اقارب کے علاوہ اہل وطن، اہل محلہ اور احباب و انصار کے ساتھ بھی انسان کے مراسم ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے اس پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ جن کا بجالانا اس کے لئے ضروری ہے۔ یہ سب حقوق العباد ہیں۔ حقوق العباد کو خوش اسلوبی، رضامندی، تدبیر اور مستعدی سے ادا کرنے کا نام حسن اخلاق ہے۔ جو شخص اقارب و اہل وطن و اہل وطن اور اہل محلہ کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا اور ان کی وجہ سے عائد شدہ شرعی و اخلاقی فرائض کو باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ادا کرتا ہے وہ اخلاقِ حسنہ سے بہرہ ور ہے۔

دنیا کی خوشحالی اور فارغ البالی اخلاق سے وابستہ اخلاق کی اہمیت ہے۔ اخلاق کے بغیر نہ امن و امان قائم ہوتا ہے نہ کسی حکومت کو بقا و استحکام نصیب ہوتا ہے۔ جب اخلاقی انحطاط رونما ہوتا ہے تو حکومت اس کی کمی کو قانون کی قوت و شوکت سے پورا کرنا چاہتی ہے۔ اگر اخلاقی معیار دنیا میں قائم رہے تو دنیا کی کسی حکومت کو جبری حکومت نافذ کرنے کی ضرورت ہی لاحق نہ ہو۔

دنیا کے تمام مذاہب کی بنیاد اخلاقی پر ہی رکھی گئی ہے۔ کائناتِ ارضی میں جس قدر پیغمبر اور مصلح آئے سب یہی کہتے رہے کہ سچ بولنا اچھا اور جھوٹ بولنا بُرا ہے۔ انصاف بھلائی اور ظلم بُرائی ہے۔ تاہم جس طرح اسلام کے دیگر احکام و مسائل مذاہبِ عالم کی تعلیمات پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح اسلام کا پیش کردہ نظامِ اخلاق بھی دوسروں کی نسبت جامع کامل اور ہمہ گیر ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

أَتَمَّا بَعَثْتُ لِأَتِيَهُمْ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ (مسند احمد بیہقی) مجھے صرف اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آنحضرتؐ نے آفاقی بعثت کے ساتھ ہی اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کا اہم کام شروع کر دیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ مکرمہ ہی میں مقیم تھے کہ ابوذر



نے اپنے بھائی کو اس نئے پیغمبر کے حالات کی تحقیق کے لئے بھیجا۔ انہوں نے واپس آکر اپنے بھائی کو ان الفاظ میں اطلاع دی کہ :-

"رَأَيْتُهَا يَا مُرَّ بِمَكَارِمِ الْأَخْلَاقِ" میں نے اس کو دیکھا وہ لوگوں کو (صحیح مسلم) اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دیتا ہے۔

ہجرتِ مدینہ سے قبل جب چند مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ پہنچے۔ شاہِ حبشہ نجاشی نے مسلمانوں کو بلوا کر اسلام کے متعلق دریافت کیا تو اس کے جواب میں حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے جو تقریر کی۔ اس کے چند فقرے یہ ہیں۔

"اے بادشاہ! ہم ایک جاہل قوم تھے۔ بتوں کو پوجتے تھے۔ مردار کھاتے تھے۔ بدکاریاں کرتے تھے۔ ہمسایوں کو ستاتے تھے۔ بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا۔ طاقت ور کمزوروں کو کھا جاتے تھے۔ اسی اثناء میں ایک شخص ہم میں پیدا ہوا۔ اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں۔ سچ بولیں۔ خونریزی سے باز آجائیں۔ یتیموں کا مال نہ کھائیں۔ ہمسایوں کو آرام پہنچائیں۔ پاکدامن عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں۔"

(سیرت النبیؐ بحوالہ مسند ابن حنبل)

قرآنِ کریم نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں یہ الفاظ فرمائے ہیں :-

"وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ (یہ پیغمبر جاہلوں کو پاک و صاف کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے) وَالْحِكْمَةَ" (المجمد)

یہ سلیمان ندوی اس آیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اس آیت میں دو لفظ قابلِ غور ہیں۔ ایک پاک و صاف کرنا جس کو قرآنِ پاک نے تزکیہ کہا ہے اور دوسرا حکمت۔

۱۔ تزکیہ کے لفظی معنی میں پاک و صاف کرنا، نکھارنا۔ میل کچیل دور کرنا۔ قرآنِ پاک نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے کہ نفسِ انسانی کو ہر قسم کی پچاسوں



اور آلودگیوں سے نکھار کر صاف سُخرا کیا جائے یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دُور کر کے اس میں صیقل اور جلا پیدا کر دی جائے۔

۲۔ حکمت کے لفظ کا اطلاق جہاں اس علم و عرفان پر ہوتا ہے جو نورِ الہی کی صورت میں نبی کے سینہ میں ودیعت کیا جاتا ہے۔ اس کا دوسرا اطلاق ان علمی آثار و نتائج پر بھی ہوتا ہے جن میں بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات کا ہے۔

وَأَكْمَلُ الْإِيمَانَ لِيَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ  
أَحْسَنَهُمْ خُلُقًا (ترمذی)

سب سے کامل ایمان والا وہ شخص ہے جس کا خلق سب سے بہتر ہے

نیز فرمایا :-

”إِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحْسَنَكُمْ  
أَخْلَاقًا“ (بخاری و مسلم)

تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جس کا خلق سب سے بہتر ہے

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ سعادت ہجرت میں دو صحابیہ تھیں۔ ایک رات بھر نماز پڑھتیں۔ دن کو روزہ رکھتیں اور صدقہ دیتیں مگر اپنی زبان درازی سے پڑوسیوں کا دم ناک ہیں کئے رکھتی تھیں۔ دوسری صرف نماز پڑھتیں اور غریبوں کو کپڑے بانٹ دیتیں مگر کسی کو تکلیف نہ دیتیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان دونوں کی نسبت پوچھا گیا تو آپ نے پہلی کی نسبت فرمایا :-

”اس میں کوئی نیکی نہیں وہ اپنی بد خلقی کی سزا بھگتے گی“

دوسری کے بارے میں فرمایا۔ ”وہ جنتی عورت ہے“ (ادب المفرد امام بخاری)

حضرت براء بن عازبؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک بدوی نے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ”مجھے وہ کام سکھائیے جو مجھے جنت میں لے جائے۔“ فرمایا۔

”انسانوں کو غلامی سے آزاد کر۔ ان کی گردنوں کو قرص کے بندھن سے چھڑا اور ظالم رشتہ داروں کو ظلم سے منع کر۔ اگر تو یہ نہ کر سکے تو بھوکے کو کھلا اور پیاسے کو پلا نیکی کی راہ دکھا اور بُرائی سے روک۔ اگر یہ بھی نہ کر سکے تو بھلائی کے سوا اپنی زبان بند رکھ۔“ (مشکل الآثار امام طحاوی جلد ۴ ص ۷۱)



## ایمان کے اوصاف و لوازم

بکثرت ایسی احادیث ہیں۔ جن میں سرور

لوازم و خصوصیات بیان فرمائی ہیں۔ جس قدر ان لوازم میں زیادتی یا کمی ہوگی۔ گویا اسی قدر اک ایمان کے منشاء میں زیادتی و کمی ہوگی۔ یہ ظاہری اخلاق ہماری اندرونی ایمانی کیفیت کا معیار اور پیمانہ ہیں۔ ہمارے دل کے اندر کا ایمان ہمارے گھر کا چراغ زبردست ہے۔ جس کی چمک دمک اور روشنی کا اندازہ اس کی باہر نکلنے والی شعاعوں سے کیا جائے گا۔ آپ نے فرمایا: ایمان کی نشتر سے کچھ اور شاخیں ہیں جن میں سے ایک جیا ہے۔ ۲۔ ایمان کی بہت سی شاخیں ہیں جن میں سب سے بڑھ کر توحید کا اقرار ہے اور سب سے کم درجہ یہ ہے کہ تم راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹا دو تاکہ دوسرے بھائی کو تکلیف نہ ہو۔

۳۔ جس میں تین باتیں ہوں اس نے ایمان کا مزہ پایا۔ جس کو خدا اور اس کا رسول سب سے پیارا ہو۔ جو دوسرے کو صرف خدا کے لئے پیار کرے اور جس کو ایمان کے بعد کفر میں مبتلا ہو جانے سے اتنا ہی دکھ ہو جتنا آگ میں پڑنے سے۔

۴۔ جس میں یہ تین باتیں ہوں اس نے ایمان کا مزہ پایا۔ سچی بات کے سامنے جھگڑنے سے باز رہنا۔ مزاحمت کے باوجود جھوٹ نہ بولنا اور یقین کرنا کہ جو کچھ پیش آیا وہ سچ نہیں سکتا۔

۵۔ تین باتیں ایمان کا جز ہیں۔ مفلسی میں بھی خدا کی راہ میں دینا۔ دنیا میں امن و سلامتی پھیلانا اور خود اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی انصاف کرنا۔

۶۔ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا۔ جب تک اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے کرتا ہے۔

۷۔ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے جس پر لوگ اتنا بھروسہ کریں کہ اپنی جان و مال اس کی امانت میں دیدیں۔

۸۔ ایک شخص آکر پوچھتا ہے یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہ کیا ہے ایمان؟



بہتر ہے۔ فرمایا بھوکوں کو کھانا کھلانا اور جانے انجانے ہر ایک کو سلامتی کی دعا دینا  
 ۹۔ ایک شخص پوچھتا ہے کہ اے خدا کے رسول! اسلام کیا ہے۔ فرمایا اچھی بات  
 بولنا اور کھانا کھلانا۔ پھر پوچھا۔ ایمان کیا ہے فرمایا صبر کرنا اور اخلاقی جو امر وی  
 دکھانا۔

۱۰۔ مومن وہ ہے جو دوسروں سے اُلفت کرتا ہے اور جو کوئی نہ دوسروں سے  
 اُلفت کرتا ہے اور نہ کوئی اس سے اُلفت کرتا ہے اس میں کوئی بھلائی نہیں۔  
 ۱۱۔ مومن نہ تو کسی پر طعن کرتا ہے نہ کسی کو بد دعا دیتا ہے اور نہ گالی دیتا ہے اور  
 نہ بد زبان ہوتا ہے۔

۱۲۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر وہ ظلم کرے اور نہ اس کو  
 گالی دے جو اپنے کسی بھائی کی مدد میں ہوگا خدا اس کی مدد میں ہوگا۔ جو کسی مسلمان  
 کی کسی مصیبت کو دور کرے گا تو خدا اس کی مصیبت کو دور فرمائے گا۔

۱۳۔ مومن وہ ہے جس کو لوگ امین سمجھیں۔ مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے  
 لوگ سلامت رہیں۔ ہما پڑوہ ہے جس نے بدی کو چھوڑ دیا ہے۔ اس ذات کی  
 قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ کوئی اس وقت تک جنت میں  
 نہیں جاسکتا جب تک اس کا پڑوسی اس کے غصے سے محفوظ نہ ہو۔

۱۴۔ جو صاحب ایمان ہے اس کو چاہئے کہ اپنے ہجان کی عزت کرے۔

۱۵۔ بے ایمان منافق کی پہچان تین باتیں ہیں: ۱۔ بولے تو جھوٹ بولے اور عدہ

کرے تو خلاف کرے ۲۔ اس کو امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔

ان مذکورہ بالا حدیثوں سے ایک ایک حدیث پر غور کرنا چاہیے کہ ایمان کا

اخلاقی تخیل سمجھنا اور بند ہے۔

لیکن اسلام نے اخلاقِ حسنہ  
اخلاقِ حسنہ صفاتِ الہی کا پرتو نہیں کا اس سے بھی بلند تصور پیش

کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اخلاقِ حسنہ درحقیقت صفاتِ الہی کا سایہ اور نئی ہیں اور اسی



کی صفات کاملہ کے ادنیٰ ترین مظاہر ہیں۔ حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا۔  
 - مِنَ الْخَلْقِ خَلَقَ اللَّهُ الْأَعْظَمُ یعنی خوش خلقی اللہ تعالیٰ کا خلق

(طبرانی) عظیم ہے۔

ہم انہی اخلاق کو اچھا کہتے ہیں جو صفات ربانی کا عکس ہیں اور انہی کو بُرا کہتے ہیں جو خدا کی صفات کے منافی ہیں۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ خدا کی بعض خاص حقیقتیں ایسی بھی ہیں جو اس کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن کا تصور بھی دوسرے میں نہیں کیا جاسکتا۔ جیسے اس کا واحد ہونا۔ نیز بعض ایسی پُر جلال حقیقتیں بھی ہیں جو صرف خدا ہی کیلئے تریا ہیں جیسے اس کی کبریائی اور بڑائی وغیرہ۔ اس قسم کی صفات کا بندہ میں کمال یہ ہے کہ ان کی مقابل کی صفات اس میں پیدا ہوں۔ خدا کی کبریائی کے مقابلہ میں بندہ میں خاکساری اور تواضع ہو اور خدا کی بلندی کے مقابلہ میں بندہ میں پستی اور فروتنی پیدا ہو۔ الغرض اسلام نے انسان کی روحانی تکمیل کا ذریعہ اسلام کو اس لئے قرار دیا ہے کہ وہ صفات الہی کے انوار سے کسب فیض کا سبب ہے۔ ہم جس حد تک اس کسب فیض میں ترقی کریں گے ہماری روحانی ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا اور یہی ہماری روحانی سیر کی آخری منزل ہے۔ اخلاق کا اس سے بلند تر تخیل ممکن نہیں۔

دنیا میں اخلاق کے بڑے  
 بڑے معلم پیدا ہوئے۔  
 آنحضرتؐ کا امتیاز اخلاقی معلموں میں

جن کے کتب میں آکر بڑی بڑی قوموں نے ادب کا زانو تہ کیا اور آداب و اخلاق کے وہ سبق ان سے حاصل کئے جو سینکڑوں اور ہزاروں برس گزر جانے کے بعد بھی اب تک ان کو یاد ہیں اور سچ یہ ہے کہ آج جہاں کہیں بھی حسن اخلاق کا کوئی نمونہ موجود ہے۔ وہ انہی کے صحیفہ تعلیم کا ایک ورق ہے۔ مگر ایک تنقیدی نظریہ بتا دے گی کہ ان اخلاقی استادوں اور معلموں میں باہمی نسبت کیا ہے۔ ان کے تعلیمی نصاب کی ترتیب کن کن اصولوں پر مبنی ہے اور ان میں درس گاہ عالم کے سب سے بڑے معلم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کیا امتیاز حاصل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے



نوع انسانی کے اخلاقی معلمین کی دو جماعتیں تھیں۔ ایک وہ جس نے اپنی تعلیم کی بنیاد کسی اخروی مذہب پر رکھی جیسے عام انبیاء علیہم السلام اور بعض مذہبوں کے بانی دوسری وہ ہے جس نے اپنے فلسفہ و حکمت اور عقل و دانائی کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کی۔ ہم ان میں سے اول کو انبیاء اور مصلحین دین اور دوسری کو حکماء کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان دونوں جماعتوں نے اپنے درس و تعلیم کے اصول و طریقے الگ الگ اختیار کئے۔ پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں نے اپنی تعلیم کا ماخذ حکم خداوندی کو قرار دیا اور اس حکم و فرمان الہی کے سوا ان کی تعلیم کی کوئی اور بنیاد نہیں۔ نہ ان کی تعلیمات میں علت و معلول کا سلسلہ ہے۔ نہ اخلاق کے دقیق نکتوں کی گہرائی ہے اور نہ ان احکام و تعلیمات کی اخلاقی مصلحتوں اور عقلی مصلحتوں اور عقلی حکمتوں کی تصریح ہے۔ دوسرے فریق کی تعلیمات میں علت و معلول کی تحقیق نفسیاتی خواص کی بحث اخلاق کی غرض و غایت یہ سب کچھ ہے۔ مگر بحث و نظر سے آگے عمل کا درجہ صفر محض ہے۔ اگر ہے تو بے کیف و بے لذت مگر ع

یا رہا میں وارد آں نیز ہم

دنیا کے آخری معلم کی تعلیم میں حکم خداوندی اور عقل و قیقرسی۔ فرمان الہی اور اخلاقی نقطہ وری امر ربانی اور حکم فطرت کتاب اور حکمت دونوں کی آمیزش ہے۔ انبیاء اور حکماء میں جو اصلی فرق و امتیاز ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء کی اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ ان کی معصوم زندگی، ان کے مقدس کارنامے اور ان کے پاک اثرات ہوتے ہیں۔ جن کا فیض ان کے ہر بن موم سے خیر و برکت کی سبیل بن کر نکلتا ہے اور پیاسوں کو سیراب کرتا ہے لیکن بلند سے بلند حکیم اور اخلاق کے دانائے رموز فلسفی جس کی اخلاقی سخن طرازی اور نکتہ پروری سے دنیا محو حیرت ہے اور جس نے انسان کے ایک ایک اندر کی جذبہ، باطنی قوت اور اخلاقی فطرت کا سراغ لگایا ہے۔ عمل کے لحاظ سے دیکھو تو اس کی زندگی ایک بازاری سے ایک اپنچ بلند نہ ہوگی۔ وہ گود دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے مگر خود تاریکی سے باہر نہیں آتا۔ وہ دوسروں کی رہنمائی کا مدعی بنتا ہے مگر خود عمل کی براہ



ہیں بھٹکتا پھرتا ہے وہ رحم و محبت کے طلسمات کے ایک ایک راز سے واقف ہے۔ مگر غریبوں پر رحم کھانا اور دشمنوں سے محبت کرنا وہ نہیں جانتا۔ وہ سچائی اور راست بازی کی حقیقت پر بہترین خطبہ دے سکتا ہے مگر خود سچا امتیاز نہیں ہوتا۔

## اخلاق و ایمان کا تعلق

اسلام میں تمام نیک کاموں کی اصلی غرض و غایت صرف رضائے الہی قرار دی گئی ہے۔ ایک سچے مسلمان کو صرف اسی کی خاطر کام کرنا چاہئے اور اس کے سوا کسی دوسری غرض کو اپنے کام کی بنیاد نہیں بنانا چاہئے۔ یہی چیز فلسفہ اخلاق اور اسلامی اخلاق کے مابین حد فاصل ہے۔ حکمائے اخلاق آج تک اس مسئلہ پر متفق نہ ہو سکے کہ انسانی اخلاق کی اصلی غرض کیا ہے دوسری بجانب معلم اخلاق صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اخلاق کی غرض و غایت رضائے الہی کا حصول ہے۔ انسان کے پاس جان و مال کے سوا آخر رکھا ہی کیا ہے۔ الہی دونوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرنا ایثار اور حسن اخلاق ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ دین اسلام میں نفس عمل مطلوب نہیں بلکہ وہ عمل مطلوب ہے جس کی غرض و غایت صحیح ہو۔ عمل ایک ڈھانچہ ہے اور صحیح غرض و غایت اس کی رُوچ ہے۔ رُوچ نہ ہو تو بے جان قالب کس کام آسکتا ہے۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات میں دلی ارادہ اور انسان کی اندرونی غرض و غایت کو اچھے اور بُرے کام کی بنیاد قرار دیا ہے۔ چونکہ اسلام میں اخلاق بھی دیگر مذہبی امور کی طرح عبادت ہے۔ اس لئے اس کی غرض و غایت ہر قسم کی دنیوی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہئے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ان کاموں میں کوئی نیکی اور ثواب نہیں ہے۔ نہ ہی انہیں عبادت قرار دیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے ایمان و اخلاق کا باہمی ربط و تعلق واضح ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اخلاق سے اٹھائے، صفائے نیت اور سیدھے غرضی اسی صورت میں پیدا ہونے لگتی ہے جب دل میں ایمان کا جذبہ موجزن ہو اور دل اس یقین سے بھر پور ہو کہ ہم کو ذات خداوندی کے آگے اپنے تمام کاموں کا جواب دہ ہونا ہے اور ایک دن آئے گا جب ہمیں



اپنے اعمال کی جزا ملے گی۔ جب تک یہ یقین ذہن و قلب میں جاگزیں نہ ہو اچھے اخلاق کا ظہور اچھی نیت سے ہرگز ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام نے خدا اور قیامت پر ایمان لانے کو ہر ایک عمل کی بنیاد قرار دیا۔ اگر یہ نہ ہو تو ہر کام محض ریاکاری اور نمائش بن جاتا ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا ہے :-

”اے ایمان والو! اپنے صدقات کو جھٹلا کر یا سنا کر برباد نہ کرو۔ جس طرح وہ شخص برباد کرتا ہے جو اپنے مال لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے اور خدا اور

آخری دن پر یقین نہیں رکھتا“ (سورہ بقرہ - ۳۶)

قرآن حکیم میں دوسری جگہ فرمایا :-

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ  
كَسْرَابٍ يَبْقِيَةٌ يَجْسَبُهَا  
الظَّمَانُ مَاءً طَاحْتِي إِذَا جَاءَهُ لَمْ  
يَجِدْهُ شَيْئًا

(سورہ نور)

جو لوگ خداوند تعالیٰ اور روز قیامت کو نہیں مانتے۔ ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے میدان میں ریت کہ پیاسا اسے پانی خیال کرے۔ جب وہ جائے تو کچھ بھی نہ پائے۔

یہاں ان لوگوں کی غلطی واضح ہوتی ہے جن کا خیال ہے کہ اخلاق حسنہ ہماری بخشش کے لئے کافی ہیں۔ ہمیں ایمان کی ضرورت ہے نہ اعمال کی۔ ان دلائل سے معلوم ہوا کہ ایمان کی عدم موجودگی میں اعمال و اخلاق کی حیثیت صرف ایک بے روح ڈھانچہ کی ہے جو خلوص نیت سے عاری ہے اور اس لئے سُرَاب کی طرح بے حقیقت ہے۔ اس ضمن میں ایک حدیث قابل مطالعہ ہے۔ جس کو بیان کرتے ہوئے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تین دفعہ غش کھا کر گرے اور جس کو سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ زار زار روئے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ عدالت کے لئے اترے گا اور ہر امت اپنی جگہ پر گھٹنے ٹیکے گی۔ اس وقت سب سے پہلے قرآن کے عالموں کو پیش کیا جائے گا۔ پھر نمازیوں اور دولت مند لوگوں کو۔ اللہ تعالیٰ عالم سے پوچھے گا کہ کیا تو نے اپنے علم



پر عمل کیا۔ وہ عرض کرے گا بارِ خدا یا میں شب و روز نماز میں قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ خدا فرمائے گا تو جھوٹا ہے۔ فرشتے بھی کہیں گے یہ جھوٹا ہے۔ پھر خدا فرمائے گا کہ تو اس لئے پرکام کرتا تھا کہ لوگ تجھے بڑا قرآن خواں سمجھیں۔ چنانچہ دنیا میں تجھے یہ لقب مل گیا۔ پھر دولت مند سے خدا فرمائے گا۔ کیا میں نے تجھے مال و دولت سے نہیں نوازا تھا؟ وہ عرض کرے گا۔ اے میرے رب درست ہے۔ خدا فرمائے گا۔ پھر تم نے اس مال کو کہاں خرچ کیا۔ وہ جواب دے گا میں اسے خدا کی راہ میں صرف کرتا تھا ارشاد ہو گا تو جھوٹا ہے۔ فرشتے بھی کہیں گے یہ جھوٹا ہے۔ پھر خدا فرمائے گا۔ تو یہ کام اس لیے کرتا تھا کہ لوگ تجھے سخی کے نام سے پکاریں۔ چنانچہ تمہیں دنیا میں سخی کہا گیا۔ اس کے بعد جہاد میں جان دینے والے کو بلایا جائے گا۔ خدا اس سے پوچھے گا۔ تم نے کس لئے جان دی؟ وہ کہے گا میں جہاد کرتے ہوئے مارا گیا تھا۔ خدا فرمائے گا۔ تو جھوٹا ہے۔ فرشتے بھی اسے جھوٹا کہیں گے۔ پھر خدا فرمائے گا تو بہادر کہلانے کے لئے لڑا تھا۔ چنانچہ یہ لقب تمہیں مل گیا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو سب سے پہلے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ (ترمذی شریف)

### اخلاقِ حسنہ سے متعلق اُسوۂ نبویؐ

اگر گزشتہ تمام انبیاء و حکماء کی زندگی کو جانچا پرکھا جائے تو ان میں سے کسی کی

زندگی بھی پیغمبر اسلام علیہ السلام کی حیات پاک کے برابر جامع کمالات نہیں۔ دنیا کا کوئی پیغمبر یا بانی مذہب ایسا نہیں جس کی اخلاقی زندگی کا یہ پہلو ہمارے سامنے اس طرح بے نقاب ہو گیا وہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ۳۳ برس کی زندگی میں سے صرف تین برس کا حال ہم کو معلوم ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک کسی نبی کی زندگی کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ ان انبیاء علیہم السلام کے علاوہ ہندوستان، ایران اور چین کے بائبان مذاہب کی اخلاقی زندگی کے ہر پہلو پر ناواقفیت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ صرف اسلام ہی کے ایک معلم کی زندگی ایسی ہے جس کا حرف و حرف دنیا میں محفوظ اور سب کو معلوم ہے۔ بقول باسورۃ اِسْمٰحٰ



محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر پہلو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حکم دیا تھا کہ میرے ہر قول و فعل کو دوسروں تک پہنچاؤ۔ حرمانِ روز کو اجازت تھی جو مجھے خلوت میں کرتا دیکھو اس کو خلوت میں بر ملا بیان کرو جو حجرہ میں کہتے سنا اس کو چھتوں پر چڑھ کر پکارو۔

آپ فرمایا کرتے تھے۔

أَلَا قَلِيلٌ بَلِّغِ الشَّاهِدَ الْغَائِبِ  
جو حاضر ہو وہ غیر حاضر کو پہنچا دے۔  
ہادی برسخ کی زندگی اخلاقِ حسنہ کا زندہ پیکر تھی۔ سورہ القلم میں اللہ تعالیٰ کا آپ سے ارشاد ہے۔

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خَلْقٍ عَظِيمٍ  
آپ خلقِ عظیم سے بہرہ ور ہیں۔  
ایک صحابی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا تھا کہ سرکارِ دو عالم کا خلق کیسا تھا۔ آپ نے صحابی سے فرمایا۔ "تم قرآن نہیں پڑھتے ہو؟" انہوں نے جواب دیا پڑھتا ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق قرآن تھا۔ دینِ اسلام جس برقِ رفتاری کے ساتھ دنیا کے گوشہ گوشہ تک پہنچ گیا۔ جہاں اس کے دوسرے اسباب بھی تھے وہاں اس کی سب سے بڑی وجہ اسلامی اصولوں کی صداقت کے بعد آنحضرت کے اخلاقِ حسنہ کی مقناطیسی کشش تھی۔

## سوالات

- ۱۔ اسلامی تعلیمات کے پیش نظر اخلاق کی اہمیت واضح کیجئے۔
- ۲۔ اخلاق و ایمان کے ربط و تعلق پر روشنی ڈالئے اور بتائیے کہ اسلامی تہذیب کی تعمیر میں اخلاق سے کیا مدد ملتی ہے؟
- ۳۔ اخلاقِ حسنہ کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہٴ حسنہ پیش کیجئے۔



## انسانی زندگی کے ارتقائی مراحل

۱- فرد | جس طرح ہر چیز آغاز ظہور میں نہایت معمولی ہوتی ہے اور وہ ارتقاء کے منازل طے کر کے اوج کمال پر گامزن ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان ایک بے کس و بلا چار نو مولود کی صورت میں جنم لیتا ہے اور ارتقائی مراحل و ادوار سے گذر کر اشرف المخلوقات کے مرتبہ پر فائز ہوتا ہے۔ بے کسی و بے بسی کے اس دور میں نہیں کہا جاسکتا کہ نوزائیدہ بچہ جو قدم قدم پر دوسروں کا دست نگر ہے اور جس کی زندگی کا ہر لمحہ دوسروں کا محتاج ہے۔ بڑا ہو کر کس منصب رفیع پر فائز ہوگا۔

۲- گھر | نو مولود سب سے پہلے گھر کی چار دیواری میں آنکھیں کھولتا ہے۔ والدین کی محبت بھری نگاہیں ہر لحظہ اس کا تعاقب کرتی ہیں۔

بھائی بہن اس سے پیار کرتے نہیں تھکتے۔ گھر کی چار دیواری اور والدہ کی گود اس کے لئے اولین تربیت گاہ ہے۔ والدہ اس کی پہلی معلمہ ہے جو اسے زندگی کے آداب و اطوار کا درس دیتی ہے۔ بچہ زندگی کے اس دور میں جو سبق سیکھتا ہے۔ اس کے منٹ نقوش ہمیشہ کے لیے اس کے لوح ذہن پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ جن بچوں کو زندگی کے اس دور میں سازگار گھریلو ماحول نصیب ہوتا ہے۔ وہ آگے چل کر بڑا نام پیدا کرتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بڑے لوگوں کی عظمت ان کی عمدہ تربیت کی رہین منت ہوتی ہے۔

۳- مکتب | گھر میں ابتدائی تربیت حاصل کرنے کے بعد بچہ جب تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہوتا ہے تو اسے مکتب میں بھیجا جاتا ہے

یہاں اسے شفیق اساتذہ کی صحبت میسر آتی ہے۔ قابل اساتذہ کی تربیت کے اثرات بڑے دیرپا اور خوش آئند ثابت ہوتے ہیں۔ مستقبل کی تابانی و درختانی کا انحصار بڑی



حد تک اساتذہ کی طرزِ تعلیم و تدریس پر ہوتا ہے۔ اساتذہ کی تعلیم صرف الفاظ تک محدود نہیں رہتی بلکہ شاگرد کے قلب و ذہن پر اثر انداز ہو کر اس میں عظیم انقلاب برپا کرتی ہے۔

بلوغت کی حدود میں داخل ہوتے ہی مسجد سے واسطہ پڑتا ہے۔

**۴۔ مسجد** اخوت و مساوات کی تلقین کی جاتی ہے۔ دیانت و امانت سکھائی جاتی ہے۔ اسلامی عبادت بجالانے سے انسان کے اندر احساسِ فرض پابندی وقت اور یقینِ محکم کا جذبہ ابھرتا ہے۔ عجز و انکسار۔ انسانی مساوات اور عالمگیر اخوت کے احساسات کو ٹٹ لیتے ہیں۔ مسجد میں اسلام میں ایک عظیم دینی شعار کی حیثیت رکھتی ہے۔ غزوات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا۔ جہاں سے آذان کی آواز آتی وہاں حملہ کرنے سے روک دیتے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کہیں مسجد دیکھو یا آذان کی آواز سنو تو وہاں کسی شخص کو قتل نہ کرو۔ (ابوداؤد)

اصحابِ صفہ مسجد نبوی میں رہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث و تفسیر کا درس لیا کرتے تھے۔ خلافت راشدہ میں بھی مسجد کو مکتب کی حیثیت حاصل تھی۔ تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں مسجد کو امتیازی حیثیت حاصل رہی اور وہ خانہ خدا ہونے کے علاوہ ایک بہترین درس گاہ اور یونیورسٹی بھی تصور کی جاتی تھی۔

**۵۔ معاشرہ** حدِ بلوغت کو پہنچتے ہی بچہ معاشرہ کا ایک فرد شمار ہونے لگتا ہے گھر میں جب تک تھا تو ہر طرف سے لطف و محبت کی صدا میں سناتا تھا۔ اب خشکیوں لگا ہوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ معاشرہ میں دوست و دشمن سمجھتے ہیں اور سب ہی سے پالا پڑتا ہے۔ کچھ لوگوں کے حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں۔ اس کے حقوق دوسروں پر واجب ہوتے ہیں۔ پھر اس کی شادی خانہ آبادی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کے یہاں اولاد پیدا ہوتی ہے اور اس طرح اس کی انفرادیت مکمل طور سے معاشرہ میں گم ہو جاتی ہے۔



۶۔ دُنیاۓ اسلام | چند افراد کے مجموعہ سے ایک خاندان بنتا ہے۔ متعدد خاندانوں کی ترکیب سے ایک برادری وجود میں آتی ہے۔ چند برادریوں کے مجموعہ کو شہر کہتے ہیں۔ چند شہروں سے مل کر ایک ملک کی تشکیل ہوتی ہے۔ مجموعہ ممالک کا نام کراہ ہے اور اگر اسے اہل اسلام تک محدود کر دیا جائے تو اسے دُنیاۓ اسلام کے نام سے پکارتے ہیں۔

بورڈ آف انٹرمیڈیٹ کے مجوزہ نصاب کے مطابق اب ہم علی الترتیب انسانی زندگی کے مذکورہ بالا ارتقائی مراحل کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔ سب سے پہلے فرد کے عنوان کے تحت اسلامی اخلاق سے متعلق مندرجہ ذیل امور زیر بحث آئیں گے۔

- ۱۔ تدبیر ۲۔ تحمل ۳۔ تقویٰ ۴۔ ذکر ۵۔ شکر ۶۔ صبر ۷۔ عفو و عدل ۹۔ احسان ۱۰۔ خدمتِ خلق

## فرد

انسان کی اولین حیثیت فرد کی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ شخصی و انفرادی زندگی کی اصلاح معاشرہ کی اصلاح سے مقدم ہے۔ فرد کی اہمیت اسی بات سے بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ ایمان ایک انفرادی چیز ہے۔ وہی معاشرہ سب سے اچھا ہوگا جو صالح افراد پر مشتمل ہو۔ افراد ہی وہ مسالہ ہیں جن سے قصر جماعت کی تعمیر ہوتی ہے۔ قصر جماعت کا استحکام اس بات پر موقوف ہے کہ اس کی ہر اینٹ خوب پکی ہو۔ ہر شہتیر پائیدار ہو اور کسی حصہ میں ناکارہ اور بے جان مسالہ استعمال نہ کیا جائے۔

اخلاقِ انسانی کے چند عنوانات شخصی و انفرادی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لئے تعلیمات کتاب و سنت کے پیش نظر ان پر مختصراً بحث کی جاتی ہے۔ اولین عنوان تقویٰ ہے۔



۱۔ معنی و مفہوم  
 لفظ تدبیر باب تفعیل کا مصدر ہے، اس کا مادہ تدبر (پہچھا  
 انجام) ہے۔ تدبیر کے معنی ہیں کسی چیز کے انجام اور نتیجہ  
 پر غور کرنا۔ انتہائی غور و فکر کا نام تدبیر ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں تدبیر قابل  
 اور فکر میں معنی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں، راجحاً علوم الدین جلد چہارم صفحہ ۴۱۲  
 امام غزالی تدبیر کی حقیقت بیان کرتے ہوئے راجحاً  
 علوم الدین میں فرماتے ہیں: "دو معرفتوں کو دل میں  
 اس لئے جبکہ دنیا کہ دینا کہ اس سے تیسری معرفت حاصل ہو تدبیر کہلاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص دنیا کی  
 محبت میں گرفتار ہے اور وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اخروی زندگی دنیا کے مقابلہ میں قابل ترجیح  
 ہے تو اس کے سامنے دو راستے کھلتے ہیں۔

۱۔ اخروی زندگی کی فضیلت معلوم کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کسی دوسرے شخص سے آخرت  
 کی فضیلت سن کر اس پر یقین کرے اور بذاتِ خود اسے کچھ بھی معلوم نہ ہو اسے تقلید کہتے ہیں معرفت  
 نہیں کہتے۔ یہ کسی طرح بھی قابل تقلید نہیں۔

۲۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ یہ شخص پہلے معلوم کرے کہ دنیا و آخرت میں سے جو پائیدار ہو وہی  
 لائق ترجیح ہے۔ بعد ازاں اس بات کی معرفت حاصل کرے کہ دنیا و آخرت میں سے پائیدار  
 آخرت ہے۔ ان دونوں باتوں کی پہچان ہے اسے ایک تیسری حقیقت سے آگاہی حاصل ہوگی کہ آخرت  
 ہی افضل اور ترجیح کے قابل ہے اس سے واضح ہوا کہ تیسری حقیقت کا علم اسے اسی صورت میں حاصل  
 ہوا کہ اس نے سابقہ دونوں باتوں کو ذہن میں رکھا اسی کا نام تدبیر ہے۔"

حقیقت تدبیر کے بیان میں امام غزالی کی تقریر کو منطقیانہ انداز میں بول ادا کر سکتے ہیں۔  
 صغریٰ: دنیا و آخرت میں سے جو پائیدار ہو وہی افضل اور ترجیح کے قابل ہے۔  
 گہری: آخرت دنیا کے مقابلہ میں پائیدار ہے۔  
 نتیجہ: آخرت دنیا سے افضل اور قابل ترجیح ہے۔



شمال ہذا میں جب صغریٰ و کبریٰ کی صداقت کو تسلیم کیا گیا تو اس سے ایک تیسری بات واضح ہوئی اسی طرز فکر کا نام تدبیر ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں تدبیر کی مندرجہ ذیل قسمیں بیان کی ہیں۔

## ۱۔ اقسام تدبیر

۱۔ ذات باری میں تدبیر :- ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء نے ذات الہی کو غور و فکر کی آماجگاہ بنانے سے منع کیا ہے۔ اس لئے کہ عوام اس کی صلاحیت سے محروم ہیں۔  
۲۔ صفات باری میں تفکر :- یہ تدبیر کی دوسری قسم ہے۔ مثلاً خدا کے علم اور رحمت و قدرت کو موضوع فکر بنانا صوفیہ کی اصطلاح میں اسے مراقبہ کہتے ہیں۔

۳۔ افعال خداوندی میں تدبیر :- تدبیر کی تیسری قسم یہ ہے کہ افعال خداوندی میں غور و فکر کیا جائے۔ مثلاً یہ کہ وہ بارش کیونکر نازل کرتا اور پھر اس سے انواع و اقسام کی چیزیں اگانا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

”و جو لوگ آسمان و زمین کے بارے میں غور و فکر کرتے اور کہتے ہیں کہ تو نے یہ کائنات بے مقصد پیدا نہیں کی  
۴۔ تاریخی حقائق پر غور و فکر کرنا :- یہ تدبیر کی چوتھی قسم ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس بات پر غور کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض اقوام کو کس طرح اور کمال پر پہنچایا اور بعض کو ذلیل و خوار کر دیا۔ کن اسباب کی بنا پر ایسا ہوا؟ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا تھا۔

”ذٰکِرُوْهُمْ بِآیٰتِ اللّٰهِ“ (ان کو تاریخی واقعات سے تکرار نصیحت کیجئے۔)

۵۔ تفکر فی الموت :- تدبیر کی پانچویں قسم یہ ہے کہ موت اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات پر عبرت پذیری کے نقطہ خیال سے غور کیا جائے اس میں حشر و نشر اور جزا سزا سب شامل ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ دنیوی مشاغل سے فارغ ہو کر جب کوئی شخص تنہائی میں ان امور پر غور کرے گا۔ تو اس کی نفسانی خواہشات مغلوب ہو کر روحانی قوت غالب آجائے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی عبادت میں خشوع و خضوع پیدا ہوگا۔ (حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم ص ۸۲)

۶۔ اسلام میں تدبیر کا مقام  
امام غزالی کی رائے میں اس کو تفکر و تذکرہ  
تامل، نظر اور اعتبار بھی کہتے ہیں۔ یہ سب



الفاظ ہم معنی ہیں۔ انسان کی امتیازی خصوصیت جو اسے دیگر حیوانات سے ممتاز کرتی ہے وہ خدا کی ودیعت کردہ نعمت عقل و خرد ہے۔ انسان کے ذہن میں غور و فکر کی صلاحیتوں کا بے کنار خزانہ ودیعت کیا گیا ہے وہ اس سے کام لے کر حقائق کی تہ تک پہنچ سکتا ہے اور محض ظاہریت کے فریب میں نہیں رہتا۔ کائنات کے سینہ میں بے شمار اسرار پوشیدہ ہیں۔ جو انسان کی نگاہِ دور بین کے منتظر ہیں۔ انسان جس قدر غور و فکر کرے گا وہ کائنات کے اسرار کی معرفت حاصل کرتا جائے گا۔ اور اس کا ایمان توحید پر پختہ سے پختہ ہوتا جائے گا۔ اگر انسان اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہوتا تو اس کا کام بھی دیگر حیوانات کی طرح صرف کھانا پینا اور نسل کشی کرنا ہوتا اس کے سوا کوئی بلکہ نصب العین اس کے پیش نظر نہ ہوتا۔ دنیا میں یہ چل چل رہی۔ رونق و آبادی شان و شوکت ہو۔ و شرف و رفعت ہو کچھ بھی ہے سب عقل و خرد کی کرشمہ سازی ہے۔ اگر انسان عاقل ہوتے ہوئے عقل و خرد کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے تو وہ انسانیت کے مقامِ ارفع سے اتر کر حیوانات کی پستی میں جا گرتا ہے عقل و فہم ہی کی بنا پر انسان اپنے جذبات پر قابو رکھتا ہے۔ اس کے برعکس حیوانات اپنے جذبات سے مغلوب رہتے ہیں۔ آج اہل یورپ کی نئی نئی ایجادات کا چرچا ہے۔ جن کے طفیل وہ مادی ترقی کے نقطہ عروج پر پہنچ گئے ہیں۔ ان کا ہر قدم ترقی کی جانب اٹھ رہا ہے۔ لیکن کیا یہ چیز انہیں سعی و جہد کے بغیر حاصل ہو گئی؟ ہرگز نہیں۔ انہوں نے غور و فکر اور تدبیر سے کام لیا۔ مختلف ایجادات کیں۔ اور اپنے لئے ہر قسم کی آسائشوں کے دروازے کھول دیئے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے ذہن میں ہزار ہا قسم کے خزانے پیدا کئے ہیں اور ہر چیز کو اس کے لئے مسخر کر دیا۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ عقل و خرد سے کام لے کر ان خزانوں کو نکالے۔ اور ان سے کام لے۔ جن قوموں نے اس راز کو پانیا وہی دنیا میں کامیاب و کامران ہو رہی ہیں۔ جو قومیں غور و فکر سے کام نہیں لیتیں ان کے حصے میں سوائے ذلت و ناکامی کے اور کچھ نہیں آتا۔

اسلام کی نگاہ میں عقل و خرد خدا کی نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اسے کسی صورت میں بھی بیکار نہیں چھوڑا جاسکتا۔ قرآن جگہ جگہ انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتا اور اسے تدبیر و تدامل کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے

«أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ  
أَفْقَارٌهَا» (۲۴ : ۲۵)

کیا لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں۔



دوسری جگہ فرمایا :

«ان فی مَخْلِقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ  
وَإِخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ آيَاتٍ لِأُولِي  
الْأَلْبَابِ» (پارہ ۲ - رکوع ۴)

بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور  
دن کے آنے جاتے میں عقلمندوں کے لئے بہت  
سی نشانیاں ہیں۔

اس آیت میں انسانوں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ مناظر قدرت پر غور کر کے خداوند تعالیٰ کی ہستی  
کا ثبوت ملاحظہ کریں۔ یہ کارخانہ قدرت صاف اس کی ہستی کی عظمت دے رہا ہے۔

ایک جگہ یوں ارشاد ہوا: «وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ  
وَفِي الْفَيْسِكُمْ أَفَلَا تَبْصُرُونَ» (۲۱: ۵۱-۲۲)

اور یقین والوں کے لئے زمین میں نشانیاں  
ہیں اور خود تمہارے وجود میں بھی پھر کیا تم دیکھتے نہیں

ان آیات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ معرفت الہی کے لئے تدبیر و تفکر کی ضرورت ہے  
تدبیر کی بنیادی اہمیت و ضرورت اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ غور و فکر کے بغیر خدا کی پہچان بھی حاصل  
نہیں ہو سکتی۔ اسلام کے نامور فلاسفر امام غزالی تدبیر کی اہمیت ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔

«تدبیر و تامل کا ثمرہ علم کی صورت میں ظہور پذیر

## ۵۔ تدبیر و ذکر الہی سے افضل ہے

ہوتا ہے علم کے حاصل ہونے سے دل کی دنیا

بدل جاتی ہے جب دل میں انقلاب آتا ہے تو اعضاء انسانی کے اعمال بھی بدل جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اعمال انسانی

احوال قلب کے تابع ہیں۔ ذلی کے احوال علم کے زیر اثر ہیں اور علم تدبیر و تامل کا نتیجہ ہے۔ اس سے واضح ہوا

کہ تدبیر و تفکر تمام نیک اعمال کا مبداء و مصدر ہے، اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ تدبیر و ذکر الہی سے افضل

ہے کیونکہ اس میں ذکر الہی سے ایک زائد وصف موجود ہے جو ذکر میں نہیں، مزید یہاں تدبیر و تفکر دل کا

عمل ہے۔ ظاہر ہے کہ دل کا عمل اعضاء کے عمل سے افضل ہوتا ہے۔ بنا بریں یہ ثابت ہوا کہ تدبیر تمام اعمال

سے بڑھ کر ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ ایک گھڑی کا تفکر رات بھر کی نماز گزاری سے افضل ہے (احیاء الغزالی)

حضرت عبداللہ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی

## ۶۔ اقوال و امار

ذات و صفات میں چھٹکیاں کر رہے تھے، انہیں دیکھ کر آنحضرت نے فرمایا:

«خدا کی مخلوق میں غور کیجئے مگر خدا کی ذات کے بارے میں فکر و تامل سے بھرا کیجئے کیونکہ تم اس کا حق

ادا نہیں کر سکتے۔ (رواہ ابو نعیم فی الحلیۃ بسند ضعیف)



۲۔ محمد بن واسع روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو ذر غفاری کی وفات کے بعد لہجہ کا ایک شخص اُن کی والدہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پر داز سو ا کہ ابو ذر کی عبادت کی کیفیت کیا تھی؟ انہوں نے جواباً فرمایا ابو ذر سارا دن گھر کے کونے میں بیٹھ کر محو فکر رہا کرتے تھے۔ (احیاء اللغز الی)

۳۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں ایک لمحہ سوچ بچار کرنا ایک شب کے قیام سے بہتر ہے (راجیہ)

۴۔ حضرت فضیل بن عیاض فرماتے ہیں تدبیر و تفکر ایک آئینہ ہے جس میں تم اپنے اچھے یا برے اعمال کا عکس دیکھ سکتے ہو۔

۵۔ حضرت صفیان بن عیینہ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔  
 اِذَا السُّرُوءُ كَانَتْ لَهُ نِكُوَةٌ " فَمَنْ كَلَّ شَيْئًا بِرُكُوءِهِ عِبْرَةٌ "

(جب آدمی میں غور و فکر کی عادت ہو تو ہر چیز میں اس کے لئے سامانِ عبرت موجود ہے)

۶۔ آپ نے فرمایا ایک گھڑی کا تفکر ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے (حجۃ اللہ البالغہ)

۷۔ تدبیر کی حکما دہ و قیوہ  
 کتاب و سنت کے دلائل و براہین میں غور و فکر  
 کی جس قدر تاکید کی گئی ہے اس کا اندازہ

آیات ذیل سے ہو سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اسے رسول لوگوں سے کہہ دو کہ میں تمہیں  
 ایک ہی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ تم  
 اللہ کیلئے دودھ ایک ایک کر کے گھر سے ہو جاؤ۔

«قُلْ إِنَّمَا أَعْطِيكُمْ لِوَأَحَدَةٍ  
 أَنْ تَقُومُوا لِلَّهِ مِثْلَ خِيَلٍ  
 تُتَفَكَّرُونَ» (سورہ سبأ رکوع ۶)

اور پھر غور و فکر سے کام لو۔

اللہ تعالیٰ عقل و خرد اور تفکر و تدبیر سے کام نہ لینے والوں کو بے عقل جانوروں سے تشبیہ دیتا ہے  
 قرآن میں فرمایا۔

«ان کے دل ہیں جن سے سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے نہیں اور ان کے  
 کان ہیں جن سے سنتے نہیں۔ وہ چوپاؤں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں لوگ غافل ہیں۔

سورہ اعراف رکوع ۲۲

اس حقیقت مسلمہ کے باوصف کہ عقل و خرد بڑی گراں قدر چیز ہے، اور انسان زندگی



کے کسی مرحلے میں بھی اس سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔ اسلام نے عقل انسانی کو بے ہمار نہیں چھوڑا بلکہ کسی حد تک اسے محدود و محصور کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسلام اس بات کی ترغیب دیتا بلکہ تاکید حکم دیتا ہے کہ کائنات عالم میں غور کر کے ہستی باری تعالیٰ کا ثبوت ملاحظہ کیجئے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ خدا کی ذات و صفات کو غور و غوض کو آماجگاہ نہ بنائے۔

اسی طرح تقدیر کے پھیر اور لائیکل مسئلہ میں قیاس آرائی سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اس کا نتیجہ الحاد و ضلالت کی صورت میں بہاؤ ہوتا ہے، امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ تقدیر میں غور کرنے والے کی مثال سورج کی شعاعوں سے نظر ملنے والے کی ہے۔ وہ جس قدر دیکھے گا۔ اس کی نچیرہ چھٹی اور حیرانی بڑھے گی۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ عقل کو چراغ کے طور پر استعمال کرنا چاہئے۔ نصب العین نہیں بنانا چاہئے۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغ راہ سے منزل نہیں سے (اقبال)  
قرآن کریم میں جو غور و فکر کا حکم دیا گیا ہے اس کا اہل ہر شخص نہیں۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہر کندہ نا تراش اور عربی زبان کی ابجد سے نا آشنا جاہل مسند تفسیر پر براجمان ہو سکتے ہوں بلکہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم قرآن فہمی کے لئے عربی زبان و ادب کا ذوق آشنا ضروری ہے۔ فرماتے ہیں:-

ادع بیت کا ذوق سلیم نہ ہونے کی وجہ سے تدریجاً کا ایک نہایت پست معیار مقرر ہوا یہ لپٹی صرف معانی و مطالب ہی میں نہیں بلکہ ہر چیز میں پوری رہتی کہ اس کی زبان اس کے الفاظ اس کی ترکیب اور اس کی بجلاعت کے لئے بھی نظر و ذہن کی کوئی بلند جگہ باقی نہ رہی۔

۱۸۔ تفسیر کے تراشا : قرآن کریم میں غور و فکر کی بدولت علم و فن، حکمت و معرفت اور دانش و بصیرت کی راہیں کھلتی ہیں۔

۲۔ کائنات عالم میں غور و فکر کرنے سے معرفت اپنی حاصل ہوتی ہے۔ اور انسان عرفان



بصیرت کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے ۔  
 ۳۔ تدبیر و تفکر تمام اعمالِ صالحہ کا میدار و مصدر ہے۔ سب اعمالِ اسی سے صادر ہوتے ہیں ۔

۴۔ تدبیر ذکرِ الہی سے بھی افضل ہے ۔

۵۔ تدبیر کی بنیاد پر انسان تمام حیوانات سے ممتاز ہے۔ اور اسی کے بل بوتے پر انسان ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں ۔

۶۔ دورِ حاضر کی تمام ایجادات غور و فکر کی رہن منت ہیں ۔

۷۔ تدبیر کی بدولت دینِ اسلام کے اسرار و رموز کی گہرائی کھلتی ہیں ۔ اور انسان علم و فضل کی اعلیٰ منزلیں طے کرتا ہے ۔

\*\*\*

### سوالات

- ۱۔ تدبیر کے متعلق اسلامی تعلیمات کا خلاصہ تلم بند کیجئے ۔
- ۲۔ تدبیر کن ثمرات و نتائج کا موجب ہوتا ہے تفصیلاً لکھیے ۔
- ۳۔ تدبیر کی حدود و قیود ضبط تحریر میں لائیے ۔
- ۴۔ دلائل کتاب و سنت کی روشنی میں تدبیر کی اہمیت و فضیلت تحریر کیجئے ۔



۱۔ مفہوم تحمل عربی زبان میں باب تفعیل کا مصدر ہے۔ اس کا مادہ تحمل (اُمْتَارًا) ہے تحمل کے معنی میں برداشت کرنا، حلم و بردباری کا مظاہرہ کرنا۔ قدرت کے باوجود کسی سے انتقام نہ لینا، بالفاظ دیگر تحمل کا مطلب یہ ہے کہ ناگوار بات کو بڑے صبر و حوصلہ سے برداشت کیا جائے اور ایسے شخص کو فراخ دلی سے معاف کر لیا جائے۔ حواریوں روزگار میں بہر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا، مشکلات کو عزم و ہمت سے برداشت کرنا اور کسی سے دکھ پا کر تنگ دل نہ ہونا یہ سب تحمل کی قسمیں ہیں۔ تحمل اور حلم دونوں مترادف ہیں۔

۲۔ تحصیل کی برزرت انسان دنیا میں روزانہ سینکڑوں اشخاص سے ملتا ہے اور بے شمار واقعات سے درچار ہوتا ہے ان میں سے بعض اس کی افتاد طبع اور مزاج سے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور بہت سے خلائق طبع اور ناگوار صفت تحمل کا تقاضا ہے کہ انسان نا سازگار امور و واقعات کو اپنی عالی ظرفی بلند حوصلگی اور وسعت قلب سے نادیدہ و ناشنیدہ تصور کر کے اپنے لوح ذہن سے مٹا دے، اور ان کو خاطر میں نہ لائے۔ اسی کا نام حلم و بردباری ہے۔ اس کے برعکس وہ ایک حساس اور نازک مزاج آدمی کی طرح ہر بات کا لٹس بننے لگے اور بات پر چپیں کھینچیں ہو جائے تو دنیا میں اس کا رہنا اجیرن ہو جائے اور معاشرہ کو اس کی وجہ سے بڑی رحمت کا سامنا ہو۔ ایسا انسان کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ قدم قدم پر اسے ناکامیوں کا سامنا ہوتا ہے۔ بخلاف ازیں ایک سانس کھنکھانہ دل اور فراخ حوصلہ انسان جہاں جاتا ہے کامرانی اس کے قدم چومتی ہے وہ اپنی خوش اخلاقی سے پرانے کو بھی اپنا بنا لیتا ہے اور کسی جگہ ناکامی کا ماتہ نہیں دیکھتا۔

قرآن کریم میں اہل ایمان کی یہ صفت بیان فرمائی۔  
 رَاٰنَآ لَہٗ عَلٰی اٰمُرٍ مِّنْہٖنْ اَعْرَہٗ عَلٰی اِسْکَافِیۡنَ ۗ (سورہ المائدہ - ۱۰)

مسلمانوں کے زماں دار اور کانفرنس پر بھاری یعنی صحابہ کرام جہاں کفار کے مقابلہ میں بڑے طاقتور تھے، مردانہ راز ان کا مقابلہ کرنے اور ہرگز پیچھے نہ ہٹتے تھے۔ اسی طرح مسلمانوں کے ساتھ ہزار گزرتے ہیں تحمل و بردباری کا زندہ پیکر تھے، یہ دونوں متضاد صفتیں ان میں پوری طرح موجود تھیں۔



تاہم علم و بردباری کے یہ معنی نہیں کہ انسان اپنی قوتِ صمیمیت و غیرت کو زیر زمین دفن کر کے پرلے درجے کا بے قیمت اور بے غیرت ہو جائے اور ہر کس و ناکس کی ہر جائز و ناجائز خواہش کے آگے سر تسلیم خم کرے۔ اسلام نے جہاں تحمل و بردباری کو سراہا ہے وہاں بے غیرتی اور نامردی سے روکا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام غصہ کی اصلاح کرنا چاہتا ہے اسے فنا نہیں کرنا چاہتا۔ بنا بریں قوتِ تحمل و برداشت کو بے غیرتی کی حد تک لے جانا اسلام کی نگاہ میں معیوب سے محبوب نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "تَخْلُقُوا بِأَخْلَاقِ اللَّهِ" (اخلاقِ خداوندی کے خوگر بنو)۔ اس حدیث نبوی پر عمل پیرا ہونے کا ثبوت ہے کہ مسلمان قوتِ برداشت و تحمل کے ضعف سے موصوف ہوں۔ اس لئے قرآن کریم میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ تحمل و بردباری کا اظہار فرمایا ہے، آیاتِ ملاحظہ فرمائیے:

وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (سورہ بقرہ ۲۸) "إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ" (آل عمران ۱۶)

"إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا" (بنی اسرائیل ۵)

مذکورہ صدر آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ علم کے ساتھ اپنی صفتِ مغفرت کا ذکر کر دیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس کی یہ بردباری لغو ذواللہ کسی ضعف یا عدم قدرت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کی شانِ عفواری کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں:

"مَجَلَانِي أَوْ بَرَانِي بَرَابَرٌ هِيَ بَرَانِي كَوَيْبَلَانِي سَعْدٌ دَفْعٌ كَرْدٌ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہارا دشمن دوستی لگانے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس بات پر عمل کرنے کی توفیق انہی کو ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور انہی کو یہ سعادت ملتی ہے جو بڑے خوش نصیب ہیں۔ اور اگر شیطان تم کو اکسائے تو خدا کی پناہ مانگو اس لئے کہ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ سورہ حم السجده ۱۰۔" اس آیت سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ مجلانی اور برانی برابر ہیں۔ برانی کو کویبلانی سے دفع کر دے اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہارا دشمن دوستی لگانے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس بات پر عمل کرنے کی توفیق انہی کو ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور انہی کو یہ سعادت ملتی ہے جو بڑے خوش نصیب ہیں۔ اور اگر شیطان تم کو اکسائے تو خدا کی پناہ مانگو اس لئے کہ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ سورہ حم السجده ۱۰۔

۲۔ دشمن سے بھنی بھنی اور حسن سلوک کی تاکید فرمائی اور بتایا کہ نیک طرزِ عمل سے تمہارا دشمن بھی دوست بن جائے گا۔ (۳) دشمن سے ساتھ نیکی کرنے کو صبر کا انتہائی درجہ قرار دیا اور بتایا کہ صبر سے کام لینا خوش نصیبی کی دلیل ہے۔ (۴) دشمن کے ساتھ برائی کرنے کو شیطانی تحریک کا نام دیا۔ اور اس سے خدا کی پناہ مانگنے کا حکم دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جو صحابہ میں بڑے مفسرین اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

واللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غیظ و غضب کی حالت میں صبر کا اور کسی کی بُرائی کرنے پر غم و درد گزارنے کا حکم دیا ہے وہ ایسا کرے کہ اللہ تعالیٰ کو شکر ہے کہ پتھر سے پھیرنے کا اور ان کا دشمن بھی درست کی طرح ان کے آگے سر تکانے کا۔ (صحیح بخاری، جلد ۲ صفحہ ۱۰۳ نیز تفسیر ابن جریر)



## ۳۔ تحمل کی قدر قیمت

تحمل ربرداشت کا وصف اسلامی زاویہ نگاہ سے بڑا قابل قدر ہے

اللہ تعالیٰ نے سورہ آل عمران میں جہاں متقیوں کے اوصاف بیان کئے

وہاں ارشاد فرمایا۔ "وَإِلَّا ظَلَمْنَاهُم بِالْعَدْوَىٰ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ"

(ممتقین وہ لوگ ہیں جو غصہ کو دبالتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں) اسکی تفسیر میں مولانا شبیر احمد صاحب قمبر نے فرمایا:

"غصہ کو پی جانا ہی بڑا کمال ہے، اس پر مزید یہ کہ لوگوں کی غلطیوں کو معاف کر دیتے ہیں، غالباً پہلے جن

لوگوں کی نسبت بددعا کرنے سے روکا یہاں ان سے متعلق غصہ دبانے اور عفو و درگزر سے کام لینے کی ترغیب دی گئی ہے۔"

حلم و تحمل کی اہمیت جملانے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے انبیاء کی مدح و ستائش میں ذکر

کیا ہے۔ حالانکہ انبیاء کرام اوصاف محمودہ کا مجموعہ ہوتے ہیں حضرت ابراہیم نے اپنے بت پرست باپ کو سمجھا بچا کر عذاب

الہی سے بچانا چاہا۔ انہوں نے اس کا فریاد کے ہاتھوں طرح طرح کے مظالم سہے اور آخر کار مجبور ہو کر اس سے

کنارہ کش ہو گئے، پھر بھی بردباری اور تحمل کا دامن ان کے ہاتھ سے نہ پھوٹنے پایا، اور اس وقت تک اس کے حق

میں دخلے خیر کرتے رہے جب تک وہ پوری طرح مایوس نہ ہو گئے اور ان کو قطعی طور سے معلوم نہ ہو گیا کہ وہ خدا کا

دشمن ہے۔ اس ضمن میں ارشاد ہوا۔

"اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے بخشش مانگنا تو صرف ایک وعدہ کی بنا پر تھا، جو ابراہیم نے اپنے باپ

سے کر لیا تھا، جب ان کو معلوم ہو گیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو باپ سے دستبردار ہو گئے، بیشک ابراہیم بڑے نرم دل

اور بردبار تھے۔ (سورہ توبہ - ۱۴)

حضرت اسماعیل کی شان میں فرمایا: "فَبَشِّرْهُ فَإِنَّهُ لَبِغْلٌ حَلِيمٌ (والصافات - ۳)

(تو ہم نے ان کو (ابراہیم) ایک بڑے بردبار لڑکے (اسماعیل) کی خوشخبری دی)

آنحضرت برقدارہ ابی و امی کی ذات اقدس علم و تحمل کا زندہ پیکر تھی، قریش

مکہ کے مظالم تاریخ اسلام کی خونیں داستان ہیں، راستے میں کانٹوں کا

پھانتا، سر پر کوڑا کرکٹ پھینکنا، طائف میں پاؤں مبارک کا لہو لہان ہونا، بنی ہاشم کو شعب ابی طالب میں

تین سال تک محصور رکھنا، آپ کے احباب و اصحاب کو ہجرت حبشہ پر مجبور کرنا، بعض کو قتل کرنا اور بعض پر

مظالم ڈھانا، تاریخ اسلام کے مشہور واقعات ہیں، باس ہمہ جیب فتح مکہ کے موقع پر آپ فاتحانہ شان سے

مکہ میں داخل ہوئے تو کفار مکہ کو لا تشریب علیکمہ الیوم (آج کے روز تم پر کوئی عتاب نہیں) کا مژدہ جانفزا

سنایا، اور ساتھ ہی فرمایا کہ میں وہی الفاظ دوہراتا ہوں جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے ظالم



بھائیوں کو سنائے تھے۔

مولانا سید سلیمان ندوی سیرت النبیؐ میں فرماتے ہیں:-

”اسلامی اخلاق کی مثالیں ملاحظہ کرنا چاہو تو اسلام کے اولین داعی و واعظ کی حیاتِ مقدسہ کا مطالعہ کیجئے۔ جیسی نے فاتح بن کر مفتح ہو کر نہیں حاکم ہو کر محکوم بن کر نہیں بہ یک دفعہ مکہ کے ان ہزاروں دشمنوں کو معاف کر دیا۔ جس نے اس کے قتل یا گرفتاری کے لئے اہل مکہ کا اشتهار و انعام سن کر اس کا لعنت کیا تھا۔ جس نے خیبر میں اپنے زبردینے والی یہودیہ کو معاف کیا تھا۔ جس نے اپنے چچا کے قاتل کو معاف کیا تھا۔ جس نے حمزہ کی لاش کو بے حرمت کرنے والی اور ان کے جگر کو چبانے والی کو معاف کیا جو اس کے قتل کے لئے آیا تھا۔ جس نے تنیم کی ولدی میں قریش کے اس گرفتار دستہ کو معاف کیا جو اس کے قتل کے لئے آیا تھا۔ جس نے نجد کے ایک نخلستان با حبیب وہ مخو خواب تھا اپنے ایک بیغ بکف حمد آور کو قابو پا کر معاف کیا۔ جس نے ان طائف والوں کے حق میں دعائے خیر کی جنہوں نے اس پر پتھروں کی بارش کی تھی جس سے اس کے پاؤں خون آلودہ ہو گئے تھے جس نے احد کے میدان میں اپنے چہرہ کے زخمی کرنے والوں کو نیک دعادی جس نے دشمنوں کے حق میں بددعا کرنے والوں کے حق میں کہا کہ بن دنیا میں لعنت کے لئے نہیں رحمت کے لئے آیا ہوں“ (سیرت النبی جلد ۱ صفحہ ۱۰۵ بحوالہ ترمذی و بخاری) یہ تھا آنحضرتؐ کا ذاتی عمل تحمل و بردباری کے بارے میں۔ اب آپ کے ارشاداتِ عالیہ ملاحظہ فرمائیے۔ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار یہ درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیے آپ نے ہر بار یہ جواب دیا کہ ”غصہ نہ کرو“ اگر غصہ آ بھی جائے تو اس کو ضبط کیا جائے۔ (بخاری) ۲۲ آنحضرتؐ نے فرمایا پہلوان وہ نہیں جو لوگوں کو کشی میں پچھاڑ دے، بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔ (بخاری)

۳۲ آپ نے فرمایا: ”میں نہیں قدرت کے باوجود غصہ کو بند کر سکتا ہوں۔“ (بخاری) ۳۱ اللہ تعالیٰ! کو: ”اتے دن“ سے۔ اب جو اگر اعلیٰ درجہ کے انسان ہوں، تو مجھے کھڑا کر۔ (ترمذی)

۳۳ حضرت ابو بکرؓ کہتے ہیں کہ ابابکرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص نے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! میرے بچے رشتہ دار ہیں میں ان کے ساتھ ملتا ہوں وہ مجھ سے بدسلوکی کرتے ہیں میں بھلائی کرتا ہوں وہ بدی کرتے ہیں وہ میرے ساتھ جہالت کرتے ہیں میں تحمل سے پیش آتا ہوں۔ آنحضرتؐ نے یہ سن کر فرمایا کہ اگر بات یہی ہے جیسا کہ تم کہتے ہو تو تم ان کے منہ میں گرم راکھ بھرتے ہو اور جب تک اس حالت پر قائم رہو گے، خدا کی طرف سے تمہاری مدد ہوتی رہے گی۔ (صحیح مسلم و ادب المفرد امام بخاری)



۵۔ آپ نے فرمایا جو شخص چاہتا ہے کہ قیامت کو اس کی منزل بلند ہو۔ اور اس کے درجات رفیع ہوں وہ ظالم کو معاف کرے جو اس سے بخل کرتا ہے اس سے سخاوت کرے جو اس سے تعلق توڑتا ہے اس سے تعلق جوڑے اور جو اس سے ضد کرتا ہے اس سے علم و بردباری کا سلوک کرے۔ (کنز العمال جلد دوم)

۶۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ آپ ایک چادر اورٹھے ہوئے تھے، راستے میں ایک بدوی آپ کو بلا اور آپ کی چادر پکڑ کر اتنے زور سے کھینچی کہ آپ بدوی کے سینے کے سامنے کھج آئے، میں نے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی گردن مبارک کو دیکھا تو بدوی کے زور سے کھینچنے سے اس پر چادر کے کناروں کے نشان پڑ گئے۔ پھر وہ بدوی بولا: "محمد خدا کا جو مال تمہارے پاس ہے اس میں سے مجھے بھی کچھ دو" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے اس کے کہ اس کی بدتمیزی پر اسے سزا دیتے نہایت تحمل سے اس کی طرف دیکھا اور ہنس کر اسے کچھ مال دینے کا حکم دیا۔ (بخاری و مسلم)

۷۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک بدوی نے مسجد میں پیشاب کر دیا، لوگ اسے مارنے کے لئے اٹھے۔ رسول اللہ نے فرمایا: "اسے چھوڑ دو۔ اور ایک ڈول پانی کا بہا دو۔ تم آسانی کے لئے پیدا کئے گئے، سورتنگی کرنے کے لئے نہیں۔" (بخاری)

۸۔ **تَحْتَلُّ كِي حَدُّوَدٍ**: قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ تحمل کی ایک حد ہے۔ اس سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ اس حد سے تجاوز کر کے انسان بزدلی اور بے حیثی کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے جہاں انسان کی عزت و حیثیت اور دین پر حملہ کیا جا رہا ہو۔ قوت ایمانی کا تقاضا ہے کہ ایسے موقع پر ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ارْمَنِ قَتْلُ حُرِّ وَنِ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ وَمَنْ قَتَلَ دُونَ هِرْصِنَهُ فَهُوَ شَهِيدٌ۔

جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتا ہو امارا جائے وہ شہید ہے۔ اور جو اپنی آبرو کی تحفظ کی خاطر جان دے وہ بھی شہید ہے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مجیدہ اخلاق ہونے کے باوجود درستی و نرمی دونوں سے کام لیا کرتے تھے۔ ایک کامیاب معلم کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں سختی و نرمی دونوں ہوں۔ وہ ایک جراح ہے جس کے ایک ہاتھ میں لشر ہو جس سے زخم کو چیر کر فاسد مواد کو باہر نکال دے اور دوسرے ہاتھ میں مرہم ہو جس سے زخم میں ٹھنڈک پڑ جائے۔ اگر کسی



جراح کے پاس ان دو میں سے صرف ایک ہی چیز ہوتی ہے اپنے ذہن کا میاب نہیں ہو سکتا۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں :-

سہ درشتی و نری بہم در بہ است  
چوں رگ زن کہ فساد و مرہم نہ است

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سختی و نرمی کے موقع و محل کو خوب پہچانتے تھے حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ آپ نے کبھی اپنی ذات کے لئے کسی سے بدلہ نہ لیا البتہ اگر کوئی شریعت کی حدود کو توڑے تو اس کو سزا دیتے تھے۔ قریش کی ایک عورت چوری کے جرم میں پکڑی گئی بعض مسلمانوں نے سفارش کرنا چاہی تو آپ نے فرمایا تم سے پہلی قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ جب ان میں معمولی لوگ گناہ کرتے تھے تو ان کو سزا دی جاتی اور بڑے لوگوں سے کچھ تعرض نہیں کیا جاتا تھا۔ (بخاری)

قرآن میں جہاں صحابہ کی صفت رُحَمَاءُ بَلِيْغَةٌ (مومن آپس میں مہربان ہوتے ہیں) بیان کی ہے وہاں یہ بھی فرمایا ہے کہ

وَأَشَدُّ أَعْرَابِيًّا الْكُفَّارِ (وہ کفار کے مقابلہ میں بڑے طاقتور ہیں)

مذکورہ صدر آیت کا یہ مطلب نہیں کہ صحابہ کافروں سے سنگری اور بے رحمی کے ساتھ پیش آتے ہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ مسلمان اپنی بہت و استقلال یا بھی اتحاد اور قوت ایمان کی وجہ سے ایسے طاقتور رہیں کہ کفاروں سے نرسوب ہیں اور ان پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اَشَدُّ أَعْرَابِيًّا الْكُفَّارِ کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کافروں پر سخت ہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ صحابہ کفار پر بھاری ہیں یعنی ان پر غالب ہیں۔ اچنانچہ نحشی نے کشاف میں امام ابن حبان نے تفسیر مکر محیط میں اور قاضی بیضاوی نے اس آیت کے یہی معنی بیان کیے ہیں۔ عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں لکھا ہے کہ اَشَدُّ أَعْرَابِيًّا کا واحد شَدِيْدٌ ہے جس کے معنی ہیں۔ قوی اور طاقتور (لسان العرب جلد ۴ صفحہ ۳۱۸)

علامہ کلام یہ کہ ایمان و اسلام درشتی و نرمی دونوں کا تقاضا کرتا ہے اور ہر ایک کا خاص مقام ہے۔

۶۔ متحمل کے ثمرات :- تحمل سے حسب ذیل ثمرات و نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ متحمل مزاج آدمی راحت و سکون کی زندگی بسر کرتا ہے۔ بخلاف ازیں مغلوب الغضب آدمی ہر وقت بھگرتا رہتا ہے۔



- ۱۔ غصہ کو قابو میں رکھنا عین تحمل حکم خداوندی ہے۔
- ۲۔ جو شخص تحمل و حلم کے اوصاف سے بہرہ ور ہے وہ اسوۂ رسول پر عمل کرتا ہے۔
- ۳۔ رحیم و پرور بار آدمی کسی حد تک خدا کی صفتِ حلم سے بہرہ یاب ہے۔
- ۴۔ تحمل مزاج انسان انبیاء عظام مثلاً حضرت ابراہیم و اسماعیل کی صفتِ خصوصی سے موصوف ہے۔
- ۵۔ تحمل استقلال طبع عزم راسخ اور عالی ظرفی و بلند جوصلگی کا منظر ہے۔
- ۶۔ تحمل کی صفت اشاعتِ دین کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اور اسوۂ انبیاء ہے۔
- ۷۔ رحیم طبع آدمی زندگی کے ہر میدان میں کامیاب ہوتا ہے۔
- ۸۔ جلد بازی سے کام بگڑ جاتے ہیں۔ جو کام سوچ بچار اور تحمل سے انجام دیئے جائیں وہ کامیاب اور مفید ثابت ہوتے ہیں۔

### سوالات

- ۱۔ تحمل کے بارے میں اللہ اور رسول کے فرمودات قلمبند کیجئے۔
- ۲۔ تحمل کی ضرورت و اہمیت واضح کیجئے۔
- ۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس حد تک تحمل کا عملی نمونہ پیش کیا۔
- ۴۔ تحمل کی حدود کیا ہیں؟
- ۵۔ تحمل کے بارے میں تین احادیث نبویہ کا خلاصہ لکھئے۔



## تَقْوَىٰ

تَقْوَىٰ وَقِي يَقِي وَقَايَةً  
تَقْوَىٰ كَالْعَوَىٰ وَاصْطِلَاحِي مَفْهُومٌ

تقویٰ سے اسم ہے۔ دراصل وقیا  
تھا۔ ابتدائی واؤ کو تاء سے اور یا کو واؤ سے بدل دیا۔ یہ مادہ عربی زبان میں ان معانی

کے لئے مستعمل ہے۔

۱۔ نگران کرنا

۲۔ بچانا

۳۔ حفاظت کرنا

۴۔ پرہیز کرنا

۵۔ ڈرنا

(قاموس و صراح)

یہ تقویٰ کا لغوی مفہوم ہے۔ شرعی اصطلاح میں تقویٰ دل کی اس کیفیت کا  
نام ہے۔ جس کی بناء پر نیک اعمال انسان سے بسہولت صادر ہوتے جائیں اور  
برے کاموں کے خلافتِ دل میں نفرت و حقارت کے جذبات موجزن ہوں۔

دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ تقویٰ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے۔  
جس کی بناء پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس سے  
سرموخالفت کرنے سے شدید نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے  
ایک دوسرے صحابی سے تقویٰ کی حقیقت دریافت کی انہوں نے کہا: آپ خود ہی بتائیے  
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تمہیں خاردار جنگل سے گذرنا پڑے تو کس



طرح گذرتے ہوئے انہوں نے کہا احتیاط سے کپڑے سمیٹ کر۔ آپ نے فرمایا۔ اسی کا نام تقویٰ ہے۔ دنیوی زندگی ایک خاردار جنگل ہے۔ جس میں قدم قدم پر کانٹے دامن پکڑنے کے لئے موجود ہیں۔ اگر کوئی شخص سمٹ سمٹا کر اس میں سے گزر جائے تو وہ متقی ہے۔ تقویٰ کی تعریف میں اکابر سلف کے یہ اقوال قابل ملاحظہ ہیں :-

۱۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔ متقی وہ شخص ہے جو شرک اور کبائر و فواحش سے پرہیز کرتا ہو۔ (خازن)

۲۔ شہر بن خوشب فرماتے ہیں۔ متقی وہ شخص ہے جو گناہوں سے ڈرتے ہوئے مباحات سے بھی کنارہ کش ہو جائے۔ (معالم للبعوی)

۳۔ عمر بن عبدالعزیز کا قول ہے کہ ادا تے فرض اور ترکِ محرمات کو تقویٰ کہتے ہیں۔

(معالم)

۴۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھنے کا نام تقویٰ ہے۔

۵۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ تقویٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو کہتے ہیں۔ (معالم التتزیل للبعوی)

**تقویٰ کے متعلق اکابر علماء کی رائے**

اب زمانہ حال کے بعض اکابر علماء کے ارشادات عالیہ تقویٰ کے بارے میں درج کئے جاتے ہیں :-

علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں۔

”تقویٰ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے چھجک معلوم ہونے لگتی ہے اور نیک کاموں کی طرف رغبت پیدا ہوتی ہے۔ روزہ کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو۔ بات یہ ہے کہ انسانوں کے دلوں میں گناہوں کے خیالات اکثر حیوانی قوت کی افراط سے پیدا ہوتے ہیں۔ روزہ انسان کے ان جذبات کی شدت



کو کمزور کر دیتا ہے۔“ (سیرۃ النبیؐ جلد پنجم صفحہ ۲۱۱)

مولانا عبد الماجد دریا آبادی فرماتے ہیں۔

”تقویٰ نفس کی ایک مستقل کیفیت کا نام ہے۔ جس طرح مُضر غذاؤں اور مُضر عادتوں سے پرہیز کرنے سے جسمانی صحت دُرست ہو جاتی ہے اور مادی لذتوں سے لُطف و انبساط کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ بھوک خوب لگتی ہے۔ خون صالح پیدا ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح دنیوی زندگی میں تقویٰ اختیار کرنے سے عالمِ آخرت کی لذتوں اور نعمتوں سے لُطف اٹھانے کی صلاحیت و استعداد انسان میں پوری طرح پیدا ہو کر رہتی ہے۔“ (تفسیر ماجدی)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں۔

”تقویٰ نفس کی اس کیفیت کا نام ہے جو خدا ترسی اور احساسِ ذمہ داری سے پیدا ہوتی ہے۔ تقویٰ یہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کا خوف ہو۔ بندہ ہونے کا شعور ہو۔ خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری و جوابدہی کا احساس ہو اور اس بات کا زندہ ادراک ہو کہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے جہاں خدانے کچھ عمر دے کر مجھے بھیجا ہے۔ آخرت میں میری نجات کا فیصلہ اس بات پر منحصر ہے کہ میں اس امتحان گاہ میں اپنی قوتوں اور قابلیتوں کو کس طرح استعمال کرتا ہوں۔ ان بے انتہا سامانوں پر کس طرح تصرف کرتا ہوں۔ جو خدانے مجھے دیئے ہیں اور ان انسانوں کے ساتھ کیسا معاملہ کرتا ہوں۔ چن سے میری زندگی متعلق ہے۔ یہ احساس و شعور جس شخص میں پیدا ہو جائے۔ اس کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے۔ اس کی دینی حس تیز ہو جاتی ہے۔ اس کو ہر وہ چیز کھٹکنے لگتی ہے جو خدا کی رضا کے خلاف ہو۔ اس کا احساسِ فرض اسے مجبور کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے تمام حکموں کو پوری فرمانبرداری سے بجالائے۔ اس کی خدا ترسی اس موقع پر اس کے قدموں میں لغزش پیدا کر دیتی ہے۔ جہاں حدودِ اللہ سے تجاوز کا اندیشہ ہو۔ اس خیال سے بھی اس کا ضمیر



کانپ اٹھتا ہے کہ کہیں اس سے کوئی بات حق کے خلاف سرزد نہ ہو جائے۔“

(تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں صفحہ ۳۹-۴۰)

اسلامی عبادات کی تین بڑی قسمیں ہیں:-

## تقویٰ کی اہمیت

۱۔ جسمانی عبادات ۲۔ مالی عبادات ۳۔ قلبی عبادات

۱۔ جسمانی عبادات وہ ہیں جن کا تعلق انسانی جسم و جان کے ساتھ ہے۔ نماز، روزہ، حج اور دیگر تمام عبادات جو جسمانی اعضاء کے ساتھ ادا کی جاتی ہیں جسمانی عبادات کہلاتی ہیں۔ ۲۔ زکوٰۃ اور صدقات و خیرات کو مالی عبادات کہا جاتا ہے۔ ۳۔ عبادات کی تیسری قسم کا تعلق تمام تر قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیت سے ہے۔ قرآن کریم میں کثرت سے ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ تقویٰ۔ اخلاص۔ توکل۔ صبر اور شکر قلبی عبادات میں شامل ہیں۔

یہ وہ عبادات ہیں جو اسلام کی روح اور ہمارے تمام اعمال کا اصلی جوہر ہیں جن کے الگ کر دینے سے وہ عبادات بیچگانہ بھی جن پر اسلام نے اس قدر زور دیا ہے جس دے روح بن جاتی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ دل کی پاکیزہ ترین اور اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے جو تمام نیکیوں کی محرک ہے اور وہی مذہب کی جان اور دینداری کی روح ہے۔

۱۔ پوری اسلامی شریعت کا خلاصہ ہم صرف ایک

## تقویٰ کی جامعیت

لفظ میں بیان کرنا چاہیں تو اس کو تقویٰ سے ادا

کر سکتے ہیں۔ اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اس تقویٰ کی روح پیدا کرنا ہے۔ قرآن حکیم نے سورہ بقرہ کے آغاز میں اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیمات سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو تقویٰ کی صفت سے بہرہ ور ہوں۔ ارشادِ خداوندی ہے

۱۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (بقرہ-۱) قرآن تقویٰ والوں کو راہ دکھاتا ہے۔

تمام اسلامی تعلیمات کی غرض و غایت اسی تقویٰ کا حصول ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی



عبادت کرو۔ جس نے تم کو اور تمہارے  
پہلے لوگوں کو پیدا کیا تا کہ تم منفق  
بن جاؤ۔

رَبِّكُمْ الَّذِي خَلَقَكُمْ  
وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ  
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (البقرہ)

۳۔ روزہ کی غرض بھی تقویٰ کا حصول ہے۔ قرآن میں فرمایا :-

تم پر روزہ اسی طرح فرض کیا جس  
طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا  
تھا تا کہ تم تقویٰ حاصل کرو۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ  
كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ  
مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ  
تَتَّقُونَ (البقرہ)

۴۔ حج کا مقصد بھی تقویٰ ہے۔ قرآن میں ہے۔

اور جو حج کے شعائر کی عزت کرتا  
ہے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔

وَمَنْ يُعْظِرْ شَعَائِرَ اللَّهِ  
فَأَنَّهُ مِنَ الْفٰلِقِينَ

(سورہ حج - ۲)

۵۔ قربانی بھی تقویٰ ہی کے لئے ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :-

خدا کے پاس قربانی کا گوشت اور خون  
نہیں پہنچتا لیکن تمہارا تقویٰ اس کو  
پہنچاتا ہے۔

لَنْ يَنَالَ اللَّهُ لِحْمٌ مِّمَّهَا  
وَلَا دِمَآءٌ هَاوٍ لِّكِن يَنَالُهُ  
التَّقْوٰى مِنْكُمْ (سورہ حج ۵)

۶۔ تقویٰ بہترین توشہ ہے۔ فرمایا :-

سب سے اچھا زادِ راہ تقویٰ ہے۔

فَاِنَّ خَيْرَ الْاٰدِ التَّقْوٰى

(بقرہ - ۲۵)

۷۔ تقویٰ کا لباس سب سے بہتر ہے۔ ارشاد باری ہے :-

اور تقویٰ کا لباس سب سے  
اچھا ہے۔

وَلِبَاسِ التَّقْوٰى ذٰلِكَ  
خَيْرٌ (اعراف - ۳۰)

۸۔ آخری نعمتیں تقویٰ والوں کو ملیں گی۔



بے شک تقویٰ والے باغوں اور چشموں  
میں ہوں گے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَ  
نَعِيمٍ (سورہ طور - ۱)

بے شک تقویٰ والے باغوں اور چشموں  
میں ہوں گے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ  
وَعُيُونٍ (ذاریات - ۱)

۹۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے قوم اور قبیلہ موجب فخر و مباحات نہیں بلکہ عظمت و  
فضیلت کا معیار تقویٰ ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ  
أَتْقَاكُمْ۔ سورہ حجرات - ۱۸

تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے معزز  
وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ  
والا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر لاکھوں انسانوں کے  
سامنے اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:-

"اے لوگو! خوب سن لو کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کسی  
قسم کی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ اگر کسی کو فضیلت حاصل ہے تو صرف تقویٰ کے  
سبب۔ (صحیح بخاری)

ایک مرتبہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ سب سے زیادہ  
معزز کون ہے۔ فرمایا جو ان میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے (صحیح مسلم)  
۱۰۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل تقویٰ اللہ کے محبوب ہیں۔  
فرمایا:-

إِنَّ أَقْرَبَ أَهْلِ اللَّهِ  
إِلَّا الْمُتَّقُونَ (تقویٰ والے ہی خدا کے دوست ہیں)  
(الأنفال - ۳۴)

نیز فرمایا:-  
وَاللَّهُ مَوْلَى الْمُتَّقِينَ۔  
(الحجاثہ - ۱۹)

اور اللہ تقویٰ والوں کا دوست ہے۔



علماء نے تقویٰ کے تین درجات بیان کئے ہیں :-  
**تقویٰ کے درجات** ۱۔ ادنیٰ ۲۔ اوسط ۳۔ اعلیٰ

۱۔ ادنیٰ درجہ کا تقویٰ ایمان ہے جو عذابِ جہنم سے بچنے کا ذریعہ ہے۔  
 ۲۔ اوسط درجہ کا تقویٰ یہ ہے کہ صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کیا جائے اور کیاڑ سے پوری طرح اجتناب کیا جائے۔  
 ۳۔ اعلیٰ درجہ کا تقویٰ یہ ہے کہ ہر اس کام سے پرہیز کیا جائے جو انسان کے دل کو خدا سے غافل کر دے۔ یہ تقویٰ کا اعلیٰ مقام ہے اور خدا کے خاص بندے اس سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

تذکرہ صدر آیات و احادیث سے واضح ہوا کہ  
**اہل تقویٰ کی پہچان** تقویٰ ہی اسلامی تعلیمات کی اصلی غرض و غایت اور دینِ اسلام کی رُوح ہے۔ دین و دنیا کی تمام نعمتیں اہل تقویٰ ہی کے لئے ہیں۔ اس کے ساتھ قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ اہل تقویٰ کون ہیں اور ان کے خصوصی اوصاف کیا ہیں سورہ الزمر میں فرمایا :-

”اور جو سچائی لے کر آیا اور اس کو سچ مانا وہی لوگ ہیں تقویٰ والے۔ ان کے لئے ان کے رب کے پاس وہ سب کچھ ہے۔ جو وہ چاہیں یہ ہے بدلہ نیکی والوں کا۔“ (سورہ زمر - ۴)

آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر کام کے ہر پہلو میں سچائی لے کر آئے اور اس ابدی سچائی کو مانے۔ وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ فوری ثمرہ مال و دولت اور جاہ و عزت کے نقطہ پر نہیں بلکہ سچائی کے ہر پہلو پر نظر رکھتا ہے اور خواہ بظاہر اس کا کسی قدر نقصان ہو مگر وہ سچائی اور راست بازی کے راستے سے ہال بھر ہٹنا نہیں چاہتا۔ سورہ بقرہ میں اہل تقویٰ کی تفصیلی خصوصیات بیان کیں۔ جس سے تقویٰ والوں کے خدو حال بہت اچھی طرح سامنے آجاتے ہیں۔ ارشادِ باریکین نیکی یہ ہے کہ جو خدا پر اور روزِ قیامت پر کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لایا۔



اور مال کی محبت کے باوجود اسے رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگتے والوں پر اور غلام کو آزاد کرنے میں خرچ کیا اور نماز پڑھی اور زکوٰۃ دی اور وہ جو وعدہ کر کے اپنے وعدہ کو پورا کرنے والے ہیں اور سختی تکلیف اور لڑائی میں صبر کرنے والے ہیں یہی ہیں جنہوں نے اپنے عہد کو سچ کر دکھایا اور یہی لوگ متقی ہیں۔ (سورہ بقرہ - ۲۲)

اس آیت کی تفسیر سے ثابت ہوا کہ اہل تقویٰ مندرجہ ذیل صفات کے حامل ہوتے ہیں۔

- ۱۔ اللہ تعالیٰ روزِ قیامت رسولوں، فرشتوں اور آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتا ہو۔
- ۲۔ خدا کے عطا کردہ مال میں سے یتیموں، مسکینوں اور عزیز و اقارب کو دیتا ہو۔
- ۳۔ نماز پڑھتا ہو اور زکوٰۃ ادا کرتا ہو۔
- ۴۔ وعدہ پورا کرنے کا شوگر ہو۔
- ۵۔ حوادث و آلام اور حرب و پیکار میں صبر کرتا ہو۔

تقویٰ دراصل تمام نیکیوں کی بنیاد اور اصل الاصول ہے۔ تقویٰ سے مندرجہ

## تقویٰ کے ثمرات و نتائج

ذیل آثار و نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

- ۱۔ عبادات میں خلوص اور خشوع و خضوع پیدا ہوتا ہے (سورہ بقرہ)
- ۲۔ دل میں خدا کا خوف پیدا ہوتا ہے۔ (صحیح مسلم)
- ۳۔ انسان حقوق و فرائض سے آگاہ ہوتا ہے۔ حلال حرام کو پہچانتے لگتا ہے۔ (بخاری و مسلم)
- ۴۔ جن چیزوں کا حلال یا حرام ہونا شریعت سے معلوم نہیں۔ صاحب تقویٰ ایسی مشکوک اشیاء سے بھی کنارہ کش رہتا ہے۔ (بخاری و مسلم)
- ۵۔ تقویٰ سے دوسروں کے حقوق کے تحفظ و نگہداشت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں متقین کی تعریف بیان کی گئی ہے کہ ان کے مالوں میں سائل اور نادار آدمی کا حق ہے۔ (الذاریات - ۱۱۹)
- ۶۔ تقویٰ سے بہرہ ور ہو کر انسان عدل و انصاف کے تقاضوں پر عمل کرنے لگتا ہے۔ (واعبدوا اللہ اقربا للثقیل المائدہ - ۸)



۷۔ تقویٰ سے انسان میں ایفاء عہد کا وصف پیدا ہوتا ہے۔ عہد شکنی تقویٰ کے

مناہی ہے۔ (سورہ انفال)

بطور مثبتہ نمونہ از خروار کے تقویٰ کے چند خصائص کا ذکر کیا گیا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ تقویٰ ایک جامع وصف ہے جو دین اسلام کے تمام حقوق و فرائض اور واجبات سنن سے لے کر مستحبات تک کو شامل ہے اور اس کی معنوی وسعت سے نیکی کا کوئی کام خارج نہیں۔ قرآن کریم نے یہ کہہ کر تقویٰ کی مدح و منقبت پر مہر ثبت کر دی کہ :-  
وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ إِذَا رَمَيْتَ  
لِلْمُتَّقِينَ (زخرف - ۳۵) تقویٰ والوں کے لئے ہے۔

اس آیت سے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ کامیاب اخروی زندگی صرف انہی لوگوں کی ہوگی جو تقویٰ سے بہرہ یاب ہوں گے۔

تقویٰ کی حد یہ ہے کہ آدمی مشکوک چیزوں سے پرہیز کرے۔  
تقویٰ کی حد ایسا نہ ہو کہ تقویٰ کے زعم میں حلال اور مباح چیزوں کو بھی اپنے اذ پر حرام کرے۔ اسی کو قرآن میں رہبانیت کا نام دیا گیا ہے۔ اسلام میں رہبانیت کی اجازت نہیں۔ عہد رسالت میں جب چند صحابہ نے ترک دنیا اور تہجد کا ارادہ کیا تو آپ نے انہیں سختی سے روکا اور فرمایا۔ میں سردارِ انبیاء ہوں اور اس کے باوجود لوازم حیات کو ترک نہیں کر رہا۔ لہذا تقویٰ کی حد یہ ہے کہ نہ صرف محرّمات بلکہ مشتبہات سے بھی پرہیز کیا جائے مگر مباحات کو کسی حال میں بھی حرام قرار نہ دیا جائے۔

## سوالات

- ۱۔ تقویٰ کا لغوی و اصطلاحی مفہوم نیز اس کی حقیقت بیان کیجئے؟
- ۲۔ تقویٰ سے انسانی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ تقویٰ کے آثار و نتائج بیان کیجئے؟
- ۳۔ اہل تقویٰ کے خصوصی اوصاف کتاب و سنت کی روشنی میں درج فرمائیے۔
- ۴۔ جنیبتوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی کیا عاقبت ہے؟



## ذکر

ذکر عربی زبان میں ذکر یذکر کا مصدر ہے۔ ذکر کے معنی ہیں یاد کرنا۔ بھولی ہوئی چیز کی یاد تازہ کرنا۔ اسے بار بار ذہن میں لانا۔ شرعی اصطلاح میں ذکر سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا مراد ہے۔ ذکر کے مقابل غفلت کا لفظ ہے۔

ذکر کی فضیلت و اہمیت | انسان ہمیشہ اس چیز کو یاد کرتا ہے جس سے گہرا لگاؤ ہو۔ قلبی رابطہ ہو اور کسی صورت میں اسے فراموش کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ یہ قلبی ربط و تعلق مختلف وجوہ و اسباب کی بناء پر ہو سکتا ہے۔ یہ محرکات اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور بُرے بھی۔ ایک مومن کامل کی دلی محبت اور مجلسانہ الفت و مؤدت صرف ذاتِ باری تعالیٰ سے ہو سکتی ہے۔ بیشک محبتِ ذنیوی اشیاء مثلاً بیوی بچوں زر و مال بن بھائیوں اور دیگر عزیز واقارب سے بھی ہوتی ہے اور یہ محبت غیر شرعی بھی نہیں بلکہ عین موافق مذہب و ملت ہے اور انسان اکثر ان کو یاد بھی کرتا رہتا ہے۔ مگر ایک مومن کامل کا جو خصوصاً رابطہ ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے۔ دنیا کی کسی چیز سے نہیں ہوتا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (مومن کو سب سے زیادہ محبت خدا سے ہوتی ہے)

حُبِّ خداوندی کا تقاضا ہے کہ ذکرِ الہی ہر لمحہ وردِ زبان رہے۔ سالارِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ

كَانَ يَذْكُرُ اللَّهَ فِي كُلِّ أَحْيَانٍ (آپ ہر لمحہ خدا کو یاد کیا کرتے تھے)



اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاں مومنین کے اوصاف گنائے ہیں وہاں فرمایا :-  
 الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ  
 قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ  
 جُنُوبِهِمْ (آل عمران - ۱۹۱) ہیں

مجت کی تحریک جانبین سے ہوتی ہے۔ جب بندہ خدا کو یاد کرتا ہے تو دوسری  
 جانب سے اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد کرتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

وَإِذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ  
 (سورہ بقرہ - ۱۵۲) کرتا رہوں گا

اس آیت کی تفسیر میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی فرماتے ہیں :-  
 "بندہ کا اپنے مالک کو یاد کرنا یہی ہے کہ اس کی بتلائی ہوئی سزا پر ہمت اور  
 شوق سے چلتا رہے۔ یہ یادِ الہی کسی خاص وقت کے ساتھ محدود و مقید نہیں۔ لکھتے  
 پڑھتے بولتے، چلتے، سوتے، جاگتے سب حالتوں میں رضائے الہی کو مقدم رکھنا،  
 یہی بندہ کی طرف سے یادِ الہی ہے۔ ابوبکر جصاص رازی نے ذکر سے آیاتِ الہی اور  
 اور ان کی عظمت و قدرت میں تفکر مراد لیا ہے اور اس کو سب اذکار سے افضل اور  
 ان کی اصل قرار دیا ہے۔"

اللہ کا اپنے بندوں کو یاد کرنا یہی ہے کہ ان پر دنیا و آخرت دونوں میں اپنے خصوصی  
 فضل و کرم کی بارش کرتا رہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی صاحب فرماتے ہیں کہ بندہ  
 ادھر یادِ الہی میں لگا ہے تو ادھر سے بھی سرفرازی ہوتی رہے گی۔

بندہ کے ذکرِ الہی کا یہی اصل ثمرہ اور انعام ہے۔ اگر ذہن کے سامنے وہ موجود  
 رہے تو ذکر کرنے والے کو نہ کبھی تشویش ہو اور نہ بے حاصلی کی شکایت پیدا ہو (ماجدی  
 قرآن کریم میں ذکرِ الہی کا حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ  
 ذِكْرًا كَثِيرًا (سورہ احزاب - ۴۱) بہت یاد کرو



جنگ کے موقع پر جہاں جان کے لئے پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ذکرِ الہی کا حکم دیا۔ سورہ انفال میں فرمایا۔

”اے ایمان والو! جب تمہارا مقابلہ کسی فوج سے ہو جائے تو حجم جاؤ اور اللہ کو خوب یاد کرو۔“

ذکر کی اہمیت و افضلیت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ - (یادِ الہی بہت بڑی چیز ہے)

(سورہ عنکبوت - ۲۵)

مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

”اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے نماز اور جہاد وغیرہ سب عبادات کی روح کہہ سکتے ہیں۔ یہ نہ ہو تو عبادت ایک جسدِ بے روح اور لفظِ بے معنی ہے۔ خدا کے ذکر سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں۔ اصلی فضیلت اسی کی ہے۔ عارضی اور وقتی طور پر کوئی عمل خدا کے ذکر پر سبقت لے جائے تو دوسری بات ہے لیکن غور کیا جائے تو پتا چلے گا کہ اس عمل میں بھی فضیلت ذکرِ الہی کی بدولت آئی ہے۔“

ذکرِ الہی میں مشغول رہنے اور اس سے غفلت نہ برتنے کو علامتِ ایمان قرار دیا۔ سورہ نور میں فرمایا۔

”مومن وہ لوگ ہیں کہ ان کو اللہ کی یاد اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے سے نہ تجارت غافل کرتی ہے نہ خرید و فروخت۔ وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن دل اور آنکھیں اکٹ جائیں گی۔“ (سورہ نور رکوع - ۱۵)

ایک مرتبہ غریبہ مہاجرین کی ایک جماعت سالارِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پر دائر ہوئی کہ دولت مند جنت کے بلند درجات حاصل کرنے میں ہم سے سبقت لے گئے جیسے ہم نمازیں پڑھتے ہیں وہ بھی پڑھتے ہیں۔ جیسے ہم روزے رکھتے ہیں وہ بھی رکھتے ہیں مگر ان کے پاس دولت و مال ہے جس سے وہ حج و عمرہ کرتے ہیں جہاد کرتے ہیں صدقہ دیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمہیں ایسی چیز



بتاؤں جس کی بناء پر تم ان کے برابر ہو جاؤ۔ بعد میں آنے والوں سے بڑھ جاؤ اور تم سے افضل صرف وہی شخص ہو جو تمہاری طرح اس پر عمل کرے؛ صحابہ نے عرض کی ہاں! آپ نے فرمایا۔ ہر نماز کے بعد ۳۳ بار سبحان اللہ، ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۳ بار اللہ اکبر پڑھا کرو۔ چند روز بعد یہ صحابہ پھر حاضر ہوئے اور عرض کی کہ دولت مندوں نے ہمارا ذکر سن لیا اور اب وہ بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ حضور نے جواب دیا۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے عطا کر دے۔ (بخاری و مسلم)

ابتداء میں ذکرِ خداوندی ایک فریضہ کے طور سے کیا جاتا ہے۔ اگر آدمی اس پر کار بند رہے اور باقاعدگی سے ادا کرتا رہے تو یہ اس کی طبیعت میں راسخ ہو جاتا ہے۔ پھر اگر وہ زبان سے ذکر نہ بھی کرے تو اس کا دل ذکرِ الہی سے معمور رہتا ہے۔ امام غزالی نے ذکر کے چار درجات بیان کئے ہیں۔

۱۔ صرف زبان سے ذکر کرنا ۲۔ دل پر چیر کر کے اسے ذکر کا خوگر بنانا۔ ۳۔ دل میں ذکرِ خداوندی اس حد تک پختہ ہو جائے کہ بلا تکلف زبان پر جاری رہے ۴۔ دل ذکرِ الہی میں اس حد تک مشغول ہو جائے کہ اپنے آپ کی خبر نہ رہے۔ صوفیہ کی اصطلاح میں اس کا نام استغراق ہے۔ یہ ذکر کے چار درجے ہیں۔ پہلے تین درجے اس کے لئے مقدمہ و تمہید کا کام دیتے ہیں۔

متعدد احادیثِ نبویہ میں مجالسِ ذکر کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ چند احادیث

**مجالسِ ذکر کی فضیلت**

درج ذیل ہیں۔

- ۱۔ چند آدمی جس مجلس میں بیٹھ کر یادِ الہی میں مصروف ہوں تو فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں۔ رحمتِ خداوندی ان پر چھا جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ آسمانی مخلوقات میں ان کو یاد کرتے ہیں۔ (مشکوٰۃ شریف)
- ۲۔ جب چند آدمی رضاٹے الہی کے لئے کسی مجلس میں بیٹھ کر یادِ خدا کرتے ہیں تو



ایک منادی کرنے والا آسمان سے پکارتا ہے۔ تمہیں بخش دیا گیا اور تمہارے گناہ نیکیوں میں تبدیل کر دیئے گئے۔ احمد ابو یعلیٰ و طبرانی بسند ضعیف)

۳۔ جب لوگ کسی مجلس میں بیٹھ کر نہ خدا کو یاد کرتے ہوں نہ آنحضرت پر درود بھیجتے ہوں تو بروز قیامت انہیں حسرت و ندامت کا ماننا ہوگا۔ (ترمذی)

۴۔ داؤد علیہ السلام فرمایا کرتے تھے۔

"بارخدا یا! جب میں تمہیں یاد کرنے والوں کی مجلس کو ترک کر کے غافلوں میں بیٹھنے لگوں تو میرے پاؤں توڑ ڈال کہ میں وہاں تک پہنچ نہ سکوں۔ یہ احسانِ عظیم ہوگا۔"

(احیاء علوم الدین للغزالی)

۵۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ بازار گئے تو لوگوں کو دیکھ کر کہا۔ "تم یہاں بیٹھے ہو اور ادھر مسجد نبویؐ میں نبی کریمؐ کی میراث تقسیم ہو رہی ہے۔ لوگ والہانہ بھاگ کر مسجد نبویؐ پہنچے تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ ابو ہریرہؓ سے بولے "وہاں تو میراث وغیرہ کچھ بھی نہیں"۔ ابو ہریرہؓ نے فرمایا "پھر تم نے وہاں کیا دیکھا ہے" کہنے لگے چند آدمی وہاں یادِ اہی میں مشغول تھے اور قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ ابو ہریرہؓ نے فرمایا۔ "وہی میراثِ رسولؐ ہے"۔ (طبرانی فی المعجم الصغیر)

۱۔ حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ "ہمیں یہ حدیثِ قدسی

پہنچی ہے کہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں۔ "اے میرے بندے نماز فجر اور عصر کے بعد تھوڑی دیر تک مجھے یاد کر لیا کرو۔ تمہارے لئے بس اتنا ہی کافی ہے"۔ (احیاء للغزالی)

۲۔ بعض علماء کا قول ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ میں بندے کے دل کو جھانک کر دیکھتا ہوں۔ جب مجھے وہاں یادِ خدا کا غلبہ نظر آتا ہے تو میں اس کے سارے کاموں کا کیفیل بن جاتا ہوں اور اس کی ہم نشینی اور ہم کلامی اختیار کرتا ہوں۔

(احیاء للغزالی)

۳۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ "ذکر کی دو قسمیں ہیں ۱۔ ایک



وہ ذکر جس کا تمہارے اور اللہ کے سوا کسی کو علم نہ ہو۔ اس کا اجر بہت بڑا ہے۔  
 ۲۔ ذکر کی دوسری قسم یہ ہے کہ بندہ جب محرمات کو دیکھے تو اسے خدا یاد آئے۔ یہ سب  
 افضل ذکر ہے۔ (احیاء) ۴۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ اصل  
 جنت کو سب سے زیادہ حسرت و ندامت اس لمحہ پہوگی جو خدا کو یاد کئے بغیر گذر گیا  
 ہو۔ (احیاء معلوم الدین للفرالی)

قرآن کریم میں ذکر الہی کا طریقہ بیان کرتے  
 ہوئے ارشاد فرمایا :-

اور اپنے رب کو اپنے جی میں گڑ گڑاتے  
 اور ڈرتے ہوئے یاد کرتا رہ اور اسے  
 دھیمی آواز سے صبح و شام یاد کر اور  
 غافلوں سے نہ ہو

وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ  
 تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ  
 مِنَ الْقَوْلِ بِالْخُدُوِّ وَالْآصَالِ  
 وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ

(سورہ اعراف - ۲۰۵)

مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں  
 "اس آیت میں ذکر الہی کا طریقہ بیان فرمایا۔ ذکر الہی کی اصل روح یہ ہے کہ  
 جو زبان کہے دل سے اس کی طرف دھیان رکھے تاکہ ذکر کا پورا لطف ظاہر ہو اور زبان  
 دل دونوں خدا کی یاد میں مشغول ہوں ذکر کرتے وقت دل میں نرمی ہونی چاہئے۔ سچی  
 رغبت سے خدا کو پکارے جیسے کوئی خوشامد کرنے والا ڈرا ہوا آدمی خدا کو پکارتا ہے  
 ذکر کرنے والے کے لہجہ میں آواز میں اور مہیبت میں بجز و نیاز کا رنگ محسوس ہونا  
 چاہئے۔ خدا کی عظمت و جلال سے آواز کا پست ہونا قدرتی چیز ہے۔ اسی لئے  
 زیادہ چلانے کی ممانعت آئی ہے۔ دھیمی آواز سے ستر آیا بہرہ خدا کا ذکر کرے۔ پھر  
 اس سے زیادہ عاشق کی خوش قسمتی اور کیا ہے۔"

اس آیت سے مندرجہ ذیل امور واضح ہوئے :-

۱۔ ذکر کرتے وقت زبان کے ساتھ دل بھی متوجہ ہو۔ ۲۔ ذکر کرتے وقت دل



میں رقت ہونی چاہئے۔ ۳۔ ذکر کرنے والے کے دل میں درشتی اور کرخت پن نہ ہو بلکہ دھیمی آواز سے ذکر کیا جائے۔ ۴۔ صبح و شام کے اوقات میں خصوصاً ذکر خداوندی بجلائے۔

خدا کی یاد کا سب سے اہم طریق نماز ہے۔ یہ عمل بارگاہ ربانی میں سب سے زیادہ مقبول اور قرب خداوندی کا ذریعہ ہے۔ تلاوت قرآن بھی بڑا عمدہ ذکر ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کا نام ذکر بھی رکھا۔ یعنی کتاب الہی سے اس کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ قرآن حکیم کے مطالب و معانی پر غور کیا جائے تو اس کا اجر و ثواب بہت بڑھ جاتا ہے لیکن اس کی تلاوت بھی بیشمار عظمت و فضیلت کی موجب ہے۔ خدا کے حضور میں عجز و انکسار سے دعا کرنا بھی ذکر کی ایک بہترین قسم ہے۔ حدیث میں دعا کو عبادت کا مغز و جوہر کہا گیا ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنے کا حکم خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ اس لئے آپ پر درود و سلام بھیجنا بہت اعلیٰ درجہ کا ذکر ہے۔ حدیث میں درود شریف کے فضائل بڑی کثرت سے بیان کئے گئے ہیں۔

## اذکارِ مسنونہ کی اہمیت

آیت مذکورہ صدر کے علاوہ ذکر الہی میں جن بات کا ملحوظ رکھنا اشد ضروری ہے۔ وہ یہ

ہے کہ اذکار و ادعیہ وہی ہوں جو کتاب و سنت میں مذکور ہیں۔ غیر مسنون اذکار بجائے ثواب کے الٹا موجب عذاب ہیں۔ دین اسلام عبادت ہے اللہ و رسول کی اطاعت سے جس طرح اس کے احکام و اوامر اپنے قیاس سے گھڑے نہیں جاسکتے۔ اسی طرح اذکار و ادعیہ کا مسنون ہونا بھی ضروری ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کریم و حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اذکار اس کثرت سے بیان کئے گئے ہیں کہ انہی موجودگی میں دوسرے وزد و وظیفہ کی طرف رجوع کرنا قطعی طور پر بے کار ہے۔ بیدھی بات ہے کہ آخر اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کلام کا نکتہ دان اور اثر شناس کون ہو سکتا ہے۔ اسے چونکہ اپنا ذکر بہت مرغوب ہے۔ اس لئے اس نے ذکر کے بعض الفاظ قرآن حکیم میں



اور بعض اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے بیان کر دیئے۔ علمائے سلف نے اذکارِ مسنونہ پر مستقل کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان میں سے وہ اذکارِ معلوم کر لینے چاہئے۔ جو نبی کریمؐ کے روزِ زبان رہا کرتے تھے۔ سب سے بڑھ کر اوراد و وظائف وہی ہیں۔ غیر مسنون اذکار پر اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ خدا کی یاد کا سب سے اچھا طریقہ فرضی و نفل نماز ہے۔ قرآن میں ہے۔

أَقْبَبُوا الصَّلَاةَ لِذِكْرِي

میرا ذکر کرتے وقت نماز قائم کیجئے  
پنجگانہ نمازوں کے علاوہ کچھ نفل نمازیں بھی ہیں جو بندہ اپنے ذوق و شوق سے ادا کرتا ہے۔ ان سے بڑا اجر و ثواب ملتا ہے۔ نفل نمازوں میں افضل ترین نماز تہجد ہے جو نبی کریمؐ عمر بھر ادا کرتے رہے۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا :-

"اپنے رب کا نام صبح و شام پکارو اور راتوں کو اس کے حضور سجدہ ریز ہو اور رات کا ایک لمبا حصہ اس کی تسبیح میں گزار دو۔" (سورہ دہر رکوع ۲)

ذکر کے ثمرات و نتائج

ذکر الہی مندرجہ ذیل فوائد و منافع کا موجب ہے۔ ۱۔ بارگاہِ خداوندی میں قرب و قبولیت

حاصل ہوتی ہے۔ قرآن میں فرمایا :-

"فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ"  
(سورہ بقرہ رکوع ۱۸)

۲۔ دل میں عاجزی اور خوفِ خدا پیدا ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے :-

اِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلْتُمْ  
ثُلُوبُهُمْ (سورہ حج رکوع ۵)

۳۔ ذکر الہی سے حصولِ مقاصد کی تمام راہیں کھل جاتی ہیں۔ فرمایا :-

وَإِذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا  
تَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ (سورہ جمعہ رکوع ۲) حاصل کرو

۴۔ ذکر الہی سے اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا :-



الَّا بِذِكْرِ اللَّهِ تَقْوَمِينَ  
انْقَلُوبُ (سورہ رعد رکوع ۴)

خدا کی یاد سے دلوں کو اطمینان  
نصیب ہوتا ہے

دورِ حاضر میں مادی لوازمِ حیات کی فراوانی ہے۔ عیش و عشرت میں جس قدر اضافہ  
ہوا ہے۔ حقیقی سکون و اطمینان میں اسی قدر کمی آتی گئی ہے۔ دولت کی افراط انسان  
کو ذہنی و قلبی سکون مہیا کرنے سے قاصر رہی ہے۔ موجودہ دور میں اعصابی امراض  
میں بھی بہت اضافہ ہوا ہے۔ جن کے علاج سے اطباء تقریباً عاجز آچکے ہیں۔  
آیت زیر تبصرہ میں بتایا گیا ہے کہ اعصابی امراض اور قلبی اضطراب کا علاج  
ذکرِ الہی ہے۔ ذکر سے دل کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ یہ قوت سب قوتوں  
کا سرچشمہ ہے بلکہ حقیقی زندگی ذکر ہی کے دم سے ہے۔

۵۔ ذکرِ الہی سے روگردانی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی معیشت ضائع ہو جاتی  
ہے۔ ارشاد ہوا۔

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي  
فَأِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا  
(سورہ طہ)

جس نے میری یاد سے روگردانی کی  
اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی

۶۔ ذکرِ الہی سے منہ پھرنے والا بروز قیامت نابینا اٹھے گا۔  
وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ  
اَعْمٰی (سورہ طہ)

اور ہم ان کو قیامت کے دن نابینا  
اٹھائیں گے

۷۔ ذکرِ الہی سے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ قرآن میں فرمایا۔

متقی وہ لوگ ہیں اگر ان سے بڑا کام سرزد ہو جائے یا کوئی گناہ کر کے اپنی  
جان پر ظلم کریں تو خدا تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں  
اور گناہوں کو اللہ کے سوا اور کون معاف کر سکتا ہے؟ (سورہ آل عمران رکوع ۱۲)

۸۔ یادِ الہی توشہٗ جنت ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرتے  
ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت عطا کرتا ہے قرآن میں ارشاد ہوا۔ "جو مرد اور عورتیں



اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں ان کے لئے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔ (سورہ احزاب)  
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
 إِذَا مَرَّ بِكُمْ مِنْ يَأْتِي الْجَنَّةَ فَارْتَقُوا (مشکوٰۃ شریف)  
 جب صحابہؓ نے آنحضرتؐ سے اس کی وضاحت چاہی تو آپ نے فرمایا۔ باغات  
 پر ہو تو پھیل چنا کرو)  
 مساجد ہیں اور پھیل چھٹنے سے مراد ذکر الہی ہے۔

## سوالات

- ۱۔ ذکر کی فضیلت و اہمیت قرآن کریم کی روشنی میں واضح کیجئے۔
- ۲۔ ذکر کی اہمیت احادیث نبویہ سے ثابت کیجئے۔
- ۳۔ ذکر کے ثمرات و فوائد بیان کیجئے۔
- ۴۔ ذکر کے آداب و اقسام قلم بند کیجئے۔
- ۵۔ ذکر سے روگردانی کرنے والے کس نمرانے کے مستوجب ہوں گے؟



# شکر

**شکر کا لغوی مفہوم** | لفظ شکر عربی زبان میں چند معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً: ۱۔ اظہارِ احسان مندی کرنا۔

- ۲۔ اگر شکر کا فاعل اللہ تعالیٰ ہو تو اس کے معنی 'اجودینا اور جزادینا ہوں گے۔'  
 ۳۔ شکور مٹھوڑے چارہ پر صبر کرنے والا گھوڑا جو چارہ کم کھانے کے باوجود موٹا تازہ رہے۔ ۴۔ دودھ دینے والے بانور کے تھنوں کا دودھ سے بھر جانا۔ بخل کے بعد سخاوت پر آنا۔ ۵۔ بارش سردی اور ہوا کا تیز ہو جانا۔

(القاموس المحيط جلد اول)

**شکر کا اصطلاحی مفہوم** | شرعی نقطہ نظر سے محسن حقیقی (ذات باری تعالیٰ) کے بنے پائیاں انعامات

کا دل زبان اور اعضاء سے اعتراف کرنے کو شکر کہتے ہیں اور شکر کے مقابلے میں کفر کا لفظ بول جاتے ہیں۔ جس کے لغوی معنی چھپانا ہیں۔ کفرانِ نعمت کا لفظ اسی سے بنایا گیا ہے۔ جس کے معنی ہیں نعمت کا شکر نہ ادا نہ کرنا۔ کفر وہ لفظ ہے جس سے زیادہ بڑا لفظ اسلام کے لغت میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لاتعداد احسانات کو فراموش کر کے دل سے ان کا اعتراف نہ کرنا۔ زبان سے ان کا اقرار اور عمل سے اپنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ظاہر نہ کرنا کفر ہے۔ جو شخص اس کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس کو کافر کہتے ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ جس طرح کفر اسلام کی نگاہ میں بدترین خصلت ہے۔ اس کے بالمقابل شکر سب سے بہتر اور اعلیٰ صفت ہے۔ قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ اسی طرح ایک دوسرے کے بالمقابل بولے گئے ہیں۔



(ہم نے انسان کو راستہ بتا دیا۔ اب وہ  
یا شکر گزار ہے یا ناشکر!)

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا  
شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا

(سورہ دہر)

دوسری جگہ فرمایا:-

لَمَّا شَكَرْنَاكَ لَزِدْنَاكَ  
وَلَمَّا كَفَرْنَا لَنَعَذِّبَنَّكَ  
شَدِيدًا (سورہ ابراہیم-۲) میرا عذاب بہت سخت ہے

قرآن حکیم میں شکر و کفر کا یہ تقابل اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ کفر  
اللہ تعالیٰ کی لاتعداد نعمتوں کی ناقدری اور ناشکری کا نام ہے تو شکر کی حقیقت اس  
کے مقابلے میں یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اس کے  
احکام کی اطاعت اور دل سے فرماں برداری کی جائے۔

ایام غزالی فرماتے ہیں کہ شکر کے تین درجے ہیں جن کا  
دار و مدار نیت پر ہے۔ وہ مراتب یہ ہیں ۱۔ احسان

خداوندی پر اس کا شکر یاد کرنا ۲۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اس بات کی دلیل قرار دینا  
کہ اس کی محجہ پر نظر کرم ہے اور اس بات پر خدا کا شکر ادا کرنا کہ اب وہ مزید فضل کرے گا۔  
۳۔ اس بات پر شکر گزار ہونا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت نے میرے دل میں یاد الہی کو اور  
تازہ کر دیا ہے۔ میرا دل اس کی طرف اور مائل ہو گیا ہے۔ اس نعمت سے فائدہ اٹھا کر  
مجھے اللہ تعالیٰ کا مزید قرب حاصل ہوگا۔ (احیاء علوم الدین)

اگر انسان آنکھیں کھول کر دیکھے تو اسے  
شکر کی فضیلت و اہمیت معلوم ہوگا کہ اس کا برگ و ریشہ منعم

حقیقی کے ان گنت احسانات کے نیچے دبا ہوا ہے۔ احسانات کی حد یہ ہے کہ بقول شیخ  
سعدی علیہ الرحمۃ انسان ایک دفعہ سانس لیتا ہے تو اس سے دو شکر واجب ہو جاتے  
ہیں۔ ایک اس بات کا شکر کہ تازہ ہوا جسم میں داخل ہوئی اور دوسرا اس احسان کا شکر



کہ غلیظ ہوا جسم سے خارج ہوئی۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے وہ جسم میں بند ہو جاتی تو انسان کا جینا محال ہو جاتا۔ قرآن کریم میں اسی مضمون کو یوں ادا فرمایا :-

وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا - (ابراہیم - ۳۴) (اگر تم خدا کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکو گے)

اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے شکر ادا کرنے کا بار بار تقاضا اس لئے کیا ہے کہ ہم یہ سمجھنے لگیں کہ خدا کے فضل و کرم کے سوا ہم خود بھی ان نعمتوں کے مستحق ہیں۔ حالانکہ ان کے لئے نہ کوئی ہمارا خاندانی استحقاق تھا نہ علمی اور عملی استحقاق۔ جو کچھ ملا اس کے فضل و کرم سے ملا اور جو کچھ ملے گا اسی کی عطا اور بخشش ہوگی۔ انسان ان گنت احساناتِ خداوندی کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ مجھ پر اللہ کا احسان نہیں بلکہ یہ فطرت کی عام بخشش ہے۔ جس کے شکر یہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ یاد رکھئے کہ یہی وہ بیج ہے جس سے کفر و الحاد کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں اپنی ایک ایک عنایت کو گنوا یا ہے۔ اور اس پر شکر ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔

دولت و نعمت پانے کے بعد انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ عام انسانوں سے بلند تر ہے اور اس کو جو کچھ ملا ہے وہ اس کا خاندانی حق تھا یا اس کے ذاتی علم و ہنر کا نتیجہ تھا۔ جیسا کہ قارون نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا۔ یہی غرور ہے جو ترقی کر کے بخل اور ظلم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ خدا نے انسانوں پر جو نعمتیں اتاری ہیں اور اپنی لگاتار بخششوں سے ان کو نوازا ہے اس سے یہی مقصود ہے کہ وہ اپنے اس محسن کی قدر پہچانیں اور اس کے مرتبہ کو جانیں۔ اس کے حق کو مانیں اور اس کی نعمت و بخشش کا شکر جان و مال سے ادا کریں فرمایا :-

"وَذَقُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ" (سورہ انفال - ۳) روزی دی تاکہ تم شکر کرو۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان میں فرمایا۔  
شَاكِرًا لِّمَا آتَاهُ اجْتَبَاهُ (ابراہیم اللہ کے احسانوں اور نعمتوں کا



وَهَذَا إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (سورہ نحل - ۶)

شکر گزار تھا۔ اللہ نے اس کو سچن لیا اور اس کو سیدھی راہ دکھائی۔

اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس بناء پر مدح فرمائی کہ آپ خداوند کی نعمات کے شاکر تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شکر ایمان کی جزو دین کی اصل اور اطاعت الہی کی بنیاد ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے۔ جس کی بناء پر بندے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت کے قولی و عملی اظہار کا داعیہ ابھرتا ہے۔ اس کا نام شکر ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا۔

اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ تو خدا تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اور اللہ تو قدر پہچانتے والا اور علم رکھنے والا ہے۔ (سورہ نساء - ۲۰)

آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے صرف دو باتیں چاہتا ہے۔ شکر اور ایمان۔ ایمان کی حقیقت معلوم ہے۔ اب رہا شکر تو شریعت میں جو کچھ ہے وہ شکر کے دائرہ میں داخل ہے۔ تمام عبادتیں شکر ہیں۔ بندوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ کی حقیقت بھی شکر ہی ہے۔ دولت مند اگر اپنی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں دیتا ہے تو یہ دولت کا شکر ہے۔ صاحب علم اپنے علم سے بندگان الہی کو فائدہ پہنچاتا ہے تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے۔ الغرض شریعت کی اکثر باتیں صرف شکر کی تفصیل ہیں۔ اسی لئے شیطان نے جب خدا سے یہ کہنا چاہا کہ تیرے اکثر بندے تیرے حکموں کے نافرمان ہوں گے تو یہ کہا۔

”وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ“ (سورہ اعراف - ۱۲)

اور تو ان میں سے اکثر کو شکر کرنے والا نہ پائے گا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کی جزا کا ذکر کرتے ہوئے اسی

لفظ سے یاد فرمایا۔

(اور ہم شکر کرنے والوں کو جزا دیں گے)

”وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ“ (آل عمران - ۱۵)



اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں شریعت کی اطاعت کا حکم دیتا ہے۔  
 "بَلِ اللّٰهُ فَاَعْبُدْ وَكُنْ مِنَ الشَّاكِرِيْنَ" (سورہ زمر - ۷) شکر گزاروں میں سے ہو۔  
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ شکر خداوندی کا زندہ پیکر تھی آپ ہمہ وقت ذکر و شکر میں مشغول رہتے۔ راتوں کو اٹھ کر اتنی دیر عبادت میں مصروف رہتے کہ پاؤں مبارک سوج جاتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک رات حضورؐ کی یہ حالت دیکھ کر میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! آپ کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے۔ پھر آپ اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں؟ حضورؐ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا۔

"أَفَلَا أَكُونُ عَبْدًا شَكُورًا"

دیکھا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ ہوں!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شکر خداوندی بجالانے کے لئے کثرت سے دعائیں پڑھا کرتے تھے۔ مثلاً "کھانا کھانے کی، نئے کپڑے پہننے کی، سونے کی، سو کر جاگنے کی، نئے پھل کھانے کی، مسجد میں جانے کی، بہارت خانہ سے نکلنے وغیرہ وغیرہ۔ ان دعاؤں کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر یہ ادا کیا جائے۔ مگر شرط یہ ہے کہ زبان کا یہ شکر یہ دل کا ترجمان اور قلبی کیفیت کا بیان ہونا چاہئے۔

شکر کی دو قسمیں ہیں :-

**اقسام شکر**

۱۔ بندوں کا شکر ۲۔ اللہ تعالیٰ کا شکر۔

۱۔ دنیوی زندگی میں انسان مختلف حاجات و ضروریات سے دوچار ہوتا ہے۔ ساری ضروریات کو از خود پورا کرنا مشکل ہے۔ بدیں و جہ اسے دوسروں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ جو شخص اس آڑے وقت میں اس کے کام آئے گا اور اس کی ضروریات کا کفیل ہوگا۔ وہ اس کا بحسن بجاڑی ہوگا۔ جس طرح حقیقی رالہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح مصیبت کے وقت تعاون کرنا



انسان کے احسان کا اعتراف اور اس کا صلہ بھی ایک لازمی امر ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔

"مَنْ لَا يَشْكُرُ النَّاسَ لَا يَشْكُرُ اللَّهَ" (ترمذی شریف)  
(جو لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا۔ وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا)

۲۔ اللہ کا شکر تین طریقہ سے ادا کیا جاتا ہے ۱۔ دل سے ۲۔ زبان سے ۳۔ عمل سے قلبی شکر :- قلبی شکر یہ ہے کہ دل میں انعاماتِ خداوندی کا احساس و اعتراف پیدا ہو۔ یہ بات اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی۔ جب تک یہ حقیقت انسان کے دل کی گہرائی میں اتر جائے کہ اس کا سناتا، برہمنی کا خالق و مالک وہ پروردگارِ حقیقی ہے جس نے انسان کو تمام ظاہری و باطنی انعامات سے نوازا۔ سب حاجات و ضروریات کو اس کے لئے مہیا کیا۔ اس کی خدمت کے لئے ہزار ہا مخلوقات کو جنم دیا۔ انسان کی جسمانی و روحانی تربیت کے لوازمات مہیا کئے۔ جب یہ صداقت انسان کے قلب و ذہن پر چھا جاتی ہے تو اس کا دل ہمدن شکر بن جاتا ہے اور اس کا ہر رگ و ریشہ احسانِ خداوندی کا اعتراف کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔

"اور اللہ تعالیٰ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حالت میں پیدا کیا کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے اور اس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنا کے تاکہ تم شکر کرو۔"

اس آیت سے قلبی شکر کی صحیح صورت نمایاں ہوتی ہے۔

قول شکر :- زبان سے جو شکر ادا کیا جاتا ہے۔ اسے قول شکر کہتے ہیں۔ محسن کا قول شکر بھی ضروری ہے اور وہ یوں کہ زبان سے اس کے احسان کا اقرار کیا جائے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"أَمْثَابِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" (اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر کرو۔  
زبان سے شکر خدا ادا کرنے کا نام قرآن کی اصطلاح میں "حمد" ہے۔ حمد کی



تاکید سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ جس طرح سارے قرآن کا خلاصہ سورہ فاتحہ ہے۔ سورہ فاتحہ کا پچوڑ خدا کی حمد ہے۔ حمد کا ترانہ موجودہ دنیا کے ایک ایک ذرہ سے آج بھی بلند قرآن میں فرمایا۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَوَاتِ  
وَالْأَرْضِ (سورہ روم-۱۲) میں ہے)۔  
اس سے بڑھ کر قرآن میں ارشاد ہوا کہ کائنات ارضی کی ہر چیز اس کی حمد میں لگی ہوئی ہے۔

وَأَنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ (الاسراع-۲۲) تسبیح نہ کرتی ہو)

اور کوئی چیز نہیں جو خدا کی حمد کی عمل شکر: عمل شکر کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی زبان کے علاوہ دوسرے جسمانی اعضاء کو اطاعت خداوندی میں استعمال کرے۔ عمل شکر کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ خدا کی عطا کردہ نعمتوں کو صحیح اسلامی طریقے پر استعمال کرنا اور انہیں ضائع نہ ہونے دینا یہ بھی عمل شکر ہے۔ مثلاً جسم و جان کی حفاظت، لباس کا خیال رکھنا۔ اہل و عیال کی مناسب دیکھ بھال اور اچھی تربیت یہ سب خدا تعالیٰ کا عمل شکر ہے۔ جسمانی اعزاز سے خدمت خلق کا کام لینا، خدا اور دولت کو نیک مصارف میں خرچ کرنا بہتر عمل شکر ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز اللہ فرمائے گا: "اے آدم کے بیٹے! میں بیمار پڑا تو نے میری بیماری پر سی نہ بندہ کہے گا۔ اے میرے پروردگار تو سارے جہان کا رب ہے۔ میں تیری بیماری پر سی کیے کرتا۔ فرمائے گا: کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہے۔ تو نے اس کی پرستش نہ کی اور اگر کرتا تو مجھ کو اس کے پاس پاتا۔ پھر خدا فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے! میں نے تم سے کھانا مانگا۔ تو نے مجھے نہیں کھلایا۔ بندہ عرض کرے گا: "اے میرے پروردگار! تو سارے جہان کا پالنے والا ہے۔ میں تجھے کیسے کھلاتا۔ فرمائے گا: تجھے معلوم نہ ہوا



میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے اس کو کھلایا۔ اگر تو اس کو کھلاتا تو اس کا بدلہ آج میرے پاس پاتا۔ اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا۔ تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ بندہ کہے گا۔ اے میرے پروردگار! تو تو سارے عالم کا پروردگار ہے میں تجھے کیسے پانی پلاتا۔ فرمائے گا۔ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا۔ تو نے اس کو پانی نہیں پلایا۔ اگر تو اس کو پلاتا تو آج وہ پانی میرے پاس پاتا۔ (صحیح مسلم

باب فضل عیادۃ المریض)

راے داؤد کے گھر والو شکر ادا کرنے کے لئے نیک عمل کرو (سورہ سبأ - ۱۲)

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ شکر کا اثر صرف زبان تک محدود نہ ہو۔ بلکہ عمل سے بھی ظاہر ہونا چاہئے۔

شکر کے باب میں ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے زبان سے الحمد للہ پڑھ

دیا تو مالک کا شکر ادا ہو گیا۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ شکر دراصل دل کے اس لطیف احساس کا نام ہے جس کے سبب سے ہم اپنے محسن سے محبت رکھتے ہیں۔ ہر موقع پر اس کے احسان کا اعتراف کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس کو خوش رکھ سکیں اور اس کے احکام پر عمل کرتے رہیں۔ اگر ہم صرف زبان سے شکر کا لفظ ادا کریں۔ لیکن دل میں احسان مندی اور منت پذیریری کا کوئی اثر نہ ہو اور اس اثر کے مطابق ہمارا عمل نہ ہو تو ہم اس محسن کی احسان مندی کے اظہار میں جھوٹے ہیں اور وہ شکر خدا کی بارگاہ میں قبول نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کے دل میں ایک شکر ہی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو رین و دنیا میں بھلائی کے لئے اس کو کسی اور تنبیہ کی ضرورت نہ ہو۔ وہ خدا کی نعمتوں کی قدر جان کر اس کو مانے گا۔ اس کے حکموں پر چلے گا اور اس کے بندوں کے احسانات کے جواب میں بھی ان کے ساتھ نیک اور خیر خواہی کرے گا۔



## سوالات

- ۱۔ شکر کسے کہتے ہیں۔ اسلامی زاویہ نگاہ سے شکر کی حقیقت بیان کیجئے۔
- ۲۔ شکر کی اقسام قلمبند کیجئے۔
- ۳۔ اسلام میں شکر کو کیا اہمیت حاصل ہے۔ تفصیلاً بیان کیجئے۔
- ۴۔ بندوں کا شکر ادا کرنے کے کیا معنی ہیں۔ کتاب و سنت کے دلائل سے واضح کیجئے۔



## صبر

لفظ صبر لغت میں ان معان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

صبر کا لغوی مفہوم

۱۔ جرات و شجاعت و مردانگی ۲۔ روکنا۔ مریخی کو چارے کے بغیر رکھنا ۳۔ مصائب میں بیقراری کا اظہار نہ کرنا ۴۔ پسندیدہ اشیاء سے کنارہ کش رہنا ۵۔ باندھ دینا قید کرنا (المنجد)

قرآن زبان میں صبر کا مفہوم نفسِ انسانی کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا ہے۔ صبر کا تانا بانا استقامتِ طبع، جو اعزدی اور استقلال سے بنتا ہے۔ اس وصف کو قائم رکھنا اور اس کا صحیح استعمال ہی صبر ہے۔ صبر ان اخلاقی فاضلہ میں سے ہے جس کی ہر حالت میں ضرورت ہے یعنی دشواری میں بھی اور آسانی میں بھی۔ تو نگری میں بھی اور جاہ و شوکت میں بھی۔ اس حقیقت کے پیش نظر حالات و مواقع کے لحاظ سے اس کے مفہوم میں جزوی سافرق پڑ جاتا ہے لیکن بنیادی عنصر استقامتِ طبع ہر جگہ موجود ہے۔

صبرِ دل کی کمزوری بے بسی کی خاموشی اور بے کسی کی حالت میں مجبور ہو کر درگزر سے کام لینے کا نام نہیں بلکہ دل کی انتہائی قوت، ہمت کی بندی، عزم و استقامت اور مشغلات و مصائب کو خدا کے بھروسہ پر خاطر میں نہ لانے کا نام ہے۔ حضرت موسیٰ<sup>۳</sup> اور خضر<sup>۲</sup> کے قصہ میں ایک ہی آیت میں تین جگہ یہ لفظ آیا ہے اور ہر جگہ یہی معنی مراد ہیں۔ حضرت خضر<sup>۲</sup> کہتے ہیں :-

"إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا" تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے اور



اس بات پر کیسے صبر کر سکتے ہو جس  
کا تمہیں علم ہی نہیں۔

وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ  
تَحِطْ بِهِ خُبْرًا (سورہ کہف)

حضرت موسیٰ جراب میں فرماتے ہیں:

سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا

راگر خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر

پائیں گے۔

(کہف)

حضرت موسیٰ نے اپنے آپ کو جو صابر کہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب عجیبے

غریب قسم کے واقعات معرض وجود میں آئیں گے تو میں اس پر اضطراب اور بے چینی  
کا اظہار نہیں کروں گا۔

قرآن کریم میں لفظ صبر عزم کی پختگی اور  
استقامت طبع کے معنی میں استعمال ہوا

قرآن کریم اور لفظ صبر

ہے۔ مگر حالات کے تغیر سے اس کے مفہوم میں کہیں کہیں ذرا ذرا فرق آ گیا ہے۔ سید  
سیمان ندوی مرحوم نے سیرت النبی جلد پنجم میں اسے تفصیلاً بیان کیا ہے۔ ذیل میں اس  
کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم میں لفظ صبر ان معانی میں استعمال کیا گیا ہے۔

۱۔ مناسب وقت کا انتظار کرنا :- جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے

سامنے دعوت اسلام کا آغاز کیا تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپ کی مخالفت میں

سرگرم جولاں ہو گیا۔ ہر طرف سے عداوت اور دشمنی کے مظاہرے ہونے لگے۔ اس

وقت نشلی کا یہ پیام آیا کہ اضطراب و گھبراہٹ کی ضرورت نہیں۔ آپ مستعدی سے

اپنے کام میں لگے رہیں۔ ارشاد ہوا۔ اے رسول! تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ ذَانِكَ (تا بہت قدمی کے ساتھ منتظر رہ کیونکہ

بَاعَيْنَا (سورہ طور ۲) تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے)

۲۔ بے قرار ہونا :- صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ مصائب و آلام میں مضطرب و  
بے چین نہ ہوں بلکہ ان کو خدا کا حکم اور مصلحت سمجھ کر خوشی خوشی برداشت کریں۔



حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں سے یہ چھوٹی خبر سن کر کہ بھیرے نے حضرت

یوسف علیہ السلام کو کھنکھایا فرماتے ہیں یہ توبہ بہتر صبر سے اور خدا سے اس پر

عَلَىٰ مَثَلِ نُصُوفٍ ﴿۱۰۰﴾ (سورہ یوسف) مدد چاہی جاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو

حضرت ایوب علیہ السلام نے جسمانی اور مالی مصیبتوں کو جس کو خندہ پیشانی کے

ساتھ برداشت کیا اسکی مدح خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی۔  
"إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا" (ص-۲۲)

۳۔ مشکلات کو خاطر میں نہ لانا: صبر کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ منزل مقصود

کی راہ میں جو مشکلات اور خطرات پیش آئیں اور مخالفین جو طعن و طنز کریں۔ ان سے

بدول اور پست ہمت ہونے کے بجائے اور زیادہ استقلال پیدا ہو۔ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دعوت و تبلیغ کا حکم ہوا تو ساتھ ہی اس حقیقت سے باخبر

کر دیا گیا تھا "يَا أَيُّهَا الْمَدِينُ قَابِئِدِينَ" (راے چادر پوش اٹھ اور لوگوں کو

وَلِرَبِّدْ فَأَصْبِرْ" (المدثر) ہشمار کر اور اپنے پروردگار کے لئے

اکثر انبیاء علیہم السلام کو مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ چنانچہ آنحضرت کو نبوت

کی اس اعلیٰ مثال کی پیروی کا حکم ہوا۔ "فَأَصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ" (من الرسل الاحقاف-۳۵) کہ جس طرح پختہ ارادہ والے پیغمبروں

۴۔ درگزر کرنا: صبر کا چوتھا مفہوم یہ ہے کہ برائی کرنے والوں کی برائی کو نظر انداز

کر دیا جائے اور جو برائی اسے پیش آئے اس کے قصور کو معاف کیا جائے۔ قرآن پاک



کی کسی آیتوں میں صبر کا لفظ اس مضمون میں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :-

”وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا

بِمِثْلِ مَا عُوِّقَبْتُمْ بِهِ

وَأَمِنْ صَبْرًا شَمَّ فَهُوَ

حَنِيفٌ لِلصَّابِرِينَ (سورہ نحل ۱۶)

(اور اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر

تم کو تکلیف دی گئی اور اگر صبر کرو تو

صبر کرنے والوں کے لئے یہ بہتر ہے)

یہ صبر کی وہ قسم ہے جو اخلاقی حیثیت سے بہت بڑی بہادری ہے۔ مسلمانوں

کو اس بہادری کی تعلیم بار بار دی گئی ہے۔

۵۔ ثابت قدمی :- صبر کا پانچواں اہم مفہوم لڑائی پیش آجانے کی صورت

میں میدان جنگ میں بہادری اور استقامت اور ثابت قدمی ہے۔ قرآن پاک نے

اس لفظ کو اس مفہوم میں بار بار استعمال کیا ہے۔

(اور ثابت قدمی دکھانے والے مصیبت

میں اور نقصان میں اور لڑائی کے وقت

وہی ہیں جو سچ بولتے ہیں اور وہی پرہیزگار

ہیں)

”وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ

وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ

أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا

وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ

(بقرہ - ۲)

اگر لڑائی شروع ہو جائے تو اس میں کامیابی کی چار شرطیں ہیں۔

۱۔ خدا کی یاد ۲۔ حاکم وقت کی اطاعت ۳۔ آپس میں اتحاد ۴۔ میدان جنگ

میں صبر و استقامت۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

”اے ایمان والو! جب تم کسی دشمن سے مقابلہ کرو تو ثابت قدم رہو اور اللہ

کو بہت یاد کرو تاکہ فلاح پاؤ اور خدا اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرو اور

آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تم مست ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر

کرو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“ (انفال - ۶)



حق کے مددگاروں کی ظاہری قلت۔ تعداد کی تلافی، صبر و استقامت کی روحانی قوت سے ہوتی ہے۔ تاریخ کی نظر سے متعدد مشاہدے ایسے گزرے ہیں کہ چند ثابت قدم بہادروں نے کثیر التعداد فوج کو شکست دے دی۔ میدانِ کارزار میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی تعدادی قوت کی پروا نہ کریں اور صبر و ثبات کے ساتھ اپنے سے دو چند دشمن کا مقابلہ کریں اور تسلی دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ان ہی لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو صبر سے کام لیتے ہیں۔

۶۔ ضبطِ نفس :- صبر کا چھٹا مفہوم ضبطِ نفس ہے۔ اشخاص اور قوموں کی زندگی میں سب سے نازک موقع وہ آتا ہے۔ جب وہ کسی بڑی کامیابی یا ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں۔ اس وقت نفس پر قابو رکھنا اور ضبط سے کام لینا مشکل ہوتا ہے مگر یہی ضبطِ نفس کا اصلی موقع ہوتا ہے اور اسی سے اشخاص اور قوموں میں سنجیدگی متانت اور کردار کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا :-

”اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے کسی مہربانی کا مزہ چکھائیں۔ پھر اس سے اس کو دور کریں تو وہ ناامید اور ناشکرا ہو جاتا ہے۔ اور اگر کسی مصیبت کے بعد اس کو نعمت کا مزہ چکھائیں تو کہتا ہے کہ برائیاں مجھ سے دور ہو گئیں۔ بے شک وہ شاداں و نازاں ہے لیکن وہ جہنوں نے صبر (نفس پر قابو) کیا اور اچھے کام کئے۔ یہ لوگ ہیں جن کے لئے معافی اور بڑا انعام ہے۔“ (سورہ ہود - ۳)

۷۔ ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا :- صبر کا ساتواں مفہوم یہ ہے کہ کسی فرض کو عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی کے ساتھ ادا کیا جائے۔ اسی لئے مذہبی فرائض کو جو بہر حال نفس پر شاق گذرتے ہیں۔ عمر بھر پختہ غم کے ساتھ ادا کرنے رہنا بھی صبر ہے۔ قرآن میں فرمایا :-

”وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ  
وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا“  
اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کر اور  
آپ اس پر قائم رہو

(طہ - ۱۳)



## صبر کی فضیلت

قرآن کریم میں صبر کی فضیلت پر روشنی ڈالتے ہوئے

”انہما یوفی الصابرون اجرہم“ صبر کرنے والوں کو ان کی مزدوری حساب میں حساب ملے گی۔ (سورہ زمر - ۱۲)

یہ امر پیش نظر رہے کہ صبر کا موقع ہمیشہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان پر تازہ تازہ مصیبت وارد ہو۔ رو دھو کر اور جزع جزع کا اظہار کرنے کے بعد یہ کہہ دینا کہ ہم صبر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کچھ قیمت نہیں رکھتا۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ایک عورت کے پاس سے ہوا جس کا لڑکا مر گیا تھا اور وہ جزع جزع میں مصروف تھی۔ آپ نے اسے صبر کی تلقین کی وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پہچانتی نہ تھی۔ کہنے لگی۔ اگر تمہارا لڑکا مر جاتا تب میں دیکھتی تم کس طرح صبر کرتے۔ آپ خاموشی سے واپس چلے آئے۔ بعد میں کسی نے بتایا کہ یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اس پر وہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی۔ میں نے صبر کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”صبر وہ ہے جو صدمہ کی ابتداء میں کیا جائے۔“ (بخاری)

صبر کا شمار بڑی بڑی نیکیوں میں ہوتا ہے۔ اس نے انسان کی پھیل غلطیاں حریف غلط کی طرح مٹ جاتی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

”جنت اور خدا کی خوشنودی ان کو حاصل ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ اے پروردگار ہم ایمان لائے۔ ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا اور صبر کرنے والے اور سچ بولنے والے اور بندگی میں لگے رہنے والے اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے اور پھیل راتوں کو خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے والے۔“

(آل عمران)

دعا اور صبر سے مشکلات کا ازالہ ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا۔

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ (البقرہ)

صبر اور دعا سے مدد حاصل کرو۔ ان



یہودیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول نہیں کرتے تھے۔ اس کے دو سبب تھے  
 ۱۔ ایک یہ کہ ان کے دلوں میں گداز و تاثر نہیں رہا تھا۔ ۲۔ دوسرے یہ کہ پیغام حق قبول  
 کرنے کے ساتھ ان کو جان و مال و شوازیں پیش آئیں۔ یہ عیش و عشرت و ناز و نعمت  
 کے خوگر ہو کر ان کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
 وسلم کی طبیعت روحانی نے ان بیمار لوگوں کے لئے نماز اور صبر کا نسخہ تجویز کیا۔ دعا سے  
 ان کے دل میں اثر اور طبیعت میں رقت پیدا ہوگی اور صبر کی عادت سے قبول حق کی  
 راہ میں مشکلات دور ہوں گی۔

ہجرت مدینہ کے بعد جب کفار قریش مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور  
 مسلمانوں کے ایمان و اخلاص کی آزمائش کا وقت آیا تو یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ ارشاد  
 ہوتا ہے :-

”اے ایمان والو! صبر و ثبات قدمی اور دعا سے طاقت حاصل کرو۔ بیشک  
 اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور جو خدا کی راہ میں مارے گئے۔ ان کو مردہ نہ کہو  
 بلکہ زندہ ہیں لیکن تم کو خبر نہیں اور ہم تم کو کسی قدر خطرہ اور بھوک اور مال و جان اور  
 پیداوار کے کچھ نقصان سے آزماتے ہیں گے اور صبر والوں کو خوشخبری سنادو کہ جب کوئی  
 مصیبت پیش آئے تو کہیں کہ ہم اللہ کے ہیں اور ہم کو اللہ ہی کے پاس لوٹ جانا ہے  
 (سورہ بقرہ - ۱۹)

ان آیات سے واضح ہوا کہ جان و مال کی جو مصیبت پیش آئے۔ اس کو صبر و تحمل  
 اور ثبات قدمی سے برداشت کریں اور یہ سمجھیں کہ ہم خدا کے مخلوم ہیں۔ آخر اس کی  
 طرف لوٹ کر جانا ہے۔

امام غزالی کی تصدیقات کے مطابق صبر کا لفظ قرآن کریم کے ستر سے زائد مقامات  
 پر وارد ہوا ہے۔ ان کی رائے میں اکثر اعمال صالحہ کا مصدر و منبع صبر ہے اور  
 اس کے ثمرات و نتائج ہیں۔ فضیلت صبر کی اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ روزہ کے بارے  
 متعلق جو سراسر صبر ہی صبر ہے۔ حدیث قدسی میں وارد ہوتا ہے۔



"نَصْرُمُ لِيْ وَ اَنَا اَجْرِيْ بِهٖ"  
 (صحیح بخاری)

روزہ صرف میرے لئے ہے اور میں  
 ہی اس کی جزا دوں گا

روزہ واحد عبادت ہے جس کو خداوند کریم نے اپنی ذات کی جانب منسوب فرمایا۔  
 صبر کرنے والوں کی فضیلت میں فرمایا۔

"وَ اَصْبِرْ وَاِتَّقِ اللّٰهَ"  
 (اور صبر کرو کیوں کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے  
 والوں کے ساتھ ہے)

صبر کے بارے میں احادیث و آثار

۱۔ حدیث قدسی میں ارشاد  
 ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ  
 میرے اس مومن بندے کی جزا جنت کے سوا اور کہا ہے جس کا پیارا میں نے دنیا سے اٹھایا  
 اور اس نے ثواب کی امید پر صبر کیا۔ (بخاری)

۲۔ مومن پر جتنی بڑی مصیبت نازل ہوگی اتنا ہی اسے بدلہ دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ  
 جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اس کو آزمائش اور مصیبت میں ڈالتا ہے۔ اب جو  
 شخص اس آزمائش میں خدا کی مرضی پر راضی رہتا ہے۔ خدا کی خوشنودی حاصل کر لیتا ہے۔  
 اور جو گھبرا کر دکھ درد کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ اللہ بھی اس پر ناراض ہو جاتا ہے۔ (ترمذی)

۳۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے خط بنام حضرت ابو موسیٰ اشعری میں تحریر  
 فرمایا :-

"صبر پر کار بند رہیے اور خوب جان لیجیے کہ صبر دو قسم کا ہوتا ہے۔ صبر کی ایک قسم  
 دوسری سے افضل ہوتی ہے۔ الم ورنج کے موقع پر صبر کرنا اچھا ہے مگر اس سے بھی  
 بہتر یہ ہے کہ محرمات و منہیات سے اپنے آپ کو روکا جائے"

۴۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"اگر صبر نہ کیا جائے تو فقر و فاقہ اور بیماری عذاب ہیں اور اگر صبر کیا جائے تو یہ خدا  
 کی جانب سے انعام و اکرام ہیں"

۵۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :



"ایمان کی عمارت چار ستونوں پر کھڑی ہے۔ یقین، عدل، جہاد، عدل"  
 حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دوسرا قول ہے :-

"صبر کو یہ ان سے وہی نسبت ہے جو سر کو جسم سے۔ جس طرح سر کے بغیر جسم کا وجود  
 ممکن نہیں اسی طرح صبر کے بغیر ایمان کا وجود بھی محال ہے۔ رہے آثار کا محض  
 احوال للغزالی

۴۔ حضرت جناب ایک غلام تھے۔ بز شروع ہی سے اسلام لے آئے تھے۔ اس  
 جرم کی پاداش میں ان کے آقا اور دیگر قریش مکہ ان پر سخت مظالم ڈھاتے تھے۔  
 ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کی دیوار کے نیچے تشریف فرما تھے کہ انہوں  
 نے آکر قریش کے جو رسوم کی شکایت کی اور عرض کیا :- "یا رسول اللہ! آپ ہمارے  
 لئے نصرت کی دعا کیوں نہیں فرماتے تاکہ ہم بھی امن و سکون کی زندگی بسر کر سکیں"۔ آنحضرت  
 نے انہیں صبر کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا :-

"سنو! تم سے پہلی امتوں کا یہ حال تھا کہ مومن شخص کو پکڑ لیتے اور گڑھا کھود  
 اور اس میں گاڑ کر مرنے پر آمادہ رکھ دیتے اور اسے دو ٹکڑے کر دیتے۔ لوہے کی کنگھی  
 اس طرح چلائی جاتی کہ گوشت اور ہڈی کو کاٹتی چل جاتی مگر یہ تکلیف بھی اسے دین  
 حلیف سے نہ لوٹا سکتی"۔ (بخاری)

صبر لا تعدا و فوائد کا مرجب ہے مثلاً ۱۔ قرآن میں  
**صبر کے ثمرات** مندرجہ :-

"إِنَّمَا يُوفَى الصَّابِرُونَ  
 أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ" (الزمر: ۴۱) (بشمار ملتا ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ صبر کا اجر سب اعمال سے زیادہ ہے۔ آنحضرت کا ارشاد  
 ہے کہ اللہ صبر کرنے والے شخص کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے۔ اسے مصیبت میں ڈال کر آزما  
 ہے۔ (ترمذی)

۱۔ مثلاً "میں کو صبر کرنا اور اللہ تعالیٰ کی نصرت کا منتظر رہنا بہت بڑی



عبادت ہے۔

۳۔ صبر کامیابی کی ضمانت ہے جو آدمی صبر و ثبات سے مصائب و آلام کا مقابلہ

کرتا ہے۔ آخر کار کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔

۴۔ صبر گناہوں کی مغفرت کا موجب ہے۔ حدیث قدسی سے کہ جب میں اپنے

مومن بندے کی کسی چیز کو چھین لیتا ہوں اور وہ اس پر صبر کرتا ہے تو میں اسے جنت

عطا کرتا ہوں۔ (ریاض الصالحین)

۵۔ صبر طریق انبیاء ہے۔ حضرت ابوبکر کو صبر کی وجہ سے صابر کا لقب ملا۔

۶۔ نامرادمی و ناکامی سے بچنے کی قرآن حکیم کی تعلیمات کے پیش نظر چار صورتیں

ہیں ۱۔ ایمان ۲۔ عمل صالح ۳۔ نیکی کی تبلیغ ۴۔ صبر کی تلقین

۵۔ صبر تقرب خداوندی کا ذریعہ ہے۔

۸۔ فقر و فاقہ پر صبر کرنا دخول جنت کا موجب ہے۔ سالارِ رسل صل اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا۔ تنگدست ہماجرین دولت مند ہماجرین سے پانچ سو برس قبل جنت

میں داخل ہوں گے۔ (ترمذی)

## سوالات

۱۔ قرآن کریم میں صبر کا لفظ کن معانی میں استعمال کیا گیا ہے۔

۲۔ صابرین کی ندرج میں کم از کم دو آیات قرآنی لکھیے۔

۳۔ صبر کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ صبر کے متعلق عام تصور کس حد تک درست ہے

۴۔ احادیث و آثار سے صبر کی تفصیلات بیان کیجئے۔



باب ۱۱

عفو

معنی و مفہوم

عفو عربی زبان میں عفا یعفو کا مصدر ہے۔ یہ لفظ متعدد معانی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

گناہ سے درگزر کرنا اور سزا نہ دینا۔ اپنا حق وصول نہ کرنا اور اس سے دست بردار ہو جانا۔ (القاموس)

عفو کی تاکید

قرآن کریم میں یہ لفظ مغفرت کے معنی میں آیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے کے گناہ پر پردہ ڈال دینا۔ اسے مٹا دینا اور بخش دینا۔

عفو و درگزر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو دنیا ایک لمحہ کے لئے بھی آباد نہ رہے اور دم کے دم میں یہ گناہوں سے بھری ہوئی کائنات کی بستی سونی پڑ جائے۔ وہ چاہے توانسوں کے گناہوں کے سبب سے ان کو ایک دم ہلاک کرنے۔ قرآن میں فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (سورہ شوریٰ) اعمال کی وجہ سے تباہ کروے اور (بہتوں کو معاف کروے)

اسلامی تعلیمات میں عفو کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور بڑے پُر زور الفاظ میں اس کی تاکید کی گئی ہے۔ عفو صفت خداوندی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی رح سیرت النبی جلد ششم میں رقم فرماتے ہیں: قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے درجہ اپنے کو غافر (بخشنے والا) پانچ دفع



عَفْوًا رُبِّي بِخَيْشِ وَاللَّهِ اِطْمَاحٌ مَرْتَبَةً عَفْوًا (معاف کرنے والا) اور ستر سے زیادہ  
 آیتوں میں عَفْوًا رُبِّي خَشِنَةً وَاللَّهِ کہا ہے۔ جس سے اندازہ لگا جا سکتا ہے کہ اس  
 کے عفو و درگزر کا سمندر کس زور و شور سے جوش مار رہا ہے۔ خدا نے اپنی ساری  
 صفتوں میں سے اپنی اسی صفت کی تجلی کا پرتو اپنے بندوں میں پیدا کرنے کی دعوت  
 دی ہے۔ فرمایا ہے:-

” اَوْ تَعْفُو عَنْ سُوءِ فَإِنَّ اللَّهَ  
 كَانَ عَفْوًا قَدِيرًا “  
 (سورہ نساء - ۲۱)

اس آیت میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عفو و درگزر اس ناتراں  
 اور بے بس انسان کا عفو نہیں ہے جو مخالفت پر قدرت نہ پا کر مجبوراً معاف کرنے  
 پر اتر آتا ہے۔ ایک کمزور اور نہتاً انسان اپنے سے زیادہ طاقت ور اور مسلح  
 شخص کو معاف نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کا عفو  
 اس ہستی کا عفو ہے کہ اس کی قدرتِ کاملہ کے سامنے تمام مخلوقاتِ ارضی و سماوی  
 کی قدرتِ یسوع ہے۔ وہ اس لئے معاف نہیں کرتا کہ وہ بے بس ہے۔ اور مجرم اس  
 کی شدید گرفت سے باہر ہے بلکہ اس لئے اور صرف اس لئے کہ عفو و درگزر اس  
 کے عظیم اوصاف میں سے ایک ہے۔ سورہ نور میں ارشاد فرمایا ہے:-

” وَ لِيَعْفُو وَيُصْفَحُوا إِلَّا تَجِبُوهَا  
 أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ  
 عَفْوٌ رَحِيمٌ “ (سورہ نور - ۳)

اور چاہئے کہ وہ معاف کر دیں اور  
 درگزر کریں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ  
 خدا تم کو معاف کر دے اور اللہ معاف  
 کرنے والا مہربان ہے)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو عفو و درگزر کی تعلیم اس ترغیب کے  
 ساتھ دی ہے کہ تم دوسروں کو معاف کرو تو خدا تم کو معاف کرے گا اور جب اللہ  
 عفو و رحیم ہے تو تم پر بھی اس کے ابر کرم کی چھینٹیں پڑنی چاہئیں۔



غصہ کی حالت میں معاف کرنا مقابلتاً زیادہ دشوار ہے۔ انسان اس حالت میں اپنے جذبات سے مغلوب ہوتا ہے۔ معاف کرنے کے لئے آسانی سے تیار نہیں ہونا اس حالت کے متعلق فرمایا ہے۔

"وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ" (سورہ شوریٰ) کرتے ہیں) اور جب غصہ آئے تو وہ معاف

مذکورہ صدر آیت سے واضح ہوا کہ غصہ کی حالت میں عفو و درگزر سے کام لینا ایمانِ کامل کی علامت ہے۔

دینِ حق کی تبلیغ و اشاعت کے موقع پر اعدا و دینِ طرح طرح کی مشکلات پیدا کرتے اور اس کا رخیر کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ تبلیغ طبعاً اس سے دل برداشتہ ہو جاتا ہے اور اس سے انتقام لینے کے لئے ہمہ تن مستعد ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر وہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو تبلیغ و دعوت کا کام بند کر دیا جائے یا دعوتِ اسلام کے سلسلہ میں ان ناگوار یوں کو برداشت کیا جائے۔ اسلام اس نازک مرحلہ پر بھی انتقامی کارروائی کے بجائے عفو و درگزر کی تلقین کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"إِذْ نَجَّى بِاللَّيْلِ هِيَ أَحْسَنُ الشَّيْءِ" ربدی کا دفاع ایسے طریقے سے کیجئے جو  
مَنْ أَعْلَمَ بِمَا يَصِفُونَ " بہت ہی اچھا ہو۔ جو کچھ تمہاری نسبت  
(سورہ مؤمنون - ۶) کہا کرتے ہیں وہ ہم کو خوب معلوم ہے)

غم و غصہ کے اظہار کا اصل وقت تب آتا ہے جب انسان کی عزت و آبرو پر حملہ کیا جائے۔ اس حالت میں بھی اسلام نے عفو و درگزر سے کام لینے کا حکم دیا ہے چنانچہ حضرت مسطح رضی اللہ عنہما حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما کے خالہ زاد بھائی تھے اور وہ ان کی کفالت کرتے تھے لیکن جب انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تہمت میں حصہ لیا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان کی مالی امداد بند کر دی۔ اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی اور تم میں سے جو لوگ عروت پیشہ اور دولت مند ہیں۔ رشتہ داروں اور محتاجوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (خرچ) نہ دینے کی قسمیں نہ کھا پیئیں



بلکہ چاہئے کہ ان کو معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ مسلمانوں! کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کر دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔" (سورہ نور ۲) یہ آیت سننے ہی حضرت ابو بکر رضی نے بیساختہ کہا۔ "ہاں میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت کرے۔ اس کے بعد انہوں نے پھر مالی امداد شروع کر دی (سیرت النبیؐ جلد ششم)

بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں عفو کی تلقین

## عفو کے متعلق ارشادات نبویؐ

فرمائی۔ مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ ہوں۔

۱۔ وَمَا ذَاكَ اللَّهُ رَجُلًا بَعْفِي الْأَعِزُّ (بخاری) کی عزت میں اضافہ کرتا ہے

۲۔ آپ نے فرمایا۔ پہلوان وہ نہیں جو سب کو پھپھاڑ دے۔ اصلی طاقت وہ شخص ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔ (صحیح مسلم)

۳۔ ایک دفعہ ایک اعرابی نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں آکر عرض کی، یا رسول اللہ! مجھے وہ بات بتائیے جس کے کرنے سے مجھے جنت مل جائے حضور نے اسے چند باتیں بتائیں۔ منجملہ ان کے فرمایا۔ "ظالم رشتہ دار پر اپنی عنایت کی بارش کرو۔" (حاکم)

۴۔ ایک مرتبہ آپ نے صحابہؓ سے فرمایا۔ "بیکسی یہ نہیں کہ صلہ رحمی کرنے والوں کے ساتھ صلہ رحمی کرو بلکہ یہ ہے کہ جو سلوک کرے اس کے ساتھ بھی مروت اور حسن سلوک کا برتاؤ کرو۔" (ترمذی ابواب البر والصلۃ)

۵۔ آپ نے فرمایا۔ ایک دوسرے کو معاف کرو۔ تمہارے باہمی کینے رفع ہو جائے (کنز العمال جلد دوم)

۶۔ ابو سعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنے ایک غلام کو مار رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔ "جان لو۔ جان لو۔" مڑ کر دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم



فرما رہے تھے کہ ابو مسعود! جتنا قاتل تو تم کو اس غلام پر ہے۔ اس سے زیادہ خدا کو تم پر ہے۔ ابو مسعود کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں نے پھر کسی غلام کو نہیں مارا۔ (ترمذی شریف)

ایک شخص نے سرور کائنات سے آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ میں اپنے خادم کا قصور کتنی مرتبہ معاف کروں۔ آپ پہلے تھوڑی دیر چپ رہے۔ اس نے پھر پوچھا۔ تب آپ نے فرمایا۔ "ہر روز ستر مرتبہ"

اسلام میں عفو و درگزر کا حکم صرف غیر مسلموں سے عفو و درگزر

کفار و مشرکین کو بھی معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

قُلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُ وَالَّذِينَ لَا يَنْجُونَ آيَاتُ اللَّهِ لِيَجْزِيَ قَنْ مَا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝

مَنْ عَمِلْ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ثُمَّ الْحَا رَبُّكُمْ تَنْجُونَ ۝

(سورہ جاثیہ - ۱۲)

اس آیت کے شان نزول میں لکھا ہے کہ کسی کافر یا منافق نے کسی مسلمان سے کوئی بد تمیزی کی بات کہی تھی۔ اس پر بعض مسلمانوں کو طیش آیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری اور مسلمانوں کو عفو و درگزر کرنے کی نصیحت فرمائی۔ (تفسیر کبیر امام رازی)

جن آیتوں میں کفار سے عفو و درگزر کرنے کی نصیحت کی گئی ہے۔ ان کے بارے میں عام مفسرین کا خیال یہ ہے کہ فرضیت جہاد سے پہلے کی بات ہے۔ جہاد نے کفار کے حق میں عفو و درگزر کے حکم کو منسوخ کر دیا۔ لیکن مفسرین میں کچھ ایسے بھی



ہیں۔ جن کے نزدیک جہاد کا حکم عفو و درگزر کے منافی نہیں۔ اس ضمن میں امام رازی نے یہ فیصلہ صادر کیا ہے۔

آیت قرآنی "وَاعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ" (جاہلوں سے اعراض کیجئے) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ جاہلوں کی بُد اخلاقی پر صبر کریں۔ اور ان کی بہرہ بائیں اور کھینچنے حرکتوں کا جواب اسی قسم کی باتوں اور حرکتوں سے نہ دیا جائے۔ اس میں جہاد و قتال سے باز رہنے کی کوئی ہدایت نہیں کیونکہ جاہلوں سے اعراض برتنے اور مشرکوں سے قتال میں کوئی تضاد نہیں۔ (تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۴۹۶)

عفو کے باب میں اُسوۂ نبویؐ

سالارِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی عفو و درگزر کا موقع تھی۔ حدیث

میں آیا ہے کہ آپؐ نے زندگی بھر کسی سے انتقام نہیں لیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں دس برس آنحضرتؐ کی خدمت میں رہا۔ آپؐ نے اس تمام عرصہ میں مجھے اُف تک نہ کہا۔ (بخاری)

تاریخ اسلام نبی کریمؐ کے عفو و درگزر کی درخشندہ مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ کوئی کہاں تک شمار کرے۔ عفو و درگزر کی انتہا ہے کہ آپؐ نے اپنے چچا سید الشہداء حضرت حمزہؓ کے کلیجہ کو چبانے والی عورت ہندہ زوجہ ابی سفیان کو معاف کر دیا تھا ابوسفیان کی ساری زندگی عداوت رسولؐ میں گزری تھی۔ بایں ہمہ جب مکہ فتح ہوا اور مسلمان فتح کے شادیاں بجانے لگے کہ میں داخل ہوئے تو آنحضرتؐ نے یہ کہہ کر ابوسفیان کے گھر کو دار لمان قرار دیا کہ

مَنْ دَخَلَ دَارَ أَبِي سَفْيَانَ  
فَهُوَ آمِنٌ  
(جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگا وہ امان پائے گا)

صلح حدیبیہ کے موقع پر کفار مکہ کے ستر آدمی گرفتار کر لئے گئے جو مسلمانوں پر اچانک حملہ کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ نے پیغمبرانہ وسعتِ قلب سے انہیں معاف کر دیا۔ آپؐ ایک یہودی کے مقروض تھے وہ خدمت میں حاضر ہو کر سخت سست



بکنے لگا اور آپ کے گلے میں چادر ڈال کر اسی طرح تاڑ دیا کہ آپ کی آنکھیں ابھر آئیں۔ صحابہ رسالت آپ کے ساتھ گستاخ یہودی کی یہ شوخ چٹھی گوارا نہ کر سکے اور اسے قتل کرنے کی اجازت چاہی۔ آپ نے فرمایا:۔

انَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ عَجَبًا (مقدار کے لئے کچھ گنجائش ہوتی ہے)

دین اسلام جس سرعت کے ساتھ اکنافِ ارضی میں پھیلا۔ اس کار از خود اس کی صداقت و حقانیت کے علاوہ عفوِ نبوی میں مضمر تھا۔ اخلاقِ نبوی کی تقابلی

جاذبیت ہی تھی جو اطراف و جوانب کے کفار کو آستانہِ نبوی پر کھینچ لائی۔

عفو کے لئے اگر کوئی حد مقرر نہ کی جائے تو ضعف و عجز

**عفو کی حد** اور گھٹیا پن کی حدود میں داخل ہو جائے۔ اسلام یہاں

عفو و درگزر کی تلقین کرتا ہے۔ وہاں یہ بھی سکھاتا ہے کہ غیرت و خودداری اور

عزت و نفس (SELF RESPECT) کو ہر حال میں اور ہر قیمت پر قائم

رکھا جائے۔ اسی لئے اسلام نے اخلاقی تعلیم کے درس میں قوت و قدرت کے جزو

کو ضرور شامل کیا اور اس کو فراموش نہیں کیا۔ اسلام انجیل مقدس کی طرح یہ نہیں

کہتا:۔

”اگر ایک شخص کسی کے گال پر طمانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کر دو“

کیونکہ اس سے ذلت اور لپٹ طبعی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام کی

زریں تعلیم یہ ہے کہ:۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ (تمہارے لئے قصاص میں زندگی

دالینقراۃ ) ہے)

آیت متذکرہ الصدر میں قصاص کو سرچشمہ حیات قرار دیا۔ اگر اسلام میں عفو و

درگزر کے علاوہ قصاص و دفاع کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی تو غزواتِ النبیؐ

کا سنہرے باب کبھی وائے ہوتا اور تاریخ اسلام کے اوراق مسلمانوں کی جرات و شجاعت

کے مظاہر سے یکسر خالی ہوتے۔



اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ انسان میں دفاع کا قدرتی جذبہ پایا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص اسے زک پہنچانا چاہتا ہے تو وہ اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ یہ جذبہ انسانی فطرت کا لازمہ ہے۔ اس لئے اس کو نابود نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام نے غصہ کو دبانے کا حکم دیا ہے۔ مٹانے کا نہیں۔

در اصل انسان کے تمام اخلاق کی بنیاد اس کی دو قوتوں پر ہے۔ ۱۔ قوت غضب ۲۔ قوت شہوت۔ غضب کی قوتوں سے نامناسب امور کا دفاع کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس قوت شہوت سے مناسب و مفید امور کو حاصل کیا جاتا ہے۔ ان دونوں قوتوں کی افراط و تفریط اور ان کے مختلف مراتب سے سینکڑوں اچھے برے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔ غضب کی قوت اگر افراط و تفریط سے پاک ہو اور عقل کے قابو میں ہو تو اس کا نام شجاعت ہے۔ شجاعت حالات و کیفیات کے لحاظ سے مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ مثلاً خودداری، دلیری، آزادی، حق گوئی، بلند ہمتی، استقلال، وقار، صبر و سکون، جدوجہد اور جہاد۔ جب یہی قوت اعتدال سے ہٹ کر افراط کی طرف مائل ہوتی ہے۔ تو اس سے عجز و نخوت، خود پرستی، تکبر و دوسروں کی تحقیر وغیرہ برائیاں پیدا ہوتی ہیں اور جب اس قوت میں کمی پیدا ہوتی ہے تو اس سے ذلت پسندی، کم حوصلگی، خوف اور گھٹیا پن کے اخلاقی عیوب معرض وجود میں آتے ہیں۔ اسلام انسان کی ان دونوں قوتوں کو افراط و تفریط سے ہٹا کر ان میں اعتدال پیدا کرتا ہے۔ مسیحیت کے نزدیک یہ دونوں قوتیں بذات خود بُری ہیں اور اسلام کے نزدیک یہ بذاتہ بُری نہیں۔ بلکہ بعض اوقات ان کے استعمال کا موقع محل بُرا ہوتا ہے۔

عفو ان فوائد کا موجب ہے۔

۱۔ عفو سے معاشرہ میں امن و سلامتی کا دور دورہ

عفو کے ثمرات

ہوتا ہے۔ حسد و عناد مٹ جاتا ہے۔

۲۔ عفو کرنے والا خدا کی صفتِ مغفرت کو اپناتا ہے۔



۲۔ عفو کے دم سے محبت کی دنیا میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ دشمن دوست ہو جاتے ہیں۔

۳۔ عفو کے بدولت ایثار کا جذبہ ابھرتا ہے۔  
۴۔ عفو عزم و حوصلہ کا موجب ہوتا ہے۔ جو اقوام عالم کی کامیابی و کامرانی کی شرطِ اولین ہے۔

۵۔ غصہ سے مغلوب ہونا ایک اعصابی مرض ہے۔

۶۔ عفو سے کام لینے والا اسوہ نبویؐ پر گامزن ہوتا ہے۔

۷۔ عفو رضائے الہی کا ذریعہ ہے۔

۸۔ عفو روحانی بلندی اور عظمت کا نشان ہے۔

۹۔ عفو سے انسان کی استقامت اور شانِ مردانہ میں کمال پیدا ہوتا ہے۔ جس پر انسانی عزت و شرف کا مداد ہے۔

## سوالات

- ۱۔ عفو کسے کہتے ہیں۔ وضاحت کیجئے۔
- ۲۔ عفو کے بارے میں قرآنی تعلیمات کا خلاصہ کیجئے۔
- ۳۔ عفو کے بارے میں کم از کم تین احادیث تحریر کیجئے۔
- ۴۔ عفو کی حدود کیا ہیں۔ اسلام کس حد تک عفو کی تلقین کرتا ہے۔
- ۵۔ عفو کے متعلق اسوہ نبویؐ کیا ہے۔ مثالوں سے واضح کیجئے۔



## عدل

**مفہوم** | لفظ عدل عربی زبان میں ان معانی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے - ۱- سپدھا کرنا - ۲- برابر کرنا - ۳- راستہ سے پھر جانا منحرف ہو جانا - ۴- توازن قائم رکھنا - ۵- افراط و تفریط سے بچنا عدل و انصاف کے الفاظ ہم معنی استعمال ہوتے ہیں - انصاف کے لغوی معنی ہیں - کسی چیز کو دو برابر حصوں میں بانٹنا - حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں کہ عدل کسی چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھنے کو کہتے ہیں - اس کی ضد ظلم کا لفظ ہے - جس کے معنی ہیں - کسی چیز کو غلط جگہ پر رکھنا جو اس کے مناسب حال نہ ہو -  
(کشف المحجوب)

قرآن حکیم میں عدل کے لئے قسط کا لفظ بھی آیا ہے - عدل کی ضد جور ہے - جور کا لفظ عدم توازن اور حد سے تجاوز کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے -

**عدل کی اہمیت** | یہ طویل و عریض کائنات عدل کے بل بوتے پر قائم ہے - اس کے اجزاء میں ایک مکمل توازن ہے - اگر

اس کے عناصر غیر متوازن ہو جائیں تو ایک لمحہ کے لئے بھی زندہ نہ رہ سکے - اس طرح کائنات ارضی کی تمام اشیاء میں مخصوص توازن پایا جاتا ہے - جس کے فقدان کی صورت میں اس کا قیام و بقا محال ہے - خدا کے ۹۹ صفاتی ناموں میں سے عادل بھی ایک نام ہے جس کے معنی ہیں - عدل و انصاف سے کام لینے والا - اس سے واضح ہوا کہ بندوں میں جو عدل کی صفت پائی جاتی ہے وہ عدل خداوند کا ہی پرتو ہے - قرآن کریم کے بیشتر مقامات میں عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے - فرمایا :-



إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ رَبِّهِ تَعْلَمُ الصَّافِ وَأُور  
(سورہ نحل - ۱۱۳) نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے)

اسلام میں عدل کو جو اہمیت حاصل ہے اس کے ثابت کرنے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ اُمتِ ہذا کو اُمتِ وسط قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

”جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا“ (ہم نے تم کو اعتدال پسند اُمت بنا دیا ہے)

معاشرتی زندگی میں عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت ان لوگوں کو ہوتی ہے جو ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کرتے ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کو حکم دیا

”فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا“ (پھر اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ  
ایک ہی بیویوں میں انصاف نہ کر سکو گے  
تو ایک ہی بیوی کافی ہے)

یتیموں کے حقوق کی نگہداشت کے لئے بھی عدل و انصاف کی ضرورت ہے

اس لئے فرمایا:-

”وَأَنْ تَقُولُوا لِبَنَاتِنَا بِالْقِسْطِ“ (یتیموں کے حق میں انصاف  
ملاحظہ رکھو) (النساء)

روزمرہ زندگی میں عدل و

انصاف کی شدید ضرورت

## ناپ تول میں عدل و انصاف

خرید و فروخت اور وزن و پیمائش میں بھی لائق ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ارشاد ہوا  
”وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ“ (اور انصاف کے ساتھ پوری پوری  
ناپ تول کرو) (سورہ النعام - ۱۱۹)

قرآن کریم کی متعدد آیات میں بار بار تاکید کی گئی ہے کہ ناپ تول میں لے انصافی  
نہ کی جائے۔ خرید و فروخت کا معاملہ روزمرہ زندگی میں ہر شخص کو پیش آتا ہے۔ اس  
لئے وزن و پیمانہ میں کمی کرنے سے جو نقصان پہنچتا ہے۔ اس کا دائرہ بہت وسیع  
ہے۔ مزید برآں ناپ تول میں معمولی کمی کرنے سے انسان کا گھٹیا پن اور ٹھیکگی ظاہر



ہوتی ہے جس سے انسانی روح پر بڑا ناگوار اثر پڑتا ہے اور بلند ہمتی و عالی ظرفی کے جذبات ختم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

عدالتی امور میں عدل و انصاف کی بچید ضرورت  
عدالتی امور میں عدل ہے اور اسلام نے عدالتی کاروبار کے ہر پہلو میں  
 عدل و انصاف کا لحاظ رکھا ہے۔ دستاویز لکھنے کے متعلق فرمایا۔

”وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبًا“ (بقرہ - ۳۹) ساتھ لکھے

عدالت میں گواہی دیتے وقت بہت سے لوگ ایمان و امان ہاتھ سے چھوڑ  
 دیتے ہیں۔ خصوصاً جب کہ مقدمہ کا ایک فریق قریبی رشتہ دار ہو۔ اسلام اس حالت  
 میں بھی عدل کی تاکید کرتا ہے۔ فرمایا۔

”وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَكَوْنُوا  
 كَانِ ذَاقُوا حَبًّا“ (النعام - ۱۹) اپنا رشتہ دار ہی رکیوں نہ ہو انصاف  
 کا ساتھ دیجئے۔

دوسری جگہ فرمایا :-

مسلمانوں! خدا کے لئے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کے لئے آمادہ رہو اور  
 لوگوں کی عداوت تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم معاملات میں انصاف نہ کرو۔  
 انصاف کرو کیونکہ شیوہ انصاف پر ہینرگاری سے قریب تر ہے۔ (سورہ ماڈہ)

مذکورہ صدر آیت سے واضح ہوا کہ جہاں  
غیر مسلموں سے عدل اپنے مذہب والوں کے مابین عدل کا حکم

دیا گیا ہے۔ وہاں غیر مذہب والوں سے بھی عدل ہی کے برتاؤ کی تاکید کی گئی ہے۔  
 یہود و نصاریٰ اسلام کے کھلے ہوئے دشمن تھے۔ تاہم آپ کو یہ حکم دیا گیا ہے۔  
 آپ کہہ دیں کہ میں ہر اس کتاب کو ماننا ہوں جو اللہ نے اتاری اور مجھے خدا سے  
 یہ حکم ملا ہے کہ میں تمہارے یہود و نصاریٰ کے مابین انصاف کروں۔ اللہ ہمارا اور



تمہارا رب ہے۔ ہم کو تمہارے کاموں کا بدلہ ملے گا اور تم کو تمہارے کاموں کا۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کچھ جھگڑا نہیں۔ اسی کی طرف سب کو پھر کر جانا ہے۔

(سورہ شوریٰ - ۲)

مذکورہ صدر آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلانیہ یہ بات کہنے کا حق دیا گیا ہے کہ دینی مخالفت کی بنا پر یہود و نصاریٰ سے بے انصافی نہیں کی جائے گی۔ دوسرے یہ کہ یہود میں مقدمات کے فیصلہ کی جو یہ صورت جاری تھی کہ دو تہذیبوں اور عزت والوں کے ساتھ رعایت کا اور عام لوگوں کے ساتھ سختی کا قانون برتنا جائے میرے خدائی ایسا کرنے سے مجھے منع کیا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ عام و خاص اور امیر و غریب سب کے ساتھ یکساں اور برابری کا سلوک کیا جائے۔ کیونکہ ہمارا تمہارا سب کا رب ایک ہی ہے۔ ہم سب اس کے غلام ہیں۔ اس لئے اس کے سب غلاموں کے لئے ایک ہی قانون ہونا چاہئے۔

عدل و انصاف کا مشکل ترین مرحلہ یہ ہے کہ اپنے

نفس کے مقابلہ میں عدل کا دامن ہاتھ سے نہ

اپنی ذات سے عدل

چھوٹنے پائے۔ قرآن کریم میں اس کیفیت منزل کی رہنمائی بھی پوری طرح کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :-

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا  
قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ  
لِلَّهِ وَرَوْعًا لِنَفْسِكُمْ  
أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُ اللَّهُ  
الَّذِينَ آمَنُوا وَ هُمْ  
يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَ يَأْتُونَ  
بِالصَّدَقَاتِ وَ هُمْ  
يُحْفَظُونَ أَمْرَ اللَّهِ  
وَ أَمْرَ رَسُولِهِ  
أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُ اللَّهُ  
الَّذِينَ آمَنُوا وَ هُمْ  
يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَ يَأْتُونَ  
بِالصَّدَقَاتِ وَ هُمْ  
يُحْفَظُونَ أَمْرَ اللَّهِ  
وَ أَمْرَ رَسُولِهِ“

دائے ایمان والو! انصاف کی حمایت  
میں کھڑے رہو۔ اللہ کے لئے گواہ بنو،  
اگرچہ اس میں تمہارا نقصان ہی ہو  
یا ماں باپ کا یا رشتہ داروں کا

(سورہ نساء - ۲۰)

مولانا سید سلیمان ندوی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

اس آیت میں عدل کے خلاف ایک ایک ریشہ کو بڑے نکال کر پھینک دیا گیا

ہے۔ کہا گیا کہ معاملات میں عدل و انصاف تمہارا مقصد ہو جو کچھ کہو خدا لگتی کہو اور



خدا واسطے کہو۔ عدل و انصاف کے فیصلے اور گواہی میں نہ تو اپنے نفس کا خیال بیچ میں آئے نہ عزیزوں اور رشتہ داروں کا۔ نہ دولت مند کی طرفداری کا۔ نہ محتاج پر رحم کا۔ پھر اس فیصلہ اور گواہی میں کوئی بات لگی لپٹی نہ رکھی جائے۔ نہ حق کا کوئی پہلو جان بوجھ کر بچا لیا جائے۔

دو شخصوں یا جماعتوں میں مصالحت کرانا بھی  
دو جماعتوں میں عدل

ایک عدالتی معاملہ ہے۔ اس لئے اس پر بھی عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ بڑی نازک صورت حال ہوتی ہے۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف میدان جنگ میں برسر پیکار ہوتے ہیں۔ اس وقت عقل کی قوت اور نیکی کی صلاحیت کا چراغ جذبات کی آندھیوں میں بجھ رہا ہوتا ہے۔ اس دشوار مرحلہ پر بھی مسلمانوں کو عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے۔ فرمایا ہے:-

”اور اگر مسلمانوں کے دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادو۔ پھر اگر ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو جو زیادتی کرتا ہے تم اس سے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ حکم خدا کی طرف رجوع کرے تو دونوں میں عدل و انصاف کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف کو ملحوظ رکھو۔ بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو چاہتا ہے۔“ (سورہ حجرات-۱)

عدل و انصاف حکومت و سلطنت  
حاکم کے لیے عدل کی ضرورت

کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے ہر قسم کے مذہبی اور عدالتی فیصلے کے لئے عدل کو ضروری قرار دیا۔ اگر عدل نہ ہو تو کسی مظلوم کی وادری ممکن ہی نہیں۔ اس لئے ایک حاکم کا پہلا فرض یہ ہے کہ عادل ہو۔

عدالتی فیصلہ کے بارے میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:-  
”بعض لوگ میرے پاس آکر اپنے آپ کو زبان درازی سے سچا ثابت کر کے اپنے حق میں فیصلہ صادر کرا لیتے ہیں۔ مگر انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ جہنم کی آگ پھانکتے ہیں۔“







ان آیات کی رو سے اگرچہ ہر مسلمان کو عادل ہونا چاہئے۔ تاہم حاکم وقت کے لئے عادل ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ اسی لئے حدیث میں عادل سلطان کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت کے دن خدا جن لوگوں کو اپنے سایہ میں لینگا۔ انہیں ایک شخص عادل حاکم ہوگا۔ (صحیح بخاری)

## سرور کائنات کا عدل و انصاف

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی عدل و انصاف کا

مجسمہ تھی۔ تاریخ اسلام کے صفحات آپ کے واقعات عدل و انصاف سے پر ہیں۔ چند ایک واقعات ملاحظہ ہوں :-

۱۔ سرق رضنامی ایک صحابی تھے۔ انہوں نے ایک بدوی سے ایک اونٹ مرل خریدا لیکن قیمت ادا نہ ہو سکی۔ بدوان کو پکڑ کر آپ کی خدمت میں لے گیا اور واقعہ عرض کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قیمت ادا کر دو۔ انہوں نے ناداری کا عذر کیا۔ آپ نے بدوسے کہا کہ بازار لے جا کر ان کو فروخت کر لو۔ بدوان کو بازار لے گیا۔ ایک صاحب نے دام دے کر بدوسے خریدا اور آزاد کر دیا۔

(مسند احمد جلد ۲ ص ۲۲۳)

زندگی کے آخری لمحات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع عام میں یہ اعلان کیا کہ اگر میرے ذمہ کسی کا قرض آتا ہو۔ اگر میں نے کسی کی جان و مال یا آبرو کو صدمہ پہنچایا ہو تو میری جان و مال اور آبرو حاضر ہے۔ اسی دنیا میں وہ اپنا انتقام لے لے۔ صرف ایک شخص نے چند درہم کا دعویٰ کیا جو ادا کر دیئے گئے۔

۱۔ عدل و انصاف کو ملحوظ رکھا جائے تو سب لوگوں کو ان کے واجب حقوق مل جاتے ہیں۔

## عدل کے ثمرات

- ۲۔ عادل افراد اقوام دنیا میں اوج کمال پر پہنچتی ہیں۔
- ۳۔ عادل حاکم دنیا میں کامیاب اور خدا کے یہاں سرخرو ہوتا ہے۔
- ۴۔ عدل سے معاشرہ میں امن قائم ہوتا ہے اور قوم تعمیری کاموں کی طرف متوجہ



ہوتی ہے۔

۵۔ عدل اسوہ رسول ہے اور اس کا اتباع افرادِ امت کے لئے ضروری ہے

۶۔ عدل سے معاشرتی مساوات قائم ہوتی ہے اور بندہ اور آقا کی تمیز اٹھ

جاتی ہے۔

۷۔ عدل سے آخرت میں سرفرازی حاصل ہوتی ہے۔ امام عادل قیامت کے

روز عرش کے سایہ تلے ہوگا۔

۸۔ عدل صفاتِ خداوندی میں سے ایک ہے اور خدا کا حکم ہے کہ اپنے اندر

میری صفات پیدا کرو۔

## سوالات

۱۔ دینی نقطہ نظر سے عدل کی اہمیت بیان کیجئے۔

۲۔ عدالتی معاملات میں اسلامی تعلیمات کا خلاصہ لکھئے۔

۳۔ غیر مسلموں سے عدل و انصاف کے بارے میں اسلام نے کیا تعلیم دی ہے۔

۴۔ عدل کے بارے میں اسوہ نبوی کیا تھا۔ واقعات سے ثابت کیجئے۔

۵۔ حکومت کس طرح عدل و انصاف کو قائم کر سکتی ہے؟



## احسان

**مطلب و مفہوم** | احسان باب افعال کا مصدر ہے۔ اس کا مادہ حَسُن ہے۔ عربی میں احسان کے معنی یہ ہیں:-

- ۱- اچھا کام کرنا۔ اس کی ضد۔ اَسَاءَ یُسِیْ اِسْءَاةً = (بُرا کام کرنا) ہے۔
- ۲- خوبصورت بنا دینا ۳- کسی علم و ہنر میں ماہر ہونا فَلَانٌ یُحْسِنُ الْقِرَاءَةَ ) -
- ۴- احسان کا صلہ جب الٰہی یا بہ ہو تو اس کے معنی حسن سلوک اور مروت کے آتے ہیں۔ ۵- کسی کام کو ذوق و شوق اور خلوص سے انجام دینا۔ اس میں حسن و عفتی پیدا کرنا۔ (القاموس)

خلاصہ یہ کہ احسان کے معنی ہیں کسی کام کو جی لگا کر عمدگی اور سلیقہ سے انجام دینا یہ مفہوم قدر مشترک کے طور پر مذکورہ بالا تمام معانی میں پایا جاتا ہے۔ اردو میں یہ لفظ حسن سلوک اور مروت کا مفہوم ادا کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ جب عربی میں یہ مفہوم ادا کرنا مقصود ہو۔ اس وقت احسان کا صلہ لفظ "الی" یا "ب" آتا ہے۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں مُحْسِنٌ یا مُحْسِنِیْنَ کے الفاظ صلہ کے بغیر آئے ہیں۔ ان سے بعض جگہ احسان کرنے اچھے کام یا کام کو سلیقہ سے انجام دینے کے معنی مراد لئے گئے ہیں۔ اس وسیع معنی میں حسن سلوک اور مروت کا مفہوم بھی داخل ہو سکتا ہے۔ ہر جگہ عربی میں احسان کا لفظ حسن سلوک میں محدود نہیں جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی حجتہ اللہ البالغہ کے باب الاحسان میں فرماتے ہیں۔

شارع علیہ السلام نے نبی نوع انسان کو جن واجبات یا محرمات کا امور و مکلف کیا ہے۔ ان سے دو طرح بحث کی جاسکتی ہے۔

- ۱- پہلے اس اعتبار سے کہ یہ اعمال لوگوں پر کب اور کس وقت واجب تعمیل ہیں؟ ان



کی ظاہری شکل و صورت کیا ہے۔ ان کا بچا لانا لوگوں پر کس حد تک ضروری ہے؟ ظاہر ہے کہ ان امور میں اعتدال کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ یہ سب باتیں علم الفقہ میں مذکور ہوتی ہیں۔

۲۔ دوسرے یہ کہ یہ اعمال بنی نوع انسان کو کس حد تک منہذب بناتے ہیں اور ان سے وہ غرض و غایت کہاں تک حاصل ہوتی ہے۔ جس کے لئے ان کو انسانوں پر واجب ٹھہرایا گیا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان اعمال کی ظاہری شکل و صورت کو دیکھنا ہوگا۔ اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ ان اعمال کی اصل روح کیا ہے۔ اور وہ ان سے کہاں تک حاصل ہوتی ہے جو علم ان امور سے بحث کرتا ہے۔ اس کو علم الاحسان کہتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ احسان کے متعلق سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

”الْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ  
كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَمْ تَكُنْ  
تَرَاهُ فَاِنَّهُ يَرَاكَ“

احسان کے معنی یہ ہیں کہ تو خدا کی اس  
طرح عبادت کرے۔ گویا اسے دیکھ رہا  
ہے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو۔ تو یہ سمجھو کہ وہ  
تجھے دیکھ رہا ہے

(صحیح بخاری)

اگے چل کر شاہ صاحب نے تفصیلاً بتایا ہے کہ احکام اسلام گہرے منافع و مصالح پر مبنی ہیں۔ اسلام کا جزوی سے جزوی حکم بھی مصلحت و حکمت سے خالی نہیں احسان کا مطلب یہی ہے کہ شرعی احکام کو اس قدر و جمعی کیسویں اور اخلاص نیت کے ساتھ ادا کیا جائے کہ ان کی اصل روح حاصل ہو جائے۔

**اہمیت** احسان اپنے وسیع معنی میں یعنی بھلائی کرنا اور کام کو خوش اسلوبی سے انجام دینا، ایک ایسی جامع صفت ہے۔ جو نیکی کی ہر قسم کو شامل ہے۔ اسلام جہاں نیکی میں سبقت کرنے اور زیادہ سے زیادہ نیکیہ اعمال بجالانے کا حکم دیتا ہے۔ وہاں اس بات کو بھی ضروری قرار دیتا ہے کہ نیک خوب سے خراب تر طریقہ پر دل و جان سے انجام دہی جائے۔ ان خصوصیات کا ارشاد ہے کہ ہر عمل کو اپنا آخری عمل تصور کرنا چاہیے۔ یہ خصوصیتوں میں سے ہے کہ اس کی انجام دہی میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔ اسی کا نام احسان ہے۔



اس کی صورتیں اتنی بے شمار ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ ان تمام صورتوں کا ما حاصل یہ ہے کہ دوسرے کے ساتھ ایسا نیک سلوک کیا جائے جس سے اس کا دل خوش ہو۔ اور وہ الم ورنج سے نجات حاصل کرے۔ گویا احسان عدل و انصاف سے بڑھ کر ایک وصف کا نام ہے۔ عدل مساوات کا تقاضا کرتا ہے۔ احسان اس سے بڑھ کر یہ چاہتا ہے مستحق کو اس کے حق سے زیادہ دے دیا جائے۔ خداوند کریم ان دونوں صفات سے متصف ہے۔ جب کوئی شخص بدی کا ارتکاب کرتا ہے۔ تو اس کے اعمال نامہ میں ایک ہی بدی لکھی جاتی ہے۔ یہ اس کا عدل ہے۔ بخلاف ازیں جب کوئی شخص نیک عمل انجام دیتا ہے۔ تو بارگاہِ باری سے دس سے لے کر سات سو تک نیکیاں اس کے اعمال نامہ میں درج ہو جاتی ہیں۔ یہ اس کا احسان ہے۔

مندرجہ صدر بیان سے واضح ہوا کہ احسان کی دو قسمیں ہیں :-

- ۱۔ عبادات کو احسن طریق اور خشوع و خضوع سے بکمال اخلاص انجام دینا۔
- ۲۔ دوسری قسم کا احسان یہ ہے کہ انسانوں سے نیک سلوک روا رکھا جائے اور دوسرے شخص کی بھلائی کا بڑھ کر بدلہ دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں

”اِنَّ اِلٰهَہٗ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ“  
(سورہ نحل رکوع ۱۳۰) ہے۔

اس آیت میں۔ عدل و احسان دونوں کا حکم دیا گیا۔ عدل صرف واجب حق دلاتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ دوسرے شخص کی ضروریات کا تقاضا کیا ہے۔ احسان کسی کے استحقاق کو میزان عدل میں رکھ کر وزن کرنے کا متقاضی نہیں۔ بلکہ فیاضی اور دریادلی کا منظر ہے قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اگر بدی کی سزا دینا پڑے۔ تو یہ سزا اس کی بُرائی سے بڑھ کر ہرگز نہ ہو۔ زیادہ سے زیادہ برابر کا بدلہ ہو۔ یہ عدل ہے مگر اس سے بلند تر یہ چیز ہے کہ اگر ممکن ہو تو مظلوم مجرم کو معاف کر دے۔ الغرض حسن معاملات کی ترکیب عدل و احسان کے حسین امتزاج سے قائم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ صدر آیت میں عدل و احسان



دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ دراصل یہ دونوں صفات ایک دوسری سے مرلوب ہیں۔  
حضرت یوسف علیہ السلام نے جب طویل قید و بند کے بعد قید خانہ سے نجات پائی اور  
ان کے والدین اور بھائی بخیریت مصر پہنچ گئے۔ تو ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے احسان کا  
شکر ادا کیا۔

وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجْتَنِي مِنَ  
السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُمْ مِنَ الْبَدْوِ  
رسورۃ یوسف - (۱۱)

اور خدا نے مجھ پر احسان کیا کہ مجھے قید خانہ  
سے نجات دی۔ اور آپ لوگوں کو گاؤں سے  
یہاں لے آیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے ایک دولت مند شخص قارون نے جب زکوٰۃ  
ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ تو اسے ان الفاظ میں تنبیہ فرمائی۔  
”أَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ“  
رسورۃ قصص

تو احسان کر جس طرح خدا نے تجھ پر  
احسان کیا۔

احسان کے لئے کوئی مقدار متعین نہیں۔ بلکہ بھلائی کی ہر چھوٹی بڑی قسم احسان میں  
داخل ہے۔ احسان مالی امداد کے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ بلکہ احسان کے اور بھی بہت سے  
طریقے ہیں۔ عام لوگوں کے علاوہ والدین۔ قرابت دار۔ یتیم۔ محتاج۔ پڑوسی۔ اجاب انصاف  
مسافر۔ لونڈی۔ غلام احسان کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ اس لئے خداوند تعالیٰ نے  
سورۃ نساء رکوع - ۵ میں ان لوگوں کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا۔ والدین کے ساتھ  
احسان کرنے کی متعدد آیات میں تاکید ہے۔

احسان کی اہم صورتیں | مصیبت سے نجات دلانا کسی کو مصیبت  
سے نجات دلانا احسان کی اہم صورت ہے! اللہ تعالیٰ

نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ سے نجات دلانی تھی۔ حضرت یوسف نے اسے  
احسان سے تعبیر کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی سینکڑوں شریفانہ اور فیاضانہ افعال ہیں جن  
کو خدا نے احسان قرار دیا ہے۔ مثلاً عورتوں کو قانونی حیلے نکال کر دق کرنا ہر کام تھا جس  
سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا۔ اور فرمایا کہ اگر کسی عورت کو اپنی زوجیت میں نہ رکھنا چاہو۔ تو



بطریق احسن اس کو انگ کر دو۔ قرآن میں ارشاد ہوا۔

(رحمی) طلبہ قبیل زرفا رو میں پھر دستوں  
کے مطابق زوجیت میں رکھنا ہے یا حسن  
سلوک کے ساتھ رخصت کر دینا۔

الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِذَا نَكَحَ  
بِمَعْرُوفٍ اَوْ سَرَخٍ بِاِحْسَانٍ

البقرہ - ۲۹

۲۔ کسی کے حق کی باقاعدہ ادائیگی۔

کسی کے واجب الادا حق کو بلا چون و چرا ادا کرنا۔ قرآن میں فرمایا۔

پھر جس (قاتل) کو اس کے بھائی (طالب  
قصاص) نے کچھ قصاص معاف کر دیا تو مطالبہ  
معتول طریق پر کرنا چاہیے اور مطالبہ کو اس  
(فریق) کے پاس اچھی طرح سے پہچا دینا  
چاہیے۔

فَمَنْ عَفِيَ لَهُ مِنْ اَخِيهِ شَيْئًا  
فَاِتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَاَدَاءُ  
الْيَسْرِ بِاِحْسَانٍ

(سورۃ بقرہ - ۲۲)

۳۔ قصور وار کے قصور کو معاف کرنا۔

قصور وار کے قصور کو معاف کرنا بھی احسان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس احسان کو  
یہ درجہ دیا ہے کہ جو اس صفت سے متصف ہوں۔ وہ بھی خدا کے محبوب بندوں میں ہوں  
گے۔ ارشاد ہے۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ  
اور اللہ ان نیکی کرنے والوں کو پیار  
کرتا ہے۔

(سورۃ آل عمران - ۱۱۳)

۴۔ غیر مسلموں سے سلوک۔

غیر مسلموں سے حسن سلوک کرنا بھی احسان کی ایک خاص قسم ہے۔ صحابہ میں کچھ لوگ  
ایسے تھے۔ جو غیر مسلموں پر صدقہ کرنے کو ثواب کا کام نہیں سمجھتے تھے۔ اس پر حکم نازل  
ہوا کہ ہدایت سے بہرہ ور کرنا تمہارا نہیں میرا کام ہے۔ تم کو بلا امتیاز مسلم اور غیر مسلم  
کے ساتھ نیکی کرنا اور اپنی نیت ٹھیک رکھنا چاہیے۔ قرآن میں ارشاد ہوا۔

ان کو ہدایت دینا تمہارا کام نہیں۔ اللہ جیسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔ تم



جو خیرات دو گے۔ وہ تمہارے لئے ہے اور تم صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے  
دیتے ہو۔ تم جو خیرات بھی دو گے وہ تم کو پوری مل جائے گی اور تمہارا حق مارا  
نہ جائے گا۔ (سورہ بقرہ - ۱۳۷)

### ۵۔ نیکی کا بدلہ نیکی

هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ  
اور بھلائی کا بدلہ صرف بھلائی ہے۔  
(سورہ رجن - ۴۲)

نیکی کا بدلہ نیکی سے دین اسلام کا وہ اصول ہے جس پر ثواب و عذاب کا دار و مدار  
ہے۔ جو نیک کام کریں ان کو خدا کے ہاں سے نیک جزا ہی ملے گی۔ اس آیت میں آخرت کی جزا  
کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر لفظوں کے لحاظ سے اس اصول کی وسعت دینا اور آخرت دونوں  
کو شامل ہے۔

### ۶۔ مقروض کو مہلت دینا۔

احسان کی ایک صورت یہ ہے کہ قرضداروں کے بوجھ کو ہلکا کیا جائے تنگ دست  
مقروضوں کو مہلت دی جائے۔ اور جو لوگ قرض ادا کرنے سے معذور ہوں۔ ان کا قرض  
معاف کر دیا جائے۔

دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے اس طرف توجہ دی۔ عرب میں  
سود خواری نے لوگوں کو اس قدر بے رحم اور سنگ دل بنا دیا تھا کہ جو لوگ قرض ادا نہیں کر سکتے  
تھے۔ وہ غلاموں کی طرح فروخت کر دئے جاتے تھے اور جو قیمت ملتی تھی، اس سے ان  
کا قرض ادا کیا جاتا تھا۔ آج اس متمدن زمانہ میں قرض کی زنجیر مقروضوں کے لئے اتنی ہی  
بھاری ہے۔ بلکہ سرمایہ داری کے نظام نے اس کو اور زیادہ بھاری بنا دیا ہے۔ قرآن کریم  
کی مندرجہ ذیل آیت نے اس سارے نظام کو تہہ و بالا کر دیا۔

قرآن کریم میں فرمایا۔

”وَإِنْ كَانَتْ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ  
إِلَىٰ مِيسْرَةٍ وَإِنْ تُصَدَّقُوا

اور اگر کوئی تنگ دست (تمہارا مقروض)  
ہو تو فراخی تک کی مہلت دو۔ اگر سمجھوتہ



تمہارے حق میں یہ زیادہ بہتر ہے کہ اس کو  
(اصل قرض بھی) بخش دو۔

عام لوگوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ دولت و  
ثروت کے بغیر کسی سے احسان کرنا ممکن

### احسان کے بارے میں غلط فہمی

نہیں۔ ان کی نگاہ میں احسان کا مفہوم بڑے بڑے احسانات تک محدود ہے۔ وہ اسی بنا پر  
کہتے ہیں۔ کہ غریب کس احسان کے قابل ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ احسان اور  
بھلائی کرنے کے لئے دولت کی نہیں دل کی ضرورت ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما  
کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک بددی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض  
کی۔ کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جس کے کرنے سے مجھے جنت نصیب ہو۔ آپ  
نے فرمایا: تمہارا سوال نہایت معقول ہے۔ تم جانوں کو آزاد کرو اور گردنوں کو چھڑاؤ۔ اس  
نے کہا یا رسول اللہ! کیا یہ دونوں باتیں ایک ہی نہیں۔ فرمایا: ”نہیں“ اگر تم کیلئے کسی کو  
آزاد کرتے ہو۔ تو یہ جان کا آزاد کرنا ہے۔ اور اگر دوسرے کے ساتھ شریک ہو کر کسی کے  
آزاد کرانے میں مالی امداد کرتے ہو تو یہ گردن چھڑانا ہے لگاتار دیتے رہو اور ظالم رشتہ دار  
کے ساتھ نیکی کرو۔ اگر تم یہ بھی نہ کر سکو تو بھوکے کو کھلاؤ اور پیاسے کو پلاؤ نیکی کا حکم دو  
اور بُرائی سے روکو اور اگر یہ بھی نہ کر سکو تو اپنے آپ کو بھلائی کے سوا اور باتوں سے  
روکو۔ (مستدرک حاکم)

۱۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ سابقہ  
اقوام میں ایک شخص تھا جو حاجت مندوں کو قرض

### احادیث نبویہ اور احسان

دینے کے سوا اور کوئی نیک کام نہیں کرتا تھا۔ جب اس کو کوئی مقروض تنگ و دست نظر  
آتا۔ تو اپنے ملازموں سے کہتا کہ اس سے ورگزر کرو۔ شاید خدا ہم سے بھی ورگزر کرے۔ اس  
کے صلہ میں خدا نے اسے معاف کر دیا۔ (بخاری)

۲۔ آپ نے فرمایا۔ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ خدا سے قیامت کی تکلیف سے نجات دے

اور تنگ و دست کو ہمت دے یا اس کا قرض معاف کر دے۔ (صحیح مسلم)

اللہ تعالیٰ تعالیٰ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ تعالیٰ تعالیٰ



۳۔ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! میں کسی شخص کے پاس سے گزرتا ہوں۔ تو وہ میری مہمانی نہیں کرتا تو کیا حیب اس کا گنہ مجھ پر ہو میں بھی اس کی گنج خلقی کا بدلہ اسی طرح دوں۔ فرمایا: نہیں تم اس کی مہمانی کرو۔ (ترمذی)

۴۔ آپ نے فرمایا: ایسے نہ بنو کہ اپنی عقل سے کام نہ لو اور دوسروں کی دیکھا دیکھی کام کرو۔ اور یہ کہنے لگو کہ اگر لوگ احسان کریں گے۔ تو ہم بھی کریں گے۔ اور اگر ظلم کریں گے تو ہم بھی کریں گے۔ بلکہ اپنے آپ کو اس پر مطمئن کر لو کہ اگر دوسرے احسان کریں تو تم احسان کرو گے۔ اور اگر وہ برائی بھی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔ (ترمذی)

۵۔ جو اپنے قرض دار کو مہلت دے گا۔ یا اس کا قرض معاف کرے اس پر احسان کرے گا تو قیامت کے دن خدا کے عرش کے سایہ میں ہوگا۔ (مسند احمد)

۶۔ ایک دفعہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے پوچھا یا رسول اللہ! مجھے کوئی عمل بتائیے فرمایا: جو روزی خدانے دی ہے۔ اس میں سے دوسروں کو دیکھتے۔ حضرت ابو ذر نے عرض کیا یا حضرت! اگر وہ شخص خود مفلس ہو؟ فرمایا: زبان سے اچھے کلمات ادا کرے۔ عرض کی: اگر اس کی زبان نہ چلتی ہو؟ فرمایا: عاجز کی مدد کرے۔ عرض کی: اگر وہ کمزور ہو۔ اور مدد نہ کر سکتا ہو؟ فرمایا: جس کو کوئی کام نہ کرنا آتا ہو اس کا کام سرتے عرض کی: اگر وہ خود ناکارہ ہو؟ فرمایا: کسی کو ایذا نہ پہنچائے۔ (مسند رک حاکم کتاب الایمان)

۷۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے۔ اگر تمہیں کسی کو شرعی حکم کے پیش نظر جان سے مارنا بھی پڑے۔ تو اس کو اچھائی کے ساتھ مارو۔ کسی جا لور کو زنج کرنا چاہو۔ تو بھی خوبی کے ساتھ کرو۔ چھری کو خوب تیز کرنا کر دو اور اپنے ذبحہ کو راحت دو۔ (مسلم)

غرض یہ ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ساتھ احسان کرنے کو کسی خاص معنی میں محدود نہیں کیا ہے بلکہ اس کو نیکی کی راہ میں وسیع کر دیا ہے۔ زندگی تو زندگی موت میں بھی اس نے اس اصول کے دائرہ کو تنگ نہیں کیا ہے۔



احسان کے بارے میں اُسوۂ نبوی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صفت احسان کا  
زندہ پیکر تھے۔ اس کی حد یہ ہے کہ آپ

اعدادین سے بھی نیک سلوک کرتے۔ تاریخ اسلام ایسے واقعات سے پُر ہے۔ چند  
واقعات ملاحظہ ہوں۔

حضرت عکرمہ دشمن اسلام ابو جہل کے فرزند تھے اور اسلام سے پہلے باپ کی طرح  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ترین دشمن تھے۔ فتح مکہ کے بعد مکہ سے بھاگ کر یمن  
چلے گئے۔ ان کی بیوی مسلمان ہو چکی تھیں وہ یمن گئیں اور عکرمہ کو تسلی دی۔ ان کو مسلمان  
کیا اور خدمت اقدس میں لے کر حاضر ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب  
ان کو دیکھا۔ فرط مسرت سے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اس تیزی سے ان کی طرف  
بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی اور زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے۔

مَرْحَبًا بِالرَّاكِبِ الْمَهَّاجِرِ  
اے ہجرت کرنے والے سوار تمہارا آنا  
مبارک ہو۔ (موطا امام مالک و ترمذی)

وحشی جو اسلام کے قوت بازو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز ترین چچا حضرت  
حمزہ رضی اللہ عنہ کا قاتل تھا مکہ میں رہتا تھا۔ جب مکہ میں اسلام کی قوت و شوکت ظاہر ہوئی وہ بھاگ کر  
طائف آیا۔ طائف کے شہر والوں نے بھی اُسے سزا طاعتِ خم کیا۔ وحشی کو یہاں سے بھی کوچ کرنا پڑا  
اس نے سنا کہ آپ دور سے آنے والوں کے ساتھ کبھی سختی کے ساتھ پیش نہیں آتے چنانچہ خود  
رحمت عالم کے دامن میں پناہ لی اور اسلام قبول کیا۔ آنحضرت نے صرف اس قدر فرمایا کہ  
میرے سامنے نہ آیا کرو تم کو دیکھ کر مجھے چچا کی یاد آتی ہے۔ (صحیح بخاری)

احسان جتلانے کی ممانعت

دولت و ثروت خدا کی داد ہے۔ اگر ہمیں کسی احسان  
کرنے کا موقع ملے تو خدا تعالیٰ کا شکر بحالانا چاہیے

جس نے اس کا رنجیر کی توفیق بخشی۔ اگر کسی کی مالی امداد کی جائے تو دل میں یہ خیال جاگزیں ہو کہ  
یہ امانت ایڑھی تھی جو میں نے اس کو تفویض کر دی اور اگر جسم و جان سے کسی کی مدد کی جائے  
تو اس نظر یہ کے ساتھ کہ یہ خدمت توفیق ربانی تکمیل پذیر ہوئی اور مجھے اس عطائے خداوندی



کا پاس گزار ہونا چاہیے۔ احسان جتانے سے اس کی قدر و قیمت کھٹ جاتی ہے اور جس پر احسان کیا جاتا ہے۔ اسے لوگوں کے رویہ و شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا  
صَدَقَاتِكُمْ بِالْحَنَنِ وَالْأَدْوَى  
اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان  
جھٹلا کر اور دکھ دے کر ضائع نہ کرو۔  
(البقرہ ۱۷۷)

اس آیت میں احسان جتانے سے منع کیا اور بتلایا کہ اس سے صدقات و خیرات کا اجر و ثواب ضائع ہو جاتا ہے۔

**احسان کے نتائج** | ۱۔ احسان کرنے والا کسی حد تک صفت خداوندی محسن سے  
بہرہ یاب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود محسن ہے۔ اور وہ احسان  
کرنے والے کی قدر کرتا ہے۔ اس کی عبادت خشوع و خضوع سے کی جائے یا اس کے  
بندوں سے نیک سلوک کیا جائے تو وہ اس کا اجر و دونوں جہانوں میں دیتا ہے۔ قرآن کریم  
میں فرمایا ہے:

وَسَنَنْزِلُ يُدُ الْمُحْسِنِينَ  
ہم احسان کرنے والوں کو مزید عطا فرمائیں  
گے۔

- ۲۔ احسان پیشہ شخص اُسوۂ نبوی کی راہ پر گامزن ہے۔
- ۳۔ احسان رضائے الہی کا باعث اور بخت میں جلتے کا موجب ہے۔
- ۴۔ احسان سے الفت و محبت بڑھتی اور حسد و بغض کا خاتمہ ہوتا ہے۔ آغاز اسلام میں اشاعت اسلام کا ایک قوی سبب یہ تھا کہ اسلامی فتوحات مفتوحہ اقوام کے لئے عفو عام کا پیغام ہوتی تھیں جس سے لوگ اہل اسلام کے گرویدہ ہو جاتے تھے چنانچہ جہاں جہاں اسلامی پرچم پہنچا۔ وہاں اسلام کا سکہ جاری ہو گیا۔
- ۵۔ احسان سے معاشرہ میں امن و سلامتی کا دور دورہ ہوتا اور اس طرح اسے استحکام و بقا نصیب ہوتا ہے۔



۶۔ احسان سے دشمن دوست بن جاتے ہیں۔

۷۔ احسان کا صلہ انخروی نجات کی صورت میں ملے گا۔

۸۔ احسان ایثار و قربانی کے لئے اساس کا حکم رکھتا ہے اور ایثار کے بغیر کوئی قوم ترقی

کے مدارج طے نہیں کر سکتی۔

## سوالات

۱۔ احسان کا مفہوم و مطلب تحریر کیجئے اور بتائیے؟ اس کے اردو اور عربی استعمال میں

کیا فرق ہے؟

۲۔ احسان کی اہم صورتیں کیا ہیں؟ قرآن کریم کی روشنی میں تحریر کیجئے۔

۳۔ احسان کے بارے میں کم از کم دو احادیث نبویہ لکھئے۔

۴۔ احسان کے بارے میں اسوہ نبوی کیا تھا کم از کم دو واقعات لکھئے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے احسان کرنے والوں کے متعلق کیا فرمایا ہے۔

۶۔ غیر مسلموں سے احسان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کیا حکم دیا ہے؟



## خدمتِ خلق

**مفہوم** خدمتِ خلق کا مطلب یہ ہے کہ کسی غرض یا صلب کے بغیر ہی نوعِ انسان کی خدمت کی جائے۔

خدمتِ خلق کا دائرہ بڑا وسیع ہے یہاں تک کہ اس میں انسان و حیوان سب شامل ہیں۔ اس میں مسلم غیر مسلم رشتہ دار غیر رشتہ دار و احباب و اعدا کسی کی تمیز نہیں۔ خدمتِ خلق کا تقاضا ہے کہ بلا اختیار مذہب و ملت ہر قسم کی خدمت کی جائے اور ہر وقت کی جائے۔ خدمتِ خلق کو محدود نہیں کرنا چاہیے۔ جہاں تک ممکن ہو اس کے دائرہ میں وسعت پیدا کی جائے اور مسلم و غیر مسلم امیر و غریب اور انسان و حیوان سب کو اس سے مستفید کیا جائے اگر کوئی غیر مسلم ہماری مدد کا محتاج ہو تو اس کی امکانی امداد سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ سوزہ تو بے بیس آیا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم تمہارے پاس پناہ طلب کرنے کے لئے آئے تو اسے پناہ دو اور بحفاظت اسے منزل مقصود تک پہنچا دو۔

حیوانات کو آرام پہنچانا بہت ثواب کا کام ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک شخص سفر میں تھا کہ اسے پیاس لگی ایک کنواں نظر آیا۔ اس میں اتر آیا۔ پیاس بجھا کر اوپر آیا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی وجہ سے کنوئیں کے کنارے کی گیلی مٹی چوس رہا ہے۔ مسافر کھڑکیوں میں اتر اپنے موزے کو پانی سے بھرا اور اسے منہ میں بکڑے باہر لایا اور کتے کی پیاس بجھائی اس کا یہ عمل بارگاہِ ایزدی میں اس قدر مقبول ہوا کہ اس کی نجات ہو گئی۔ صحابہ نے عرض کیا کہ حضور! کیا جانوروں کی خدمت کا بھی ثواب ملے گا۔ آپ نے فرمایا ہر جاندار چیز کی خدمت میں ثواب ہے۔ (سابقہ الصحاحین)

خدمتِ خلق کی توضیح یہ ہے کہ دین اسلام عقائد و اعمال کے مجموعے کا نام ہے۔ عقائد میں وہ تمام امور شامل ہیں جن پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص دائرہ ایمان و اسلام میں داخل نہیں



ہو سکتا۔

حقوق اللہ :- اعمال کی دو بڑی شاخیں ہیں۔ (۱) حقوق اللہ (۲) حقوق العباد اللہ کے حقوق وہی ہیں جن کو پانچ ارکان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی توحید و رسالت کا اقرار۔ نماز۔ زکات۔ حج۔ روزہ۔

حقوق العباد :- حقوق العباد دہندوں کے حقوق کی کسی شاخیں ہیں۔ ان میں سے بعض فرض واجب کے درجہ کے ہوتے ہیں۔ اور بعض مستحب کا درجہ رکھتے ہیں حقوق العباد بحیثیت مجموعی اخلاقیات میں ہی شمار ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا تعلق بندے کی اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ اور بعض کا مقصد دوسروں کو نفع پہنچانا۔ خدمتِ خلقِ اخلاق کی وہ قسم ہے جو دوسرے بندوں کی فیض رسانی سے متعلق ہے۔ اس کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ والدین و اولاد اور زوجین (خاوند و بیوی) کے حقوق سے لے کر یتیموں مسکینوں اور بیماروں کے حقوق تک اس میں آجاتے ہیں۔

لظاہر روزی کمانا ایک ذاتی فعل ہے جو اپنے مفاد کے لئے انجام دیا جاتا ہے۔ مگر اس میں بھی خدمتِ خلق کی روح پیدا کی جاسکتی ہے۔ اگر انسان اپنے ذاتی فرائض تنہا ہی مستعدی سے انجام دے۔ تجارت کے دوران کسی سے دھوکہ نہ کرے۔ پورا بازار ہی نہ کرے اور جائز نفع کھائے تو ایسا شخص ملک و ملت کی اخلاق و اقتصادی ترقی میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔ جو لوگ حکومت کے مناصب جلیلہ پر فائز ہیں۔ ان میں خدمتِ خلق کے جذبہ کا ہونا از بس ناگزیر ہے۔ اسی جذبہ کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ عوام حکومت سے متعلق معاملات میں دادرسی کے لئے عرصہ دراز تک دفتروں کا طواف کرنے کے باوجود تحصیل مقصد میں ناکام رہتے ہیں۔ جو حکام احساسِ فرضِ شناسی کے ساتھ ساتھ خدمتِ خلق کے جذبہ سے سرشار ہوتے ہیں وہ پبلک کے کام انجام دیتے ہیں تغافلِ شعاری کے مزکب نہیں ہوتے۔

دنیا میں داد و ستد کا سکہ جاری ہے اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے کے اصول پر عمل کرنا عوام الناس کی خدمتِ خلق کی اہمیت



فطرت کا ایک لازمی جزو بن چکا ہے۔ ایک انسان دوسرے سے اچھا سلوک کرتا ہے تو پہلے سوچ لیتا ہے کہ اسے کیا صلہ ملے گا۔ جب تک یہ محرک موجود نہ ہو کوئی قدم نیکی کی طرف اٹھتا ہے نہ دوسرے کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ خود غرضی اور نفسا نفسی کے اس جذبہ کے عین برخلاف دین اسلام انسان میں یہ روح پیدا کرنا چاہتا ہے کہ بعض کام ذاتی مفاد سے بلند ہو کر انجام دینا عین تقاضائے انسانیت و اخوت ہے۔ اسی کا نام خدمتِ خلق ہے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست

بہ تسبیح و سجادہ و دولق نیست

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے۔

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

ہر کہ خود را دید او محسروم شد

قرآن کریم میں اہل ایمان کی خصوصی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

وہ اپنے پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں وہ خود ضرورت مند کیوں نہ ہوں۔

”يُؤْتِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ“ (المحذ۔ ۹)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے لئے مسکین یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

”وَيُطْعِمُونَ الطَّلَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا“

(پارہ ۲۹۔ رکوع ۱۹)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

”تیمامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے ایک بندے سے فرمائے گا۔“ اے میرے بندے

میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا نہ کھلایا۔ میں پیاسا تھا تو نے مجھے پانی نہ پلایا۔ میں بیمار تھا تو نے میری تیمارداری نہ کی۔ میں حاجت مند تھا تو نے میری حاجت روائی نہ کی۔“ بندہ عرض کرے گا۔“ اے میرے پروردگار تو تو ان سب باتوں سے پاک ہے۔ تجھے بھوک پیاس کی



کیا حاجت! اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ "میرا فلاں بندہ پیاسا تھا تو نے اسے پانی نہ پلایا تو نے گویا مجھے پانی نہ پلایا۔ میرا فلاں بندہ بھوکا تھا تو نے اسے کھانا نہ کھلایا۔ میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کی تیمارداری نہ کی۔ تو نے گویا میری تیمارداری نہ کی۔ میرا فلاں بندہ محتاج تھا تو نے اس کی حاجت روائی نہ کی۔ تب اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دے گا اور وہ اسے کھینچتے ہوئے دوزخ میں لے جائیں گے۔" (صحیح بخاری)

دنیا میں وہی قوم فلاح و بہبود سے بہکنار ہو سکتی ہے جس میں خدمتِ خلق کا بھرپور جذبہ موجود ہو۔ جو ایثار و قربانی کی روح سے سرشار ہو جو ملک و ملت کے وقار کی خاطر ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہو اور وقت آنے پر اپنا تن من دھن قربان کرنے سے ڈرہ بھر دریغ نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بڑا دشوار ہے اور اس کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے مسلمان کا زاویہ نگاہ یہ ہونا چاہیے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا کا عطا کردہ ہے۔ وقت صحت دولت اور دیگر لوازم حیات سب خدا کی داد ہیں۔ اگر انسان ان تمام وسائل کو صرف ذاتی راحت و آرام کی خاطر صرف کرتا ہے تو وہ حد درجہ خود غرض اور تجمل ہے۔ جس طرح مال کی زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے۔ اسی طرح بدن کی زکوٰۃ بھی واجب اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تندرست و توانا بنایا ہے تو اس کی عطا کردہ قوت و طاقت کا کچھ حصہ خدمتِ خلق کے لئے بھی وقف ہونا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر روز جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو انسان کے ہر جوڑ پر صدقہ واجب ہو جاتا ہے۔ اگر تو دو آدمیوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کرے تو یہ صدقہ ہے تو کسی آدمی کو سوار ہونے میں مدد دے تو یہ صدقہ ہے تو اسے سواری پر بٹھائے یا اپنی سواری پر اس کا سامان رکھے تو یہ صدقہ ہے۔ کلمہ طیبہ صدقہ ہے۔ نماز کے لئے توجہ قدم اٹھاتا ہے صدقہ ہے۔ اگر تو کسی تکلیف دہ چیز کو راستہ سے ہٹا دے تو یہ صدقہ ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ خدمتِ خلق کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ ایثار بھی خدمت کی ایک بڑی اہم قسم ہے۔ ایثار کے معنی یہ ہیں کہ

خدمتِ خلق کے بارے میں  
آنحضرت کا عملی نمونہ



قربانی کے جذبہ سے کام لے کر دوسروں کی ضروریات کو اپنی حاجات سے مقدم سمجھا جائے۔  
آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ میں ایثار کا وصف ایک نمایاں حیثیت رکھتا  
ہے جس کا اثر ہر موقع پر نظر آتا تھا۔ سیرت النبی جلد دوم سے چند واقعات پیش کئے  
جاتے ہیں۔

۱۔ حضرت فاطمہ زہرا سے آپ کو والہانہ محبت تھی۔ جب آپیں تو فرطِ محبت سے  
کھڑے ہو جاتے۔ پشانی کو بوسہ دیتے اور اپنی جگہ بٹھاتے۔ حضرت فاطمہ کی تنگ دستی  
کا یہ حال تھا کہ گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی۔ خود چکی پیستیں۔ خود ہی پانی کی مشک بھرتیں۔ چکی  
پیتے پیتے ہتھیلیاں گھس گئی تھیں اور مشک کے اثر سے سینہ پر نیل پڑ گئے تھے۔ ایک دن  
خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں۔ خود تو پاسِ جہا سے عرض نہ کر سکیں۔ جناب امیر نے ان  
کی طرف سے یہ حال عرض کیا اور درخواست کی کہ فلاں جنگ میں جو کنیزیں آئیں ہیں ان  
میں سے ایک کنیز مل جائے۔ آپ نے ارشاد فرمایا ابھی اصحابِ صفہ کا انتظام نہیں ہوا  
اور جب تک ان کا بندوبست نہ ہوئے۔ میں کسی اور طرف توجہ نہیں دے سکتا۔

۲۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے کام خود کر لیا کرتے تھے۔ پھٹا ہوا کپڑا اسی  
پیتے۔ جو یا مرمت کر لیتے۔ گھر کی صفائی کر دیتے۔ اونٹ اور بکری وغیرہ کو خود کھول بانڈھ  
دیا کرتے تھے جو لوگ بازار جانے سے معذور ہوں ان کا سودا سلف خرید لیا کرتے تھے۔  
یہ کام انجام دے کر آپ ان لوگوں کی خدمت کرتے جن سے یہ امور متعلق ہوتے تھے۔  
مدینہ میں ایک پاگل بڑھیا تھی ایک دن وہ آئی اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر کچھ کام کہنے لگی۔ آپ  
نے فرمایا: اے خاتون! تو جس کو چہر میں جانا چاہے میں تیرے ساتھ چلوں گا۔ پھر آپ  
اس کے ساتھ چل دیئے۔ ایک عورت مسجد نبوی میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔ وہ چند روزہ آئی  
حنور نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وفات پا چکی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ مجھے بناؤ اس کی  
قبر کہاں ہے؟ آپ قبر پر تشریف لے گئے اور نمازِ جنازہ پڑھی۔ (صحیح مسلم)

۳۔ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے کسی امر کی درخواست کی۔ فرمایا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تم  
کو دوں اور اہلِ صفہ کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ وہ بھوک سے لاچار ہوں۔



(مسند احمد جلد ۱ صفحہ ۷۹)

۴۔ ایک صحابی نے شادی کی سامانِ ولیمہ کے لئے گھر میں کچھ نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس جاؤ اور اٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ۔ وہ گئے اور جا کر لے آئے حالانکہ کاشانہ نبوت میں اس اٹے کے سوا شام کے کھانے کو کچھ نہ تھا۔

(مسند احمد جلد ۴ صفحہ ۵۸)

۵۔ ایک دفعہ ایک مہمان آیا۔ رات کو کھانے کے لئے صرف پکری کا دودھ تھا۔ وہ آپ نے اس کے نذر کر دیا۔ یہ تمام رات خانہ نبوی میں فاقہ سے گزری۔ اس سے پہلی شب میں بھی یہاں فاقہ ہی تھا۔

(مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۳۶۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے آپ سے خدمت کا جذبہ سیکھا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

### صحابہ کرام اور خدمتِ خلق

اپنے عہدِ خلافت میں عام لوگوں کی خدمت کرنے میں ذرہ بھر عار محسوس نہیں کرتے تھے جب آپ منصبِ خلافت پر فائز ہوئے تو آپ لڑکی آئی اور عرض کیا: اب آپ امیر المؤمنین بن گئے ہیں۔ اب ہماری بکریاں کون دو با کرے گا۔ حضرت ابو بکرؓ نے کہا: خدا کی قسم میں یہ خدمت بجالاؤں گا۔ میری خلافت اس خدمت کی انجام دہی میں سنگِ راہ نہ ہوگی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے عہدِ خلافت میں مجاہدین کی محاذِ جنگ سے آئی ہوئی چھٹیاں ان کے گھروں پر خود تقسیم کر آیا کرتے تھے۔ ان کی چوکھٹ پر بیٹھ کر چھٹیاں تحریر بھی کر دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ رات کے وقت حضرت عبدالرحمن بن عوف کے ساتھ مدینہ کی گشت کر رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک عورت نے ہنڈیا پر چٹھا رکھی ہے اور بچے پاس رو رہے ہیں۔ آپ نے بچوں کے رونے کی وجہ پوچھی تو عورت نے بتایا کہ بچوں کو بہلانے کے لئے خالی ہنڈیا چولھے پر رکھ دی ہے۔ آپ اسی وقت بیت المال گئے اور خورد و نوش کا سامان اٹھا کر لے آئے۔ غلام نے بوجھ اٹھانے پر اصرار کیا تو فرمایا: "قیامت کے روز میرا بوجھ کون اٹھائے گا؟" یہ سامان عورت کے حوالے کیا جب کھانا تیار ہو گیا اور بچے کھا کر سو گئے تو آپ واپس لوٹ آئے۔ (الفاروق شبلی)



حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جنت اس شخص کی مشتاق رہتی ہے جو اپنے مومن بھائی کی حاجت روائی کرتا ہے۔ (کنز العمال)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے خدمتِ خلق کا جو نمونہ ہم پہنچایا وہ آپ دیکھ چکے۔ اب اس ضمن میں آپ کے

خدمتِ خلق کے بارے میں  
احادیث نبویہ

چند اقوال و ارشادات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ تم مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے محبت کرنے اور شفقت سے پیش آنے میں جسم انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو تو بدن کے سارے اعضاء بجا اور بے غواپی میں ہتلا ہو جاتے ہیں۔ (صحیح مسلم)

۲۔ جو شخص اپنے کسی بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہتا ہے۔ خدا اس کی ضرورت پوری کرے گا جو کسی مسلمان کی تنگی کو دور کرے گا۔ تو خدا اس کے بدلہ قیامت میں اس کی تنگی کو دور فرمائے گا۔ (ابوداؤد)

۳۔ جو کسی مسلمان کی دنیوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا۔ اور جو کسی تنگ دست پر آسانی کرے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس پر آسانی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی بدد میں رہتا ہے۔ جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے۔

(ابوداؤد)

۴۔ جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کا سامان تیار کیا وہ گویا جہاد میں شریک ہوا۔ جس نے مجاہد کے بعد اس کے گھر والوں کی خبر گیری کی وہ جہاد میں شامل ہوا۔

۱۔ زکوٰۃ میں طرح مال میں فرض ہے اسی طرح جسم انسانی میں بھی

خدمتِ خلق کے ثمرات و نتائج

زکوٰۃ ہے اور وہ خدمتِ خلق ہے۔



۲۔ خدمتِ خلق ارتقا پر قوم و وطن کا ذریعہ ہے۔ کوئی قوم خدمتِ خلق کے جذبہ کے بغیر شاہراہ ترقی پر گامزن نہیں ہو سکتی۔

۳۔ خدمتِ خلق اخروی فلاح و نجات اور رضائے الہی کی موجب ہے۔

۴۔ خدمتِ خلق اسوۂ نبوی ہے۔ جو شخص اس وصف سے بہرہ ور ہے وہ مشیحِ سنت ہے۔

۵۔ خدمتِ خلق سے انسان میں الفت و مودت کا جذبہ ابھرتا اور بے مروتی اور بدسلوکی کے جذبات فنا پذیر ہوتے ہیں۔

۶۔ خدمتِ خلق کرنے والا عالمگیر جذبہ انہوت و مودت سے سرشار ہوتا ہے اور بنی نوع انسان میں محبت کے روالبط استوار کرتا ہے۔

۷۔ جو قوم اس جذبہ سے عاری ہو وہ بقا و دوام حاصل نہیں کر سکتی۔

۸۔ خدمتِ خلق اخلاقی روحانی معاشرتی عمرانی اور اقتصادی ترقی کی ضامن ہے۔

۹۔ خدمت سے فضیلت و عظمت حاصل ہوتی ہے۔ مشہور ہے۔

سَيِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ (قوم کا سرور ان کا خادم ہوتا ہے)

فاروق اعظمؓ اپنے آپ کو اَجِيرُ الْمُسْلِمِينَ (مسلمانوں کا مزدور) کہا کرتے تھے ایک دن سرکاری اونٹوں پر تیل مل رہے تھے۔ ایک صحابی نے کہا یہ کام کسی غلام سے لینا چاہیے۔ فرمایا مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہو سکتا ہے۔

## سوالات

- ۱۔ اسلامی اخلاق میں خدمتِ خلق کو کیا اہمیت حاصل ہے؟
- ۲۔ خدمتِ خلق کے بارے میں قرآنی تعلیمات کا خلاصہ لکھئے؟
- ۳۔ کم از کم دو احادیث لکھئے جن میں خدمتِ خلق کی تعلیم دی گئی ہو۔
- ۴۔ خدمتِ خلق کے بارے میں اسوۂ نبویؐ کیا تھا واقعات سے ثابت کیجئے۔
- ۵۔ خدمتِ خلق کا دائرہ کس حد تک وسیع ہے اس میں کون کون سے امور داخل ہیں۔



# عالمی زندگی رکن ہے

۱۴۷

**مفہوم** کنبہ کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جو بل جمل کر ایک گھر میں زندگی بسر کرتے ہوں۔ کنبہ کے اس وسیع مفہوم میں گھر کے سب افراد شامل ہیں۔ یہاں تک کہ یہ لفظ نوکر چاکر، بونڈی، غلام اور دور نزدیک کے رشتہ داروں کو بھی اپنی وسعت میں سمولیتا ہے۔ مگر یہ وسعت و جامعیت اس میں استعمال کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جہاں تک لغوی حقیقت کا تعلق ہے۔ اہلی یا عائلی زندگی میں صرف میاں بیوی اور ان کی اولاد ہی داخل ہے۔ باقی لوگ ان کے اعوان و انصار یا متعلقین میں سے ہیں۔ لہذا اہلی (گھریلو) زندگی میں ان کی شمولیت تبعاً و ضمناً ہے۔

**اہلی زندگی کی اہمیت** اسلام اہلی زندگی کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس لئے کہ کنبہ تہذیب و تمدن کے لئے بنیادی اینٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا یہ اولین معاشرتی اکائی ہے۔ پہلے مرد تنہا ہوتا ہے۔ شادی کے بعد بیوی گھر میں آتی ہے۔ پھر اولاد پیدا ہوتی ہے۔ اس سے ایک کنبہ معرض وجود میں آتا ہے۔ چند کنبوں کے ملنے سے ایک برادری کی بنا پڑتی ہے۔ چند برادریوں کی آمیزش سے ایک معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ جسے قوم کے لفظ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ دنیا کی مختلف اقوام کے اختلاط سے انسانی برادری وجود میں آتی ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ انسانی برادری کے قیام و بقا میں کنبہ کو وہی حیثیت حاصل ہے جو اینٹ اور پتھر کو تعمیر مکان میں۔ ہر عمارت کے لئے اینٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ عمارت کی مضبوطی و پائیداری کا انحصار اینٹ کی پختگی اور مضبوطی پر ہوتا ہے۔ قومی نظام کو مضبوط اور صحت مند بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس نظام کی اینٹیں مضبوط اور زندگی کے حوادث و آلام کو برداشت کرنے والی ہوں۔ قوم کے افکار و خیالات، اس کے جذبات و احساسات، اس کی آئندہ امنگیں اور امیدیں بڑی حد تک گھریلو ماحول کے زیر اثر پڑوان چڑھتی ہیں۔ قوم



جن خیالات کو آنے والی نسلوں کے دلوں اور دماغوں میں داخل کرنا چاہتی ہے۔ وہ گھر کو ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں اور غیر شعوری طور پر گھر کی چار دیواری میں پتے بڑھتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔ گویا گھر اور کنبہ کا ماحول اولین درس گاہ ہے۔ جہاں بچہ اپنی تربیت کا آغاز کرتا ہے۔ اور گھر کا ماحول اچھا ہوگا۔ تو پیدا ہونے اور پلنے والے بچے اچھا دل و دماغ، اچھی سیرت و کردار لے کر بڑے ہوں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قوم بھی اچھے دماغ، اچھے دل اور اچھے کردار والی بن جائے گی اور اگر بچے حدود و عداوت اور ذہنی پستی کا شکار ہوں گے تو وہ اسی حد تک قوم کو بھی پست اور کمزور بنا دیں گے گویا آئندہ نسلوں کی تربیت کا طبعی سکول یہی اہلی زندگی ہے۔ اور اسی پر پوری قوم کے کردار کا دار و مدار ہے۔

اسلام نے اہلی زندگی کو کامیاب اور یا مقصد بنانے کا جو اہتمام کیا ہے۔ کسی اور مذہب یا کسی اور ضابطہ و قانون نے اس تفصیل سے اس پر روشنی نہیں ڈالی اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے تمدن کی اس ضرورت کو کتنا اہم قرار دیا ہے بخلاف انہیں دیگر مذاہب نے اسے چنداں اہمیت نہیں دی۔ مثلاً مسیحیت نے قوم کے اکابر اور صلحاء کے لئے نکاح کو مفید نہیں سمجھا بلکہ اس کو اونے درجہ دے کر اس کی اہمیت کو کم کیا ہے۔ اسلام نے نکاح کی اہمیت پر زور دیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جو لوگ اس ذمہ داری کو نہیں اٹھا سکتے۔ وہ مناسب وقت کے منتظر رہیں یا اسلام سے پہلے اپنی زندگی کی حالت نہایت اتر چکی۔ عورت کو ذاتی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ اس کی کوئی قانونی اور ذاتی حیثیت نہ تھی۔ جب تک اس کا خاوند اسے پسند کرتا۔ اسے اپنے پاس رکھتا۔ جب چاہتا چھوڑ دیتا۔ نہ رکھنے کی شرائط تھیں نہ چھوڑنے کی۔ اگر خاوند مر جاتا تو اس کے بیٹے اس عورت کے ساتھ منانی کارروائی کرتے۔ عورت پر روٹی کمانے کی ذمہ داری بھی ڈال دی جاتی تھی۔ بعض قبیلوں میں شادی بیاہ کا بھی کوئی مکمل نظام نہ تھا۔ اسلام نے اگر نہایت قلیل عرصہ میں اس اخلاق سوز اور پست تمدن کو ایک پاک اور مضبوط تمدن بنا دیا۔ نکاح کے قواعد بتائے، عورت کے حقوق قائم



کئے۔ اسے ورثہ میں حصہ دلایا۔

## اہلی زندگی کا نقطہ آغاز

اسلامی زاویہ نگاہ کے مطابق انسانیت کا آغاز ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام ہوا

حضرت حوا کو حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کیا اور پھر ان سے نسل انسانی کا آغاز ہوا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ  
وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ  
مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً

(سورہ نساء - ۱)

جس نے تم کو ایک جان (حضرت آدم) سے پیدا کیا اور اسی سے پیدا کیا۔ اس کا جوڑا حضرت حوا اور پھیلائے ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

« حضرت حوا کو حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا کیا پھر ان دونوں سے تمام مرد اور عورتوں کو پیدا کیا اور دنیا میں پھیلا یا تو حقیقت میں گویا تمام انسان اللہ تعالیٰ نے ایک جان حضرت آدم سے پیدا کئے مطلب یہ ہے کہ جب تم سب کو عدم سے وجود میں لانے والا اور پھر تم کو باقی اور قائم رکھنے والا وہی ہے تو اسی سے ڈرنا اور اسی کی اطاعت کرنا چاہیے »

مذکورہ صدر آیت کریمہ سے عیاں ہوا کہ اس کائنات ارضی پر آباد ہونے والا پہلا کنبہ حضرت آدم و حوا کا تھا۔ اس سے اہلی زندگی کی اہمیت واضح ہوتی۔ قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کا ذکر کرتے ہوتے فرمایا۔

ہم نے آپ سے قبل بہت سے رسولوں کو بھیجا۔ اور ان کو بیوی بچوں والا بنایا۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ سَلْمَانَ  
قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمَا امْرَأَتَيْنِ  
وَأُولَادًا مِمَّا كَرِهَتْ

رُذَيْبَةَ (رعد - ۱۵)

اس سے یہ ظاہر کہ نامقصود ہے کہ انبیاء جو دنیوی الجھنوں سے امکانی حد تک



گمراہاں رہتے ہیں۔ پھر وہی زندگی بسر نہیں کرتے تھے۔ بلکہ خانگی زندگی کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ "احیاء علوم الدین" میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں صرف شادی شدہ انبیاء کا ذکر کیا ہے۔ کسی غیر شادی شدہ نبی کا ذکر قرآن میں نہیں آیا۔ فرماتے ہیں "حضرت یحییٰ بھی شادی شدہ تھے۔ حضرت عیسیٰ آسمان سے نازل ہو کر شادی کریں گے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ان لوگوں کی مدح فرماتے ہیں جو اس سے طالب اولاد ہوتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا  
هَبْ لَنَا مِنْ أَنْزَلِ وَأَجْنِبْنَا  
ذُرِّيَّتَنَا فِتْنَةً أَعْيُنِنَا (قرآن ۷۴)

جو لوگ کہتے ہیں ایسی بیویاں اور  
اولاد عطا کر جو موجب راحت و  
سرور ہو۔

**حدیث نبوی سے اہلی زندگی کی تاکید** بعض لوگ اہلی زندگی کی نازک ذمہ داریوں سے گھبرا کر مجرور رہنا چاہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس ضمن میں فرماتے ہیں۔

۱۔ جو شخص میرے اور داؤد و سلیمان اور ابراہیم علیہم السلام کے دین پر ہے اگر اسے توفیق ہو تو نکاح کرے (کنز العمال)

۲۔ جو آدمی نکاح کا مقدر رکھتا ہو اور نکاح نہ کرے اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں (کنز العمال)

۳۔ جس کو میری فطرت سے محبت ہے وہ میری سنت پر چلے اور وہ نکاح ہے۔ (تفسیر نیشاپوری)

۴۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اے جو انواتم میں سے جو آدمی مہر و نفقہ کی استطاعت رکھتا ہو وہ نکاح کرے۔ کیوں کہ اس سے نگاہ پاک رہتی ہے اور اخلاق کی حفاظت ہوتی ہے جو شخص نکاح کی استطاعت نہ رکھتا ہو اسے چاہیے کہ روزے رکھے۔ (صحیح مسلم)

۵۔ انسان کے میزان اعمال میں جو چیز سب سے پہلے رکھی جاتی گی وہ اس کا کنبہ



پر کیا ہوا خرچ ہوگا۔ (کنز العمال جلد ۸)

۶۔ جب کوئی شخص اپنا خانگی کام انجام دینے کے لئے نکلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم کے بدلہ میں ایک درجہ بکھتا ہے۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہو جاتا ہے۔

تو اسے بخش دیتا ہے۔ (کنز العمال جلد ۸)

۷۔ وہ بیوہ عورت جو اولاد کی پرورش کر کے تکلیف اٹھاتی ہے۔ قیامت کے روز اس

طرح میرے قریب ہوگی۔ جیسے میرے ہاتھ کی دو انگلیاں (مشکوٰۃ)

۸۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نکاح کے لئے دیندار عورت کا انتخاب کرنا

چاہیے نیز فرمایا کہ دنیا کی عزیز ترین متاع نیک عورت ہے۔ (کنز العمال)

۹۔ آپ نے فرمایا: مباح چیزوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین چیز

نکاح ہے۔ (تفسیر مدارک)

۱۰۔ آپ نے فرمایا جو شخص افلاس کے ڈر سے شادی نہ کرے وہ ہمارے طریقہ

پر نہیں (بالاحیاء)

۱۱۔ بشر بن حارث فرمایا کرتے تھے کہ احمد بن حنبل مجھ سے تین

باتوں میں فوقیت لے گئے (۱) وہ اپنے اور دوسروں کے لئے

حلال روزی کھاتے ہیں اور میں صرف اپنے لئے روزی کی فکر کرتا ہوں (۲) امام احمد

شادی شدہ ہیں اور میں غیر شادی شدہ (۳) انہیں امامت عامہ کا منصب حاصل ہے

اور میں اس منصب پر فائز نہیں۔

۱۲۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ امام احمد کی بیوی فوت ہو گئی تو انہوں نے دوسرے ہی

دن شادی کر لی اور فرمایا کہ میں تجرد کی حالت میں رات گزارنا پسند نہیں کرتا۔

۱۳۔ سفیان بن عیینہ کا قول ہے زیادہ عورتوں (شرعی حدود کے اندر) کو نکاح میں

لانا دنیوی کام نہیں بلکہ ایک دینی امر ہے وہ اس کی دلیل یہ دیتے تھے کہ حضرت

علی رضی اللہ عنہ اصحاب رسول میں سے بڑے زاہد تھے حالانکہ آپ کی چار

بیویاں تھیں۔



۴- حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ اہل و عیال کی حفاظت و نگہداشت جہاد سے بھی افضل ہے (دیکھتے سعادت)

۱- بقائے نسل

اہلی زندگی کی

دینی نقطہ نظر سے عائلی زندگی کا اہم مقصد نسل انسانی کا تحفظ و بقا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

غرض و غایت

إِنِّي مَفْخِرٌ بِكُمْ الْاُمَمِ (میں دوسری امتوں پر فخر کروں گا)

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کی کثرت کی بنا پر دوسری امتوں پر بروز قیامت فخر کریں گے۔ اکثر مفسرین لکھتے ہیں کہ اِنَّا اَعْطَيْنَاكَ الْكُوشَا (ہم نے آپ کو کثرت دی) میں کوشا کے لفظ سے امت محمدی کی کثرت مراد ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغۃ میں فرماتے ہیں۔

”چونکہ انسان کو یقیناً نسل کے لئے اولاد کی ضرورت تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ میاں بیوی دونوں حسین معاشرت کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ جب ان کے ہاں اولاد پیدا ہونے لگتی ہے۔ تو طبیعتاً ان کے دل میں اپنی اولاد پر شفقت کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ دونوں مل کر تربیت اور ادا کا فرض ادا کرتے ہیں اولاد کی تربیت میں مال کا حصہ تقابلاً زیادہ ہے امور معاش میں وہ مرد کی نسبت کمتر درجہ رکھتی ہے۔ جیسا کہ اور شرم کی صفت اس کی سرشت میں داخل ہے۔ گھر ہی کے اندر رہ کر گھر کے کاروبار میں مشغول رہنا اس کے لئے بارہا خطر نہیں ہوتا۔ امور خانہ داری کو بہترین صورت پر انجام دینے کی قابلیت اس میں کامل طور پر موجود ہے“

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

نِسَاءُ كُنَّ نَحْوَكُم مَّا كَانُ

(سورہ بقرہ ۲۲۳)

تمہاری عورتیں تمہاری

کھیتیاں ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد و عورت کا تعلق باہم کسان اور کھیت کا سا ہے۔ کھیت میں کسان محض تفریح کے لئے نہیں جاتا بلکہ پیداوار حاصل کرنے جاتا ہے۔



اسی طرح، نسل انسانی کے کہان کو بھی انسانیت کی اس کھیتی میں اس لئے جانا چاہیے کہ وہ اس سے نسل کی پیداوار حاصل کرے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کو کھیتی کی حیثیت سے محروم کر دینا ایک غیر فطری اقدام ہے اور غیر شرعی بھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ ذیل احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

۱ - حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے نکاح کیا اس نے اپنے نصف دین کی تکمیل کر لی۔ اب اس کو چاہیے کہ باقی آدھے دین میں خدا سے ڈرتا رہے (بیہقی)

۲ - حضرت معقل بن یسار کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس عورت سے نکاح کرو جو شوہر سے محبت کرے اور زیادہ بچے پیدا کرنے والی ہو۔ اس لئے کہ میں دوسری امتوں کے مقابلہ میں اپنی امت کی کثرت پر فخر کروں گا (ابوداؤد نسائی)

۲۔ تربیت اولاد

گھر بچے کی اولین تربیت گاہ ہے۔ بچہ بچپن میں جو کچھ سیکھتا ہے وہ اس کے ذہن میں راسخ ہو جاتا ہے اور گھر

فراموش نہیں ہوتا اگر میاں بیوی دیندار، راست باز، شریف اور خوش اخلاق ہوں تو یقیناً ان کی اولاد بھی ان صفات کی حامل ہوتی ہے اور اگر وہ دین سے بیگانہ، امانت و دیانت سے دور اور لڑائی جھگڑے کے دلدادہ ہوں تو ان کی اولاد بھی اسی رنگ میں رنگا جاتی گی۔ دیندار والدین بچے کو شروع ہی سے دینی ماحول میں تربیت دیتے ہیں۔ اس کے دل میں ایمان کا جذبہ پیدا کرتے ہیں بچے کو آغاز کار ہی سے اسلامی آداب و اطوار کا جو گہ بنا تے ہیں۔ آج کل توجوانوں کے اخلاق کا بگاڑ ان کی غیر دینی تربیت کا آئینہ دار ہے جب بچہ گھر کے ماحول میں شروع ہی سے ریڈیو کے فحش گانے سننے کا جو گہ چمکا ہو۔ راتیں والدین کے ساتھ سینما ہال میں بسر ہوتی ہوں تو وہ جوان ہو کر اکیوں کو عاداتِ قلیبہ کا رسیا بنے ہوگا۔

چونکہ بچے اپنی پرورش میں والدین کے دست نگر ہوتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ان کے دلوں میں بے پناہ شفقت و ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا



تاکہ وہ تربیت اولاد کا فرض انجام دے سکیں۔ ان کی تربیت ایسے طریقہ پر کی جائے جس سے ان کی زندگی سنور جائے۔ والدین اپنی اولاد کے حق میں بزرگ محترم ہونے کے علاوہ ان کے محسن بھی ہیں۔ اولاد کی تربیت میں انہوں نے وہ تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ جن کا اندازہ لگانا مشکل ہے ان وجوہ کی بنا پر والدین کی تعظیم اولاد کا فرض اولین ہے۔

حضرت عید اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خبردار! تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ امام و خلیفہ لوگوں کا نگہبان ہوتا ہے۔ لہذا اس سے اس کی رعیت کی بابت پوچھا جائے گا۔ مرد اپنے گھر والوں کا نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعیت کی بابت سوال ہوگا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر کی محافظ ہے اور اس سے اس کے بارے میں دریافت کیا جائے گا۔ غلام اپنے آقا کے مال کا محافظ ہے اس سے اس کی بابت پوچھا جائے گا۔ خبردار! تم میں سے ہر شخص اپنی رعیت کا نگہبان ہے اور اس سے اس ضمن میں سوال کیا جائے گا۔ (بخاری و مسلم)

اس حدیث سے اولاد کی تربیت کی اہمیت واضح ہوتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کی نیک تربیت کرنا اسے اسلامی، اخلاق و آداب کا خوگر بنانا اور اس میں دینی شعائر کی محبت پیدا کرنا صرف ایک نیک کام ہی نہیں بلکہ ایک دینی فریضہ بھی ہے۔

۳ غَضُّ بَصَرٍ (نگاہ کا نیچا رکھنا)

اہلی زندگی کا تیسرا نائدہ یہ ہے کہ اس سے اخلاقی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کے فوائد گناتے ہوئے ارشاد فرمایا: "إِنَّهُ يَخْصُصُ الْبَصَرَ" اس سے نگاہ نیچے جھک جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا جو مالی اعتبار سے خوشحال ہوں وہ شادی کر لیں کیونکہ اس سے نگاہ جھک جاتی ہے اور بوشخص اس استطاعت سے بہرہ ور نہ ہو اسے چاہیے کہ روزے



رکھے (مسلم) ایک حدیث میں آپ نے نکاح کو نصف ایمان فرمایا۔ حدیث میں وارد ہے کہ چند صحابہ کرام مسجد نبوی میں مختلف خیالات کا اظہار کر رہے تھے کسی نے کہا میں ہمیشہ روزہ دار رہوں گا۔ دوسرا بولا میں رات بھر عبادت میں مصروف رہوں گا۔ تیسرا کہنے لگا میں بیوی بچوں سے قطع تعلق کر لوں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب گفتگو سن لی۔ مسجد میں تشریف لا کر فرمایا تم ایسے خیالات کا اظہار کر رہے ہو۔ میں سید الانبیاء ہوں اور میری نو بیویاں ہیں۔ اس سے نکاح کی غرض و غایت و اشکاف ہوتی ہے۔

دیندار خادما اور دیندار بیوی ایک دوسرے کا اخلاق سنوارنے میں بہت اہم کردار انجام دیتے ہیں۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ امکانی حد تک دیندار بیوی تلاش کرنا چاہیے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ صالح اور دیندار بیوی دنیا کی افضل ترین متاع ہے۔ (کنز العمال)

#### ۴۔ سکون و اطمینان

حضرت حوا کی تخلیق کی غرض قرآن نے یوں بیان فرمائی لَيْسَكُنِ الْيَسَاءُ

رَتَاكَ اَوْ مَحْوَا سَكُونًا حَاصِلًا كَرِيْمًا

دوسری جگہ ارشاد ہوا

وَمِنْ آيَاتِهِ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ

مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لَتَسْكُنُوا

اِلَيْهَا ۝ (الروم - ۲۱) کیں تاکہ تم ان سے سکون پاؤ۔

ان آیات میں بیوی کو وجہ سکون قرار دیا۔ اگر گھر میں امن و آسشتی کا ماحول ہو تو ایسا گھر جنت ارضی قرار دینے کے قابل ہے میان بیوی کے حسن سلوک سے جو قرار و سکون حاصل ہوتا ہے وہ دولت کے ایک انبار سے بھی میسر نہیں آسکتا۔ جب والدین امن و چین کی زندگی بسر کر رہے ہوں تو بچوں کی تربیت بھی نہایت خوشگوار ماحول میں ہوگی۔ مرد چونکہ معاشی امور کا قبیل ہوتا ہے اس لئے اسے رزق کی تلاش میں سرگرداں بنا پڑتا ہے جب وہ محنت و مشقت سے روزی کما کر گھر پہنچتا ہے تو گھر کے پر سکون ماحول سے



اس کی ساری کلفت کا فورہ ہو جاتی ہے، الغرض اہلی زندگی کے دم سے کائنات ارضی کی یہ رونق و شادمانی قائم ہے۔ بخلاف ازیں بجز زندگی سراسر وحشت و مایوسی کی زندگی ہے۔

۵۔ احساسِ ذمہ داری

خانگی زندگی کے فرائض انسان میں احساسِ ذمہ داری کے جذبہ کو جنم دیتی ہے صاحب خانہ میں یہ احساس کو دٹ لیتا ہے کہ وہ تنہا نہیں بلکہ ایک بیوی کا خاوند اور چند بچوں کا باپ ہے۔ ظاہر ہے کہ بیوی اور بچے طرح طرح کی ضروریات رکھتے ہیں جن کے مہیا کرنے کے لئے اسے سخت محنت کی ضرورت ہے شادی بیاہ سے قبل اس کی بے کاری اور تن آسانی صرف اس کی ذات کے لئے ضرور رساں تھی۔ مگر اب پورا کنبہ اس کی لپیٹ میں ہے۔ بدیں و بوجہ مرد رزق کے نت نئے وسائل تلاش کرنا اور اپنی آمدنی کو بڑھانے کے لئے کوشاں رہتا ہے تحصیل رزق کے لئے اس کی یہ جدوجہد رائیگاں نہیں جاتی۔ ما، اللہ تعالیٰ اس میں برکت پیدا کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا۔

غیر شادی شدہ مردوں اور ان غلاموں اور لونڈیوں کی شادی کر دو جو نکاح کے قابل ہیں اگر وہ تنگ دست ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا

(سورہ نور)

## سوالات

- ۱۔ اہلی زندگی کی اہمیت واضح کیجئے۔
- ۲۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے عائلی زندگی کی غرض و غایت کیا ہے۔ تفصیلاً لکھئے۔
- ۳۔ حدیث نبوی کی روشنی میں اہلی زندگی کس اہمیت کی حامل ہے۔ احادیث سے ثابت کیجئے۔
- ۴۔ قرآن کس حد تک اہلی زندگی کی تاکید کرتا ہے کم از کم دو آیات لکھئے۔



## حقوق والدین و اولاد

**اسلام میں حقوق کی اہمیت** چونکہ انسان کا تعلق کائنات اور عیسیٰ کی ہر چیز سے ہے۔ اس لئے اس پر ہر چیز کی ذمہ داری کا بوجھ بھی ڈالا گیا ہے۔ حفاظت و نگہداشت کی ذمہ داری کا نام حق ہے اس کی جمع حقوق ہے۔ انسان پر جمادات کا حق یہ ہے کہ ان کو بلاوجہ تکلیف نہ پہنچاتی جاتے اور ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھا جاتے نباتات کا حق یہ ہے کہ ان کو نشوونما اور تربیت کا موقع دیا جاتے ایک انسان پر دوسرے نبی نوع انسان کا حق یہ ہے کہ بوقت ضرورت ان کی مدد کی جاتے اور ان سے ہر موقع پر الفت و محبت کا سلوک روا رکھا جاتے۔ خود انسان کا اپنے اوپر بھی حق ہے کہ اس کا ہر عضو جس غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس سے وہی کام عدل و انصاف کے اندر لیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”بے شک تیری جان کا تجھ پر حق ہے۔ تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے (صحیح بخاری)“

اسی لئے درخت لگانا اسلام میں کارِ ثواب سمجھا گیا ہے آپ نے فرمایا ہے جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے تو جو پرندے یا جانور یا انسان اس کا پھل کھاتے ہیں۔ اس کا ثواب درخت لگانے والے کو ملتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

آپ نے پھلدار درخت کو بلاوجہ کاٹنے سے منع فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تمثیلی حکایت میں فرمایا کہ ایک شخص کو صرف اس لئے بخشا گیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی اور ایک عورت پر صرف اس لئے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بٹی کو باندھا اور اس کو کھانے پینے کو نہیں دیا یہاں تک



کہ وہ اسی طرح سسک سسک کر مر گئی۔ ایک اور شخص نے چینی ٹی کو جلا دیا تھا۔  
بنائیں اس سے باز پرس کی گئی۔ (بخاری)

حقوق کی ادائیگی میں اسلام نے ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی ہے۔ ہر ایک کا درجہ  
اور مرتبہ الگ الگ مقرر کر دیا ہے۔ مثلاً ایک حیوان کے مقابلہ میں ایک انسان کی مدد ایک  
اجنبی شخص کے مقابلہ میں ایک دوست کی بیگانوں کے مقابلہ میں ایک عزیز کی اور ان  
عزیزوں میں بھی قرابت کی دوری و نزدیکی کی ترتیب پیش نظر رکھی گئی ہے مگر یہ ترتیبی امداد  
حق کی شرط کے ساتھ مشروط ہے اگر کوئی قریبی عزیز یا ظل پر ہو تو اس کے مقابلہ میں  
اس غیر کی امداد جو حق پر ہے فرض ہے۔

رشتہ داروں کے حقوق اور اسلام  
دین اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب  
میں انسانی حقوق کی درجہ دار کوئی

تفصیل نہیں ہے مثلاً بدھ کی اخلاقی تعلیم میں قوم قبیلہ اور خاندان کی کوئی تمیز نہیں بلکہ  
سرے سے رشتہ اور قرابت ہی کی کوئی تفصیل موجود نہیں۔ ہندو مذہب میں گنہ ماں اور لشی  
ہونے کے باوجود ماں کا درجہ پاسکتی ہے۔ یہودیت اور عیسائیت میں تمام رشتہ داروں  
کو چھوڑ کر صرف ماں باپ کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے حق اطاعت کو تسلیم کیا گیا ہے باقی  
رشتہ داروں کو کوئی مرتبہ نہیں دیا گیا۔ لیکن اسلام نے اس مسئلہ میں پوری تفصیل سے  
کام لیا ہے۔

اسلام نے اقارب کے حقوق میں جو ترتیب ملحوظ رکھی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ  
قرابت میں جس کا درجہ زیادہ ہے اس کا حق بھی بڑھ کر ہے۔ مثلاً ماں کا تعلق سب سے  
گہرا ہے پھر باپ کا، پھر بھائی کا اور اسی ترتیب سے ان کا حق ادا کرنا بھی ضروری ہے  
اسلامی نقطہ نظر سے یہ نیکی نہیں کہ اپنی عزیز اور بیمار ماں کو چھوڑ کر کوئی اپنے عزیز اور  
بیمار پڑوسی کی خدمت کے لئے آمادہ ہو جائے یہ ایثار نہیں بلکہ ظلم ہے۔

والدین کے حقوق  
والدین کی عزت، خدمت اور اطاعت حضرت موسیٰ  
حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی



تعلیمات میں یکساں ضروری قرار دی گئی ہے انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول یوں نقل کیا گیا ہے۔

”خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کرو اور جو ماں باپ پر لعنت کرے جان سے مارا جائے۔ تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے باپ یا ماں کو کہے کہ جو کچھ مجھے تجھ کو دینا واجب تھا وہ خدا کی نذر ہوا اور اپنے باپ یا ماں کی عزت نہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ پس تم نے اپنی روایت سے خدا کے حکم کو باطل کر لیا“

(رمتی - ۱۵-۱۶)

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں اگرچہ اس حد تک افراط نہیں پاتی جاتی کہ ”جو ماں باپ پر لعنت کرے، جان سے مارا جائے“ تاہم آپ نے والدین کے حقوق کی ادائیگی اور ان کا اکرام و احترام بجالانے کی بے حد تاکید کی ہے۔ ایک شخص نے بارگاہ نبویؐ میں حاضر ہو کر عرض کی کہ میں مالدار اور صاحب اولاد ہوں۔ میرے والدین بھی میرے مال کے محتاج ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”تم بھی اپنے باپ کا مال ہو اور تمہارا سب اثاثہ بھی (ابو داؤد) سالار رسل صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد خدمت والدین کا درجہ قرار دیا اور اس کے بعد جہاد کا (ریاض الصالحین)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! والدین کا اولاد پر کیا حق ہے آپ نے فرمایا ”وہ تیرے لئے جنت بھی ہیں اور دوزخ بھی (ابن ماجہ)“

دین اسلام تورات و انجیل کی طرح نہ صرف والدین کی عزت مال کا درجہ اور ان سے ڈرنے رہنے کی تاکید کرتا رہتا بلکہ سب سے پہلا یہ واضح کرتا ہے کہ ماں اور باپ میں بھی سب سے بڑا درجہ ماں کا ہے۔ اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ ماں اپنی نسوانی کمزور کے باوجود حمل، وضع حمل اور تربیت اولاد کے دوران سینکڑوں مہینوں سے دوچار ہوتی ہے والدہ یہ سارے مصائب ہنسی خوشی برداشت کرتی چلی جاتی ہے اور ان کا پیشانی تک ٹیک نہیں آتا۔



قرآن کریم میں فرمایا

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ  
إِحْسَانًا وَهَمَلْتُمْ أُمَّهَاتُكُمْ  
كُتُوبًا وَأَضَعْتُم كُرْهُنَّ

اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے  
ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے اس کی ماں  
نے اس کو تکلیف کے ساتھ بیٹھیں رکھا  
اور تکلیف کے ساتھ جانا۔

(سورہ احقاف ۱۲)

۱۔ حدیث نبویؐ میں والدہ کے ادب و احترام کی مزید تاکید کی گئی ہے ایک شخص نے  
خدمت اقدس میں آکر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ میرے حسن سلوک کا سب سے  
زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں، پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں۔ اس نے  
عرض کیا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں۔ تین دفعہ آپ نے یہی جواب دیا۔ چوتھی مرتبہ  
پوچھنے پر ارشاد ہوا "تیرا باپ اور اس کے بعد درجہ بدرجہ قرابت دار

(بخاری و مسلم)

۲۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار بڑے گناہوں کا ذکر کیا اور سرفہرمت  
ماں کی نافرمانی کو قرار دیا اور فرمایا کہ تمہارے خدا نے ماں کی نافرمانی تم پر حرام  
کی ہے۔ (صحیح بخاری)

۳۔ ایک دفعہ ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک بڑا گناہ کیا ہے  
کیا میرے لئے کوئی توبہ ہے؟ فرمایا کیا تیری ماں زندہ ہے؟ جواب دیا۔ نہیں۔  
دریافت کیا حال ہے؟ گزارش کی تھی "فرمایا تو اس کے ساتھ اچھا سلوک کر" یہی  
اس کی توبہ ہے (ترمذی)

۴۔ ایک صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! میں جہاد میں شرکت کرنا چاہتا ہوں  
اور مشورہ کی خاطر حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا "کیا تمہاری ماں زندہ ہے؟ جواب دیا  
"ہاں" فرمایا تو اسی کی خدمت میں لگے رہو کہ جنت اس کے پاؤں کے پاس ہے،  
والترغیب والترہیب لمنذری

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ محترمہ آپ کے بچپن میں وفات پا گئی تھیں۔ آپ کی



کنیز ام ایمن نے آپ کی بہت خدمت کی اپنے بچوں کی طرح پالا۔ حضور جب ام ایمن کو دیکھتے تو بڑے خوش ہوتے اور فرماتے ام ایمن میری والدہ ہیں۔ ایک مرتبہ ام ایمن نے آپ کو پانی پیتے دیکھا تو پینے کے لئے پانی طلب کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ناراض ہو کر کہا کیا تم حضور سے پانی طلب کرتی ہو۔ ام ایمن نے کہا تم نے مجھ سے بڑھ کر حضور کی خدمت نہیں کی۔ حضور نے فرمایا "یہ سچ کہتی ہیں۔ چنانچہ آپ پانی لاتے اور ام ایمن کو پلایا۔"

(البدایہ والنہایہ جلد ۵ ص ۳۱۹)

ان احادیث سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں تمام مخلوقات انسانی ہیں سے ماں کو بہتری حاصل ہے۔ اور یہ بہتری بالکل فطری ہے انسان اپنے وجود میں ذات باری تعالیٰ کے بعد جن کا سب سے زیادہ ممنون ہے وہ والدین ہیں مفاہیم کا اشتراک اس میں کم ہے۔ ماں وہ ہستی ہے جس نے ہزاروں سختیاں اٹھا کر نو ماہ تک اسے پیٹ میں رکھا پھر ولادت کی آفتاب پر داشت تکلیف کو ختمہ جبینی سے گوارا کیا پھر اس نو مود کو چھاتیوں سے لگا کر اپنا خون پانی کر کے اسے پلایا اور اس کی تربیت اور غور و پرداخت میں اپنی ہر راحت قربان اور اپنی ہر خوشی نثار کر دی۔ ایسی حالت میں ماں سے بڑھ کر انسان اپنے وجود میں اور کس کا محتاج ہوگا!

ماں کے بعد جو دوسری ہستی بچے کی محسن ہے۔ وہ باپ

## باپ کا درجہ

ہے اس میں شک نہیں کہ اس کی نشوونما اور تربیت میں ماں

کے بعد باپ ہی کی جسمانی و مالی کوششیں شامل ہیں۔ اس لئے جیب بچہ ان کی محنتوں اور کوششوں سے جوانی کو پہنچے تو اس پر فرض ہے کہ والدین کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوت کا شکرانہ ان کی خدمت کی صورت میں ادا کرے قرآن پاک میں والدین کے ساتھ حسن سلوک، نیکی اور خدمت کی تاکید بارہ مختلف آیتوں میں نازل ہوئی۔ اکثر جب کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید توجید اور تہجد پرستی کے حکم کے بعد آئی ہے اس میں اشارہ ہے کہ توجید خداوندی کے بعد اطاعت والدین کا درجہ ہے

قرآن میں فرمایا



اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم صرف خدا کی عبادت کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَالْوَالِدِينَ إِحْسَانًا

(سورہ بقرہ — ۸۳ رکوع ۱۸)

دوسری جگہ والدین کی مالی خدمت اور امداد کی نصیحت کرتے ہوئے فرمایا  
فَبِمَا نَفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ

فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو، ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے ہے

(سورہ بقرہ - ۲۷)

سورہ نساء میں توحید کے حکم اور شرک کی ممانعت کے بعد ہی والدین کے حسن سلوک کی تاکید کی۔

وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (سورہ نساء، ۱۴)

اور اللہ کی عبادت کیجئے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیے اور ماں باپ کے ساتھ مہذبانہ طور پر

دین اسلام میں سب سے بڑا گناہ شرک ہے تاہم اگر کسی کے والدین مشرک ہوں تو اس حالت میں بھی ان کی خدمت سے پیار نہی کرنا روا نہیں البتہ اگر وہ شرک کی دعوت دیں تو ان کی اس بات کو قبول نہ کیا جائے۔

”اور ہم نے انسان کو بتلادیا کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور اگر وہ تجھ کو مجبور کریں کہ تو خدا کے ساتھ اس کو شریک کرے جس کا تجھ کو علم نہیں۔ تو ان کا کہنا نہ مان۔ تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے۔ میں تم کو تمہارے اعمال سے آگاہ کروں گا“ (سورہ عنکبوت)

والدین کا حق یہ بھی ہے کہ اولاد ان کی زندگی میں اور ان کے بعد ان کے لئے مغفرت اور رحمت کی دعا کرے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا والد مسلمان نہ تھا، تاہم خدا سے اس کے لئے دعائیں مانگی۔



دَبْنَا غَفْرًا لِي وَلِوَالِدِيَّ  
 سورہ ابراہیم - ۲)

اے میرے پروردگار مجھے اور میرے  
 ماں باپ کو بخش دے،

حضرت نوح علیہ السلام نے بھی یہی دعا کی۔

دَبِّ غَفْرًا لِي وَلِوَالِدِيَّ  
 (سورہ نوح - ۲)

اے میرے پروردگار مجھے اور میرے  
 ماں باپ کو بخش دے۔

اس لئے والدین کے لئے دعائے مغفرت کرنا سنت انبیاء ہے۔

والدین کی ناراضی سے بچنا چاہیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "تین  
 دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں ۱) منطلق کی دعا (۲) مسافر کی دعا (۳) والد کی دعا  
 بیٹے کے لئے (تذکرہ)

والدین کے آثار سے حسن سلوک رواد رکھنا بھی ان کے ادب و احترام میں شامل  
 ہے ایک وقتہ آپ نے حضرت عباس کے بارہ میں فرمایا "جس نے میرے چچا کو ایذا دی  
 اس نے مجھے دکھ پہنچایا۔ کیونکہ چچا باپ کے مثل ہوتا ہے۔ ایک بار "آپ نے حضرت  
 عباس کی زکوٰۃ اپنے پاس سے دیا اور فرمایا کہ چچا بھی تو باپ کی مثل ہوتا ہے (مسلم)  
 نورات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین کے مقابلہ میں بیوی کی دلجوئی کو مقدم  
 رکھا جائے۔

"اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی بیوی سے ملے گا۔  
 گا۔ اور وہ ایک جان ہوں گے (کتاب پیدائش ۲-۲۰۰)

اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ اس صورت میں والدین کی اطاعت کی جائے۔ بیوی کا تعلق ایسا  
 ہے جو ٹوٹ کر جوڑ سکتا ہے اور ٹوٹ کر بدل سکتا ہے لیکن والدین کا فطری آفاق ناقابل شکست  
 ہے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک بڑی چہرہ تھی بیوی تھی۔ ان کے والد حضرت  
 عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اس اختلاف سے خانگی جھڑپ  
 کی صورت اختیار کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ کو طلاق دینے کا حکم  
 دیا۔ انہوں نے تعمیل ارشاد کر دی (تذکرہ)



ایک دفعہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ جاں نثار بھی حاضر تھے آپ نے فرمایا "وہ خوار ہوا۔ وہ خوار ہوا۔ وہ خوار ہوا۔ صحابہ نے پوچھا "کون یا رسول اللہ فرمایا "جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور پھر ان کی خدمت کر کے جنت نہ حاصل کر لی۔ ایک دفعہ آپ نے والدین کی اطاعت کے اجر و ثواب کو ایک نہایت مؤثر حکایت میں بیان فرمایا۔ ارشاد ہوتا "تین مسافر کہیں جا رہے تھے کہ اتنے میں موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ تینوں نے بھاگ کر ایک غار میں پناہ لی۔ ایک چٹان اوپر سے گری اور غار کا راستہ بند ہو گیا انہوں نے یارگاہ الہی میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے انہوں نے سوچا کہ اس مشکل کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے نیک ترین عمل کے واسطے سے خدا کے حضور التجا کریں۔ ان میں سے ایک نے کہا "اے خداوند! میرے والدین بوڑھے تھے اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ میں بکریاں چراتا تھا۔ شام کو جب بکریاں لے کر گھراتا تو دودھ دوہ کر پیلے والدین کو پلانا اور پھر اپنے بچوں کو۔ ایک دن میں دیر سے گھر ہوا۔ میرے والدین سو چکے تھے۔ میں دودھ لے کر ان کے سر ہانے کھڑا رہا۔ تب ان کو جگاتا تھا اور نہ دور مہلتا تھا کہ خدا جانے کب ان کی آنکھیں کھلیں۔ پاس ادب سے بچوں کو دودھ نہیں پلانا تھا۔ وہ بھوک سے بلک رہے تھے میں اسی طرح پیالہ میں دودھ لئے رات بھر سر ہانے کھڑا رہا۔ اسی انتظار میں رات گزر گئی۔ صبح ہوتی تو انہوں نے دودھ پیا۔ یا اللہ! اگر میں نے یہ کام تیری رضا کے لئے کیا تھا تو اس پر کو دودھ کر دے۔ یہ کہنا تھا کہ پتھر کچھ سرک گیا۔ اس کے بعد باقی دو ساتھیوں نے بھی دعا اور غار منہ بالکل کھل گیا (بخاری)

## حقوق اولاد

اسلام پہلا مذہب ہے جو اپنے پیروؤں کو سکھاتا ہے کہ اولاد کے بھی کچھ حقوق ماں باپ پر ہیں۔ دیگر مذاہب میں اولاد کا والدین پر کوئی حق تسلیم نہیں کیا گیا اور اس کو والدین کی بزرگی کے خلاف سمجھا گیا تھا سالار نبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو دین لے کر تشریف لاتے وہ حقوق کے سلسلہ میں بڑوں چھوٹوں کی تقریق کا قائل نہیں وہ جس طرح چھوٹوں پر بڑوں کے حقوق تسلیم کرتا ہے اسی طرح وہ چھوٹوں کے بھی بڑوں پر مناسب حقوق قائم کرتا ہے۔



آپ نے ارشاد فرمایا  
 « هُنَّ لَكُمْ بَيْتٌ كَيْبُوتُنَا فَلَيْسَ مِنَّا »  
 جو ہمارے چھوڑوں پر شفقت نہ کرے  
 اور ہمارے بڑوں کا ادب نہ کرے  
 وہ ہم میں سے نہیں۔  
 (ترمذی)

۱۔ اولاد کشتی کا انسداد  
 ظہور اسلام سے قبل عرب کے لوگ بچوں کو مار ڈالتے  
 تھے اور لڑکیوں کو زندہ گاڑ دیا کرتے تھے۔ بنو تمیم  
 کے رئیس قیس بن عاصم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اعتراض کیا تھا کہ اس  
 نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیوں کو زندہ دفن کیا ہے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا: "اے قیس!  
 ہر بڑی کے کفارہ میں ایک اونٹ کی قربانی کرو (تفسیر ابن جریر و ابن کثیر)  
 اس رسم کے کئی اسباب تھے۔

(۱) والدین اپنے بچوں کو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے خود ذبح کر دیا کرتے تھے۔  
 رومہ ابجرمی کے عظیم الشان متمدن قانون میں اولاد کو مار ڈالنے کا باپ کو بالکل ختم  
 تھا۔ اس قتل کی کوئی باز پرس نہ تھی۔

۲۔ اولاد کشتی کا دوسرا سبب عربوں کا فقر و فاقہ تھا وہ سمجھتے تھے کہ اولاد ہوگی تو اس  
 کے کھانے پینے کا انتظام کرنا ہوگا۔

۳۔ قتل اولاد کی تیسری وجہ یہ تھی کہ ہماری بڑی دوسروں کے گھر کی زینت بنے گی۔  
 قرآن تازل ہوا تو جاہل عربوں کو یہ تعلیم دی۔

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ حَشِيَّةً  
 اِمْلَاقِط مَحْنٌ نَزَقْتُمْ وَايَاكُمْ  
 اِن قَتَلْتُمْ كَانِ حِطًّا كَبِيرًا  
 (سورہ بنی اسرائیل - ۴)

اور اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے  
 مار نہ ڈالو۔ ہم ان کو اور تم کو، دونوں  
 کو روزی دیتے ہیں۔ ان کا مار ڈالنا  
 بڑا گناہ ہے۔

اس اخلاقی نصیحت کے علاوہ اس رسم کے انسداد کے لئے آپ نے عورتوں اور  
 مردوں سے بیعت لی۔ ایک عورت نے حضرت عبداللہ بن عباس کی خدمت میں آ کر کہا



کہ میں نے نذر مانی تھی کہ اپنے لڑکے کی قربانی کروں گی۔ فرمایا ایسا نہ کرو۔ بلکہ کفارہ دے دو۔ (موطا امام مالک)

مشہور شاعر فرزندِ ذوق کا دادا صعصعہ اسلام لانے کے بعد حیب آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے اسلام سے پہلے ۳۶۰ لڑکیوں کو خرید کر موت سے بچایا ہے مجھ کو اس کا اجر ملے گا؟ فرمایا۔ ہاں ضرور ملے گا (تفسیر درمنثور بحوالہ طبرانی)

صلح حدیبیہ کے بعد حکم ہوا کہ جو عورتیں اسلام لائیں ان سے توبہ کی بیعت لی جائے اس میں ایک بات یہ بھی ہو کہ وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی۔

ایک دفعہ ایک صحابی نے دریافت کیا یا رسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کونسا ہے فرمایا "شُرک" پوچھا اس کے بعد "فرمایا" والدین کی نافرمانی" پھر عرض کی اس کے بعد، فرمایا یہ کہ تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھاتے گی (بخاری) آپ کا یہ جواب حقیقت میں مذکورہ حدیث کی تفسیر ہے آپ کی ان تعلیمات نے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا کہ رازق خدا ہے اسی کے ہاتھ میں رزق کی کنجی ہے۔ ہر بچہ اپنی روزی کا سامان لے کر آتا ہے اس ایمان اور یقین نے اس جرم کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور عرب کی سرزمین اس لعنت سے پاک ہو گئی۔

۲۔ اولاد کی پرورش | اولاد کے جیتے کا حق تسلیم کرانے کے بعد پہلا فرض یہ ہے کہ اس کی نشوونما اور دودھ پلانے

کے حق کو تسلیم کیا جائے اور جب تک وہ کھانے پینے کے قابل نہ ہو جائے اس کی خیر گیری کی جاتی۔ دودھ پلانے کی مدت زیادہ سے زیادہ دو سال مقرر کی۔ اگر ماں مرجھی ہو یا طلاق لے کر شوہر سے علیحدہ ہو چکی ہو تو باپ پر اس کی رضاعت کا سامان کرنا اور اس کی اجرت ادا کرنا فرض ہے شیر خوارگی کے دنوں میں ماں کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھی اپنا دودھ پلا کر اس کی زندگی کا سہارا بنے تو اسلام ہی ایک مذہب بنے جس نے قانوناً اس کی اہمیت کو قبول کیا اور اس کا درجہ بھی ماں کے قریب قریب قائم کر کے اس



کی اولاد کو بھی بھائی اور بہن کے رشتہ کا منصب عطا کیا۔ حاصل یہ کہ بچوں کی نشوونما کی خدمت اسلام میں وہ مقام رکھتی ہے کہ نسبئی رشتہ داریوں کے قریب قریب پہنچ جاتی ہے اس کے بعد نابالغی کے زمانہ تک اس کی نگرانی اور اس کے خرچ کی کفالت کی جاتی چنانچہ اسلام نے یہ دونوں ذمہ داریاں والدین پر عائد کیں۔

قرآن میں ارشاد ہوا۔

» اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلاتیں۔ یہ مدت اس کے لئے ہے جو پوری مدت دودھ پلانا چاہے اور باپ پر ان دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے (سورہ بقرہ - ۲۳۰) لڑکی، لڑکے کی نسبت کمزور ہوتی ہے۔ اسی لئے ظہور اسلام سے قبل عربوں کا تختہ مشق ستم بنی رہی۔ اسلام نے اس کی پرورش و نگہداشت کی خاص تاکید کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لڑکی کی پرورش والدین اور دوزخ کے درمیان پر وہ ہے (ترمذی) آپ نے فرمایا جو شخص دو لڑکیوں کو پال کر جوان کر دے تو (حضور نے دو انگلیاں اٹھا کر فرمایا کہ) اس کا اور میرا مرتبہ جنت میں یوں ہوگا (مسلم) آپ نے فرمایا جس کی دو یا تین بیٹیاں یا بہنیں ہوں اور وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے تو جنت میں داخل ہوگا۔ (ترمذی)

جسمانی نشوونما کے بعد اولاد کی باطنی و روحانی تربیت کا درجہ ہے قرآن حکیم نے اس مفہوم کو ایک نہایت مختصر اور بلیغ فقرہ میں ادا کر دیا جس کی شرح و تفصیل کے لئے بڑے بڑے

### ۳۔ تعلیم و تربیت

دفتر بھی ناکافی ہیں۔ فرمایا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ

اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور

وَأَهْلِيكُمْ مِمَّا رَأَوْا كَرِهًا مَحْرُومًا

اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔

اس آیت میں خاندان کے سربراہ کو حکم دیا گیا ہے کہ شرعی احکام کی اطاعت کر کے اور اپنے اہل و عیال کو دینی زندگی کا عادی بنا کر خود بھی آتش جہنم سے بچو اور ان کو بھی بچاؤ



اس آیت کی رو سے گھر کے سردار پر اولاد کی اخلاقی تربیت، دینی تعلیم اور نگہداشت  
لازمی قرار دی گئی ہے۔

قرآن میں فرمایا

وَالَّذِينَ يَتَّبِعُونَ دِينَنَا هَبْ لَنَا  
مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا سُرَّةَ  
أَعْيُنٍ ..

جنت کے مستحق وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں  
اے ہمارے پروردگار ہم کو، ہماری بیویوں  
اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک  
عنایت فرما

(سورہ فرقان - ۶)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اولاد کو نیک اور سعادت مند بنانے کی کوشش کے ساتھ  
ساتھ اس کی نیکی و سعادت مندی کی دعا بھی مانگے رہنا چاہیے۔ دیندار اولاد والدین کے  
لئے صدقہ جاریہ ہے۔ جب تک وہ نیک کام کرتے رہیں گے اور والدین کے حق میں دعا گو  
ہوں گے۔ والدین کی روح کو ثواب پہنچتا رہے گا۔ حدیث میں آیا ہے کہ بعض آدمی دیکھیں  
گے کہ جنت میں ان کا درجہ بلند تر ہو گیا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اس کا سبب پوچھیں گے  
جو اب ملے گا کہ تمہاری اولاد نے تمہارے لئے جو دعا کی یہ اس کی وجہ سے ہے (بخاری)  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے باپ کا اپنے بچہ کو کوئی ادب سکھانا ایک  
صاع صدقہ سے بہتر ہے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ کوئی باپ اپنی اولاد کو اس سے بہتر عطیہ  
نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے (صحیح مسلم)

سورہ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اسے  
نماز پڑھنے کا حکم دو اور جب دس برس کا ہو جائے اور نماز نہ پڑھے تو اسے مار کر نماز  
پڑھاؤ اور اسے الگ سلایا کرو (ابوداؤد)

سورہ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک اولاد  
صدقہ جاریہ ہے ان کی دعا اور نیکی کا اجر و ثواب، والدین کو وفات کے بعد بھی پہنچتا رہتا  
ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اولاد کی بہترین تربیت کی تھی۔ حضرت عائشہ  
رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا سب عورتوں



سے بڑھ کر دانا ہیں۔ انداز کلام، حسن اخلاق اور وقار و متانت میں آنحضرت کے سوا آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ حضرت علیؑ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم بھی آپ کے تربیت یافتہ تھے۔ ان کی حیات مقدسہ اسلامی اخلاق کا زندہ پیکار تھی۔

۴۔ اولاد کے مابین مساوات | اولاد میں عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ نہینہ

اولاد سے مقابلتاً ترجیحی سلوک روا رکھنا شرعاً درست نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جس کے یہاں لڑکی پیدا ہو وہ اس کو زندہ باقی رہنے دے اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو خدا اسے جنت میں داخل فرمائے گا (ابوداؤد)"

لڑکوں میں بڑے اور چھوٹے کا امتیاز دین اسلام میں نہیں ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک یکساں طور پر ایک ہی والدین کی اولاد ہیں۔ یہاں تک کہ اگر لڑکوں میں کسی ایک کو بلاوجہ کوئی عطیہ دیا جاتے جو دوسروں کو نہ ملا ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو ظلم سے تعبیر فرمایا ہے۔ تورات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پوٹھالڑکا کا قابل ترجیح ہے یورپ کے بعض ممالک میں آج تک یہ قانون چلا آتا ہے کہ بڑے بیٹے کو جائیداد میں سے زیادہ حصہ ملتا ہے۔ یہ امتیاز تقاضے عدل و انصاف کے منافی ہے اس لئے اسلام نے اسے ہمیشہ کے لئے مٹا دیا۔ ایک صحابی نے اپنے لڑکوں میں سے کسی ایک کو ایک غلام بیہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنانا چاہا انہوں نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اپنی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے دریافت کیا کہ تم نے اپنے سب بچوں کو ایک ایک غلام دیا ہے؟ عرض کیا نہیں۔ فرمایا تو میں ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہیں ہوں گا (ابوداؤد)

۵۔ شفقت و محبت | والدین میں اولاد کی محبت کا طبعی جذبہ ہوتا ہے۔ اسلام نے اولاد کی محبت کو ایک دینی فریضہ ٹھہرا

کہ اس میں اور تقویت پیدا کر دی۔ تاکہ اولاد کی پرورش میں کوئی کمی نہ رہ جائے اس ضمن میں آنحضرتؐ کی ذاتی مثال بڑی حد تک ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ آپ کو



اولاد سے بے پایاں محبت تھی۔ آپ کے فرزند ابراہیم نے وفات پاتی تو بے ساختہ آپ کے آنسو جاری ہو گئے۔ فرمایا ابراہیم! ہمیں تمہاری جدائی کا بڑا صدمہ ہے۔ آپ کی صاحبزادی جناب فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا تشریف لائیں تو فرط محبت سے کھڑے ہو جاتے اور اپنی جگہ بٹھاتے۔ اقرع بن حابس نامی ایک اعرابی بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا آپ حضرت حسنؑ کو پیار کر رہے تھے۔ اس نے کہا کیا آپ بچوں کو پیار کرتے ہیں میرے دس بچے ہیں۔ میں نے ان میں سے کسی کو پیار نہیں کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ پھر فرمایا اگر اللہ نے تیرے دل سے رحمت و شفقت کو نکال لیا ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا (بخاری، ابوداؤد)۔ ایک مرتبہ آپ نماز پڑھ رہے تھے آپ کی تو اسمی امامہ رضی اللہ عنہا آپ کے کندھے پر تھیں۔ آپ جس وقت رکوع اور سجدے میں جاتے تو انہیں زمین پر بیٹھاتے اور جب کھڑے ہوتے تو پھر کندھے پر اٹھالیتے تھے (صحیح مسلم)

ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک غریب عورت ساتل بن کر آتی اس کے ساتھ اس کی دو کمسن بچیاں بھی تھیں۔ کاشانہ بنوئی میں اس وقت ایک کھجور کے سوا کھانے کو اور کچھ نہ تھا۔ ام المومنین نے وہی ایک کھجور اس کو دے دی۔ ماں کی ہمتا نے گوارا نہ کیا کہ وہ کھجور آپ کھالے اور ان ننھی جاتوں کو اس سے محروم رکھے اس نے کھجور کے دو ٹکڑے کر کے دونوں بچیوں کو ایک ایک ٹکڑا دے دیا۔ حضرت عائشہؓ نے یہ ماجرا دیکھ کر حیران ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تو یہ واقعہ عرض کیا۔ حضورؐ نے سن کر فرمایا جو شخص بچیوں کی آزمائش میں ڈالا گیا اور اس نے ان سے اچھا سلوک کیا تو وہ اس کے اور دو ترخ کے درمیان پردہ ہوں گی (بخاری)

دین اسلام اولاد سے شفقت و محبت کی تاکید کرتا مگر ساتھ ہی حکم دیتا ہے کہ یہ محبت دین کے تابع رہنی چاہیے ایسا نہ ہو کہ محبت کا غلبہ انسان کو دولت ایمانی سے محروم کر دے۔ قرآن میں فرمایا

إِنَّمَا مَثَرُ النَّكْمِ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ

تمہارے اموال و اولاد ایک



آزمائش ہیں۔

(الانفال - ۴۸)

اس آیت کے پیش نظر محبت میں اعتدال ضروری ہے۔ حضرت نوح کا بیٹا کافر تھا وہ کفار کے ساتھ ہی طوفان کی تذر ہو گیا۔ حضرت نوح نے اسے ڈوبتے دیکھا تو اس کے حق میں دعا کی۔ بارگاہ ایزدی سے جواب ملا کہ اس سے آپ کا کچھ تعلق نہیں

۴۔ عقیقہ | اولاد کی پیدائش پر عقیقہ کرنا بھی والدین کا حق ہے عقیقہ دراصل ان بالوں کو کہتے ہیں جو بچے کی ولادت کے وقت اس کے سر

پر ہوتے ہیں پھر اس جانور کو بھی عقیقہ کہنے لگے جو بچہ کی پیدائش کے بعد ساتویں دن ذبح کیا جاتا ہے۔ عقیقہ سنت ہے۔ صاحب استطاعت شخص رط کے کی پیدائش پر دو اور رط کی ولادت پر ایک بھیڑیگی ذبح کرے۔ حضرت سمرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بچہ عقیقہ کے عوض رہن ہے۔ ساتویں دن اس کا عقیقہ کیا جائے۔ اس کا نام رکھا جائے اور اس کے بال کاٹے جائیں (احمد ترمذی نسائی) مندرجہ بالا کے علاوہ اولاد کے چھوٹے بڑے حقوق اور بھی ہیں جن کی تفصیلات کتب حدیث و فقہ سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔

## سوالات

- ۱۔ قرآن کریم کی روشنی میں والدین کے حقوق بیان کیجئے۔
- ۲۔ قرآن کریم میں والدہ کے ادب و احترام کے متعلق کیا تعلیم دی گئی۔
- ۳۔ قرآن کریم میں اولاد کے کیا حقوق بیان کئے گئے ہیں۔
- ۴۔ ظہور اسلام سے قبل عرب میں قتل اولاد کے محرکات کیا تھے؟
- ۵۔ اسلام نے اولاد میں عدل و انصاف کے سلسلہ میں کیا تعلیم دی ہے۔ تشبیلاً لکھیے۔
- ۶۔ اولاد کی تعلیم و تربیت کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے۔



## حقوق زوجین

**مفہوم** زوج عربی میں زود مادہ کے جوڑے کو کہتے ہیں اس کا اطلاق خاوند اور بیوی دونوں پر ہوتا ہے اس کی جمع ازدواج ہے جو بزوج کے اخیر میں تاؤ بڑھا کر زوجہ کر دیا جاتے تو یہ لفظ بیوی کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے زوجین کے معنی ہیں دو زوج یعنی میاں بیوی۔ حقوق زوجین یعنی وہ حقوق جو میاں بیوی دونوں پر ایک دوسرے کے لئے عائد ہوتے ہیں۔

والدین اور اولاد کے بعد قریب ترین تعلقات کی فہرست میں تیسرا درجہ میاں بیوی کا ہے حقیقت یہ ہے کہ انہی تعلقات کی درستی پر گھر کے عیش و مسرت کا انحصار ہے اگر میاں بیوی کے باہمی تعلقات خوشگوار ہوں تو گھر جنت کا نمونہ ہو گا اور اگر خدا نخواستہ دونوں میں کشیدگی ہوگی تو گھر جہنم سے کم نہ ہو گا۔ ان تعلقات کا اثر صرف میاں بیوی پر ہی نہیں پڑتا بلکہ بچوں پر بھی پڑتا ہے۔ تعلقات کے کشیدہ ہونے کی صورت میں بچوں کا مستقبل تباہ ہو جاتا ہے۔ گھر بلیو زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے ضروری ہے کہ میاں بیوی اپنی اپنی ذمہ داری کو سمجھیں اور اسے خوش اسلوبی سے نبھائیں اسی طرح ایک دوسرے پر جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان کی بجائے اور بی میں کسی قسم کی کوتاہی سے کام نہ لیں۔

**رشتہ زوجیت اور اسلام** | ظہور اسلام سے قبل تمام مذاہب میں عورت مرد کے ازدواجی تعلق کو روحانی ترقی میں مانع

تصور کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں بدھ، جین مت، ویدانت جوگ اور سادھو پن کے تمام پیرو اس نظریہ کے پابند تھے، عیسائی مذاہب میں بھی عورت سے بے تعلق ہی کو روحانی کمال کا ذریعہ تصور کیا جاتا تھا۔ اسلام نے آکر اس نظریہ پر کاری ضرب لگائی اور بتایا کہ رشتہ زوجیت روحانی ترقی میں مانع تو کیا ہو گا۔ اس کے برعکس اس کے حصول میں



محمد و معاد ان ہو گا۔ سالار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے بیک وقت نواز و اچھ مطہرات کو عقد زوجیت میں لا کر اپنے عمل سے ثابت کیا کہ اپنی زندگی اور روحانی ارتقا کے مابین کوئی تضاد نہیں اور ایک شخص گھر کی اتنی مصروف زندگی میں گھر کے سید الرسل کے منصب پر فائز ہو سکتا ہے اور افضل البشر بھی۔

اسلام نے عقد نکاح کو ہر عمر کے مرد و عورت کے لئے خیر و برکت کا سبب قرار دیا ہے

## نکاح موجب خیر و برکت

نکاح اپنی زندگی کا نقطہ آغاز ہے تو خ انسان کی یقیناً کاروائی بھی اسی میں مضمر ہے یہ وہ عنوان ہے جس کے بغیر اولاد آدم کی بدنی اور روحانی تسکین کی داستان پریشان ہو کر رہ جاتی ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا

وَأَنْكِحُوا الْأَيَّامِيَّاتِ مِمَّنْ لَمْ يَلْحَقْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِنْ تَكُونُوا فُقَرَاءَ يُعْطِيَهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ

اور اپنے میں سے بن شوہر عورتوں کا (خواہ وہ کنواری ہوں یا راند) اور اپنے غلاموں اور نوٹھیوں میں سے نیکوں کا نکاح کر دیا کہ و اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ ان کو اپنی مہربانی سے غنی کر دے گا اور اللہ وسعت والا اور علم والا ہے

سورہ نور - ۱۴

اس آیت پاک کا یہ فقرہ کہ "اگر وہ غریب و تنگ دست ہوں تو اللہ تمہارے اپنی مہربانی سے ان کو غنی کر دے گا" یہ معنی رکھتا ہے کہ اگر دو اچھی زندگی خیر و برکت کا ذریعہ ہے اگر ایک کی تقدیر میں غربت ہوگی تو شاید دوسرے کی تقدیر میں فارغ السبالی ہو۔ تو ایک کے ذریعہ سے دوسروں کو فائدہ پہنچے گا۔

دینی و مادی اعتبار سے خیر و برکت کے دو سبب ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ بصورت نکاح ایک کام کرنے والے کے بچائے گھر میں دو کام کرنے والے ہوں گے اور آگے اولاد کے ذریعے اور کام کرنے والے پیدا ہوں گے (۲) دوسرا سبب یہ ہے کہ نکاح کی مجبوری کے باعث ایسا بے کار آدمی بھی کچھ کرنے کے لئے اپنے کو مجبور پاتے گا۔ بیوی سے اس کی محبت اس کو بعض ایسے کاموں پر آمادہ کر دے گی جن کے لئے



وہ اس کے بغیر ہرگز آمادہ نہ ہوگا۔

**باعث راحت و سکون** | نکاح کا مقصد صرف ایک فرض کو ادا کرنا ہی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو ایک

مناسب رفیقِ حیات کی تلاش ہوتی ہے یہ فطرتِ انسانی ہے اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے اخلاص و محبت کو اپنی نشانیوں میں سے ایک قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوا۔

« اور خدا کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری مجلس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں۔ تاکہ تم ان سے سکون پاؤ اور تم میں مہر و محبت پیدا کر دی بے شک اس میں سوچتے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں »

(سورہ روم - ۲۱)

قرآن پاک نے ایک لفظ سکون سے بیوی کی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے وہ ازدواجی تعلق کے فلسفہ کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اس لئے میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں اتنی خوشگواہی ہونی چاہیے کہ اس سے اس تعلق کے وہ خاص اغراض جن کے لئے خدا نے اس تعلق کو اپنے عجیب آثارِ قدرت میں شمار کیا ہے پورے ہوں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ بیوی شوہر کی فرما برداری اور شوہر بیوی کی دلجوئی کرے۔ میاں بیوی کو اپنے اپنے حقوق کے لحاظ سے برابر ہیں لیکن مرد کو قدرے بہتری اس لئے دی گئی ہے کہ وہ عورت کی خبر گیری کرتا ہے اور اس کے جائز مصارف کا بوجھ اٹھاتا ہے۔

**میاں بیوی کا درجہ** | انسانی مساوات کا تقاضا ہے کہ میاں بیوی کو معاشرہ میں یکساں مقام حاصل ہو۔ قرآن

نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا۔

« وَلَكِنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ »

(البقرہ)

عورتوں کے بھی حقوق ہیں جیسے مردوں کے ہیں۔

مگر انتظامی اعتبار سے یہ مساوات مشکل تھی۔ جس طرح ایک ملک میں دو بادشاہ حکمران



نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح گھر کی محدود ریاست میں میاں بیوی دونوں کا سکہ جاری نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو گھر کا انتظام تہ دیالا ہو جاتا۔ بتا بریں اللہ تعالیٰ نے انتظامی امور کی سرداری مرد کو تفویض کی۔ اسی آیت کے آگے یوں ارشاد ہوا ہے "وَلِلرِّجَالِ عَلِيَّةٌ مِّمَّا كَسَبُوا" (البقرہ)

دوسری آیت میں مرد کے تفویض کی وجہ بھی بتلا دی۔ فرمایا

مرد عورتوں پر نگران ہیں اس لئے کہ  
اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر  
فضیلت دی ہے اور اس لئے کہ مرد اپنے  
مال خرچ کرتے ہیں۔

سورہ نساء آیت نمبر ۳۴

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

ایک صنف یعنی مرد کو اللہ نے طبعاً بعض ایسی خصوصیات اور قوتیں عطا کی ہیں جو عورت کو نہیں دیں یا اس سے کم دی ہیں اس بنا پر خاندانی نظام میں مرد ہی منتظم ہونے کی اہلیت رکھتا ہے اور عورت فطرۃً ایسی بنائی گئی ہے کہ اسے خانگی زندگی میں مرد کی حفاظت و خیر گیری کے تحت رہنا چاہیے (تفسیر القرآن)

ایک دوسرے کا لیاں

مذکورہ صدر آیت سے کسی طرح بھی عورت کی تحقیر کا پہلو نہیں نکلتا صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ تخلیقی اعتبار سے مرد متعدد ایسے اوصاف کا حامل ہوتا ہے جن سے عورت بہرہ ور نہیں۔ مردوں کو قوت جسمانی زیادہ عطا ہوئی۔ اس لئے جسمانی قوت کے کام مرد کے سپرد کئے گئے ہیں۔ عورت بھی چند خصوصیات رکھتی ہے جو مرد کا حصہ نہیں۔ اس کا دائرہ کار اپنا ہے مثلاً عورت میں مہر و محبت کا جذبہ زیادہ رکھا گیا ہے تاکہ وہ اس جذبہ سے کام لے کہ بچوں کی پرورش کر سکے۔ ایک میں قوت و طاقت اور سمجھتی پاتی جاتی ہے۔ دوسرے میں نرمی۔ تاکہ دونوں مل کر ایک کنبہ کی تشکیں کے فرائض انجام دے سکیں۔ اس لئے یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم، ایک دوسرے کے پردہ پوش اور ایک دوسرے کی تربیت



ہیں۔ قرآن کریم نے ان تمام مطالب کو ایک تہایت بلیغ فقرے میں ادا کر دیا ہے فرمایا  
 لَمَنْ لَبَّاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٍ  
 سورہ بقرہ ۲۲  
 لباس ہو۔

مقصد یہ ہے کہ تم ان کی ستر پوشی کرتے ہو اور وہ تمہاری۔ تم ان کی زینت ہو  
 وہ تمہاری۔ تم ان کی خوب صورتی ہو وہ تمہاری۔ یہی نکاح کے اغراض ہیں  
 اور انہی اغراض کو پورا کرنا حقوق زوجین ادا کرتا ہے۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کی تخلیق اور ان کے باہمی فرائض کی تشریح  
 کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک ذات  
 (حضرت آدم) سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت  
 سے مردوں اور عورتوں کو پھیلا یا  
 (سورہ نسا۔ ۱)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نکاح ہی سے بنی نوع انسان دنیا میں پھیلے پھولے  
 ہر قسم کی رشتہ داریوں کی جڑ یہی نکاح ہے یہ نہ ہوتا تو دنیا کا کوئی رشتہ پیدا  
 نہ ہو سکتا۔

میاں بیوی کے باہمی حقوق کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ  
 وسلم نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں ان الفاظ میں فرمائی

## خاوند کے فرائض

لوگو! عورتوں کے حق میں میری وصیت کو مانتو کہ یہ تمہارے ہاتھوں میں قید ہیں تم  
 اس کے سوا اور کسی بات کا حق نہیں رکھتے لیکن یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کا کام کریں اگر ایسا  
 کریں تو ان کو خواب گاہ میں علیحدہ کر دو اور ان کو ہلکی مارو۔ اگر وہ تمہاری بات مان لیں  
 تو پھر ان پر الزام لگاتے کے پہلو نہ ڈھونڈو۔ بے شک تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا  
 تم پر حق ہے۔ تمہارا حق تمہاری عورتوں پر یہ ہے کہ پاک دامن رہیں اور اپنی عصمت کی  
 حفاظت کریں۔ غیر محرم کو گھر میں آنے کی اجازت نہ دیں۔ عورتوں کا حق تم پر یہ ہے  
 کہ ان کے پہنانے اور کھلانے میں کمی نہ کرو (ابن ماجہ۔ کتاب النکاح)

ایک شخص نے آکر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے، فرمایا



کہ جب کھاتے تو اس کو کھلاتے، جب خود پہنے تو اس کو پہناتے اور اس کے منہ پر تھپیڑ مارتے  
نہ اس کو برا بھلا کہے اور نہ سزا کے طور پر اس کو گھر سے نکالے۔

(ریاض الصالحین بحوالہ ابو داؤد)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرد کا کام خانگی زندگی کا ساری گنہگار نہیں کرتا ہے، مالک خانہ  
ہونے کی حیثیت میں اس کے کندھے پر بہت گراں ذمہ داریاں ہیں۔ اس کمائی کا سارا  
یوجہ خود برداشت کرنا چاہیے عورت کا کام یہ ہے کہ وہ اس کی کمائی کو سلیقہ سے خرچ  
کرے اور بال بچوں کی پرورش کرے

ایک مشہور حدیث میں آپ نے فرمایا

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ  
(ترمذی، دارمی، ابن ماجہ)

تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیوی  
کے ساتھ اچھا ہے۔

اس حدیث میں اچھے اور برے آدمی کا معیار بتایا گیا ہے یہ کسی ایسی  
کہ ہر شخص اپنے آپ کو اس پر پرکھ کر دیکھ سکتا ہے۔ ایک صحابی بڑے عابد و زار  
تھے۔ لیکن وہ اپنی بیوی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
نے ان کا یہ حال سنا تو ان کو بلوا کر فرمایا

وَلِيْرُؤِحِكَ عَلَيْكَ حَقًّا ۚ  
اور تیرا بیوی کا بھی کچھ بہ حق ہے بخار

ظہور اسلام سے قبل عورت کو بے وقعتی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ذرا  
سی بات پر اسے پٹیا جاتا تھا اور سخت سزا میں دی جاتی تھیں۔ اسلام آیا تو عورتوں  
کو بلاوجہ مار پیٹ سے روک دیا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک  
وقعہ میں تے اپنی بیوی کو ڈانٹا تو اس نے برابر کا جواب دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے  
ہیں کہ ہم لوگ اسلام سے پہلے عورتوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اسلام آیا تو  
اس نے ظلم و تعدی سے روک دیا (صحیح بخاری)

اکثر عورتیں فطرۃ ہندی ہوتی ہیں۔ بعض مرد ان کی عند کے مقابلہ میں سختی

کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے ان کی ایک نہایت عمدہ تشبیہ دے کر نصیحت فرمائی کہ



عورتوں کے ساتھ نیچی کا برتاؤ کرو کیونکہ ان کی پیدائش پسلی سے ہوتی ہے تم اس کے  
اس ٹیڑھا پن کے ساتھ کام لے سکو، تو لے سکتے ہو اور اگر اس کے سیدھی کرنے  
کی فکر کرو تو تم اس کو توڑ ڈالو گے

(صحیح بخاری، صحیح مسلم)

اور بیویوں کے ساتھ معقول طریقہ  
سے گزارہ کرو۔ اگر وہ تم کو پسند  
نہ آتیں تو ممکن ہے کہ تم کو ایک چیز  
پسند نہ آئے اور خدا نے اس میں بہت  
خوبی رکھی ہو۔

وَعَلَا شَرُّوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْبِ فَإِنْ  
كَرِهْتُمُوهُنَّ فَبَعْسَىٰ إِنَّ  
تُكْرَهُهُنَّ شَيْئًا وَيَجْعَلُ اللَّهُ  
فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا  
(نساء - ۳)

جاہلیت میں دستور تھا کہ مرد قسم کھا لیتے تھے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ حسن سلوک  
نہیں کریں گے اور جیب انہیں کوئی سمجھاتا تو کہتے کہ ہم قسم کھا چکے ہیں اس لئے مجبور  
ہیں۔ ایسے لوگوں کو حکم دیا

”اور خدا کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ کہ تم حسن سلوک تقویٰ اور لوگوں  
کے درمیان صلح جوئی نہ اختیار کرو گے اور اللہ سننا اور جانتا ہے  
(سورہ بقرہ)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مرد کو عورت کے ساتھ حسن سلوک پر سہیزگاری اور  
صلح جوئی کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ شوہر کے قرآن کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔  
- مہر۔ مہر اس قسم کو کہتے ہیں جو حق زوجیت کے عوض بیوی کو دی جاتی ہے  
اس رقم کا انحصار مرد، استطاعت پر ہے۔ مہر کی ادائیگی ضروری ہے تاہم  
بیوی کو معاف کرنے کا حق حاصل ہے۔

۲- نفقہ۔ شوہر کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ بیوی کو ضروریات مہیا کرے اس کو  
نفقہ کہتے ہیں۔

۳- عدل و انصاف۔ مرد کا تیسرا فرض یہ ہے کہ وہ بیوی کے ساتھ قیامت  
برتاؤ کرے اور اگر بیویاں ایک سے زیادہ ہوں تو ان میں مساوات کے اصول پر



گامزن رہے۔

بیوی کے فرائض | خاوند کی اطاعت اسلام میں اس قدر ضروری قرار دی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا اگر غیر اللہ کے آگے سجدہ

چاہئے ہوتا تو میں حکم دیتا کہ بیوی اپنے خاوند کو سجدہ کرے (ترمذی)  
 کسی شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ عورتوں میں سے افضل عورت کون سی ہے فرمایا کہ جب مرد اس کو دیکھے تو خوش ہو۔ مرد کوئی حکم دے تو اسے فوراً بچالائے اور اپنی جان و مال میں خاوند کی ایسی مخالفت نہ کرے جو اس پر ناگوار گزرے (نسائی)

آپ نے دوسری جگہ فرمایا

” تین شخص ہیں جن کی نہ تو نماز ہی قبول ہوتی ہے اور نہ ہی ان کی کوئی نیکی اوپر چڑھتی ہے (۱) بھگوڑا غلام یہاں تک کہ اپنے آقا کے پاس واپس آ جاتے (۲) وہ عورت جس سے اس کا شوہر تاخوش ہو (۳) بے ہوش آدمی یہاں تک کہ ہوش میں آجائے (بیہوشی)

اسلامی نقطہ نظر سے شوہر کی کابل اطاعت ضروری ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت شوہر کی اجازت کے بغیر نقلی روزہ بھی نہیں رہ سکتی اور نہ اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ خاوند کی اجازت کے بغیر کسی کو اس کے گھر میں آنے دے

(بخاری، مسلم)

خاوند کی عورت و آبرو بڑی حد تک بیوی پر موقوف ہوتی ہے بیوی کو لازم ہے کہ شوہر کی آبرو کی حفاظت کرے، اول سے خاوند کی قدر کرے۔ اسلام میں تین دن سے زیادہ سوگ کی اجازت نہیں مگر خاوند کی وفات پر بیوی چار ماہ و کس دن سوگوار رہتی ہے۔ (بخاری، مسلم)

ازواج مطہرات سے نبی کریم کا یرتناؤ | جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیرونی زندگی مسلمانوں کے لئے بہترین نمونہ



تھی۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی کے جو واقعات منقول ہو کر ہم تک پہنچے ہیں وہ بھی ہمارے لئے مشعل ہدایت ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم اقدس میں ایک وقت نو بیویاں تھیں ان میں عام اصول فطرت کے مطابق ہر مزاج اور طبیعت کی عورتیں تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ہمیشہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے اس لئے ان کو ضروریات زندگی مہیا کرنے کا انتظام بھی خاطر خواہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے ان کو شکایت کا موقع ملتا تھا۔ مگر بایں ہمہ آپ رنجیدہ نہیں ہوتے تھے اور ان کی شکایت کو خندہ پیشانی کے ساتھ سنتے تھے۔

جب حضرت خدیجہ سے شادی کی تو آپ اس وقت ۲۵ سالہ نوجوان تھے جو عنقوان شہاب کی عمر ہوتی ہے۔ حضرت خدیجہ بیوہ تھیں اور عمر کی چالیس منزلیں طے کر چکی تھیں تاہم آپ نے ان کی وفات تک کوئی شادی نہیں کی۔ وفات کے بعد بھی جب کبھی ان کا ذکر آجاتا تو جوش محبت سے بے تاب ہو جاتے تھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے کسی عورت پر کبھی ایسا شک نہیں آیا جیسا حضرت خدیجہ پر۔ حالانکہ میں نے انہیں دیکھا بھی نہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ کی سہیلیوں کو عورت و تکریم کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب جانور ذبح کرتے تو ان کے گھروں میں گوشت بھجاتے تھے۔ حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد آپ کے نکاح میں نو ازواج مطہرات رہیں۔ تاہم عدل و انصاف اور سکون و اطمینان کے اعتبار سے آپ کا گھر جنت تھا جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ مثالی حیثیت کی حامل تھی۔ اسی طرح آپ کی خانگی زندگی بھی اپنی مثال آپ تھی۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ شادی کرنے کے لئے عورت کا انتخاب

بیوی کے انتخاب کا معیار

چار اوصاف کی بنا پر کیا جانا ہے۔

مال - نسب - حسن - ویداری - تم دیدار عورت تلاش کرو (مشکوٰۃ شریف)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر کام میں دیداری کو مقدم رکھتے تھے اس لئے ازواج



مطہرات میں بھی وہی زیادہ منظور نظر ہوتی تھیں، جن سے دین کی خدمت زیادہ ادا ہو  
 سکتی تھی حضرت عائشہؓ سے خصوصاً لگاؤ کی وجہ یہی تھی کہ آپ دینداری، ذہانت اور وسعت  
 معلومات میں سب بیویوں پر فوقیت رکھتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ نے رفاقت نبوی سے  
 اس قدر فائدہ اٹھایا کہ بڑے بڑے نازک اور دقیق مسائل میں اکابر صحابہؓ سے اختلاف  
 کرتی تھیں، خانگی زندگی کے متعلق اکثر دینی مسائل حضرت عائشہؓ سے منقول ہیں۔ امت مسلمہ  
 ہمیشہ انکے احسانات کی ممنون رہے گی

## سوالات

- ۱۔ اسلام نے مرد و عورت کو کیا کیا ذمہ داریاں سپرد کی ہیں۔
- ۲۔ دین اسلام میں عورت کو کیا مقام حاصل ہے۔
- ۳۔ قرآن نے ازدواجی تعلقات کی کیا غرض و غایت بیان کی ہے۔
- ۴۔ خاندان کے فرائض بیان کیجئے۔
- ۵۔ بیوی کے فرائض قلمبند کیجئے۔
- ۶۔ بیوی کیسی انتخاب کرنی چاہیے۔



## مسجد و مکتب

## اسلامی نظامِ تعلیم

اسلام میں علم کا مقام | علم ایک ایسی چیز ہے جس کی اہمیت و فضیلت

کسی پر پوشیدہ نہیں۔ ترقی کی دوڑ میں آج وہی

قوم سب سے آگے ہے جس کا علمی پایہ سب سے بلند ہے جو تحقیق و تدقیق کے میدان میں سب سے آگے ہے جو سائنسی ایجادات میں دوسری قوموں کو مات دے چکی ہو۔ آج

جو بات ایک حقیقت ثابت بن کر اقوامِ عالم کے سامنے آتی ہے۔ اسلام چودہ صدیاں پہلے

بیانگ دہل اس کا اعلان کر چکا ہے تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان ملک و قوم کے لئے

مفید ثابت ہو۔ جاہل اور کم علم انسان معاشرہ پر ایک بار ہوتا ہے بخلاف ازیں ایک تعلیم یافتہ

شخص معاشرہ کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوتا ہے وہ اپنے علم و تجربہ سے ملک و قوم

کو گراں قدر فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر قسم کی تعلیم سے یہ مقصد حاصل

ہو سکے آج لاکھوں طالب علم کالجوں اور سکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں لیکن ان میں سے

بیشتر معاشرہ پر بوجھ ہیں ایسے طالب علم جب اپنی درس گاہوں سے فارغ ہو کر نکلیں

گے تو سوائے کلرک بننے کے انہیں اور کوئی راہ دکھائی نہ دے گی۔ ہر طالب علم کو یہ بات

اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ وہ تعلیم جو فکر و ذہن میں جلا پیدا کرتے کی بجائے

اس کے ذہن کو مات کر دیتی ہے۔ اس میں زندگی کی امنگیں باقی نہیں رہتی اور اس

پر جمود کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ بالکل بے کار ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پہلی وحی نازل ہوتی

اس میں ارشاد ہوا۔

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ

اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے انسانی  
کو پیدا کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر پڑھنے سے زیادہ ضروری کوئی اور کام ہوتا تو پہلے اس کی



مدینہ) نہیں آسکتے۔ اس لئے ہر قبیلہ سے ایک گروہ کو آنا چاہیے تاکہ وہ علم دین حاصل کریں۔ اور واپس جا کر اپنی قوم کو ڈرائیں شاید یہ لوگ برائی باتوں سے بچیں۔ (سورہ توبہ۔ آخری رکوع)

چونکہ مقصد یہ تھا کہ ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو نہ صرف شریعت کے اوامر و نواہی سے

واقف ہو بلکہ شب و روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتے سے تمام تر اسلامی رنگ میں ڈوب جائے۔ جس کی گفتار و کردار، بات چیت، نشست و برخاست، قول و عمل، ایک ایک چیز تعلیم نبوی کے پر تو سے منور ہوتا کہ وہ تمام ملک کے لئے نمونہ عمل بن سکے۔ اس لئے عرب کے ہر قبیلہ سے ایک جماعت آتی تھی اور آپ کی خدمت میں رہ کر تعلیمات سے بہرہ ور ہوتی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں

”عرب کے ہر قبیلہ کا ایک گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتا اور آپ سے مذہبی امور دریافت کرتا تھا اور دین میں تفرقہ حاصل کرتا تھا۔“

واعیان اسلام جو مختلف علاقوں میں بھیجے جاتے تھے ان کو ہدایت کی جاتی تھی کہ لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وطن چھوڑ کر مدینہ آجائیں اور یہیں آکر بود و باش کریں۔ اس کا نام ہجرت تھا۔ اسی بنا پر عرب کے بہت سے خاندان اپنے گھروں سے ہجرت کر کے مدینہ میں چلے آئے تھے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری آئے تو ۸۰ شخصوں کو لے کر آئے اور مدینہ میں آباد ہوئے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عصر و عہد میں تعلیم و ارشاد کے مختلف طریقے تھے ایک یہ کہ باہر سے

آنے والے کچھ عرصہ خدمت اقدس میں رہ کر عقائد اور فقہ کے ضروری مسائل سیکھ لیتے تھے اور اپنے قبائل میں واپس جا کر ان کو تعلیم دیتے تھے۔ مثلاً مالک بن نویرث نے مدینہ آکر بیس دن قیام کیا اور ضروری مسائل کی تعلیم حاصل کی۔ جب واپس جانے لگے تو آپ نے فرمایا ”اپنے خاندان میں واپس جاؤ اور ان میں رہ کر ان کو دینی مسائل سکھاؤ“



تلقین کی جاتی۔ قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا سکھلائی گئی ہے۔  
 رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا (۲۰-۱۱۴) اسے پروردگار میرے علم میں اضافہ کر دے  
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جہاں دوسرے مناصب جلیلہ سے نوازے گئے وہاں  
 آپ کو معلم اعظم کی مسند نشینی بھی تفویض ہوئی۔

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (سورۃ المجملہ) آپ ان کو کتاب و حکمت سکھاتے ہیں  
 اس آیت سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ استاد و معلم دین اسلام کی نگاہ  
 میں کس بزرگوں و وقار کا حامل ہے ایک طرف آپ سید الرسل اور افضل البشر کے منصب رفیع  
 پر فائز ہیں اور دوسری جانب آپ کے کندھوں پر تعلیم و تدریس کے گراں بار فرائض  
 بھی رکھے جا رہے ہیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ سالار رسل ہوتے ہوتے بھی معلمی کے فرائض  
 سے عہدہ برآ ہوتا آپ کے لئے موجب عار نہیں

**علم ظہور اسلام سے قبل و بعد** | ظہور اسلام سے قبل عربوں میں علم کا ذوق و  
 شوق تو کچھ، شرفاء میں لکھتے پڑھنے کو عیب  
 سمجھا جاتا تھا۔ پڑھے لکھے آدمی خال خال نظر آتے تھے۔ موزخ بلا ذریعہ کے بیان  
 کے مطابق مکہ شہر میں کل سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اسلام آیا تو مسلمانوں کا  
 ایک ایک گھر تفسیر حدیث اور فقہ کا دارالعلم بن گیا۔ اسلامی رو سے یہ ضروری افراد  
 دیا گیا کہ ہر جماعت اور ہر قبیلہ میں کچھ ایسے لوگ موجود ہوں جو تعلیم و تبلیغ کا فریضہ  
 انجام دے سکیں۔

خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے عازم مدینہ ہوئے تو سراقہ نامی ایک  
 کافر نے انعام کے لالچ میں آپ کا تعاقب کیا مگر آخر کار امان طلب کی۔ سفر ہجرت  
 میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ ان کے آزاد کردہ غلام عامر بن  
 نفیرہ بھی آپ کے ہمراہ تھے انہوں نے امان نامہ لکھا۔ یہ واقعہ اس امر کی روشنی  
 دہلے ہے کہ دوران سفر بھی لکھنے پڑھنے کا سامان ساتھ رکھنا تھا۔  
 قرآن مجید میں فرمایا:۔ اور سب کے سب مسلمان تو سفر کر کے



اور جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے اسی طرح نماز پڑھو۔ (بخاری)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا طریق تدریس یہ تھا کہ

صُفَّة کی درس گاہ

لوگ مستقل طور پر آکر مدینہ میں سکونت پذیر ہوتے اور

علم دین حاصل کرتے تھے۔ مسجد نبوی کا صحن جسے صُفَّة کہا جاتا تھا۔ ان کی درس گاہ تھی اس میں زیادہ تر وہ لوگ قیام کرتے تھے جو تمام دنیاوی تعلقات سے آزاد ہو کر شب و روز خدمتِ علم میں مصروف رہتے تھے مشکوٰۃ کتاب العلم میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لے گئے اس وقت مسجد میں دو حلقے تھے (۱) ذکر ۲۶ حلقہ درس۔ آپ حلقہ درس میں بیٹھ گئے۔ ان طالبانِ علم کو قرا کہتے تھے۔ قبیلہ عریثہ میں جو لوگ تبلیغ و تعلیم کے لئے گئے تھے اور کفار نے ان کو دھوکے سے شہید کر دیا تھا وہ اسی درس گاہ کے تربیت یافتہ تھے۔ اربابِ سیر نے لکھا ہے کہ ان لوگوں میں سے جب کوئی شادی کر لیتا تھا تو اس جماعت سے نکل آتا تھا اور ان کی بجائے دوسرے لوگ شامل ہو جاتے تھے۔ اصحابِ صفہ صرف راہِ علم کے جاوہ پیمانہ تھے بلکہ میدانِ جہاد کے غازی بھی تھے۔ وہ غزوات میں حصہ لیتے اور دادِ شجاعت دیتے تھے۔

اصحابِ صفہ اگرچہ زرو مال سے بہرہ ور نہ تھے تاہم صیر و قناعت اور سکون و طمینان سے ضرور مالا مال تھے۔ فقر و افلاس کا یہ عالم تھا کہ کسی کے پاس ایک کپڑے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ جس کو گردن سے باندھ کر گھٹنوں تک چھوڑ دیتے تھے وہ چادر اور تہجد دونوں کا کام دیتا تھا۔ جفاکشی کی حد یہ تھی کہ جنگل میں جا کر بکڑیاں چن لاتے تھے اور ان کو بیچ کر آدھ خیرات کر دیتے تھے اور آدھا اپنے ہم مکتب بھائیوں کے ساتھ مل کر کھاتے تھے اس درس گاہ کے فاضل معلمین میں مشہور صاحبِ علم صحابی عبادة بن صامت بھی تھے جن کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں تعلیم فقہ و قرآن کے لئے فلسطین بھیجا تھا اور وہیں حضرت عبادة بن صامت سے روایت ہے۔

عَلِمْتُ نَاسًا مِنْ أَهْلِ الصُّفَّةِ  
الْقُرْآنَ وَالْكِتَابَ فَهَدَى

میں نے اصحاب میں سے چند لوگوں کو  
قرآن مجید اور لکھنے کی تعلیم دی اور اس کے



إِلَى مَا جُلَّ مِنْهُمُ قَوَسًا،

(ابوداؤد)

صلہ میں مجھ کو ایک شخص نے ایک کمان  
تحفہ کے طور پر دی۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادہؓ کو اس تحفہ کے  
قبول کرنے کی اجازت نہیں دی۔ بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ درس گاہ صفہ  
کے علاوہ اور بھی کوئی جگہ تھی جہاں اصحاب صفہ رات کو تعلیم پاتے تھے۔ مسند امام احمد  
بن حنبل میں ہے

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ اصحاب صفہ میں سے، شخص رات

کو ایک معلم کے پاس جاتے تھے اور صبح تک اس میں مشغول رہتے تھے۔

جنگ بدر میں قریش کے بعض آدمی گرفتار ہوئے جو بکھے پڑھے تھے آپ نے فرمایا  
اگر تم دس دس بچوں کو بکھنا پڑھنا سکھاؤ تو تم آزاد ہو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ  
کی نگاہ میں بکھنے پڑھنے کی کیا اہمیت تھی

**خلافت راشدہ اور اس کے بعد اشاعتِ تعلیم**  
خلافت راشدہ کے دور میں درس و  
تدریس کی نئی راہیں کھلیں بات عدہ

معلمین مقرر کئے گئے جن کو بیت المال سے تنخواہ دی جاتی تھی بچوں کی تعلیم کے علاوہ  
تعلیم بانناں کا بھی اہتمام تھا۔ معلم مسجدوں میں بیٹھ کر حدیث و فقہ کا درس دیا کرتے تھے۔  
حضرت عمرؓ تجارت پیشہ لوگوں کو چھوڑ کرتے تھے کہ وہ اپنی تجارت کے بارے میں شرعی مسائل  
سیکھیں۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے جمع کردہ  
قرآن کریم کی نقلیں کروا کر اطراف ملک میں بھیجیں۔ آگے چل کر اموی و عباسی خلفاء نے  
اشاعتِ علم کے سلسلہ میں ہمیشہ بہا خدمات انجام دیں۔ علمائے اپنے زندگیوں اس مقصد  
کے لئے وقف کر دیں۔

حضرت معاویہؓ علم کے بڑے دلدادہ تھے۔ انہوں نے تاریخ کی ایک کتاب مرتب  
کرائی اور ایک بڑا کتب خانہ قائم کیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؓ رحمۃ اللہ علیہ نے کتابتِ  
حدیث کا خاص اہتمام کیا۔ عباسی دور میں خلیفہ ماموں و ہارون کا عہدِ خلافت



کے لئے خاص طور سے مشہور ہے۔ ماموں نے بیت الحکمت کی بنیاد رکھی جس میں بلند پایہ  
 علماء دیگر زبانوں کی بلند پایہ کتب کے ترجمے کرتے تھے۔ خلفائے عباسیہ کا دارالخلافت  
 بغداد علم و فضل کا مرکز تھا۔ اس میں دینی مدارس کی بھرمار تھی۔ اور طلبہ تحصیل علم کے لئے  
 یہاں جوق در جوق آتے اور فیض یاب ہو کر واپس جاتے تھے۔

کسی کام کی سچی تڑپ، والہانہ جذبہ اور حقیقی  
**تعلیم کی غرض و غایت** | ذوق و شوق اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب اس  
 کے پیچھے ایک بلند نصب العین کار فرما ہو۔ بلند پایہ غرض و غایت اور اعلیٰ مسلح نظر کے  
 بغیر آدمی اس کام کو اضطراب و مجبوراً انجام دے سکتا ہے۔ البتہ اس کا قلب ذہن اس حالت  
 میں اس کا رفیق کار نہیں ہوتا۔

اسلام جس علم کو حقیقی قرار دیتا ہے۔ اور جس کی تحصیل کے سلسلہ میں وہ یہاں تک کہہ  
 دیتا ہے کہ "قرشتے طالب علم کی رضا و خوشنودی کے لئے اپنے پروں کو انکے پاؤں کے نیچے  
 بچھاتے ہیں" وہ ایسا علم نہیں جس سے صرف بروٹی کا مسئلہ حل ہو سکے یا اس کے بدولت انسان  
 صرف معاشرہ میں بلند مقام و منزلت حاصل کر سکے۔ اگرچہ وہ خدا سے دوری کا موجب ہو  
 اور آدمی جس قدر اس میں مہارت حاصل کرتا جاتے اسی قدر اسلامی عقائد و عبادات سے  
 نفرت و حقارت کا جذبہ اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتے۔ ایسا علم اسلام کی نگاہ  
 میں نہ صرف معیوب بلکہ قابلِ نفرین ہے۔

اسلام کی نگاہ میں علم وہ ہے جس کے پڑھنے سے آدمی اللہ و رسول سے شناسا ہو  
 اسلامی عقائد و اعمال سے آگاہی حاصل کرے۔ اسلامی شعائر کا ادب و احترام سیکھے۔  
 اسلاف کی محبت دل میں پیدا ہو اور دل میں غیر متزلزل قسم کا ایمان کر دے جو علم انسان  
 کو خدا سے بیگانہ بنا دے۔ رسول سے متنفر کر دے۔ صحابہ رسول سے باغی بنا دے، وہ  
 علم نہیں، جہل ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے طویل دورِ غلامی کے نتیجہ میں غلامانہ  
 ذہنیت کے زیر اثر آج جہل ہی کو علم سمجھ رکھا ہے جانے کب مسلمانوں کی بوج ذہن ہے  
 دورِ غلامی کے یہ آثار محو ہو سکیں گے۔



اس میں شبہ نہیں کہ پیٹ کا مسئلہ بھی دینی نقطہ نظر سے کوئی معیوب کام نہیں بلکہ شرعی  
 احکام کو ادا کرنے کے ساتھ ساتھ معاشی مسائل سے عہدہ برآ ہوتا عبادت میں داخل  
 ہے بنائیں سائنس، ریاضی اور ڈاکٹری وغیرہ میں مہارت حاصل کرنا اگرچہ بظاہر ایک  
 دنیوی فعل ہے مگر ان علوم کو دینی خدمت کے جذبہ سے حاصل کرنا اور عوام الناس کی  
 فیض رسانی کو پیش نظر رکھنا ایک دینی فعل ہے اور موجب اجر و ثواب ہے مگر آج تو یہ سمجھ  
 لیا گیا ہے کہ مادی دنیا ہی سب کچھ ہے۔ انسان صرف پیٹ کا مسئلہ حل کرنے کے لئے  
 پیدا کیا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تراویہ نگاہ سے دنیا و دین کے مابین کوئی تضلیح  
 حائل نہیں۔ دنیوی امور کو احکام کتاب و سنت کے مطابق انجام دینے کا نام دین ہے۔  
 ہمارا دین دنیا کو آخرت کی کھینچی قرار دیتا ہے۔ بنائیں ہمارا نظام تعلیم ایسا ہونا چاہیے  
 جو دین و دنیا کا امتیاز مٹادے تمام علوم کو دینی قالب میں ڈھالا جائے جو باتیں  
 ان میں دینی حکام سے متصادم ہوں ان کو نکال دیا جائے ہمارے مدارس کالجوں اور  
 یونیورسٹیوں کا ماحول دینی ہو اور اساتذہ دینی جذبہ سے سرشار ہوں ان حالات کو پیدا  
 کئے بغیر علم کی غرض و غایت حاصل نہیں ہو سکتی۔

## سوالات

- ۱۔ اسلامی نقطہ نظر سے تعلیم کا مقصد کیا ہے۔
- ۲۔ عبد بنوی میں اشاعت علم کا کونسا طریق رائج تھا
- ۳۔ اسلامی نقطہ نظر سے علم کس اہمیت کا حامل ہے اور اس سے مراد کونسا علم ہے
- ۴۔ اشاعت علم کے لئے سرور کا اہمیت نے کیا جہد و جہد فرماتی۔



# مکتب

**مفہوم** | مکتب کا لفظ کتابت (لکھنا) مصدر سے اسمِ ظرف ہے اس کے معنی ہیں لکھنے کی جگہ۔ عام استعمال میں مکتب کا لفظ مدرسہ کا ہم معنی ہے مکتب یا مدرسہ اس ادارہ کا نام ہے جہاں لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا ہو۔

**اہمیت** | انسانی زندگی میں مکتب بڑا اہم پارٹ ادا کرتا ہے آج کے بچے کل کے معیار ہیں۔ انہی پر قوم کی آئندہ زندگی اور ترقی کا انحصار ہے۔ کل کو یہی ملک و ملت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھانے والے ہوں گے لہذا ان کی تربیت ازس تاگزیر ہے یہ تربیت بچوں کو صرف مکتب میں حاصل ہو سکتی ہے اگر استاد اپنے فرض کو سمجھ کر بچوں کی تربیت صحیح طور پر کریں گے۔ انہیں ہر قسم کی بے راہ زدی سے روکیں گے انہیں عمدہ اخلاق سکھائیں گے۔ ان کے دل میں دین اسلام اور وطن کی محبت کے جذبات پیدا کریں گے تو یقیناً بچوں پر اس کا اچھا اثر پڑے گا اور وہ آگے چل کر صحیح طور پر قوم کے معیار ثابت ہوں گے تربیت دینے اور اخلاقی نگرانی کرنے میں استاد کا اپنا نمونہ سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے اگر استاد اعلیٰ اخلاقی اقدار کا حامل ہوگا تو یقیناً بچے بھی اس سے اثر قبول کریں گے لیکن اگر استاد کا اپنا نمونہ اچھا نہ ہوگا تو وہ بچوں کو لاکھ اخلاقی درس دینا رہے ان پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ والدین کے زیر سایہ ابتدائی تربیت حاصل کرنے کے بعد مکتب بچہ کی اولین تربیت گاہ ہوتی ہے۔ جہاں اس کا ذہن نئے سانچے میں ڈھلنا اور اس کے لئے زندگی کی نئی راہ متعین کرتا ہے اگر اچھے والدین کے بعد اچھا مکتب میسر آجاتے تو ربے نصیب! اس دور میں بچہ کی لوح ذہن بالکل صاف ہوتی ہے اور اس کا ذہن نیک و بد خیالات سے کلیتاً پاک ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں جو بائنا اس کے ذہن نشین کر دی جاتے گی وہ پتھر کی بکیر ثابت ہوگی اور اس کے نقوش آئندہ زندگی میں کبھی مٹ نہ سکیں گے اس کی درخشندہ مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین صحابیہ کرام کی ہے۔ جنہوں نے آنحضرت کے زیر اثر صفتہ کی درس گاہ میں تعلیم دین سانس لی تھی ان میں سبھی اللہ کے لوگ تھے بچے بھی تھے، جوان بھی اور بوڑھے بھی۔ آگے چل کر یہی لوگ



دین اسلام کے ستون ثابت ہوئے اور انہوں نے کائنات ارضی کے دور افتادہ گوشوں تک اسلام کا نام روشن کر دیا۔

مشہور مکاتب | اچھے مکاتب اور ممتاز اساتذہ اقوام عالم کے لئے سرمایہ افتخار ہوتے ہیں۔ اچھے مکاتب قوم کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔

وہ قوم کو ایک نئی روح اور نیا جذبہ عطا کرتے ہیں۔ جو علماء وہاں سے ستہ فراغت لے کر نکلے ہیں وہ قوم کی ترقی میں نمایاں حصہ لیتے ہیں اور اس قوم کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ تابندہ و درخشندہ رہتا ہے جو طلبہ مدرسہ سے ستہ فراغت حاصل کر کے نکلے ہیں وہ زندگی بھر اسے فراموش نہیں کر سکتے۔ اساتذہ کو یاد کر کے ان کے سینے عقیدت کے جذبات سے لیریا ہو جاتے ہیں مسلمان بچہ دار کے مدرسہ نظامیہ کا ذکر بڑے فخر سے کرتے ہیں یہ مدرسہ ایک یونیورسٹی کی حیثیت رکھتا تھا جس میں چھ ہزار طلبہ زیر تعلیم تھے مدرسہ ان کی خوراک و لباس کا کفیل تھا۔ بچہ دار سے علوم و فنون ہندوستان، چین اور تاتار تک پہنچے۔ اندلس کی جامعہ قرطیبہ اور مصر کی ہزار سالہ قدیم ازہر یونیورسٹی تاریخ عالم میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، جامعہ ملیہ دہلی اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے مسلمانوں کو علوم اسلامیہ اور اسلامی تہذیب و ثقافت سے روشناس کرنے میں جو نمایاں خدمات انجام دیں ان سے انکار کرنا عظیم کفرانِ نعمت ہے۔

اشاعتِ علم میں مسلمانوں کا حصہ | مسلمانوں نے اپنے دور اقتدار میں علم اور علماء کو ہمیشہ قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا۔ علم کی اشاعت

مکاتب کی تعمیر اور تصنیف و تالیف کی جو صلہ افزائی کرنے سے کبھی دریغ نہ کیا مکاتب کی تعمیر کا سلسلہ اسلام میں عہد نبوی سے شروع ہوا مسجد نبوی اور اس کا سابقان جیسے صفحہ کہتے تھے اولین اسلامی یونیورسٹی تھی۔ معلم اعظم بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اولین استاد تھے اور مدینہ کے نادار صحابہ کرام تھے دینا اصحاب صفحہ کے نام سے جانتے ہیں اس یونیورسٹی کے اولین طلبہ تھے۔

علم تواتر ہی کا یہ سلسلہ خلافت راشدہ میں بھی جاری رہا۔ اس عہد میں قرآن کریم



کو کتابی صورت میں جمع کیا گیا اور اس کی تعلیم و تدریس کے لئے تنخواہ دار معلم مقرر کئے گئے چاروں خلفائے راشدین خود عالم تھے اور علم کے قدردان۔ تاہم خلافت راشدہ تک تعلیم و تدریس کا سلسلہ مساجد ہی میں جاری رہا۔ مکاتیب کی باقاعدہ تعمیر بنو امیہ، بنو عباس کے عہد ہائے خلافت میں ہوئی جب عجمی اقوام کے اختلاط سے زندگی کے سانچے بدلتے گئے۔ سادگی کی جگہ تکلف و تصنع نے لے لی۔ اور عرب بھی سادہ طبع ہونے کے باوجود ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرنے لگے۔ تاہم تاریخ اسلام کے ان زریں ادوار میں بھی مسجد کو مکتب کی حیثیت حاصل رہی اور اسے کلیتہً عبادت ہی کے لئے وقف نہ کیا گیا

- اموی خاندان کے باقی حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تاریخ کے بڑے دلدادہ تھے۔ عبدالملک ولید عمر بن عبدالعزیز اور شام سب علم دوست خلفاء تھے۔ عباسی عہد خلافت میں اشاعتِ علم کی طرف اور زیادہ توجہ دی گئی۔ انہوں نے مکاتیب کی تعمیر پر زکریا خرچ کیا اور مدارس کی سرپرستی میں بڑی فیاضی دکھائی۔ دارالتصنیف قائم تھا اور مختلف علوم و فنون پر ماہ تازہ کتابیں تصنیف کی گئیں۔ تاسنہ و طب سے متعلق یونانی کتب کا عربی میں ترجمہ کیا گیا خلاصہ یہ کہ علم ریاضی، علم طب، علم ہیئت، علم جغرافیہ اور علم تاریخ میں مسلم علماء نے حیرت انگیز مہارت حاصل کر لی اور یادگار کے طور پر زندہ جاوید کتابیں چھوڑ گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس دورِ انحطاط میں جب کہ انگریزوں کی طویل غلامی نے اسلامی اقدار کو پامال کر کے رکھ دیا ہے کسی نہ کسی طرح مسجد کی یہ حیثیت باقی رہے اور بعض مساجد میں قرآن کریم کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ مسلمانوں کی دیکھا دیکھی عیاسیوں نے اپنا بڑی بڑی یونیورسٹیوں کو اپنی نڈھالی دروس گاہوں کی بنیاد پر قائم کیا۔ چنانچہ آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کی اساس گر جا پر ہی رکھی گئی رہے مزید براں عیاسیوں کے اکثر تعلیمی ادارے وہاں کے گریجویٹوں کے زیر سایہ چل رہے ہیں۔

**طلبہ کے فرائض** | طلبہ کو یہ امر کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ وہ طالب علم ہیں وہ اپنی زندگی کے قیمتی لمحات اور اپنے والدین کی محنت شاقہ سے کمائی ہوئی دولت تحصیل علم پر صرف کر رہے ہیں اس کا تقاضا ہے کہ ان کی زندگی با کوئی لمحہ



صانع نہ ہونے پاتے اور نہ ہی تحصیل علم کا مطمح نظر ان کی نگاہ سے کبھی اوجھل ہو۔ ایک زمانہ وہ تھا جب ذرائع آمدورفت کا فقدان تھا۔ مسلمان ایک ایک حدیث حاصل کرنے کے لئے پاپیادہ سینکڑوں میل سفر طے کرتے اور اس گوہر مقصود کو تلاش کرتے تھے۔ آج راحت و آرام کا دور دورہ ہے سب علوم و فنون سہولت سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ ایسی ایجادات نے انسانی زندگی کی تمام سہولتیں مہیا کر دی ہیں اس دور میں علم سے محرومی حد درجہ کمی حراماں نصیبی اور بد بختی ہے علاوہ ازیں مکتب کے کچھ آداب بھی ہیں جن کا ملحوظ رکھنا ایک طالب علم کے لئے حد ضروری ہے مثلاً یہ آداب قابلِ ملاحظہ ہیں۔

۱۔ احترام اساتذہ مکتب کا اولین ادب احترام استاد ہے۔ اسلام نے جہاں اقارب و اعزہ کا ادب و احترام سکھایا ہے وہاں استاد کا احترام بجالانے کی بھی تاکید کی ہے۔ احترام کا تقاضا یہ ہے کہ استاد کی ہر بات نہ صرف تسلیم کی جاتے بلکہ اس پر عمل کیا جاتے۔ بات چیت کرتے وقت آداب معلماۃ کو نظر انداز نہ کیا جائے استاد کسی حیثیت کا بھی ہو اسے حقیر تصور نہ کیا جائے غرض اس کے احترام و اکرام کا خیال رکھا جائے۔

۲۔ ہم مکتب طلبہ سے حسن سلوک - ہم مکتب اور خاص طور سے ہم جماعت طلبہ سے خوش اخلاقی، ملتساری اور الفت و محبت کا سلوک کرنا چاہیے۔

۳۔ دیگر ضروری امور یہ ہیں - (۱) شائستہ طرز کلام (۲) فحش گوئی سے احتراز (۳) صفائی پسندی اور سلیقہ شکاری (۴) بلاوجہ کوئی حرکت نہ کرنا (۵) مکتب کے اوقات میں توجہ سے اپنے کام میں مشغول ہونا۔

شاگرد شعوری یا غیر شعوری طور پر استاد سے متاثر ہوتا ہے والدین کی تربیت کے بعد بچہ جس شخصیت کا اثر

## استاد کے اوصاف

سب سے زیادہ قبول کرتا ہے۔ وہ استاد ہے طلبہ کی اثر پذیری کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ یہ تاثر اخلاق و عادات، طرز زندگی، علم و فضل، زہد و تقویٰ، سبھی امور کو شامل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اساتذہ کے انتخاب میں بڑی باریک بینی کی ضرورت ہے۔

۱۔ تقویٰ - تقویٰ کا وصف استاد کے لئے لازمی اوصاف میں سے ہے۔ یہ وصف بچہ



جامع اور دیگر اوصاف کو شامل ہے اس لئے استاد کا متفق ہونا نہایت ضروری ہے ایک  
متقی استاد بلاشبہ مجموعہ اوصاف و اخلاق ہوگا

ایسا مرتبہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا پاؤں ایک بچے کے پاؤں پر آ گیا۔ بچے نے چلا کر  
کہا۔ خدا سے نہیں ڈرتا۔ امام ابوحنیفہ غمیش کھا کہ گر پڑے۔ اسلام اساتذہ سے اسی قسم  
کے خوف خدا کا مطالبہ کرتا ہے۔

۶۔ خوش اخلاقی :- استاد خوش اخلاق، خندہ جمین اور نرم مزاج ہونا چاہیے۔ ایک  
ترش رُو و تند خو آدمی کا مہیاب استاد نہیں بن سکتا۔ استاد و شاگرد کا تعلق اتادہ (فائدہ دہ) و  
استفادہ (فائدہ لینا) کا ہونا ہے ظاہر ہے کہ یہ ایسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ سبب دونوں  
کے تعلقات خوشگوار ہوں اور شاگرد بڑی بے تکلفی سے علمی فوائد حاصل کر سکتا ہو۔ مگر  
تنگ دل استاد سے یہ ممکن نہیں استاد کی تار اھنگی، خیر خواہی، ہمدردی اور محبت پر  
مبنی ہوتی چاہیے۔ وہ بے شک انہیں جفا کشی، محنت اور مسلسل کام کرنے پر مجبور کر  
سکتا ہے اور اس میں سختی سے کام لیتا بھی معیوب نہیں مگر اس کے دل کی گہرائیوں میں  
حسد و انتقام کا کوئی جذبہ پنہاں نہیں ہونا چاہیے۔

۷۔ اتباع شریعت :- استاد کے لئے متبع شریعت ہونا نہایت ضروری ہے ایسا بے عمل  
شخص کی بات میں کوئی تاثیر نہیں ہوتی۔

۸۔ عجز و وقار :- استاد معزز ہونا چاہیے، عزت و خودداری کا دامن ہاتھ سے  
چھوڑنا ایسا استاد کے لئے موزوں نہیں شاہِ بخارا نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے  
درخواست کی تھی کہ قہر شاہی پر حاضر ہو کہ اس کے بچوں کو صحیح بخاری پڑھایا کر لیا آپ  
نے اس کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور فرمایا کہ تمہیں علم کے اعزاز کو قائم رکھنا چاہیے۔

اسی طرح خلیفہ باندوین الرشید نے امام مالک سے درخواست کی میرے پاس حاضر ہو کہ  
مجھے حدیث پڑھائیے۔ امام مالک نے انکار کیا اور فرمایا تمہیں علم کو سرایت کرنا چاہیے اگر  
خلیفہ وقت ہی تذیل پر اتر آئے تو علم کی شان کیوں قائم رہے گی

۵۔ صبر و استقلال :- استاد کو چاہیے کہ وہ صابر اور مستحکم ہو۔ اس کی حالت



میں صبر و حوصلہ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے ہمارے بزرگ اکابر امام ابوحنیفہؒ  
امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اس راہ میں جو شہادت و آلام  
بدواشتہت کئے وہ بڑے صبر آزمائے تھے۔

وسعت قلب - استاد کے لئے قراخ دل ہونا از بس ضروری ہے۔ ایک تنگدل  
شخص ہرگز کامیاب استاد نہیں بن سکتا۔

مکتب کی افادیت | مکتب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ہم بتلا چکے ہیں کہ مکتب  
کس حد تک طلبہ کی سیرت کی تشکیل میں مدد و معاون ہوتا  
ہے۔ اور اصلاح معاشرہ میں اس سے کہاں تک مدد ملتی ہے اب ہم ان فوائد کا خلاصہ  
بیان کرتے ہیں۔

۱۔ مکتب ازالہ جہالت کر کے علم و فضل سے آراستہ کرتا ہے۔

۲۔ مکتب کے ذریعہ فاضل اساتذہ کی صحبت میسر آتی ہے جس سے طالب علم کے  
قلب و ذہن کی دنیا بدل جاتی ہے اور اس کی زندگی نئے سلیپے اور نیا طرز و انداز  
اختیار کرتی ہے۔

۳۔ مکتب میں رہ کر ہم مکتب طلبہ کے ساتھ جو روابط و مراسم استوار ہوتے ہیں وہ

تا زندگی باقی رہتے ہیں۔ اور! تعداد فوائد کے موجب بنتے ہیں ہم جماعتوں کی ایک  
مستقل برادری قائم ہو جاتی ہے۔ جس کے اثرات بڑے دیر پا ثابت ہوتے ہیں۔

۴۔ مکتب میں رہ کر بچہ آداب مکتب و استاد سے آشنا ہوتا ہے اور آئندہ زندگی میں

ایک نوری انسان بن جاتا ہے۔ اساتذہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کے سلیقہ پر بھی

نظر رکھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ گفتگو کے آداب سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

بدزبانی سے احتراز کرتا ہے۔ صفائی اور سلیقہ شعاری کا جو گر ہوتا ہے اور زندگی کے

دیگر آداب و اطوار سیکھتا ہے۔

۵۔ مکتب میں پابندی کے ساتھ ریاضت اور سیر و تفریح کا اہتمام کیا جاتا ہے جس سے



جسمانی صحت کے قیام و بقا میں مدد ملتی ہے۔

- ۶۔ مکتب میں رہ کر بچہ بڑوں کی تعظیم و اکرام کرنا سیکھتا ہے۔
- ۷۔ مکتب کی زندگی سے طالب علم کے اندر احساس ذمہ داری کا جذبہ پروان چڑھتا ہے
- ۸۔ مکتب کی زندگی انسان کو نظم و ضبط کا عادی بناتی ہے۔

## سوالات

- ۱۔ مکتب بچہ کے مستقبل کو سنوارنے میں کس حد تک مدد دیتا ہے؟
- ۲۔ اساتذہ کس حد تک طالب علم کی زندگی کو متاثر کرتے ہیں؟
- ۳۔ طلبہ کے فرائض و آداب کیا ہیں؟
- ۴۔ استاد کن خوبیوں کا حامل ہونا چاہیے۔ بہترین استاد کے اوصاف خصوصاً کیا ہیں؟
- ۵۔ مکتب کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالئے۔



# استاد و شاگرد کے حقوق و فرائض

## دین اسلام اور علم

علم کی فضیلت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ ترقی کی دوڑ میں آج وہی قوم سب سے آگے ہے جس کا علم پایہ سب سے بلند ہے۔ یہ تحقیق و تدقیق کے میدان میں سب سے آگے ہے جو سائنسی ایجادات میں دوسری قوموں کو مات دے چکی ہو۔ آج جو بات ایک حقیقت ثابتہ بن کر اقوام عالم کے سامنے آئی ہے اسلام چودہ صدیاں پہلے بیانگ دہن اس کا اعلان کر چکا ہے اور یوں عالم میں اسلام سب سے زیادہ علم کی اہمیت و فضیلت کا اعتراف کرتا اور اس کے سیکھنے کی عبادت توجہ دلاتا ہے۔ دین اسلام میں فضیلت علم کے اظہار کا آغاز آفریش آدم ہی سے ہو گیا تھا۔ قرآن حکیم میں تخلیق آدم کا یہ واقعہ مذکور ہے اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ علم ہی سے حضرت آدم نے قرشوں پر برتری حاصل کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پہلی وحی نازل ہوئی اس میں ارشاد ہوا

”اَشْرَقَ رُوحًا سَدِيدًا لَيْسَ الذَّبْحُ  
خَلْقًا“ (سورہ عنق) انسان کو پیدا کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر پڑھنے سے زیادہ ضروری کوئی اور حکم ہوتا تو پہلے آپ کو اس کی تلقین کی جاتی قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا سکھائی گئی ہے۔

رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا (۱۲۰-۱۲۱) (اسے پروردگار میرے علم کو زیادہ کر دے)

قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ مذکور ہے جس سے علم کی فضیلت واضح ہوتی ہے آپ ایک جلیل القدر رسول ہونے کے باوجود طویل علم کے لئے پانچ سو میل مسافت طے کر کے جناب خضر کے پاس پہنچے اور سفر میں ان کے ساتھ رہ کر علم حاصل کرتے رہے حالانکہ آپ ایک عظیم رسول تھے۔ اور حضرت خضر کا نبی ہونا اکثر علماء کے نزدیک ثابت نہیں یہ واقعہ فضیلت علم کی روشن دلیل ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ احساس عزت و عظمت کسی مرحلہ پر بھی تحصیل علم میں منگ رہا نہیں ہوتا



چاہیے۔ تیسرے یہ کہ طلب علم کی راہ میں صعوبات سفر اور دیگر مشکلات کو برداشت کرنا سنت انبیاء ہے بہر کیفیت علم کی فضیلت میں اس قدر آیات و احادیث اور اقوال و آثار وارد ہوئے ہیں کہ ان کا ذکر و بیان موجب طوالت ہے۔

**ظہور اسلام کے بعد اشاعتِ علم** | ظہور اسلام سے قبل عربوں میں علم کا ذوق و شوق تزکیا رکھنے پڑھنے کو عیب سمجھا جاتا تھا

پڑھے لکھے خال خال نظر آنے تھے۔ مورخ بلاذری کے بیان کے مطابق قریش کے سارے قیدیوں میں صرف ۷ آدمی لکھ پڑھ سکتے تھے۔ اسلام کی دینی برکتوں میں یہ واقعہ بھی کچھ کم اہم نہیں بلکہ اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ نوشتہ و خواندہ کائن بھی فروغ پاتا جاتا تھا۔ بدر کے قیدیوں میں جو نادر تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا قیدیہ مقررا لیا کہ وہ دس مسلمانوں کو لکھنا سکھادیں۔ (مسند احمد جلد اول ص ۲۴۷)

اصحابِ صفہ میں کم و بیش سو صحابہ شامل تھے۔ ان کی دیگر تعلیمات کے ساتھ ساتھ لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا (مسند احمد - جلد ۳، ص ۱۹۲)

ازواجِ مطہرات میں حضرت حفصہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ حضرت حفصہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یہ فن شفا بنت عبد اللہ سے سیکھا تھا (ابوداؤد)

بعض اور صحابیات بھی نوشتہ و خواندہ سے آشنا تھیں (فتوح البلدان بلاذری) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں۔

عرب کے ہر قبیلہ کا ایک گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتا اور آپ سے مذہبی امور دریافت کرتا اور دین میں تفقہ حاصل کرتا تھا۔

**دین اسلام میں استاد کا مقام** | دین اسلام نے استاد کو بڑے بلند منصب و مقام پر فائز کیا اور کائنات صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم جہاں دوسرے مہذب جلیبہ سے نواترے گئے وہاں آپ کو معلم اعظم کی مندرجہ ذیل بھی تفویض ہوئی۔ قرآن میں ارشاد ہوا



وہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے  
ان پڑھوں میں ان ہی میں سے ایک  
عظیم رسول بھیجا۔ جو ان پر اس کی آیات  
تلاوت کرتا۔ ان کا تذکرہ کرتا اور ان کو  
کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

”هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ  
رَسُولًا مِّنْهُمْ لِيُتْلِيَ عَلَيْهِمْ  
آيَاتِهِ وَيُزَكِّيَهُمْ  
وَيُعَلِّمَهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ  
(سورہ الجمعہ)

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے  
اہم مقاصد تین ہیں۔

- ۱۔ تلاوت آیات
- ۲۔ تزکیہ نفوس
- ۳۔ تعلیم کتاب و حکمت

مولانا عبدالمجید دریا آبادی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔  
رسول کا کام محض تبلیغ و پیام رسانی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کا کام کتاب الہی کے بعد  
اس کی تعلیم و تدریس کا بھی ہے۔ تعلیم کتاب میں اس کی شرح و تفسیر بھی شامل ہے۔ اس سے  
ان کچھ فہموں کی تردید ہوتی ہے جو رسول کا منصب (معاذ اللہ) صرف ڈاکیہ یا فاضل کا  
سمجھے ہوتے ہیں گویا اس آیت کے پیش نظر رسول کی حیثیت معلم اعظم کی ہوتی ہے۔  
(تفسیر ماجدی)

اس آیت سے یہ حقیقت و اشکاف ہوتی ہے کہ سالارِ رسل اور خاتم الانبیاء و  
المسلمین کے مقام رفیع پر فائز ہونے کے باوجود ایک معلم کا پارٹ ادا کرنے سے آپ کی  
شان میں قدح وارد نہیں ہوتی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بلا اپنے آپ کو معلم قرار دیا  
کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں تشریف لائے۔ صحابہ کرام کی ایک جماعت ذکر خداوندی  
میں مشغول تھی۔ چند دیگر صحابہ پڑھنے پڑھانے میں لگے ہوتے تھے۔ آپ ان کے حلقہ میں  
بیٹھ گئے اور فرمایا

”بُعِثْتُ مُعَلِّمًا“ (مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے) (صحاح ستہ)



قرآن کریم پڑھانے والے کی فضیلت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمائی۔

”خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ  
وَعَلَّمَهُ“ (بخاری شریف) پڑھے اور پڑھائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عصر و عہد میں تعلیم و ارشاد کے مختلف طریقے تھے۔ تعلیم و تدریس کا ایک طریقہ یہ تھا کہ باہر سے آنے والے کچھ عرصہ خدمت اقدس میں رہ کر عقائد و فقہ کے ضروری مسائل سیکھ لیتے تھے اور اپنے قبائل میں واپس جا کر ان کو تعلیم دیتے تھے حضرت مالک بن حویرث نے مدینہ اکبرہ ۲۰ دن قیام کیا اور ضروری مسائل کی تعلیم حاصل کی۔ جب واپس جاتے گئے تو آپ نے فرمایا

”اپنے خاندان میں واپس جاؤ۔ ان میں رہ کر ان کو دینی مسائل سکھاؤ اور جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے اسی طرح نماز پڑھو“ (بخاری شریف)

مذکورہ حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فخریہ طور پر اپنے آپ کو معلم تدریس دیتے تھے اور ایک معلم کے فرائض منصبی ادا کرنے کو اپنے لئے باعث عار و ننگ خیال نہیں فرماتے تھے

استاد و شاگرد کا یا بھی ربط | دینی نقطہ نظر سے استاد و شاگرد کا یا بھی ربط  
تعلق بے حد گہرا ہے موجودہ مادی دور میں جہاں

ہماری اور بہت سی اخلاقی اور روحانی قدریں برباد ہوئی ہیں۔ استاد اور شاگرد کا رشتہ بھی اس سے متاثر ہوا ہے یہ ایک المیہ ہے کہ یہ رشتہ جو محبت و تعظیم اور تعلق خاطر کا رشتہ تھا کاروباری سطح پر آگیا ہے جب ماحول مادیت سے متاثر ہو تو شاگرد سمجھتا ہے کہ میں قیس ادا کرنا ہوں اس لئے مجھے یہ حق حاصل ہے کہ کلاس روم میں بیٹھوں اور لیکچر سنوں۔ میں استاد کا مہربان منت نہیں ہوں دوسری جانب اساتذہ میں بھی اس اخلاص کا فقدان ہے جو عہد سلف کا متیار تھا۔ اکثر اساتذہ محض کسب معاش کے لئے علم حاصل کرتے ہیں۔ تکمیل علم کی مکن ایک طلب ایک پیس جو ایک عالم با رہتی چاہیے اساتذہ میں باقی نہیں ہے۔ جب علم



محض کسب معاش کی خاطر حاصل کیا جائے تو وہ انسانی رگ و پے میں سماتا نہیں ہے۔ علم بڑا ہی غیور واقع ہوتا ہے وہ ان لوگوں کے سینوں کو کبھی اپنا نشیمن نہیں بنا تا جو اسے نیک مقاصد کے لئے حاصل نہ کرتے ہوں۔ جب استاد محض کسب معاش کے لئے پڑھتا ہے تو اسے اپنے مضمون پر دسترس نہیں ہوتی اور جب مضمون پر دسترس نہ ہو تو وہ اپنی کمزوری کو طلبہ سے چھپانے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ طلبہ کچھ پوچھنا چاہتے ہیں اور استاد صاحب انہیں دیا تے اور رعب جہاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ میں استاد کے لئے محبت و تعظیم باقی نہیں رہتی۔ شاگرد یہ سمجھتا ہے کہ میں نے فیس ادا کی ہے۔ استاد کا خیال یہ ہوتا ہے کہ مجھے اپنی تنخواہ کے عوض اتنے گھنٹے کام کرنا ہے اور اس معین وقت کے ختم ہو جانے کے بعد مجھ پر طالب علم کا کوئی حق باقی نہیں رہتا ہے۔

کچھ وہ کھچے کھچے رہے کچھ ہم تنے تنے

اس کش مکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا

یوں یہ رشتہ کاروباری سطح پر آنے کی وجہ سے اپنی تمام جاؤ بیت کھو بیٹھا۔

وینتی لفظ نظر سے استاد شاگرد کا ربط و تعلق | آیتے ہم اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کا

علاج ڈھونڈیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے۔

مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَلَمْ يُوَفِّرْ كِبَانَا فَلَيْسَ مِنَّا ، ،  
جو چھوڑوں پر شفقت نہیں کرتا اور بڑوں کا احترام نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (مشکوٰۃ)

طالب علموں کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ اساتذہ سے فیض حاصل کرتے ہیں اساتذہ ان کی ذہنی تربیت کرتے ہیں اس لئے وہ ان کے محسن ہیں شراکت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے محسن کے سامنے انسان کی نگاہیں جھکی رہیں۔ انسانیت کا تقاضا یہی ہے کہ جس شخص سے انسان فیض حاصل کرتا ہے۔ اس کے گریبان میں ہاتھ نہ ڈالے اسی طرح استاد کا یہ سمجھنا کہ ان معین گفتگوں کے بعد شاگرد کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ میرے دروازے پر دستک



دے۔ صریحاً غیر اسلامی فعل ہے شاگردان کی معنوی اولاد ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں شاگرد اپنی طالب علمانہ زندگی ہی میں نہیں بلکہ عمر بھر یہ حق رکھتا ہے کہ جب کبھی اسے کوئی الجھن پیش آئے وہ استاد کی خدمت میں حاضر برادر اپنے مسائل سلجھانے کی کوشش کرے اس سے بڑھ کر اسلام تعلیم و تدریس کو ایک فریضہ یا خدمت جاریہ قرار دیتا ہے حضرت ابوقتاوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تین عمل ایسے ہیں کہ موت کے بعد بھی مسلمان کو نائدہ پہنچاتے ہیں (۱) وہ ایسا صدقہ کر گیا جس کا ثواب اس کی موت کے بعد بھی جاری رہا (۲) ایسی اولاد چھوڑ گیا جو اس کے لئے دعا کرتا ہے (۳) ایسے علم کی اشاعت کر گیا جس پر اس کے بعد بھی عمل کیا جاتا ہے (مشکوٰۃ)

مشہور نحوی خلیل بن احمد کہا کرتے تھے۔

اگر ثواب کے لئے نہیں تو اسی خیال سے لوگوں کو تعلیم دو کہ خود تمہارا علم تازہ رہے۔ کثرت سوال سے اکتاؤ نہیں کیونکہ اس سے تم پر علم کے نئے نئے دروازے کھلیں گے۔ (جامع بیان العلم لابن عبدالبر)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم پڑھانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے علم تازہ رہتا ہے لہذا طلبہ کو کسی وقت بھی مایوس نہیں کرنا چاہیے بلکہ ذوق و شوق سے ان کے سوالات کا اطمینان بخش جواب دینا چاہیے یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام خود لوگوں کو تحصیل علم کی دعوت دیا کرتے تھے عروہ بن زبیر اپنے لڑکوں سے کہا کرتے تھے "آؤ مجھ سے علم حاصل کرو کیونکہ عنقریب تم قوم میں بڑے آدمی بنو گے۔ میں بھی پہلے چھوٹا بھتا اور کوئی میری پرواہ نہ کرتا تھا لیکن جب جوان ہوا لوگ دوڑ کر آتے اور مجھ سے فتویٰ لینے لگے اس سے بڑھ کر عیب اور کیا ہو سکتا ہے کہ آدمی سے اس کے دین کی کوئی بات پوچھی جاتے اور وہ حیا ہی نکلتے۔ (جامع بیان العلم)

شاگردوں پر اساتذہ کے بہت حقوق ہیں۔ ان کو تلامذہ کے استاد کے حقوق کے فرائض بھی کہہ سکتے ہیں۔

۱۔ اطاعت استاد استاد کا پہلا حق یہ ہے کہ شاگرد اس کے احسان کو تازہ نگہی یاد



رکھے۔ اور اس کے حکم سے سر تابی نہ کرے استاد کا درجہ والد سے کسی طرح کم نہیں جس طرح  
حقیقی والد اولاد کی جیانی تربیت کرتا ہے اسی طرح استاد اس کی روحانی اور ذہنی تربیت  
کا کفیل ہوتا ہے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

« مَنْ عَلَّمَ نَفْسًا آيَةً مِنْ كِتَابِ  
اللَّهِ فَهُوَ مَوْلَايَ »

جس نے مجھے قرآن کی ایک آیت  
سکھائی وہ میرا آقا ہے۔

آپ ہی کا در سر اقول ہے۔

مَنْ تَعَلَّمْتُ مِنْهُ حَرْفًا  
فَأَنَا عَبْدُهُ

جس سے میں نے ایک حرف بھی سیکھا  
ہے میں اس کا غلام ہوں۔

۲۔ آدابِ مجلس :- استاد کا حق ہے کہ تلامذہ اس کی موجودگی میں آدابِ مجلس ملحوظ  
رکھیں۔ یہ آداب شاگرد کو مجلس نبوی سے سیکھنے چاہئیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور  
صحابہ کے تعلق کے جہاں اور کئی پہلو تھے ان میں استاد اور شاگرد بھی تھا اس لئے کہ سردار  
اتباع ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کا منصب ایک معلم اعظم کا بھی تھا۔ پس ایک مسلمان طالب علم  
کو اپنے استاد کے ساتھ برتاؤ کا ڈھنگ بھی مجلس نبوی ہی سے سیکھنا چاہیے اس استاد اعظم سے  
بات کرنے کا سلیقہ قرآن مجید میں یوں سکھایا گیا ہے۔

لَا تَشْرَفُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ  
صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ  
بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ  
( الحجرات )

اپنی آواز کو پیغمبر کی آواز سے اونچا  
مت ہونے دو اور ان سے زور زور  
سے باتیں مت کیا کرو۔ جیسے تم آپس میں  
کہ لیا کرتے ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے استاد کی آواز سے اپنی آواز کو اونچا کرنا  
صریحاً ناشائستگی ہے۔

تفہیمات

صحابہ مجلس نبوی میں کامل ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے تھے۔ صحابہ کرام کا بیان ہے کہ وہ  
مجلس نبوی میں یوں بیٹھتے تھے۔



كَانَ عَلَى دُوسِنَا الطَّيْبُو ،  
(صحیح بخاری)

گویا ہمارے سر پر پرندے بیٹھے ہیں کہ  
ذرا سی حرکت کرنے سے اڑ جائیں گے۔

ادب مجلس کا دائرہ بہت وسیع ہے اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ استاد کی بات کو  
حاموشی کے ساتھ سے اور اس کی قطع کلامی نہ کرے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں لگاتار دو برس ارادہ کرتا رہا  
کہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث کے بارے میں سوال کروں مگر  
رعب کی وجہ سے ہمت نہ پڑتی تھی آخر ایک حج کے موقع پر جب وہ قضائے حاجت سے فارغ  
ہو کر واپس ہونے لگے تو میں نے دل کڑا کے عرض کیا۔ امیر المؤمنین! ایک حدیث کے متعلق  
دو برس سے سوال کرتا چاہتا ہوں۔ مگر آپ کا رعب بولنے نہیں دیتا۔ فرمایا۔ یوں نہ کیا کرو  
جب کچھ پوچھنا ہو۔ لیے دھڑک پوچھ لیا کرو۔ علم ہوگا تو بتاؤں گا۔ ورنہ کہہ دوں گا کہ مجھے

(جامع بیان العلم)

معلوم نہیں

۳۔ تم تعظیم و احترام :- استاد کا تیسرا حق یہ ہے کہ اس کی تعظیم کو ملحوظ رکھا جائے  
تعظیم و احترام میں یہ امر بھی شامل ہے کہ شاگرد پہلے استاد کو سلام کہے۔ استاد مشفقانہ  
انداز سے اس کا جواب دے اور اس سے پہلو تہی نہ کرے۔ یہ اسلامی تعلیمات کا عین تقاضا  
ہے قرآن میں فرمایا

اور جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اس  
سے زیادہ تپاک اور گر مجوشی سے سلام  
کا جواب دو یا کم از کم ویسا ہی سلام  
لوٹا دو۔

”فَإِذَا حُيِّتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا  
بِأَحْسَنِ مِنْهَا أَوْ رُدُّوْهَا“  
(النساء - ۸۷)

تاہم اس میں کوئی حرج نہیں کہ استاد سلام میں پہل کرے بلکہ طلبہ کی تربیت کے لئے  
یہ بات مناسب تر اور سنت نبوی ہے۔ حدیث میں آیا ہے

”كَانَ يُسَلِّمُ عَلَى الصَّبِيَّانِ“  
(بخاری شریف)

(آپ بچوں کو خود سلام کیا  
کرتے تھے)



## ۴ دعائے خیر

بات بھی شامل ہے کہ اس کے فہمیت ہونے کے بعد

شاگرد اس کے حق میں دعائے خیر سے اور بارگاہِ ربانی سے اس کی معذرت طلب کرے، مروجہ اساتذہ کے لئے دعائے معذرت اکثر علمائے سلف سے منقول ہے۔

استاد کے یہ چند آداب ذکر کئے گئے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ نامہ استاد سے ادب و احترام، تعاون، ہمدردی اور اظہارِ نیاز مندی کا سلوک کیا جائے بلکہ اس کے دینا سے شخصیت ہو جانے کے بعد بھی اس کے حقوق کو ذرا موٹا نہ کیا جائے۔

اسی طرح اساتذہ پر ان کے شاگردوں کے لئے بھی چند حقوق ہیں۔ ان کو اساتذہ کے فرائض بھی کہہ سکتے ہیں۔

## شاگرد کے حقوق

۱۔ شفق و محبت :- استاد کا پہلا فرض یہ ہے کہ شاگرد سے ہر وقت محبت کا سلوک روا رکھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ذکر کی جا چکی ہے ”جو چھوٹوں پر رحم نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں“ شفق و تعظیم باہم لازم و ملزوم ہیں کبھی تعظیم سے شفق پیدا ہوتی ہے اور کبھی شفق تعظیم کو جنم دیتی ہے۔ شفق وہ چیز ہے جو بے کرم کو موم کر دیتی ہے۔ آج کل شفق میں کمی آگئی ہے۔ بعض اساتذہ کو دیکھا ہے کہ طالب علم کے سلام کا جواب بڑی سرد مہری سے دیتے ہیں۔ اور بعض تو محض سر ہلا دیتے ہیں اور زبان سے دو حرف کہتا بھی انہیں گراں گزرتا ہے یہ اسلامی تعلیمات کے متافی ہے شفق و محبت کے اس سلوک کو قدیم ادراک سوزہ کہہ کر ٹال نہیں سکتے، مگر بے مردنی اور بد اخلاقی کا نام تو تجرہ و پسندی نہیں ہے۔ اقبال نے بجا فرمایا تھا :-

زمانہ ایک حیات ایک اکائنت بھی ایک

دہل کم نظری ، قصہ جدید و قدیم

۲۔ صحبت استاد :- استاد کی ہم نشینی اور صحبت و رفاقت شاگرد کا جائزہ حق ہے اور

اس کو اس سے محروم کرنا نہایت نامناسب ہے۔ ہماری درس گاہوں میں طالب علم

استاد کے کمرہ میں جا میں تو وہ کھڑے رہتے ہیں اور بالعموم انہیں بیٹھنے کی اجازت

نہیں دی جاتی۔ یہ سب فرنگی تہذیب کے باقی ماندہ آثار ہیں۔ بقول اقبال :-



دل توڑ گئی ان کا صدیوں کی اسلامی  
 استاد و شاگرد کے مابین پیدا کردہ تفریق مغربی تہذیب کی منحوس یادگار ہے  
 اور یہ اہل کلیسا کا نظام تسلیم  
 ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف  
 جب تک استاد اور شاگرد میں مہر و محبت اور الفت و موافقت نہ ہو صحیح طور  
 پر استفادہ نہیں ہو سکتا۔

۳۔ حق سوالی شاگردوں کے حقوق میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جو بات انہیں معلوم  
 نہ ہو وہ اساتذہ سے دریافت کر سکیں اس کی انہیں کھلی اجازت ہونی چاہیے اگر تلامذہ کو  
 اس جائز حق سے محروم کر دیا جائے تو وہ بہت سی علمی باتوں سے محروم رہ جائیں گے اس  
 ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ استاد اگر کسی وقت کسی بات کا جواب نہ دے سکے تو اسے  
 اپنی کم علمی کا اعتراف فراخ دلی سے کر لینا چاہیے یہ بات کسی طرح بھی شانِ علم کے منافی نہیں  
 حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت  
 میں ایک شخص نے عرض کیا "سب سے اچھے مقامات کون ہیں؟" فرمایا میں نہیں جانتا، اس  
 نے پھر سوال کیا۔ سب سے برے مقامات کون ہیں؟ فرمایا میں نہیں جانتا "حضرت عبداللہ  
 بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

"لوگو! عیوبات جانتے ہو، وہی کہو جو نہیں جانتے اس پر اللہ اعلم و خدا  
 بہتر جانتا ہے" کہا کرو۔ کیونکہ علم کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ انسان جو بات نہیں جانتا  
 اس سے لاعلمی کا اظہار کرے۔

عبدالرحمن بن نجیبی بیان کرتے ہیں کہ ایک دن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس لگی  
 ہوتی تھی ایک شخص آیا اور عرض کی "جناب! میں چھ ماہ کا طویل سفر کے خدمت میں حاضر  
 ہوا ہوں۔ میری قوم نے ایک مسئلہ دریافت کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔  
 امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جو کچھ پوچھنا ہے پوچھو" اس نے مسئلہ پیش کیا۔ تو وہ  
 تھک سوچنے رہے۔ پھر فرمایا۔ مجھے یہ مسئلہ معلوم نہیں "سائل حیران رہ گیا، وہ تو یہ



سمجھ کر آیا تھا کہ ایسے شخص کے پاس جا رہا ہوں جو سب کچھ جانتا ہے اب صاف جواب سن کر اس کی حیرت کی حد نہ رہی پھر کہنے لگا لیکن حضرت! لوٹ کر اپنی قوم سے کیا کہوں گا امام مالک نے جواب دیا "کہنا مالک نے مجھ سے کہا کہ میں اس مسئلہ سے ناواقف ہوں

(جامع بیان العلم لابن عبد البر)

۴- تعلیم کے لئے اہل لوگوں کا انتخاب استاد کے فرائض میں یہ بات بھی شامل ہے کہ تعلیم کے لئے اہل لوگوں کو منتخب کرے اور نالائقوں کو ریور تعلیم سے آراستہ نہ کرے۔ امام زہری فرمایا کرتے تھے۔

"علم پر بھی بربادیاں آتی ہیں۔ ایک بربادی یہ ہے کہ عالم کو ناقدری کی نگاہ سے دیکھا جائے اور عالم اپنا علم سینہ میں چھپائے مر جائے۔ ایک بربادی یہ ہے کہ علم میں جھوٹ کی آمیزش کی جائے۔ یا نالائقوں کو تعلیم دی جائے اور یہ علم کی سب سے بڑی بربادی ہے۔"

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ حضرت سے فرمایا کرتے تھے "میں یہ کیا دیکھتا ہوں کہ تمہارے علماء اٹھتے جاتے ہیں اور تمہارے جہاں علم حاصل نہیں کرتے۔ لوگو! علم حاصل کرو۔ اس سے پہلے کہ اسے اٹھایا جائے۔ علم کا اٹھ جانا۔ اہل علم کا مٹ جانا ہے۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ تم اس چیز کے پیچھے پڑے ہو جو تمہیں ضرور ملے گی اور اس چیز سے بے فکر ہو جس کی تحصیل تم پر واجب ہے (یعنی علم) میں تمہارے شریعوں کو اس سے زیادہ پہچانتا ہوں جتنا سلوٹری گھوڑوں کو پہچانتا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کا استقبال پیٹھ موڑ کے کرتے ہیں اور کان بند کر کے سنتے ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگلے چلے جائیں اور پچھلے علم نہ سیکھیں اگر عالم مزید علم حاصل کریں تو ان کا علم بڑھ جائے گا اور اس میں کمی نہیں ہوگی اور اگر جاہل علم طلب کریں تو علم کو اپنے لئے ہموار پائیں گے یہ کیا ہے کہ میں تمہیں کھانوں سے بے ریزہ اور علم سے خالی دیکھتا ہوں۔"

(جامع بیان العلم)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نالائقوں کو تعلیم دینے سے منع کرتے ہوئے فرماتے ہیں "علم کو اہل لوگوں سے مت چھپاؤ کہ یہ گناہ کا کام ہے اور نالائقوں کو پیش نہ



کردہ کہ یہ حماقت ہے مہربان طیب کی طرح بندہ جو دوا اسی جگہ استعمال کرتا  
ہے جہاں مفید ہوتی ہے۔  
دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

سور کے آگے موتی نہ ڈالو۔ کیونکہ وہ موتی کی قدر نہیں جانتا۔ جسے ضرورت  
نہیں اسے علم نہ دو۔ کیونکہ علم موتی سے زیادہ قیمتی ہے اور جسے حکمت کی  
تلاش نہیں وہ ستور سے بدتر ہے (جامع بیان العلم)  
۵۔ خوش اخلاقی :- استاد کا فرض ہے کہ خوش اخلاق ہو تاکہ ہر شخص اس سے استفادہ  
کر سکے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔  
"خود علم سیکھو اور دوسروں کو سکھاؤ۔ علم کے لئے سنجیدگی اور بددباری پیدا کر دین  
سے علم سیکھو اور جسے سکھاؤ۔ اس سے خاکساری برتر۔ جیسا کہ عالم نہ ہو کہ تمہاری بد مزاجی  
تمہارا ساتھ چھوڑ دے۔"

۶۔ اشاعت علم :- معلم کا حق ہے کہ علم کی امکانی اشاعت کرے اور اس میں مٹھی  
سے کام نہ لے حضرت مالک بن دینار کا قول ہے۔

"جو شخص اپنی ذات کے لئے علم حاصل کرتا ہے اس کا علم گھٹ جاتا ہے اور  
جو لوگوں کے لئے حاصل کرتا ہے اس کا بڑھ جائے گا۔ کیونکہ آدمی کی اپنی  
ضرورتیں کم ہوتی ہیں اور لوگوں کی بہت۔"

۷۔ اخلاص نیت :- استاد کے لئے یہ عمل بھی ضروری ہے کہ علم، اجر و ثواب  
کے لئے حاصل کرنے اور شاگرد کو بھی اس بات کی تلقین کرے۔  
حدیث میں فرمایا۔

إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (اعمال کا انحصار نیت پر ہے)

(بخاری و مسلم)

استاد اور شاگرد کے بارے میں چند امور کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں بہت زیادہ  
باتوں کی گنجائش ہے۔ اگر شاگرد یہ بات پلے باندھیں کہ استاد ان کے محسن ہیں وہ ان



سے فیض حاصل کرتے ہیں اور استاد اپنے مضمون سے وفا کریں اور اس پر دسترس حاصل کرنے کے لئے کادش کریں۔ تو استاد اور شاگرد کے رشتے سے زیادہ پرکشش کوئی رشتہ نہیں۔ استاد اور شاگرد اسلامی تہذیب کے سانچے میں ڈھل جائیں تو آسے والا مورخ جیب ان تعلیمی اداروں کی تاریخ لکھے گا تو یہ ہر نالیں جو آتے دنوں ان درس گاہوں میں ہوتی رہتی ہیں ڈھونڈے سے بھی ان کا سراغ نہ مل سکے گا۔

## سوالات

- ۱ - دینی نقطہ نظر سے علم کی اہمیت اور استاد کا مقام واضح کیجئے۔
- ۲ - دینی تعلیمات کے پیش نظر استاد و شاگرد کے درمیان کس قسم کا رابطہ پایا جاتا ہے اس کی وضاحت کیجئے۔
- ۳ - استاد و شاگرد کے ربط و تعلق کو ملحوظ رکھنے سے تعلیمی اداروں کی بد نظمی کس طرح دور ہو سکتی ہے؛ اس پر تفصیلی روشنی ڈالئے۔
- ۴ - کتاب و سنت کے دلائل سے استاد و شاگرد کے تعلق کی نوعیت واضح کیجئے۔



## مسجد

**مفہوم** مسجد کا لفظ عربی زبان میں اسم ظرف ہے اس کے معنی ہیں سجدہ گاہ ، مسلمان جہاں بھی سجدہ خداوندی بجالاتا ہے۔ اسے لغت کے اعتبار سے مسجد کہہ سکتے ہیں۔ اہم مباحث میں مسجد اس جگہ کو کہتے ہیں جو نماز کے لئے وقف کر دی گئی ہو۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارے لئے ساری زمینیں مسجد بنا دی گئی ہے (مسلم) خلافت راشدہ میں مسجد کو مکتب کی حیثیت حاصل رہی۔ محدثین و فقہاء کے حلقہ ہائے درس مساجد ہی میں منعقد ہوتے تھے۔ تشنگان علم دور و نزدیک سے آتے اور

**اہمیت** ان چشمہ ہائے علمی سے سیراب ہوتے تھے۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے دور اقتدار تک مسجد اسی اہمیت کی حامل رہی بڑے بڑے علمی مدارس مساجد ہی میں قائم کئے گئے۔ خلفاء کی وابستگی مساجد سے قائم رہی۔ اور وہ ان کی سرپرستی کرتے رہے۔ مساجد میں امامت کے فرائض انجام دیتے۔ جمعہ کے روز منبر کی زینت بنتے اور لوگوں کو علمی توانہ سے مستفیض فرماتے الغرض تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں مساجد کو امتیازی حیثیت حاصل رہی اور وہ خاتمہ خدا ہونے کے علاوہ ایک بہترین درس گاہ اور یونیورسٹی بھی تصور کی جاتی تھیں۔

دینی نقطہ نظر سے بعض مسجدیں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ اور ان میں عبادت کرنا زیادہ اجر و ثواب کا موجب ہے۔ حصول اجر و ثواب کے نقطہ خیال سے دور دراز کا سفر طے کرنا بھی صرت انہی کے لئے رہا ہے۔ وہ تین مساجد علی الترتیب یہ ہیں۔

(۱) خانہ کعبہ کی مسجد (۲) مسجد نبوی (۳) بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ  
**اشاعت علم میں مسجد کا کردار** مسجد کو اسلام میں عظیم اہمیت حاصل رہی ہے مکہ میں نبوت کے بارہویں سال اگرچہ نماز فرض

ہو گئی تھی مگر مسلمانوں کی عسکری فتوت کی کمزوری کے باعث مکی زندگی میں نماز باجماعت کا اہتمام نہ کیا جاسکا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے اور ہر طرح سے ذہنی سکون حاصل ہوا تو آپ نے سب سے پہلے ایک مسجد کی تعمیر کا بیڑا اٹھایا جو آج تک



مسجد نبوی کے نام سے مشہور چلی آتی ہے۔ یہی مسجد بکیت اسلامیہ کا اولین مرکز قرار پائی۔ دیگر  
 نو ناگن فوائد کے علاوہ اس مسجد کو اعلیٰ ترین درس گاہ بلکہ اسلامی یونیورسٹی ہونے کا بھی فخر  
 حاصل تھا۔ برصغیر کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مسجد میں رونق افروز ہوتے تو صحابہ کرام حضور  
 سے دینی مسائل دریافت کرتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو علمی فیوض سے مستفید فرماتے  
 مجلس کا ہر سعادت مند شخص اپنی استعداد کے مطابق حضور کے فیض سے اپنا  
 دامن مراد بھر لیتا۔ اصحاب صدقہ مسجد نبوی میں رہ کر آنحضرت سے حدیث و تفسیر کا درس لیا  
 کرتے تھے اسی مسجد میں حلقہ ہائے درس قائم ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد  
 گرامی کو سُن کر اپنے سینوں میں محفوظ کر لیتے تھے۔ باہر سے جو نواد آتے۔ مسجد نبوی ہی میں لیسرا  
 کرتے تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب رہ کر زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں حضرت  
 عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ عہد رسالت میں مسجد نبوی کچی اینٹوں سے  
 تعمیر کی گئی تھی۔ خلافت صدیقی میں یہ جوں کی توں رہی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ  
 نے اپنے عہد خلافت میں اسے دوبارہ اپنی بنیادوں پر استوار کیا۔ الیہ اس کے ستون کچھ  
 کے بجائے عمارتی لکڑی سے بنائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس میں کچی تیلے لیاں  
 کیں۔ چنانچہ بد کی دیواریں منقوش پتھر اور چونے سے بنائیں۔ اس کے ستونوں میں بھی  
 منقوش پتھر ہی استعمال کیا۔ چھت ساگوان کی لکڑی سے تیار کی گئی۔

مسجد ایک دیہی زمار کی حیثیت سے | مسجد دین اسلام میں ایک عظیم دینی  
 شعار کی حیثیت رکھتی ہے۔ مسجدیں

اگرچہ حالص خدا کی عبادت کے لئے بنائی جاتی ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک مذہبی،  
 تعلیمی اور ثقافتی مرکز کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ غزوات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم  
 کا معمول تھا کہ رات بھر انتظار فرماتے تھے۔ صبح کو جہاں سے اذان کی آواز آتی وہاں حملہ  
 کرتے سے روک دیتے چنانچہ ایک سفر جہاد میں آپ کے کاتوں میں ایک طرف اللہ اکبر  
 کی آواز آئی تو آپ نے فرمایا یہ نظری شہادت ہے "اس کے بعد آپ نے اَشْهَدُ اَنْ  
 لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ" کی آواز سنی تو فرمایا "اگ سے نجات ہو گئی۔ صحابہ نے ادھر ادھر دیکھا



نو معلوم ہوتا چرواہے کی آواز ہے۔

(صحیح مسلم)

تمام مجاہدین کو بھی یہی حکم تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے ایک لشکر بھیجا تو یہ وصیت فرمائی

”اِذَا لَيْتُمْ مَسْجِدًا اَوْ مَسْجِدًا  
صَوْتًا غَلًّا لَقَتُّوْهُ اَحَدًا“

اگر کہیں مسجد دیکھو یا اذان کی آواز  
سنو تو وہاں کسی شخص کو

قتل نہ کرو۔

(ایوداؤد)

ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ جو قبائل اسلام لاتے تھے انہوں نے الگ الگ

مسجدیں تعمیر کر لی تھیں اور ان میں پانچوں وقت غلغلہ تکبیر و اذان بلند ہوا کرتا تھا

مسجد دین اسلام کا ایک تابندہ نشان ہے مسجد کی عمارت انتہائی سادگی کے باوجود

اپنے اندر مقناطیسی جاذبیت رکھتی ہے۔ ایک عبادت گزار شخص کے دل میں مسجد کے

لئے بے پناہ محبت کے جذبات ہوتے ہیں۔ یہ عربی شعر اکثر مساجد کے دروازہ کی زینت ہوتا

ہے۔ شاعر کہتا ہے

أَمْوَمِنْ فِي الْمَسْجِدِ كَالسَّمَاءِ فِي السَّمَاءِ  
وَالْمُنَافِقُ فِي الْمَسْجِدِ كَالطَّيْرِ فِي الْقَفْسِ

مومن مسجد میں ایسے ہوتا ہے جیسے پانی میں مچھلی اور منافق یوں ہوتا ہے جیسے

پتھرہ میں پرندے

کسی قوم کی زندگی اس کے دینی شعائر سے وابستہ ہوتی ہے اس کی بلی بیداری اور غیرت

کی دلیل ہے یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے سردور میں مسلمان مساجد کی تعمیر سے کبھی عتاق نہیں

رہے ہمارے ملک میں عظیم مساجد ابھی تک نمایاں مغلیہ کی یاد تازہ کر رہی ہے۔ لاہور کی

شاہی مسجد دیکھ کر باہر سے آنے والے سیاح و رکھ حیرت میں ڈوب جاتے ہیں۔ شاہی مسجد

کی عظیم نشان عمارت مسلم سلاطین کے باہر تعمیرات اور محب اسلام ہونے کا زندہ ثبوت

پیش کر رہی ہے۔ مسجد سے پانچ وقت اذان کی صدا بلند ہوتی ہے۔ اذان اسلام کا

ممتاز شعار ہے یہ سلطوت اسلام کا منظر ہے۔ تکبیر کی آواز مسلمان کے دل میں جذبات

کا ایک طوفان برپا کر دیتی ہے۔ غیر مسلموں کے دل اذان سن کر دہل جاتے ہیں اور وہ اپنے

لئے اسے جنگ کی لالکار تصور کرتے ہیں۔



عہد نبویؐ میں مساجد کی تعمیر | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ جاہ پرستی اور  
نمائش سے نفرت کرتے تھے۔ اس لئے اینٹ

اور مٹی پر خرچ کرنا ناپسند فرماتے تھے۔ تاہم چونکہ اسلام کی تمام تحریکات کا مقصد صرف  
یادِ خدا اور تسبیح و تقدیس تھا اس لئے ہر قبیلہ کو مسلمان ہونے کے بعد سب سے پہلے  
مسجد کی ضرورت پیش آتی تھی۔ تعمیر مساجد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نماز ادا کرنے کے  
علاوہ مساجد اہل محلہ کو دن میں پانچ بار ایک جگہ جمع کر کے ان کی اجتماعی اور اتحادی  
قوت میں اضافہ کا موجب بنتی تھیں اس لئے آپ باجماعت نماز پڑھنے کی سخت تاکید  
فرماتے تھے۔ مدینہ میں بہت سے قبائل قیام پذیر تھے۔ ہر قبیلہ کا الگ الگ محلہ تھا اور ہر محلہ  
میں ایک ایک مسجد تھی۔ عام غربت اور سادگی کی وجہ سے اس دور میں جو مسجدیں تعمیر ہوئیں  
وہ زیادہ عرصہ تک باقی نہ رہ سکیں۔ اور ان کے ساتھ ان کا نام اور تاریخ بھی مٹ گئی تاہم  
جو مسجدیں مدینوں تک قائم رہیں ان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کا کوئی گوشہ ان  
مدنی یادگاروں سے خالی نہ تھا۔ (نسائی شریف)

عرب کے عام قبائل سے بحرین کا ایک قبیلہ عبدالقیس اسلام لا چکا تھا۔ اس قبیلہ نے  
ایک مسجد تعمیر کی جیسا کہ چنانچہ اسلام میں مسجد نبویؐ کے بعد سب سے پہلے جمعہ کی نماز اسی مسجد  
میں ادا کی گئی۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں

مسجد نبویؐ کے بعد پہلا جمعہ قبیلہ عبدالقیس کی مسجد میں پڑھا گیا جو بحرین کے  
ایک گاؤں جو اٹانامی میں واقع تھی (بخاری کتاب الحجہ)

اہل طائف جب اسلام لاتے تو آپ نے ہدایت فرمائی کہ تم اس جگہ مسجد تعمیر کرنا میں جہاں  
ان کا بیت تھیں (زاد المعاد جلد اول)

حضرت طلحہ بن علی سے روایت ہے کہ جب ہماری قوم کے لوگ آنحضرت صلی اللہ  
علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور عرض کیا کہ ہمارے ملک میں ایسا گرجا ہے آپ نے  
اپنے وضو کا پانی عنایت فرمایا اور ہدایت کی کہ گرجے کو توڑ ڈالو اور وہاں یہ پانی پھیر کر  
مسجد بنا لو۔ چنانچہ جب وہ لوگ واپس آئے تو حسب ارشاد مسجد تعمیر کر لی (نسائی)



اس قسم کی مسجدیں اگرچہ عرب کے گوشہ گوشہ میں تعمیر ہوئیں۔ عموماً احادیث کی کتابوں سے صرف ان مسجدوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے جو مدینہ اور اس کے گرد و نواح میں تعمیر ہوئیں۔ امام بخاری نے اپنی کتاب میں صراحتاً مسجد نبی زکریا کا نام لیا ہے۔ حضرت انس بن مالک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عصر کی نماز پڑھ کر اپنے محلہ میں آتے تھے یہاں لوگ مسجد میں منتظر رہتے تھے وہ آ کر کہتے کہ مسجد نبوی میں نماز ہو چکی تب لوگ یہاں نماز پڑھتے تھے

(مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۲۳۲)

ابن روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت عرب کی مسجدیں الگ الگ تھیں۔ صحیح احادیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعض لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز باجماعت پڑھتے تھے اور پھر اپنے محلہ کی مسجد میں جا کر اپنی قوم کی امامت کرتے تھے۔ حضرت معاذ بن جبل کا معمول یہی تھا۔

عہد نبوی میں مساجد کی تعمیر کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راستہ میں جہاں کہیں نماز پڑھتے تھے وہاں صحابہ تبرکاً مسجد تعمیر کر لیتے تھے۔ امام بخاری نے اپنی کتاب میں ایک مستقل باب باندھ ہے جس میں ان مساجد کا ذکر کیا ہے جو مدینہ کے راستوں اور ان مقامات میں تعمیر ہوئیں۔ جہاں آپ نے نماز پڑھی۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان کے نام گنتے ہیں۔

مساجد کی تعمیر کے ساتھ ساتھ ائمہ مساجد کا تقرر بھی عمل میں آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریف یہ تھی کہ جو

ائمہ نماز کا تقرر

قبیلہ مسلمان ہو جاتا اس میں جو شخص سب سے بڑا حافظ قرآن ہوتا وہی امام مقرر کر دیا جاتا اس شرف میں چھوٹے بڑے آقا غلام سب برابر تھے آپ کی تشریف آوری سے قبل مدینہ میں جو مہاجرین آچکے تھے ان کے امام حضرت ابو حذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام سالم تھے۔ جو ہم کا قبیلہ حبیب اسلام لایا تو عمر بن سلمہؓ بھی اس وقت ساتھ آیا انھیں اس کے کس بچہ تھے چونکہ اپنے قبیلہ میں قرآن کے سب سے بڑے حافظ وہی تھے اس لئے وہی امام قرار پاتے۔



امام کے انتخاب کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند اصول مقرر فرمادیئے تھے  
 ابو مسعود انصاری سے مروی ہے کہ آنحضرت نے فرمایا جماعت کی امامت وہ کرے جو سب سے  
 زیادہ قرآن پڑھا ہو۔ اگر اس میں سب برابر ہوں تو جو حدیث سے زیادہ واقفیت رکھتا ہو  
 اگر اس میں بھی سب برابر ہوں تو جس نے پہلے ہجرت کی اور اگر اس میں بھی برابر ہوں تو  
 جس کی عمر زیادہ ہو۔  
 (صحیح مسلم)

جب کوئی ایسا قبیلہ خدمت اقدس میں حاضر ہوتا تو آپ پوچھتے کہ تم میں سب سے  
 اچھا حافظ قرآن کون ہے۔ اگر کوئی ایسا شخص ہوتا تو لوگ اس کا نام بتاتے اور آپ اس کو  
 اس عہدے پر مقرر فرماتے چنانچہ اہل طائف کے امام عثمان بن ابی العاص اسی طرح مقرر ہوئے  
 دورِ حاضر میں امامت کا تصور یکسر بدل گیا ہے موجودہ دور کا امام ایک گھٹیا مخلوق ہے جو  
 معاشی اعتبار سے مقلدک الحال، علم و فضل سے عاری، معاشرہ میں بے حیثیت اور ہر  
 لحاظ سے ناقابل التفات ہے۔ تاریخ اسلام کے زریں دور میں جب اسلام کا سکرواں تھا  
 قیصر و کسریٰ اسلام کے تریونگیں تھے اور عرب و عجم پر مسلمانوں کی عظمت و شوکت کی دھاک  
 بیٹھی ہوئی تھی۔ امامت و خطابت کے فرائض وہ شخص ادا کیا کرتا تھا جس کے ہاتھ میں عیان  
 اقتدار ہوتی تھی اور سیاہ و سفید کا مالک ہوتا کرتا تھا۔ عباسی دور کے خلیفہ ماموں و ہارون  
 اس رعب و داب کے خلفاء تھے کہ قیصر و دم ان کا نام سن کر لرزہ بر اندام ہوجاتا تھا۔ جب  
 نماز کا وقت آتا تو تاج و تخت سے الگ ہو کر مسجد میں آتے اور فرائض امامت ادا کرتے۔ اسلامی  
 شعائر کی بے وقعتی اور زوال و انحطاط کی علامت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے؟

مسجد کے مقاصد و فوائد

مسجد کی اصلی غرض دعایت فریقہ نماز کی ادائیگی  
 ہے کسی شرعی عذر کے بغیر گھر میں نماز پڑھنے کی

اجازت نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "کہ اگر گھروں میں عورتیں اور بچے نہ  
 ہوتے تو میں کسی کو نماز پڑھانے کا حکم دے کہ لوگوں کے گھروں میں جاتا اور جو لوگ بلا وجہ  
 نماز یا جماعت میں حاضر نہیں ہوتے۔ ان کے گھروں کو تذبذب آتش کر دیتا۔"

۱۔ ذکر ربانی ۲۔ دین اسلام کے سوا کسی اور مذہب کی عبادت گاہ کو یہ شرف حاصل نہیں



کہ وہاں ہر وقت ذکر خدا کی گرم بازار جاری رہتی ہو اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ادیانِ عالم میں صرف اسلام ہی توحیدِ خالص کا علم بردار ہے۔ دوسرے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں ہفتہ یا دن میں ایک دفعہ لوگ عبادت کے لئے جمع ہوتے ہیں مگر مساجد میں روزانہ صبح سے لے کر رات گئے تک نماز اور تلاوتِ قرآن کا سلسلہ جاری رہتا ہے بلکہ عبادت کے علاوہ قرآن و حدیث کا درس بھی دیا جاتا ہے۔

۲۔ دینی شعار :- مسجد ایک عظیم دینی اشعار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس اشعار کو زندہ و تازہ رکھنا علامتِ ایمان ہے۔

۳۔ درس گاہ :- درس و تدریس کے لئے مسجد مزدوں ترین مقام ہے۔ سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں پہلا مدرسہ قائم کیا جس میں اصحابِ صدقہ آپ سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ عہدِ سلف میں مسجد کو ہمیشہ مکتبہ کی حیثیت حاصل رہی مسجد میں قال اللہ و قال الرسول کا غلغلہ بلند ہوتا ہے اذان کی پانچ وقتہ صدا اٹھتی ہے خطیب ہر جمعہ کے دن لوگوں کو شرعی احکام سے آگاہ کرتا ہے۔

۴۔ وقت کی پابندی :- مسجد پابندیِ وقت کا درس دیتی ہے دن میں پانچ مرتبہ مقررہ وقت پر اذان دی جاتی ہے جو شخص باقاعدہ نماز ادا کرنے کا خوگر ہو وہ وقت کی قدر پہچانے گا اور ہرگز سہل انگاری و اضاعتِ وقت کا مرتکب نہ ہوگا۔

۵۔ تنظیم :- نمازی مسجد میں حاضر ہو کر ایک امام کی اقتدار میں نماز پڑھتے ہیں کوئی شخص امام سے پہلے رکوع یا سجدہ نہیں کر سکتا۔ یہ اطاعتِ امیر کی بہترین تربیت اور نظم و ضبط کا زبردست مظاہرہ ہے۔ امام مدائیرہ میں ادب و درجہ رکھتا ہو تو بھی ایک بڑے سے بڑا آدمی اس کے اشاروں پر حرکت کرے گا۔ صفوں کا درست کرنا بھی تنظیم کی علامت ہے۔

۶۔ مساوات :- نماز باجماعت سے مساوات کا سبق حاصل ہوتا ہے۔ مسجد مساوات، اخوت، ہمدردی اور تعاون کے جذبات ہا مرکزی نقطہ ہے۔

بڑی درگاہ میں بچے تو سب سے

بندہ و صاحب و محتاج و سب سے ہوتے (اقبال)



۷۔ اصلاح معاشرہ :- مسجد اصلاح معاشرہ میں حد درجہ معاون ہے اہل محلہ دن میں پانچ مرتبہ جمع ہو کر پیش آمدہ مسائل پر تبادلہ اُفتکار کرتے ہیں یہ پانچ وقت ملاقات بعض و حمد کے ازالہ اور الفت و مروت کے جذبات استوار کرنے میں اہم پارٹ ادا کرتی ہے :

۸۔ روحانی تربیت :- مسجد روحانی و اخلاقی تربیت کے سب سے موزوں ترین جگہ ہے

۹۔ طہارت و نظافت :- ایک نمازی شخص کے لئے جسم و لباس کی طہارت ضروری ہے ۔ بنا بریں نماز کی پابندی کرتے سے طبعاً انسان میں طہارت و نفاست کے احساسات کوٹ لیتے ہیں جب کہ بے نماز شخص پاکیزہ رہنا ضروری نہیں سمجھتا بلکہ وہ پاک و ناپاک کے شرعی احکام سے بھی آگاہ نہیں ہوتا۔

۱۰۔ اسلامی تہذیب :- مسجد اسلامی تہذیب سے روشناس کراتی ہے۔ اس میں ہر وقت اسلامی تہذیب کے مظاہر دیکھتے میں آتے ہیں۔

۱۱۔ اتحاد :- مسجد میں آنے والے سب ایک ہی مقصد کے لئے آتے ہیں۔ ان میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ جو اخوت کا سنگ بنیاد ہے۔ سب ایک ہی امام کے پیچھے قیلہ رو ہو کر ایک صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دن میں پانچ مرتبہ نماز باجماعت ادا کرنے سے رشتہ اخوت مضبوط سے مضبوط تر ہو جاتا ہے۔

۱۲۔ جسم و روح میں توازن :- مسجد میں باقاعدہ حاضر ہو کر انمان خدا سے لو لگانا ہے۔ دل دنیوی مشاغل سے ہٹ کر عبادت میں لطف و لذت محسوس کرنے لگتا ہے اس طرح جسم و روح کے مابین صحیح توازن پیدا ہوتا ہے۔ اگر مسجد نہ ہو تو انسان اپنی تمام تر صلاحیتوں اور جملہ اوقات کو کاروباری مفروضات کی تذر کر دے۔

مسجد خانہ خدا اور نہایت مقدس جگہ ہوتی ہے اس لئے اس کا ادب و احترام ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے قرآن کریم و احادیث صحیحہ کی روشنی میں ادب مساجد تحریر کئے جاتے ہیں۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے۔

مسجیدیں خدا کے لئے ہیں اس لئے

وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا



مَعَ اللَّهِ أَحَدًا خدا کے سوا ان میں کسی اور کو مت پکارو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسجد میں خدا کے سوا کسی اور کے نام کا درود وظیفہ جس کا شرعی حوازی کوئی نہ ہو نہیں پڑھنا چاہیے۔

۲۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے دایاں پاؤں رکھا جائے اور یہ دعا پڑھی جائے۔

”اللَّهُمَّ افْتَحْ لِي أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ“  
اے اللہ میرے لئے رحمت کے دروازے کھول دے۔

۳۔ مسجد میں بیٹھ کر ادھر ادھر کی بے مقصد باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

”إِذَا سَرَدْتُمْ سِرِّيَا ضِلَّ الْجَنَّةُ“ (مشکوٰۃ)  
(جب تمہارا گزر بہشت کے باغات میں ہو تو پھیل چپا کرو)

صحابہ کرام نے عرض کیا حضور! وہ باغات کون سے ہیں؟ فرمایا ”مسجداں“ اور ان میں خدا کو یاد کرنا پھیل چپنا ہے۔

۴۔ مسجد میں داخل ہو کر دو رکعت نفل ادا کرنا چاہیے ان توائل کو تھیاتہ المسلمین کہتے ہیں (مشکوٰۃ)

۵۔ مسجد کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ نماز پڑھنے والے کے آگے سے نہ گزرا جائے

آپ نے فرمایا اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والے کو معلوم ہوتا کہ اس میں کتنا گناہ

ہے تو اسے چالیس ماہ یا چالیس سال کھڑا رہنا گزرنے کی نسبت زیادہ آسان ہوتا

حدیث کے راوی کو شک ہے کہ آپ نے چالیس دن فرمایا یا چالیس ماہ یا چالیس سال (بخاری)

۶۔ مسجد میں کوئی ایسی حرکت کہنا منع ہے جو نماز کے منافی ہو اور اس سے نماز

پڑھنے والوں کو تکلیف ہوتی ہو۔ مثلاً شور و غل، دنگا فساد یا ریڑھی اٹنی جھگڑا کرنا (مشکوٰۃ باب الحدیث)

۷۔ مسجد کو پاک صاف رکھنا چاہیے اور کوڑا کرکٹ اور گند وغیرہ جمع نہیں ہونے دینا

چاہیے (مشکوٰۃ)

۸۔ کچا پیاز، لہسن، مرئی اور ایسی کوئی چیز کھا کر مسجد میں نہیں آنا چاہیے جس کے



کھاتے سے بار بڑھتی ہو (مشکوٰۃ)

- ۹- مسی میں تھوکتا یا ناک صاف کرتا گناہ ہے (بخاری)
- ۱۰- مسی میں خرید و فروخت کرنا یا گمشدہ چیز تلاش کرنا منع ہے (مشکوٰۃ)
- ۱۱- جو لوگ مسی میں دیر سے آئیں انہیں پہلے آنے والوں سے آگے پہنچنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس سے پہلے آنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے (بخاری)
- ۱۲- جمعہ کے دن امام کا خطبہ توجہ اور خاموشی سے سنتا چاہیے۔
- ۱۳- مسی سے باہر نکلتے وقت یہ دعا پڑھنا چاہیے۔  
اللّٰهُمَّ اِنِّیْ دَسْتُکَ مِنْ فَضْلِکَ وَرَحْمَتِکَ  
اے اللہ میں تیرا رحم و فضل طلب کرتا ہوں (مشکوٰۃ)

### سوالات

- ۱- اشاعت علم میں مسی کیا پارٹ ادا کرتی ہے۔
- ۲- دینی نقطہ نظر سے مسی کو کیا اہمیت حاصل ہے۔
- ۳- آداب مسی تفصیلاً بیان کیجئے۔
- ۴- آنحضرت نے تعمیر مساجد کو کیا اہمیت دی ہے اور کیوں؟
- ۵- امام صلوٰۃ میں کن اوصاف کا پایا جاتا ضروری ہے۔ منصب امامت اسلام میں کیا مقام رکھتا ہے تفصیلاً لکھیے۔



## اسلامی معاشرہ

معاشرہ عربی زبان میں مصدر ہے۔ اس کا مادہ غشترۃ زندگی بسر کرنا ہے۔  
**مفہوم** | معاشرہ کے معنی ہیں۔ مل جل کر زندگی بسر کرنا۔ اصطلاحی اعتبار سے معاشرہ  
 اس جماعت یا گروہ کا نام ہے۔ جو کسی خاص مقصد کے پیش نظر جمع ہوا ہو۔ اور اپنے مخصوص  
 ثقافتی و معاشرتی عادات و اطوار کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہو۔ انسانوں کا وہ بے ہنگم گروہ  
 جو اتفاقاً بلا مقصد و ارادہ کسی جگہ جمع ہو جائے۔ اسے معاشرہ کے نام سے نہیں پکارا جاتا۔  
**قیام معاشرہ کی ضرورت** | تنہائی سے گھبراتا ہے۔ اور اپنے بھائی بندوں کے ساتھ  
 مل جل کر خوش ہوتا ہے۔ اگر جبراً انسان کو کسی جگہ تنہا رکھا جائے۔ سب لوازمات زندگی  
 موجود ہوں۔ طرح طرح کی سہولتیں مہیا ہوں۔ انواع و اقسام کی نعمتیں اور لذتیں میسر  
 ہوں۔ تاہم وہ ایسی زندگی کو کبھی پسند نہ کرے گا۔ اور بنی نوع انسان کے ساتھ مل کر رہنے  
 کو ترجیح دے گا۔ اگرچہ وہاں فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتا ہو۔ اور زندگی کی آسائشوں سے  
 یکسر محروم ہو۔ حیوانات مل جل کر رہنے کی خواہش میں اگرچہ بنی نوع آدم کے ساتھ شریک  
 ہیں۔ مگر ان کا جذبہ اتحاد و اختلاط کسی مقصد کا حامل نہیں۔ بخلاف ازیں انسانوں کی سعی  
 اجتماع اپنے اندر بے پناہ مقاصد و نمایاں رکھتی ہے۔

معاشرہ اجتماعی زندگی

کی خشت اساس ہے

**معاشرہ اجتماعی زندگی کی اساس ہے**

یہ قوم کی زندگی نظم جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ گروہ جب گھل جاتی ہے  
 تو قوم کا شیرازہ پر اگندہ ہو جاتا ہے۔ اسلام میں نماز یا جماعت کا اہتمام انسان کو اجتماعی  
 زندگی کی رام پر ڈالتا ہے۔ ایک محلہ کے مسلمان دن کے پانچ اوقات میں اکٹھے ہوتے ہیں۔  
 ہر جمعہ کے روز بڑے پیمانے پر ایک اجتماع عام ہوتا ہے۔ ہر عید کے موقع پر ایک سالانہ



اجتماع ہوتا ہے جس میں نہ صرف ایک گاؤں بلکہ گروپس کے مسلمان اکٹھے ہو کر اپنے مذہبی اقتصادی سیاسی اور معاشرتی مسائل حل کرتے ہیں۔ نماز باجماعت میں مسلمانوں کا صفت بصف کھڑا ہونا ایک دوسرے کے شانہ سے شانہ ملا اور یکساں حرکت و جنبش کرنا۔ ان کی توہمی زندگی کی مستحکم و مضبوط ریوار کا مسالہ ہے۔ حسن طرح نماز کی درستی اس کی صفت اور نظامِ حیات کی درستی پر موقوف ہے۔ اسی طرح پوری قوم کی زندگی باہمی تعاون، مشارکت میں جوں اور باہمی بہبودی پر موقوف ہے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ صلی اللہ علیہ وسلم صفتوں کی درستی پر بہت زور دینے فرماتے تھے کہ جب تک تم خوب مل کر کھڑے نہ ہو گے تمہارے دل بھی آپس میں نہ ملیں گے۔ (صحیح بخاری)

نماز باجماعت مسلمانوں میں برادری مساوات بلکہ عالمگیر انسانی مساوات کی درس گاہ ہے۔ یہاں امیر و غریب مکالے، گورے، مارومی، حبشی، عرب و عجم کی کون بونز نہیں ہے۔ سب ایک ساتھ۔ ایک درجہ اور ایک صفت میں کھڑے ہو کر خدا کے آگے سر تگوں ہوتے ہیں۔ سب ایک ہی زمین پر ایک امام کے پیچھے ایک صفت میں دوش بدوش کھڑے ہوتے ہیں۔ اور کوئی کسی کو اس کی جگہ سے ہٹا نہیں سکتا۔ انسانی برادری کی یہ منہنق دن میں پانچ دفعہ ہوتی ہے۔ کیا دنیا کا کوئی مذہب مسلمانوں کی معاشرتی جمہوریت کی نظیر پیش کر سکتا ہے۔

اجتماعی ترقی کی بنیاد افراد کے باہمی نظم و ارتباط پر ہے اور اجتماعی فائدہ کے لئے افراد کو اپنے ہر عیش و آرام کو قربان کر دینا اور اختلافات باہمی کو ختم کر کے صرف ایک مرکز پر جمع ہو کر جماعتی مہستی کی وحدت میں فنا ہو جانا اس کے حصول کی لازمی شرط ہے۔

اسلام نے جماعت سے علیحدگی کی اجازت صرف ایک ہی موقع پر دی ہے۔ کہ جماعت میں اس قدر بگاڑ پیدا ہو جاتے۔ کہ ان کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہے۔ اور فتنہ و فساد کے شعلے اتنے بھڑک چکے ہوں۔ کہ ان کا بھجانا قابو سے باہر ہو جائے۔ ایسے وقت میں جو لوگ فتنہ کی آگ کو بجھانے پر قادر نہ ہوں۔ جماعت سے الگ ہو



جائیں۔ ورنہ ہر مسلمان کا فرض ہے۔ کہ وہ اس حالت میں تبلیغ اور امر بالمعروف کے فرض کو ادا کر کے جماعت کے بچانے میں پوری کوشش صرف کر دے۔ یہی وہ نمونہ ہے۔ کہ جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں پیش کیا۔ اور تمام بڑے بڑے صحابہ نے اس کی پیروی کی۔ آپ نے فرمایا بدی کو اپنے ہاتھ سے۔ دکنا اور مٹانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اگر ہاتھ سے نہ مٹا سکے تو زبان سے مٹائے۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اس کو دل سے بڑا سمجھے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔ (صحیح مسلم)

رہبانیت کے معنی ہیں ترک دنیا اور قطع تعلقات۔

**اسلام اور رہبانیت** | اسلام رہبانیت کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بیوی بچوں، بھائی، بہنوں اور اقارب و اعزہ کو چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشین ہو جائے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے دین و دنیا کے مابین کوئی خلیج حاصل نہیں۔ جن کو دنیاوی امور تصور کیا جاتا ہے۔ انہی کو شرعی حدود کے اندر انجام دینے کا نام دین ہے۔ دین اسلام صرف عبادتِ خداوندی کا طریقہ ہی نہیں سکھاتا۔ بلکہ زندگی کے تمام شعبہ جات کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام دیتا ہے۔ اور اسی اعتبار سے ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اقارب و اعزہ قوم و ملت اور احباب و اعداؤں سے کٹ کر درویشی کی زندگی بسر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ان کے حقوق و فرائض ادا کرنے سے قاصر رہتا۔ بلکہ ان سے راہ فرار اختیار کرتا ہے۔ یہ بات اسلام میں محبوب ہونے کے بجائے معیوب ہے۔ اسلام اسے بزوری اور کم ہمتی قرار دیتا ہے۔ مردانگی و حوصلہ مندی کا تقاضا ہے کہ دنیا میں رہ کر اس کے دکھ سکھ سہے۔ اقارب و اعزہ کے حقوق ادا کرے۔ اپنے کنبے کے لئے رزقِ حلال کمائے۔ اور اس راہ کے مصائب و آلام کو فریاد نہ کرے اور عزمِ بلند کے ساتھ۔ برداشت کرتا رہے۔ حدیثِ نبوی میں وارد ہے کہ چند صحابہؓ مسجدِ نبوی میں بیٹھ کر اسی قسم کے عزائم باندھ رہے تھے۔ کسی نے کہا کہ میں تم بھر روز سے رکھتا رہوں گا۔ دوسرا بولا میں رات یہ قیام کروں گا۔ تیسرا کہنے لگا میں بیوی بچوں کو خیر باد کہہ دوں گا۔ سالارِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں سن کر فرمایا: تمہارے عزائم کا پتہ چلا تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔ کہ



میں سمجھی کام کرتا ہوں۔ میں روزے رکھتا اور افطار کرتا ہوں۔ رات کو سوتا بھی ہوں۔ اور  
 نحو نبادت بھی ہوتا ہوں۔ عیال داری کا یہ حال ہے کہ میری نو بیویاں ہیں۔ یہ حدیث نبوی اس  
 حقیقت کی آئینہ داری کرتی ہے۔ کہ افضل زندگی وہی ہے۔ جو معاشرہ میں رہ کر گزاری جائے۔  
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سالہ عہد نبوت مجمع انسانی میں رہ کر اور تمام تر  
 انسانی جدوجہد میں شریک ہو کر گزارا۔ یہی طرز عمل خلفائے راشدین اور تمام صحابہ نے اختیار  
 کیا۔ پورا قرآن پاک اسی انسانی جدوجہد سعی اور انسانی مجمع کے ساتھ عمل صالح کی تعلیم  
 سے بھرا ہوا ہے۔ تجرد و خلوت نشینی ترک عمل و جماعت کے لئے پورے قرآن میں  
 ایک حرف بھی موجود نہیں ہے۔ اسلام کا صحیح تخیل یہ ہے کہ انسان تعلقات کے ازدحام  
 اور علاقے کے ہجوم میں گرفتار ہو کر اپنے فرائض کو بخوبی ادا کرے۔ جو شخص بفرانض سے  
 گھبرا کر گوشہ عافیت کو تلاش کرتا ہے۔ وہ کارزار عالم کا بزدل سپاہی ہے۔ اسلام  
 اپنے پیروں کو جواں مرد سپاہی دیکھنا چاہتا ہے۔ جو ان سب جھمیوں کو اٹھا کر بھی  
 خدانہ کو نہ بھولیں۔ ایک دفعہ کسی غزوہ میں ایک صحابی کا گزرا ایسے مقام سے ہوا۔  
 جس میں ایک غار تھی۔ قریب ہی پانی کا چشمہ بھی تھا۔ ان کو خلوت گزینی کے لئے جگہ  
 پسند آئی۔ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر وہاں خلوت گزینی کی اجازت طلب  
 کی۔ آپ نے فرمایا "میں یہودیت اور عیسائیت لے کر دنیا میں نہیں آیا۔ بلکہ آسان  
 اور روشن ابراہیمی مذہب لے کر آیا ہوں" (مسند امام حنبل جلد ۵ ۱۲۶۶)

**فرد اور معاشرہ** | فرد اور معاشرہ باہم لازم و ملزوم ہیں۔ جس طرح فرد  
 معاشرہ سے الگ ہو کر ایک بے حقیقت اکائی کی  
 حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح معاشرہ افراد کے بغیر معرض وجود میں نہیں آ  
 سکتا۔ دوسرے لفظوں میں افراد کے اجتماع کا نام معاشرہ ہے۔ انسان خلقۃ مدنی بطبع  
 پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی فطرت اسے مجبور کرتی ہے۔ کہ وہ دیگر انسانوں کے ساتھ  
 مل کر رہے۔ وہ پیدائش سے لے کر آخری دم تک دوسروں کے تعاون کا محتاج ہے۔  
 پیدا ہوتے ہی بچہ اپنے والدین کی نگرانی اور کفالت کا دست نگر ہوتا ہے۔ اگر والد



لمح کے لئے بھی غافل ہو جائے۔ تو اس کا جینا محال ہو جائے۔ ماں دودھ پلاتی ہے۔ اس کی صحت اور صفائی کا خیال رکھتی ہے، اس کے لئے رات بھر جاگتی ہے۔ باپ تلاش رزق میں مارا مارا پھرتا ہے اور اس کی ضروریات زندگی مہیا کرتا ہے۔ جب سچے تعلیم کے قابل ہوتا ہے۔ تو اسے اساتذہ کی رہنمائی اور تربیت کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ بچوں بچوں اس کی علم پر مہتمم ہے۔ اس کے احتیاج کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان زندگی کے کسی مرحلہ پر بھی اپنے اپنے بنائے جنس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ علامہ اقبالؒ نے فرد اور معاشرے کے ربط کو اس طرح بیان کیا ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اسلامی معاشرہ کی خصوصیات | سنت کی روشنی میں تکمیل پذیر ہوتی ہے۔ اس

لئے وہ وحدت فکر و عمل کا مجموعہ ہوتا ہے۔ وحدت فکر و عمل ہی وہ چیز ہے جس کی بنا پر کسی معاشرہ کو استحکام اور پائیداری نصیب ہوتی ہے۔ فکر و عمل کا اتحاد اسلامی معاشرہ کی عظیم خصوصیت ہے۔ جو کسی دوسرے معاشرہ میں نہیں پائی جاتی۔ دین اسلام میں بذات خود نہ فرد مقصود ہے نہ معاشرہ۔ اصلی مقصد یہ ہے کہ انسان زمین پر خلیفہ خداوندی ہونے کے لحاظ سے اس کے احکام کی اطاعت کرے۔ اسلام فرد یا معاشرہ میں کسی ایک کو بھی دوسرے پر ترجیح نہیں دیتا۔ بلکہ دونوں میں اعتدال پسند کرنا چاہتا ہے۔

کائنات ارضی کے تمام مسلمان کمرۃ ارض کے کسی کونہ میں رہتے ہوں۔ کوئی زبان بولتے ہوں۔ کسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔ عقائد و ایمانیات میں متحد النجان ہوتے ہیں۔ ہر مسلمان خدا پر، اس کے رسولوں پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ بطور فکر کی وحدت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے؟

عقائد کے بعد۔ ارکان اسلام کا درجہ ہے۔ نماز۔ روزہ۔ حج اور زکوٰۃ میں مسلمانوں



کی وحدت ان کے متحد العمل ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ مسلمان دنیا کے کسی کونہ میں بھی ہوں۔ نماز کے وقت قبلہ رو ہو کر نماز گزارتے ہیں۔ اور ایک ہی امام کے پیچھے دست بستہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بڑے، چھوٹے، امیر، غریب کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔

اسلامی معاشرہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اپنی تشکیل کے لئے اصول و ضوابط اور آئین و دستور وضع کرنے کا محتاج نہیں۔ اس کا ایک بندھا ٹکنا نظام ہے مقرر شدہ اصول و ضوابط ہیں جن کی موجودگی میں کسی دوسرے نظام کی ضرورت ہے نہ آئین کی۔

اسلام کے اصول و قواعد معاشرہ کے قواعد ہیں اور اسلام کا نصب العین اس کا مقصد و حقیقی ہے۔ طا ترانہ نظر میں اسلامی معاشرہ کی بڑی بڑی خصوصیات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ وحدت فکر و عمل :- اسلامی معاشرہ کے افراد میں پورے طور پر اتحاد و فکر و عمل پایا جاتا ہے۔ جس سے یہ معاشرہ مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم ہے۔ جس معاشرہ میں یہ دونوں چیزیں نہ ہوں۔ اس معاشرہ میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔

۲۔ اصلاحی عقائد و احکام :- اسلامی معاشرہ کی اساس کتاب و سنت پر رکھی جاتی ہے۔ اس لئے تمام افراد خلوص و محبت سے پیش آتے ہیں اور دنگ و فساد کی نوبت بہت کم آتی ہے۔

اسلام نے وحدت فکر کا جو تصور پیش کیا ہے۔ دنیا کے کسی مذہب نے نہیں کیا۔ اس فکر و وحدت کی اساس ایمان ہے۔ ایمانیت کو عقائد اور اجزائے ایمان بھی کہا جاتا ہے۔ ہر مسلم خلوص دل سے ان کا معتقد ہوتا ہے۔ وحدت فکر کے بعد وحدت عمل کا درجہ آتا ہے۔ ارکان اسلام، وحدت عمل کی اولین اساس ہیں تمام دنیا کے رہنے والے مسلمان ان پر عامل ہوتے ہیں۔ لہذا اختلاف کی نوبت بہت ہی



کم آتی ہے۔

۳۔ اخوت و مساوات: بر اخوت و مساوات شفق و مہمندی اور جذبات و کرم لطف اسلامی معاشرہ کی نشستِ اولین ہیں۔ اسلامی معاشرہ میں طبقاتی کش مکش کا نام تک نہیں۔ امراء پر زکوٰۃ اس لئے فرض کی گئی ہے کہ وہ اپنے مال کا کچھ حصہ اپنے غریب بھائیوں کو دیں اور اس طرح امراء کی دولت میں کمی آکر غریبوں کی دولت میں اضافہ ہوگا اور دونوں کے مابین توازن قائم ہوگا۔

۴۔ ایثار و قربانگی: اسلامی معاشرہ کے افراد ایثار پیشہ اور قربان خور ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنی عزیز ترین متاعِ حیات بھی اپنے بھائی کے لئے قربان کر دیتے ہیں اور اس سے دریغ نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ جس معاشرہ کے افراد میں اس قدر مہمندی ہوگی، وہ معاشرہ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔

۵۔ سادگی: اسلامی معاشرہ سادگی کا علمبردار ہے، وہ آرائش و نمائش

کو ناپسند کرتا ہے۔ اسراف سے روکتا ہے۔ وہ صفائی کی تلقین کرتا ہے مگر تکلف و تصنع کو معیوب قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ضروری لہاس اور سونے کے زیورات زیب تن نہ کریں، مردانہ صفات کے خوگر نہیں۔ اور نسوانی عادات و خصائل سے اجتناب کریں۔

۶۔ عالمگیر برادری: اسلامی معاشرہ قوم و ملک کی حدود و

سے آشنا نہیں بلکہ یہ عالمگیر برادری کا علم بردار ہے۔ جو شخص بھی اسلامی عقائد و ہمال کا قائل و عامل ہے، وہ اس برادری کا فرد ہے۔ خواہ کسی ملک میں رہتا ہو یا کوئی زبان بولتا ہو۔

۷۔ اسلامی آداب و اطوار: یہ معاشرہ اسلامی اخلاق کو اپنانے کی

تلقین کرتا اور غیر شرعی آداب و اخلاق سے روکتا ہے۔ لہذا واجب اور حرام ہونے والے مسائل اس کی نگاہ میں بے کار نام ہیں۔ تاہم شہر کی جو باجاریں، گھوڑے بازی وغیرہ لایعنی امور میں داخل ہیں۔



۸۔ وضعداری سے : عالمگیر برادری کا تصور رکھنے کے باوجود اسلامی معاشرہ کا اپنا ایک خاص رنگ ڈھنگ ہوتا ہے۔ جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ اس کے خاص آداب و اطوار ہیں۔ جو اسلامی معاشرہ کو ایک خاص وضع عطا کرتے ہیں، کھانے پینے، اٹھنے، بیٹھنے، گفتگو کرنے اور لباس وغیرہ کے بارے میں اسلام نے خاص ہدایات دی ہیں جن سے ہر دیکھنے والا شخص مسلمان کو پہچان جاتا ہے۔

### سوالات

- ۱۔ اسلامی معاشرہ کی اہمیت و افادیت پر ایک شذرہ سپرد قلم کیجئے۔
- ۲۔ اسلامی معاشرہ کے وہ اوصاف کیا ہیں جو اسے دوسروں سے متاثر کرتے ہیں۔
- ۳۔ فرد اور معاشرہ میں کیا ربط پایا جاتا ہے۔
- ۴۔ رہبانیت (درویشی کی زندگی) اسلامی نقطہ نظر سے کیوں معیوب ہے؟



## اقارب

قرآن کریم اور اقارب | اگرچہ اسلام ایک عالمگیر برادری کا داعی ہے جس نے امیر و غریب اور قریب و بعید کو ایک رشتہ اخوت میں جکڑ رکھا ہے۔ تاہم وہ خونی رشتہ کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ اور درجہ بدرجہ ان کے حقوق ملحوظ رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ اسلام میں رشتہ داروں کے ساتھ نیک برتاؤ کرنے، ان کی ضروریات کا خیال رکھنے، ان کی مالی امداد کرنے، ان سے محبت و مروت سے پیش آنے بیماری کے موقع پر دل و جان سے ان کی تیمارداری کرنے، ترکہ میں سے انہیں پورا حصہ دینے اور خدا کی دی ہوئی عمر میں کچھ حصہ ان کی خدمت میں صرف کرنے کی اہمیت دنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بار بار اس کی طرہ توجہ دلائی گئی ہے۔ قرآن کریم کی بارہ آیات میں اس کی صریح تاکید کی گئی ہے۔ دین اسلام میں اقارب سے اچھا سلوک روا رکھنا احسان نہیں بلکہ انسان کا حق اور اس پر فرض ہے۔

قرآن میں فرمایا کہ:-

”وَأْتِ ذَاتَ الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ“ (سورہ روم - ۴)

رشتہ داروں کو اس کا حق ادا کرو

قرآن میں دوسری جگہ فرمایا کہ مال و دولت کی محبت اور ذاتی ضروریات کے باوجود صرف خدا کی خوشنودی کے لئے خود تکلیف اٹھا کر اپنے اقارب کی امداد اور حاجت روائی اصلی نیکی ہے۔ حاجت مند رشتہ داروں کی مدد کرنے میں ایک بڑی حکمت یہ ہے کہ اس طرح سے وہ در بدر کی ٹھوکریں کھانے اور دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بچ جائیں گے جس میں صرف ان کی بلکہ ان کے رشتہ داروں کی بھی ذلت و رسوائی ہے۔ اگر ایک مالدار آدمی کے کسی رشتہ دار کو لوگ سڑک پر بھیک مانگتے یا دوسروں



کے اگے التجائیں کرتے دیکھیں گے۔ تو ہر شخص اس مالدار آدمی کی مذمت کرے گا۔ اور کہے گا۔ کہ فلاں آدمی کس قدر سنگدل ہے۔ کہ اس کے غریب رشتہ دار تو در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ اور وہ اپنے گھر میں بیٹھا عیش کر رہا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے والدین کے بعد ایک مسلمان کی دولت کا اولین مستحق اس کے رشتہ داروں کو قرار دیا ہے۔

چنانچہ فرمایا۔

وَأَقْرَبَ الْمَالِ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى  
اصل نیکی اس شخص کی ہے جس نے  
اس کی محبت پر اقارب کو مال دیا

روز میناق جب انسانوں سے شرعی احکام پر عمل کرنے کا عہد کیا گیا تھا۔ تو اس کے ساتھ رشتہ داروں سے نیک سلوک کا عہد بھی لیا جاتا تھا۔ فرمایا

وَبَانُوا الدِّينَ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ رِيقًا  
اور نبی اسرائیل سے عہد لیا گیا  
کہ ماں باپ اور رشتہ داروں  
کے ساتھ نیکی کرنا۔

قرابت داروں کے ساتھ نیک سلوک اسلام میں اس قدر اہمیت رکھتا ہے۔ کہ اسے توحید و عبادتِ خداوندی کے ہم پیر قرار دیا۔ ارشاد ہوا۔

أَسْبَدُوا لِلَّهِ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ  
شَبَّانُوا بِاللَّهِ إِحْسَانًا  
اور اللہ کی عبادت کرو۔ اور  
کسی چیز کو اس کا ساتھی نہ بناؤ  
اور ماں باپ اور قرابت دار  
کے ساتھ نیکی کرو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے رشتہ داروں سے محبت کرے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے اجر دے گا۔ اور جو شخص اپنے رشتہ داروں سے نفرت کرے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے عذاب دے گا۔



"قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا" دیکے پیغمبر کہہ دیجئے کہ میں تم سے  
 إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ (شوریٰ) اس پر اپنے قرابت داروں کے  
 لئے محبت کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔

بعض اوقات کسی قرابت دار سے کوئی قصور سرزد ہو جاتا ہے، اسلام اس بات  
 کی اجازت نہیں دیتا کہ اس قصور کے باعث قرابت دار کے حقوق کی ادائیگی روک دی جائے  
 اور اس کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا جائے۔ حضرت ابو بکر صدیق اپنے ایک عزیز  
 رشتہ دار مسطح بن اثاثہ کی امداد کیا کرتے تھے، ایک بار انہیں مسطح کے ذریعہ سخت  
 تکلیف پہنچی جس پر انہوں نے تم کھائی کہ آئندہ کبھی اس کی امداد نہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ  
 کو یہ بات پسند نہ تھی، قرآن پاک میں یہ آیت نازل فرمائی "اور تم سے جو لوگ بزرگ اور  
 صاحب مقدر ہیں، وہ قرابت داروں اور محتاجوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے  
 والوں کو مدد دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں، انہیں چاہیے کہ ان کے قصور بخش دیں، اور  
 درگزر کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے قصور معاف کر دے اور اللہ بخشے  
 والا صریحاً ہے" (سورہ نور رکوع ۱۳) رشتہ داروں کا ایک اہم حق یہ ہے کہ انہیں  
 ترکہ میں سے حصہ دیا جائے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے تمام رشتہ داروں کے حصے  
 مقرر کر دیئے ہیں، اور مومنوں کو حکم دیا ہے کہ کسی شخص کی وفات کے بعد اسی تناسب  
 سے مرنے والے کی جائیداد تقسیم کی جائے۔ اگر کوئی شخص ساری جائیداد پر خود قبضہ  
 کر لیتا ہے، اور دوسرے رشتہ داروں کو اس میں سے حصہ نہیں دیتا تو قطع  
 رحمی کا مرتکب ہوتا ہے، جس سے اللہ تعالیٰ نے سختی سے منع کیا ہے، یہ ضروری نہیں  
 کہ ترکہ میں سے صرف انہی رشتہ داروں کو حصہ دیا جائے جن کے حصے مقرر ہیں، بلکہ دوسرے  
 رشتہ داروں کو بھی کچھ دینا موجب اجر و ثواب ہے۔

ار ایک دفعہ ایک

احادیث نبویہ سے قرابت داری کی اہمیت

شخص نے آنحضرت  
 صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جو



مجھے جنت میں لے جائے۔ فرمایا خدا کی بندگی کرو۔ کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔ نماز پوری

طرح ادا کرو۔ زکوٰۃ دو۔ اور قرابت کا حق ادا کرو۔ (صحیح بخاری)

۲۔ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو صلہ رحمی کا حق ادا نہ کرے، وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ (صحیح بخاری)

۳۔ حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت فرمایا جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی ہڈی میں وسعت اور کرمی برکت ہو، تو اس کو چاہیے کہ وہ صلہ رحمی کرے۔

(صحیح بخاری)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نیک اعمال کا اثر اللہ نے یہ رکھا ہے کہ اس سے مال و دولت میں فراخی اور کرم میں زیادتی ہوتی ہے، کیونکہ صلہ رحمی کی وہی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ضرورت مند رشتہ داروں کی مالی مدد کی جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ خدا کی دسی گئی عمر میں سے کچھ حصہ ان کی خدمت میں صرف کیا جائے۔ مالی امداد کا اجر خدا کی طرف سے مالی وسعت اور کشادگی اور خدمت کا صلہ عمر میں برکت کی صورت میں ملتا ہے۔

۴۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جو شخص عام غریبوں کو صدقہ دے گا، اسے ایک درجہ ثواب ملے گا، لیکن جو اپنے قرابت داروں کی مالی امداد کرے گا، اسے دو درجہ ثواب ملے گا۔ (ترمذی و ابن ماجہ)

۵۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کی کہ تم رشتہ داروں کے حقوق پوری طرح ادا کرو خواہ وہ تم سے بدسلوکی سے پیش آئیں۔

۶۔ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ اپنا باخ صدقہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ آنحضرت صلی اللہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں اپنا باخ صدقہ کرنا چاہتا ہوں، آپ اسے فقرا میں تقسیم کر دے دیجئے، آپ نے فرمایا تمہیں اپنی نیت کا ثواب مل گیا، اب



تم اس باغ کو اپنے اقارب میں تقسیم کر دو۔  
 ۸۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کسی شخص کا کمال یہ نہیں ہے کہ وہ حسن سلوک کا جواب حسن سلوک سے دے بلکہ کمال یہ ہے کہ اس کے رشتہ دار اس سے بدسلوکی کریں اور وہ ان سے حسن سلوک سے پیش آئے۔ (بخاری)

۹۔ سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں اقارب سے حسن سلوک کی اہمیت اس قدر تھی کہ بعض اوقات آپ نے کسی سبیلہ پر فوج کشی محض اس لئے روک دی کہ وہاں کے لوگ رشتہ داروں سے حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔ حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے ارادے سے نکلے تو راستہ میں کسی شخص نے عرض کیا: حضور نبوذج کی بستی قریب ہے۔ اسے بھی ملیع کرتے چلیں۔ آپ نے فرمایا: مجھے اللہ تعالیٰ نے نبوذج پر چڑھائی کرنے سے منع کیا ہے۔ کیونکہ وہ اقارب سے نیک سلوک کرتے ہیں۔ (احیاء علوم الدین)

۹۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت کی خوشبو سو برس کی مسانت سے محسوس ہوگی۔ مگر والدین کی نافرمانی کرنے والے لوگ اس سے محروم رہیں گے (نفرانی)۔  
 بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ، اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ رشتہ داروں سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ اور ان کے حقوق ادا نہیں کرتے وہ جنت میں تو کیا داخل ہوں گے، اس کے قریب بھی نہ جاسکیں گے۔ اور اس کے دروازے ان پر بالکل بند ہوں گے۔

۱۰۔ آنحضرت نے فرمایا: اپنی قرابت کو تازہ کرتے رہو، چاہے سلام کے ذریعہ ہی ہو۔  
 (کنز العمال جلد ۵)

دینی نسلہ نظر کے علاوہ اقارب

اقارب سے حسن سلوک کے اثرات

کا موجب ہوتا ہے۔ جو قریبی روابط و مراسم اقارب کے ساتھ استوار ہوتے ہیں دوسروں کے ساتھ ایسے تعلقات کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ انسان دنیوی زندگی میں



ہمیشہ خوش حال و فارغ البال ہی نہیں رہتا، بلکہ حوادث و آلام کی لپیٹ میں بھی آ جاتا ہے، بیماری اس کا لقب کرتی ہے، عسرت و افلاس سے دوچار ہوتا ہے، مقدمہ بازی میں گھر جاتا ہے، گردش روزگار کے ان ایام میں اٹار ب و اعزہ ہی کا دم غنیمت ہوتا ہے، جو بیماری میں اس کی تیمارداری کرتے، فقر و فاقہ میں اس کی مالی امداد کرتے اور مقدمہ کے چکر سے رہائی دلاتے ہیں، ایک مستحکم برادری والے انسان کا دل بہت مضبوط رہتا ہے، اسے علم ہوتا ہے کہ مصیبت کے وقت رشتہ دار ہر قربانی کریں گے اور اس کی تائید و نصرت کا کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھیں گے،

قربت نوازی حسن خلق اور مردت سے بستیاں آباد ہوتی ہیں۔ اور غریب دراز ہوتی ہیں جس نیکی کا سب سے جلد ثواب ملتا ہے، وہ صلہ رحم ہے، اگر اس خاندان کے لوگ تاجر ہوں، تو ان کے مال میں برکت پیدا ہوتی ہے، کوئی خاندان ایسا نہیں کہ وہ متحد ہونے کے باوجود افلاس و غربت کا شکار ہو،  
(کنز العمال)

تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع شروع میں جن مشکلات کا سامنا ہوا، ان میں آپ کے چچا ابوطالب کی حمایت ہمیشہ بڑی مفید ثابت ہوتی رہی، جب کفار مکہ نے بنی ہاشم کا بائیکاٹ کر دیا، کہ اسلام قبول کرنے کے باوجود بنی کا ساتھ نہیں چھوڑتے، تو حضور اور ان کا قبیلہ مجبور ہو گئے، کہ گھر بار چھوڑ کر شعب ابی طالب میں محصور ہو کر رہیں، قریش کھانے پینے کی اشیاں بھی وہاں نہیں جانے دیتے تھے، بنو ہاشم کے بچے بھوک کے مارے اس قدر رویا کرتے کہ ان کی آواز گھائی کے باہر سنائی دیتی، ان حالات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان نے تین سال حضور کے ہمراہ بسر کئے، یہ خاندانی تعلقات ہی تھے، جن کی بنا پر بنو ہاشم نے آپ کی خاطر، اس قدر تکالیف برداشت کیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی پامروئی کے ساتھ تمام مصائب کو برداشت کیا، دیمک کفار کے معاہدہ کا کاغذ کھا گئی جو کعبہ پر آویزاں تھا، کفار نے پہرہ بٹھا دیا، تب آپ نے گھائی سے باہر نکل کر تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا۔



قرآن و حدیث میں قرابت کی بے حد تاکید کی  
اقارب نوازی کی حد و گئی ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ  
 ہر جائز و ناجائز بات میں ان کی بے جا حمایت کی جائے۔ دین اسلام نے قرابت داری  
 کی تاکید کے ساتھ ساتھ عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کی بھی ہدایت  
 کی ہے۔ قرآن میں فرمایا۔

فَاعْتَدُوا وَكُوكَاثَ  
 ذَا قَرْحَبِي (الانعام - ۱۵۲)

انصاف سے کام لیجئے۔ اگرچہ  
 اقارب ہی کیوں نہ ہوں۔  
 اندھا دھند حمایت کا نام تعصب ہے۔ ظہور اسلام سے قبل عربوں میں حد درجہ  
 تعصب پایا جاتا تھا۔ ہر شخص اپنے ہم نسب یا شہید شخص کی نصرت و حمایت کو اپنے  
 لئے فرض عین تصور کرتا تھا۔ اگرچہ وہ ناحق پر ہو۔ اسلام نے اگر اس سے زدک دیا  
 اقارب کی قرابت داری کو برقرار رکھا۔ مگر ظالم کی حمایت کو نار و آفرار و بیار ایک  
 دفعہ کسی شخص نے نبی کریم ﷺ اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا اپنے اقارب سے محبت  
 رکھنا تعصب میں داخل ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں تعصب یہ ہے کہ تو اپنے خاندان  
 کی بے انصافی میں مدد کرے۔

(مشکوٰۃ شریف)

اسلام میں قوم اور قبیلہ کی بنا پر فخر کرنے کی اجازت نہیں۔ سورۃ الحجرات  
 میں فرمایا۔ کہ ہم نے تمہیں اقوام و قبائل میں صرف لتاروں کے لئے تقسیم کیا ہے۔ اللہ  
 کے ہاں سب سے زیادہ اعزاز و اکرام کا مستحق وہ ہے جو تقویٰ کے وصف میں  
 سب سے پیش پیش ہو۔

خلاصہ یہ کہ دین اسلام نے قرابت داری کا حکم دیا ہے۔ مگر بے جا ظرافت داری  
 تعصب کو ممنوع قرار دیا ہے۔



## سوالات

- ۱- اقارب سے حسن سلوک کہاں ضروری ہے قرآنی آیات سے استشہاد کیجئے۔
- ۲- احادیث نبویہ سے ثابت کیجئے کہ اقارب سے حسن سلوک ضروری ہے؟
- ۳- قرابت داری کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا کن دنیوی فوائد کا موجب ہے۔ اس سے کیا اثرات و نتائج برآمد ہوتے ہیں۔
- ۴- آنحضرت کے اقارب نے آپ سے کیسا سلوک کیا۔ مثال دے کر وضاحت کیجئے؟
- ۵- قرابت داری کی حدود بیان کیجئے۔



## ہمسایہ

اپنے گھر کے قریب رہنے والے شخص کو ہمسایہ اور پڑوسی کہتے ہیں، عربی  
 مفہوم میں اس کے لئے جار کا لفظ مستعمل ہے۔ جس کی جمع بھیران ہے۔ پڑوسی  
 کی کوئی شرعی حدود لائل کتاب و سنت سے متعین نہیں، قرب و جوار میں رہنے والے شخص  
 پر پڑوسی کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ کوئی شخص جس قدر قریب تر ہوگا، اتنی طرح دوسرے ہمسایوں  
 کے مقابلہ میں قابلِ ترمیم ہوگا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے  
 دریافت کیا، میرے دو پڑوسی ہیں، اگر تیرے بھینسا چاہوں، تو کس کو بچوں؟ فرمایا جس کا گھر  
 قریب تر ہو۔ (بخاری)

اپنے رشتہ داروں کے بعد انسان کا سب سے زیادہ تعلق اپنے پڑوسیوں سے ہوتا  
 ہے۔ اگر اس کو مدد پہنچتی ہے، تو سب سے زیادہ انہی سے پہنچتی ہے، اسی لئے ایک سچے  
 مذہب کا فرض ہے کہ وہ ایسی تعلیم پیش کرے جس پر عمل کر کے ہمسایوں کے ساتھ تعلقات  
 مضبوط تر ہو جائیں اور وہ ایک دوسرے پر جان نگیں نہ لگیں۔

قرآن کریم نے دو قسم کے ہمسایوں کا ذکر کیا ہے: ارشاد ہوتا ہے:

وَالْحَارِ ذَا ذَا الْقُرْبَىٰ  
 وَالْحَارِ الْجُنُبِ فِي الْقَضَاءِ  
 بِالْجُنُبِ (نساء-۱۶)

اور (خدا نے) ہمسایہ قریب اور  
 ہمسایہ بعید اور پہلو کے ساتھی  
 کے ساتھ نیکی کا حکم دیا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ پڑوسیوں میں ان کو ترجیح دی جاتی ہے، جن کے  
 ساتھ پڑوس اور ہمسائیگی کے علاوہ کوئی دوسرا تعلق بھی ہو۔ خواہ رشتہ داری کا ہو، یا  
 ہم مذہبی کا یا کسی اور قسم کا۔ اس آیت کے پیش نظر کافر ہمسایہ کا حق سب سے  
 کم مسلمان ہمسایہ کا اس سے زیادہ اور رشتہ دار ہمسایہ کا سب سے فائق ہوگا۔  
 مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:



”دھی محمدی نے ہمسایہ کے پہلو بہ پہلو ایک اور قسم کے ہمسایہ کو جگہ دی ہے جس کو عام طور پر پڑوسی اور ہمسایہ نہیں کہتے، مگر وہ ہمسایہ ہی کی طرح اکثر ساتھ رہتا ہے۔ جیسے ایک سفر کے دو رفیق۔ ایک مدرسہ کے دو طالب علم ایک کارخانہ کے دو ملازم۔ ایک استاد کے دو شاگرد۔ ایک دکان کے دو شریک۔ یہ بھی دراصل ایک طرح کی ہمسائیگی ہے۔ اس کا دوسرا نام رفاقت اور محبت ہے۔ ان سب قسم کے ہمسایوں میں تقدم اس کو حاصل ہے جس کو ہمسایہ کے علاوہ رشتہ داری یا ہم مذہبی کا یا کوئی اور دُسر تعلق بھی ہو۔“

**ہمسائیگی کی اہمیت** | حق ہمسائیگی صرف شرعی اعتبار سے ہی نہیں۔ بلکہ اخلاقی اور معاشرتی لحاظ سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انسانی تمدن کی بنیاد اشتراکِ عمل اور باہمی تعاون پر قائم ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان دوسرے انسان کی، کا محتاج ہے۔ اگر لوگوں کو ایک دوسرے کی مدد حاصل نہ ہو، تو ہمارا معاشرہ تباہ ہو جائے گا۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ اگر اس کا سبھائی بھوکا ہو، تو اسے کھانا کھلائے۔ تن پوشی کے لئے اس کے پاس کچھ نہ ہو، تو کپڑوں سے اس کی مدد کرے۔ اگر وہ بیمار ہو، تو اس کی تیمار داری کرے اور رنج و راحت میں اس کا دست بازو بنا رہے۔

صحابہ کرام حق ہمسائیگی کو اس حد تک ملحوظ رکھتے تھے کہ جب فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ایک چھاؤنی سے کوچ کا حکم دیا۔ سپاہی خیمے اکھاڑنے لگے تو دیکھا کہ فاتح مصر کے خیمے پر ایک کبوتری نے آشیانہ بنا کر انڈے دے رکھے ہیں۔ حضرت عمرو بن العاص نے فرمایا یہ کبوتری ہماری ہمسایہ ہے۔ جب تک انڈوں سے بچے نکل کر اڑنے کے قابل نہ ہو جائیں خیمہ اکھاڑا نہ جائے۔ آپ نے آشیانہ پر ایک محفظہ مقرر کر دیا۔ کچھ دن بعد جب واپس آئے، تو خیمہ کے گرد ایک شہر آباد کیا جس کا نام فسطاط (خیمہ) رکھا۔ یہ شہر آج تک اسی نام سے مشہور چلا آتا ہے۔



پڑوس کی اہمیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کو پڑوسی سے رنج و الم پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لئے ایک سچے مذہب کا فرض ہے کہ دونوں کو باہم ملائے رکھے تاکہ کوئی خوشگوار واقعہ پیش نہ آئے۔ اور یہ پڑوس بہشت کا نمونہ معلوم ہو۔ عربوں میں دوسری قوموں سے زیادہ اسلام سے پہلے بھی پڑوس اور ہمسائیگی کے حقوق نہایت اہم تھے۔ اگر کسی عرب کے پڑوسی پر ظلم کیا جاتا یا کوئی شخص اس کی عزت و آبرو پر حملہ آور ہوتا تو دوسرا پڑوسی اسے گوارا نہ کر سکتا۔ اور اس کی خاطر لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو جاتا۔ اسلام نے اگر عربوں کے اس احساس کو اور زیادہ قوت بخشی۔ البتہ اتنی ترمیم کر دی کہ ظلم و تعدی میں پڑوسی کی حمایت نہ کی جائے۔ نصرت و حمایت نیکی کے کاموں میں ہونی چاہیے۔ بدی میں نہیں۔

ہمسایہ اگر اچھا ہو تو اس سے بڑے فوائد کی توقع کی جاسکتی ہے، وہ ہر وقت کا شریک رنج و راحت ہوتا ہے۔ وہ ایسے اڑے وقت میں کام آسکتا ہے۔ جب رشتہ دار بھی مدد کو نہ پہنچ سکیں اور اگر موزی اور بد فطرت ہو تو اس کی رنج رسانی سب دشمنوں پر سبقت لے جاتی ہے۔ اس لئے عقل و دانش کا تقاضا یہ ہے کہ ہر حال میں ہمسایہ سے اچھا برتاؤ کیا جائے۔ اس کے دکھ سکھ میں شرکت کی جائے۔ حوادث روزگار میں اس کا ساتھ دیا جائے۔ تاکہ حسن سلوک پر امن زندگی کا پیش خمیر ثابت ہو۔ اسلام جو دین فطرت ہے، اس نے ان ہی مصلحتوں کے پیش نظر ہمسایہ کا خیال رکھنے کی بڑی تاکید کی ہے۔

۱۔ انھنور  
ہمسایوں کے حقوق سے متعلق سرور کائنات کے ارشادات | صلی اللہ

علیہ وسلم نے صحابہ کے مجمع میں بڑے دل نشیں انداز میں فرمایا "خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا۔ خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا۔ خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا۔ صحابہ نے عرض کیا۔ کون یا رسول اللہ! فرمایا "وہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں؟" صحیح بخاری



۲۔ حضرت عبدالرحمن بن ابوقراد سے روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا، تو صحابہ تبرک کے طور پر آپ کے وضو کے پانی کو منہ پر ملنے لگے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان سے دریافت کیا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ صحابہ نے عرض کیا کہ خدا اور رسول کی محبت کی وجہ سے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کی یہ خواہش ہو کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھے، یا اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت رکھیں، تو اسے چاہیے کہ جب بولے سچ بولے، جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جاتے، تو اس میں خیانت نہ کرے اور اپنے پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے۔ (شعب الایمان)

۳۔ آپ نے فرمایا جو شخص خدا اور روز جزا پر ایمان رکھتا ہے، اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے۔ (صحیح بخاری)

۴۔ آپ کا ارشاد ہے کہ جو شخص خدا اور روز جزا پر اعتقاد رکھتا ہے، وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے۔ (صحیح بخاری)

۵۔ آپ نے فرمایا خدا کے نزدیک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لئے بہتر ہو۔ اور پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لئے بہتر ہو۔ (ترمذی)

۶۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جبرائیل مجھے ہمساہ کے بارے میں یہاں تک تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا، کہ اسے وارث قرار دینے لگے ہیں۔ (بخاری)

۷۔ آپ نے فرمایا تمہیں کیا معلوم ہمساہ کا کیا حق ہے۔ خدا کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، ہمساہ کے حقوق ادا کرنے کی تو فریق اسی شخص کو نصیب ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت جس کے شامل حال ہو۔ (بخاری)

۸۔ ہدیہ اور تحفہ دینا محبت میں پیش بہا اضافہ کا موجب ہوتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کو اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ ہدیہ اور تحفہ



کے لئے کسی بیش قیمت چیز کی ضرورت نہیں، بلکہ کھانے پینے کی معمولی چیزیں بھی اس کے لئے کافی ہیں۔

۸۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذر غفاری کو نصیحت فرمائی کہ اے ابوذر جب شورہ بچاؤ تو پانی بڑھا دو اور اس سے اپنے ہمسایوں کو تحفہ دو۔ (صحیح مسلم)

۹۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کون شخص مجھ سے یہ کلمات سن کر ان کو یاد رکھتا اور ان پر عمل پیرا ہوتا ہے یا اس شخص کو سکھاتا ہے جو ان پر عمل کرے، حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ میں نے اسٹھ کر کہا "یا رسول اللہ! میں اس کے لئے تیار ہوں۔" تب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے میرا ہاتھ پکڑ کر پانچ باتیں گئی ایتیں اور فرمایا (۱۱) جن چیزوں کو خدا نے حرام کیا ہے ان سے بچو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم سب لوگوں سے زیادہ عبادت گزار بن جاؤ گے۔

(۲) اپنی تقدیر پر شاکر رہو تم سب لوگوں سے زیادہ مالدار ہو جاؤ گے۔

(۳) اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرو تم کامل مومن ہو جاؤ گے۔

(۴) جو اپنے لئے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لئے پسند کرو تم پورے مسلمان بن جاؤ گے۔

(۵) زیادہ مت ہنسو کیوں کہ زیادہ ہنسنے سے دل مرجاتا ہے۔ (ترمذی)

۱۰۔ آپ نے خاص طور پر غورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ اے مسلمانوں کی بیویا! تم میں سے کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لئے حقیر نہ سمجھے، اگرچہ بکری کی کھڑی ہی کیوں نہ ہو (بخاری)

ارشاد حضور کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو بھیننے والی بیوی اپنے معمولی تحفہ کو حقیر سمجھے کہ اپنی پڑوسن کو نہ بھیجے اور نہ دوسری بیوی اس معمولی تحفہ کو حقیر خیال کرے۔

۱۱۔ آپ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا۔ "بدکاری حرام ہے، خدا اور رسول نے اس کو حرام قرار دیا ہے، لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے



پڑوسی کی بیوی سے حرام کاری کرے۔ چوری حرام ہے۔ خدا اور رسول نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرائے۔ (ادب المفرد امام بخاری)

۱۲۔ دو صحابہ تھیں جن میں سے ایک رات بھر نماز پڑھا کرتا تھا، دن کے روزے رکھتا تھا، صدقات و خیرات بھی کرتا تھا، مگر تیز زبان تھا، پڑوسیوں کو ستاتی تھا۔ لوگوں نے ان کا حال آپ سے عرض کیا، تو فرمایا ان میں کوئی نیکی نہیں، ان کو دوزخ کی سزا ملے گی۔ پھر صحابہ نے دوسری بیوی کا حال سنایا، جو صرف فرض نمازیں پڑھ لیتی اور معمولی صدقہ سے دیتیں، مگر کسی کو ستاتی نہ تھی، فرمایا یہ بیوی جنتی ہوگی۔ (ادب المفرد امام بخاری)

تورات میں لکھا ہے "تم اپنے پڑوسی کی خلات جھوٹی گواہی مت دو۔ تو تورات و انجیل میں حق ہمسائیگی

اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر۔ تو اپنے پڑوسی کی بیوی، اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیٹے اور اس کے گدھے اور کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے، لالچ نہ کر۔" (خروج - ۲-۱۷)

"تو اپنے پڑوسی سے دغا بازی نہ کر نہ اس سے کچھ چھین۔" (احبار - ۱۹-۱۱۳)

حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا۔

"تو اپنے پڑوسی کو ایسا پیار کر جیسا اپنے آپ کو" (مفسر - ۱۲-۳۰)

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔

پڑوسی کے حقوق

تم جانتے ہو پڑوسی کا کیا حق ہے؟ صحابہ نے عرض کیا، کہ اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، اس کے حقوق یہ ہیں کہ اگر وہ تم سے مدد کی درخواست کرے، تو مدد دو۔ قرض مانگے تو قرض دو۔ محتاج ہو، تو اچھا سلوک کرو۔ بیمار ہو، تو عیادت کرو۔ مرنے کے وقت نماز کے



ساتھ جاؤ۔ خوشی کے موقع پر مبارک باد اور غم کی حالت میں تعزیت بجالاؤ۔ اپنے گھر کی دیوار اتنی بلند نہ کرو کہ اس سے ہوا رُکے، نئے پھل خریدو۔ تو اسے بھی چھو۔ اور اگر نہیں بھیج سکتے تو پوشیدہ رکھو اور اپنے بچوں کو پھل ہاتھ میں لئے ہوتے باہر نہ جانے دو۔ کیوں کہ تمہارے بچوں کے ہاتھ میں پھل دیکھ کر اس کے بچے رنجیدہ ہوں گے۔ (احیاء علوم الدین امام غزالی)

امام غزالی کی ذکر کردہ اس حدیث میں آنحضرت نے پڑوسی کے حقوق کی تفصیلاً نشان دہی فرمادی۔ ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ ہر صحابی اپنے پڑوسی کا بھائی اور نیکو قرار بن گیا تھا۔

ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ حضرت جابرؓ گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا اٹھائے جا رہے تھے۔ دریافت کیا کیا ہے؟ حضرت جابرؓ نے عرض کیا: امیر المؤمنین! گوشت کھانے کو جی چاہتا تھا۔ ایک درم کا گوشت خرید کیا ہے فرمایا اسے جابر! کیا اپنے پڑوسی یا عزیز کو چھوڑ کر صرف اپنے پیٹ کی فکر کیا چاہتے ہو کیا یہ آیت بھول گئے۔

اِنَّ هَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمْ  
الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا - مَرَّةً لَوْ تَلَيْتُمْ - اُوْرَانِ سَ

(سورہ احقاف - ۲۰) (موطا امام مالک) قائمہ اٹھایا۔ (معجم امام مالک)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرور کائنات

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے جس طرح تم میں تمہارا رزق تسلیم کیا ہے۔ اسی طرح تم میں تمہارے

اخلاق اور سیرتیں بھی تقسیم کی ہیں۔ بسے شک اللہ تعالیٰ روزی اس کو بھی دیتا ہے

جسے وہ پسند کرتا ہے اور اس کو بھی جس کو وہ پسند نہیں کرتا اس ذات کی قسم جس

کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ کوئی بندہ مسلمان نہیں ہوتا جب تک اس کا

دل اور اس کی زبان مطیع فرمان نہ ہو جائیں۔ نیز وہ اس وقت تک ایسا نہیں ہوتا جب تک



تک اس کے پڑوسی اس کی ضرر رسائی سے محفوظ نہ ہوں (مسند احمد بن حنبل)  
حضرت عمر کے عہد خلافت میں دو صحابیوں کے کھیت قریب قریب تھے ان میں سے  
ایک صحابی صخاک بن قیس نے دوسرے صحابی محمد بن مسلمہ کے کھیت سے پانی گزار کر اپنے کھیت  
تک پہنچانا چاہا محمد بن مسلمہ نے انکار کیا۔

یہ معاملہ حضرت عمر کے پاس پہنچا آپ نے محمد بن مسلمہ سے کہا آپ پانی گزارتے ہیں۔  
آپ کے پڑوسی کو بھی فائدہ ہے اور آپ خود بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں مگر انہوں نے نہ  
مانا حضرت عمر نے پھر اصرار کیا مگر محمد بن مسلمہ اس کے لئے تیار نہ ہوتے۔ آخر حضرت عمر نے  
فرمایا خدا کی قسم یہ پانی گزار کر رہے گا خواہ تمہارے پیٹ پر سے ہو کہ کیوں نہ جائے چنانچہ  
ان کے کھیت سے نہ گزار دی گئی۔  
(موطا امام مالک)

ہمسایہ کے بارے میں امام غزالی کے ارشادات

کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-  
”ہمسایوں کا حق یہی نہیں کہ اسے ضرر نہ پہنچایا جائے۔ کیونکہ یہ بات تو بے جان اشیا  
مثلاً اینٹ، پتھر وغیرہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ کہ اس سے کسی کو ایذا نہیں پہنچتی بلکہ ہمسایہ  
دکھ پہنچاتے تو صبر سے کام لے۔ اور صرف صبر پر ہی اکتفا نہ کرے بلکہ اس کے ساتھ  
نیک سلوک کرے۔ کہا ہے کہ مفلس ہمسایہ قیامت کے دن اپنے امیر ہمسایہ سے جھگڑے  
گا۔ اور عرض کرے گا کہ اے میرے پروردگار اس سے پوچھ کہ اس نے اپنے سلوک سے مجھے  
کیوں محروم رکھا۔ اور مجھ پر اپنا دروازہ کیوں بند کیا۔“

ایک بزرگ کو پتہ چلا کہ ان کا ہمسایہ مقروض ہونے کی وجہ سے مکان فروخت کر رہا ہے۔  
آپ اس کی دیوار کے سایہ میں بیٹھا کرتے تھے۔ یہ خبر سن کر فرمایا کہ اگر اس نے مفلسی کے  
سبب اپنا مکان فروخت کر دیا۔ تو ہم سے اس کی دیوار کے سایہ میں بیٹھنے کا حق بھی  
ادانہ ہوا۔ پھر اس کو قرصہ کی رقم بھیج کر کہا کہ گھر کو مت فروخت کرو۔  
اسی طرح کسی بزرگ کے گھر میں چوہے بہت ہو گئے تھے۔ کسی نے ان سے کہا کہ



آپ ہی کیوں نہیں پال لیتے۔ انہوں نے کہا کہ یہ دُر ہے کہ کہیں بلی کی آواز سن کر چوہے ہمسایوں کے مکان میں نہ چلے جائیں۔ جو بات میں اپنے لئے پسند نہیں کرتا وہ ان کے لئے کیوں پسند کروں۔

امام صاحب مزید فرماتے ہیں: ہمسایوں کے حقوق مختصر ایہ ہیں۔

- ۱۔ جب ہمسایہ سے ملے تو اسے پہلے سلام کرے۔
- ۲۔ اس کے ساتھ طویل گفتگو سے پرہیز کرے۔
- ۳۔ اس کی بیماری چھڑی کرے اور مصیبت کے وقت اسے تسلی دے۔
- ۴۔ رنج و الم میں اس کا ساتھ نہ چھوڑے۔
- ۵۔ خوشی کے موقعہ پر مبارک دے۔
- ۶۔ اس کی غلطیوں سے درگزر کرے۔
- ۷۔ چھت پر سے اس کے گھر نہ جھانکے۔
- ۸۔ دیوار پر شہتیر رکھنے اور پر نالہ لگانے سے نہ روکے۔
- ۹۔ اس کے گھر میں جانے کا راستہ تنگ نہ کرے۔
- ۱۰۔ ہمسایہ جو کچھ اپنے گھر میں لے جائے اسے نہ تاکے۔
- ۱۱۔ اس کے غیب کو چھپاتے۔
- ۱۲۔ حادثہ میں اس کی مدد کرے۔
- ۱۳۔ جب وہ گھر میں موجود نہ ہو، تو اس کے مکان کی نگرانی کرے۔
- ۱۴۔ کسی سے اس کی بُرائی نہ سنے۔
- ۱۵۔ اس کے اہل خانہ سے نگاہ نیچی رکھے۔
- ۱۶۔ اس کے بچوں سے گفتگو میں نرمی برتے۔
- ۱۷۔ دین دنیا کی جو بات اسے معلوم نہ ہو اس کو ٹھیک ٹھیک بتا دے۔

(احیاء غزالی جلد ثانی)



## سوالات

- ۱- پڑوسی کسے کہتے ہیں قرآن میں پڑوسی قریب و بعید کے ماہن کیا امتیاز قائم کیا گیا ہے۔
- ۲- قرآن کریم کی روشنی میں ہمسائیگی کی اہمیت بیان کیجئے۔
- ۳- احادیث نبویہ کی روشنی میں ہمسائیگی کی اہمیت بیان کیجئے۔
- ۴- پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں صحابہ کرام کا طرز عمل کیا تھا؟
- ۵- پڑوسی کے حقوق تفصیلاً بیان کیجئے۔



## شہری

شہری کا لفظ یہاں دیہاتی کے مقابلہ میں استعمال نہیں کیا جا رہا لہذا یہاں مفہوم شہری کے معنی شہر کا باشندہ نہیں بلکہ شہری سے مراد وہ انسان ہے جو نجوشی نظر کسی معاشرہ یا ریاست یا حکومت کے قانون و دستور کو قبول کر کے اس کی رکنیت اختیار کرے اور اس کے نصب العین کو صحیح تصور کرے، ایسا شخص گاؤں میں رہتا ہو قصبہ میں یا کسی شہر میں اس ریاست کا شہری کہلائے گا۔ شہری ہونے کی حیثیت سے مسلم و غیر مسلم سب برابر ہیں۔ انگریزی میں شہری کے لئے (CITIZEN) کا لفظ ہے جو غیر مسلم اسلامی ریاست کے زیر سایہ سکونت پذیر ہوا سے ذمی کہتے ہیں۔ سب لوگ ریاست کے وفادار اور اطاعت شعار ہونے کی صورت میں ریاست کی حدود کے اندر سکونت پذیر ہوں گے، ریاست و حکومت ان کی معاشی و سیاسی اور مذہبی ضروریات کی کفیل ہوگی۔ ان کی حفاظت کا اہتمام کرے گی اور یہ اس کے صدد میں حکومت کو مالی واجبات ادا کریں گے۔

شہری کے حقوق کا تحفظ اور اسلام | دین اسلام نے شہری و مسلم ہو یا غیر مسلم، کے حقوق کا کامل تحفظ کیا ہے قبل ازیں بتایا جا چکا ہے کہ دینی حکام کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ حقوق اللہ

۲۔ حقوق العباد

چونکہ اسلام امن و سلامتی کا پیامبر ہے، لہذا اس نے حقوق العباد پر بڑا زور دیا ہے۔ حدیث میں آیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روز قیامت سب سے پہلے حقوق العباد کا محاسبہ کیا جائے گا۔ اسلام نے بنی نوع انسان کے ہر طبقہ کے لئے جو حقوق مقرر کئے ہیں اس میں شہری کے حقوق بھی شامل ہیں۔ شہری کا مفہوم بڑا



وسیع ہے۔ اسے مسلم شہری کی حد بندی میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام کا دامن غیر مسلموں کے لئے ہمیشہ کشادہ رہا۔ قرآن میں فرمایا۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى  
اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ  
لِلتَّقْوٰى

کسی قوم کی عداوت تم کو اس بات  
پر آمادہ نہ کرے، کہ تم عدل و انصاف  
نہ کرو، عدل و انصاف کرو کیوں  
کہ یہ بات تقویٰ کے زیادہ

قریب ہے۔

اس آیت میں ہر فرد و بشر کو عدل و انصاف کا حکم دیا۔ قطع نظر اس کے کہ اس  
کا تعلق کسی مذہب و ملت سے ہو۔ نبی کریم کا ارشاد گرامی ہے "تم زمین والوں پر رحم کرو  
آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔  
رستدرک حاکم

یہ حدیث رحمتہ العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رحمت کو کتنی عمومیت کے  
ساتھ ظاہر کرتی ہے۔ ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا۔

"جو مسلمان کوئی درخت لگائے گا، اس سے جو انسان پرنده کچھ کھائے گا تو اس  
کا ثواب درخت لگانے والے کو ملے گا" (بخاری)

اس فیض کے عموم میں انسان کے علاوہ پرنده پرند کو بھی داخل کر لیا۔ ایک اور حدیث  
میں فرمایا۔ تم اپنے بھائی کے لئے دی پسند کرو جو اپنے لئے چاہتے ہو۔  
بھائی کے لفظ سے مسلمان بھی مراد ہو سکتا ہے، اور عام انسان بھی۔

صدقہ و خیرات میں مسلم فقراء و مساکین کو ترجیح دینا، ایک فطرتی امر ہے۔ تاہم حضرت  
عمر فاروقؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں غیر مسکینوں کے حقوق کا بھی خیال رکھا۔ قاضی ابو  
یوسف نے کتاب اخراج میں لکھا ہے۔ کہ ایک دفعہ حضرت عمر نے دیکھا کہ ایک غیر مسلم  
بوڑھا جو اندھا بھی تھا، ایک دروازہ پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے۔

حضرت عمرؓ نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ مارا، اور پوچھا کہ تم کو بھیک مانگنے  
کی ضرورت کیا پڑی، اس نے کہا "جز یہ ادا کرتے" اپنی ضرورت پوری کرنے اور بوڑھا بچے



کی وجہ سے بھیک مانگتا ہوں۔ حضرت عمر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھڑ لائے اور اپنے گھڑ سے اسے کچھ دیار پھرا سے بیت المال کے خزانچی کے پاس بھیجا اور کہا: کہ ایسے لوگوں کو تلاش کرو۔ خدا کی قسم ہم انصاف نہیں کریں گے۔ اگر ہم اس کی جوانی کی کمائی تو کھائیں اور اس کے بوڑھے ہونے پر اس کی مدد نہ کریں۔

یہ سب مشہور ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے عام صدقے غیر مسلموں کو دینے جاسکتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا۔ ام المؤمنین حضرت صفیہ نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو ۳ ہزار درہم کی بالیت کا صدقہ دیا۔ امام مجاہد کہتے ہیں کہ مشرک رشتہ دار کا قرض معاف کر دینا ثواب کا کام ہے۔ ابن حجر عسقلانی نے فرماتے ہیں کہ قیدی کو کھلانا کارِ ثواب ہے۔ اور ظاہر ہے کہ صحابہ کے زمانہ حکومت میں مشرک ہی قید ہو کر آتے تھے۔ آنحضرت کے زمانے میں حضرت عمر نے اپنے مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا (صحیح مسلم)

روایت میں آیا ہے کہ صحابہ جب مذہبی اختلافات کی وجہ سے غریب مشرکوں کی مدد سے دست کش ہو گئے تو یہ آیت آئی۔

”ان کو ہدایت دینا تیرے اختیار کی بات نہیں۔ لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے راہ پر لے آتا ہے۔ اور جو مال تم خرچ کرو گے۔ اس کا فائدہ تمہیں کو پہنچے گا۔“

(سورۃ بقرہ - ۱۷۷)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

”تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک پورا مومن نہیں ہوگا۔ جب تک وہ اور لوگوں کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے۔ جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔“

(مسند احمد - جلد ۳ - صفحہ ۲۷۷)

اس حدیث میں محبتِ انسانی کی وسعت سازی انسانی برادری تک وسیع کر

دی گئی ہے۔ (سیرت النبی سید سلیمان)

ایک شہری کے حقوق کو چار قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔



۱۔ مذہبی حقوق

۳۔ معاشرتی حقوق

۲۔ معاشی حقوق

۴۔ سیاسی حقوق

اور عقیدہ کی آزادی۔

مذہبی حقوق

پہر شہری کو کامل آزادی حاصل ہے کہ جو مذہب چاہے اختیار کرے، دین اسلام اسلامی ریاست میں رہنے والوں کو پوری آزادی دیتا ہے، اس ضمن میں قرآن کریم نے بڑے لاگ فیصلہ کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ

دین اسلام میں جبر نہیں۔

(البقرہ - ۲۵۶)

اسلامی ریاست اپنی غیر مسلم رعایا کو تبدیل مذہب پر مجبور نہیں کرتی، تاریخ اسلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم سلاطین اس ضمن میں بڑے کشادہ دل واقع ہوئے ہیں، عباسی خلافت کے زریں دور میں غیر مسلم بڑے بڑے عہدوں پر فاترہ چکے ہیں کبھی ان سے تبدیل مذہب کے لیے نہیں کہا گیا، خود ہندوستان میں یکے بعد دیگرے متعدد مسلم خاندان وراثت تاج و تخت ہوئے، اگر وہ چاہتے، تو سرزمین ہند کے طول و عرض میں کسی غیر مسلم کو زندہ باقی نہ چھوڑتے، مگر انہوں نے عین اس کے برخلاف وسیع النظری اور عالی ظرفی سے کام لیتے ہوئے غیر مسلموں سے رواداری برتی، اور ان کو حکومت کی کلیدی آسامیاں تفویض کر دیں، جلال الدین اکبر کا عہد حکومت اس کی بہترین مثال ہے۔

جس طرح ایک غیر مسلم کو اسلامی ریاست میں کامل آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو اس کی کھلی اجازت ہے کہ مختلف فقہی مسالک مثلاً حنفی، شافعی مالکی یا حنبلی میں سے جو سا طرز فکر چاہیں اختیار کریں، یا براہ راست کتاب و سنت کی پیروی کریں، اور کسی بھی فقہی مکتب خیال کی تقلید جامد کو اپنے لئے ضروری نہ سمجھیں، جس طرح آئمہ اربعہ کے ظہور سے قبل لوگ براہ راست قرآن و حدیث کا اتباع کرتے تھے، اسلامی ریاست کو یہ حق حاصل نہیں کہ لوگوں کو کسی خاص مکتب خیال کی پیروی پر



مجبور کرے۔

خلیفہ منصور و ہارون نے جب مالکی فقہ کو بزور ملک میں رائج کرنا چاہا تو امام مالک نے یہ کہہ کر اس سے باز رکھا کہ علماء کا (فرعی) اختلاف اس اہمیت کے لئے حرج الہی ہے۔ البتہ اسلامی ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اندرون ملک کفر و الحاد کی ترویج و اشاعت کو روک دے اور ملک میں ایسے افکار و نظریات کو پھیلنے پھولنے نہ دے جو اسلام کے بنیادی افکار و عقائد سے متصادم ہوں۔

ب۔ عبادت کی آزادی۔

ریاست کا شہری اس امر میں آزاد ہونا چاہیے کہ وہ اپنی مذہبی روایات کے مطابق عبادت کر سکے، اس کے ساتھ ساتھ عبادت گاہوں کا تحفظ اور ان کی تعمیر بھی حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔

مسلمان ہمیشہ یہود و نصاریٰ کے معاہدہ کی حفاظت کرتے رہے ہیں اور انہوں نے کسی عبادت گاہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔

ذریعہ معاش۔

معاشی حقوق اور ہر انسان کو آزادی ہونی چاہیے کہ وہ حسب مرضی ذریعہ معاش اختیار کر سکے۔ بشرطیکہ وہ ذریعہ معاش شرعی یا اخلاقی اعتبار سے ناجائز نہ ہو۔ مثلاً جو بازی، چور بازی اور حرام اشیاء مثلاً شراب وغیرہ کی خرید و فروخت۔ اس حق کے زیر اثر حکومت کا فرض ہے کہ وہ اپنے شہریوں کے لئے تجارتی سہولتیں مہیا کرے تاکہ وہ اپنے کاروبار کو فروغ دے سکیں۔

ب۔ ہر شہری اپنی وسعت اور استعداد کے مطابق دولت کما سکتا ہے۔ یہ دولت اس کی انفرادی ملکیت ہے جس کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ حکومت اپنے جائز و اجبات وصول کرنے کی مجاز ہے۔ اسلام میں معاشی مساوات کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنی جسمانی و ذہنی صلاحیت کو کام میں لا کر دولت کماتے کا مجاز ہے۔ اس پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ سب افراد کی معاشی حالت مساوی ہو۔



البتہ یہ ضروری ہے کہ کوئی شخص اس سے محروم نہ رہے۔  
 ج۔ حکومت کا فرض ہے کہ رعایا کے مال کی حفاظت کرے۔ اور اس کو اغیار کی دست  
 اندازی سے بچائے۔

د۔ تمام شہری اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ اپنی صحت کے تحفظ کے لئے مناسب اوقات  
 کار کار مطالبہ کریں۔ اور معقول مزدوری حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کریں۔ اس قسم کی مساعی  
 کو بغاوت پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔

### ۳۔ معاشرتی حقوق

اور جینے کا حق۔ ایک شہری جس ریاست کا باشندہ ہو۔ اس میں اسے زندگی بسر  
 کرنے کا حق حاصل ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ اس کی جان و مال کی حفاظت کرے۔ تاکہ وہ  
 پُر امن زندگی بسر کر سکے۔

### ب۔ قانونی مساوات کا حق۔

ریاست کے ہر شہری کو قانونی مساوات حاصل ہونی چاہیے۔ اسلامی ریاست کا  
 قانون امیر و مغرب۔ مسلم و کافر سب کے لئے یکساں ہوتا ہے۔ اس میں کسی قسم کا کوئی امتیاز  
 نہیں ہوتا۔ قانونی مساوات کا ایک بنیادی پہلو یہ بھی ہے کہ وہ بلا معاوضہ ہو۔  
 مسلم سلاطین کی قانونی مساوات ضرب المثل کی حد تک مشہور ہے۔ حضرت علی کریم اللہ  
 وجہہ کے عہد خلافت کا واقعہ ہے کہ آپ کی زرہ گم ہو گئی۔ زرہ کچھ مدت کے بعد ایک یہودی  
 کے پاس دیکھی گئی۔ مقدمہ عدالت میں پہنچا اور حضرت علی نبفس نفیس فریق مقدمہ کی حیثیت  
 سے تشریف لائے۔ آپ کے پاس چونکہ گواہ نہ تھا۔ اس لئے قاضی نے یہودی کے حلی میں فیصلہ  
 دے دیا۔ آپ تے قطعاً برا نہ مانا۔ یہودی کو معلوم تھا کہ یہ زرہ حضرت علی کی ہے۔ لیکن قانونی  
 ثبوت دیتا نہ ہونے کی وجہ سے آپ کو نہ مل سکی۔ وہ اسلامی انصاف کا یہ عالم دیکھ کر  
 ایمان لے آیا۔

ج۔ عزت و آبرو۔

معاشرتی اعتبار سے تمام شہری مساوی ہیں۔ ان کی ناموس و آبرو بھی یکساں اہمیت



رکھتی ہے۔ کسی کی بے عزتی کرنا، بتنان سگانا، لگالی گلچوج دینا حکومت میں ممنوع ہونا چاہیے۔  
آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مسلمانوں پر ایک دوسرے کی توہین حرام ہے۔  
در آزادی تحریر و تقریر۔

ہر شہری کو تحریر و تقریر کی آزادی حاصل ہونی چاہیے تاکہ وہ دیانت داری سے  
اپنا مافی الضمیر واضح کر سکے، اور اس میں اس پر کوئی پابندی نہ ہو۔  
ر۔ پرامن اجلاس۔

ریاست کے شہری پرامن اجلاس کر کے اپنے افکار و آراء کا اظہار کر سکتے ہیں بشرطیکہ  
اس میں قانون شکنی سے احتراز کیا جائے، اور فساد کا اندیشہ نہ ہو۔  
معاشرتی حقوق کا دائرہ کافی وسیع ہے، مثال کے طور پر چند امور کا ذکر کیا گیا ہے۔  
اس میں طبی امداد کے حق، گھریلو زندگی کی آزادی کے حق اور حق تعلیم نیز جائداد بنانے کے حق  
کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ ریاست کے شہریوں کے لئے یہ تمام  
مراعات دیتا کرے۔

ورود دینے کا حق۔

۴۔ سیاسی حقوق | اسلامی حکومت عوام کے مشورے سے قائم کی جاتی ہے۔  
اس کے ہر ناقل و بائع شہری کو رائے دہی کا حق حاصل ہونا چاہیے تاکہ ہر شخص کامل  
آزادی سے اپنے ووٹ کا استعمال کرے۔

ب۔ بحی تقید۔

ریاست کے ہر شہری کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ حکومت پر تعمیری تنقید کر کے،  
خلافت راشدہ کے دوران عوام بر ملا خلفاء پر تنقید کرتے تھے اور خلفاء نہ صرف اسے  
گوارہ کرتے بلکہ اس پر اظہار خوشنودی کرتے تھے۔  
چ۔ حکومت کے مناصب۔

ہر شہری کا حق ہے کہ وہ حسب استعداد حکومت کے ہر عہدے پر فائز ہو سکے، اس  
میں کسی قسم کا امتیاز روادار رکھا جائے۔



**شہری کے فرائض** | حقوق کے علاوہ ایک شہری کے کچھ فرائض بھی ہیں۔  
 اولین ہے کہ وہ حکومت و ملت کی مکمل اطاعت کرے۔ ملک کا وفادار رہے اور اس کی ترقی و سلامتی میں کوشاں رہے۔ قرآن کریم میں مسلم حکام کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ اور امیر کا حکم سنو اور بجالاؤ۔ اگرچہ کوئی غلام تم پر امیر ہو۔ ایک روایت میں ہے کہ اگرچہ وہ ناک کٹا حبشی غلام ہو۔ (مشکوٰۃ)

۲۔ قانون کا احترام :- قانون کا احترام بھی ایک شہری کے لئے از بس ضروری ہے۔ اگر سب لوگ قانون شکنی پر اتر آئیں تو ملک میں ایتری پھیل جائے۔ اس لئے ہر اچھا شہری قانون کا احترام کرتا اور قانون شکنی کو جرم خیال کرتا ہے۔

۳۔ واجبات کے ادا کیے :- حکومت کو مختلف مددات پر کثیر اخراجات کی ضرورت لگتی ہوتی ہے اس لئے حکومت کے واجبات کو بخوشی ادا کرنا نہایت ضروری ہے۔  
 ۴۔ حکومت سے تعاون :- ہر مسلمان شہری کا فرض ہے کہ حکومت سے تعاون کرے، قرآن حکیم میں اسے فرض قرار دیا گیا ہے۔

۵۔ آمدنی کے واجبات استعمال :- اچھے شہری کا فرض ہے کہ آمدنی کو جائز اخراجات پر صرف کرے۔ اور جو رقم زائد ہو اسے رفاہ عامہ کے کاموں میں لگائے۔  
**اچھے شہری کے اوصاف** | اسلامی زندگی کا ایک معیاری شہری درج ذیل اوصاف کا حامل ہوتا ہے۔

- ۱۔ وہ دل و جان سے حکومت کا وفادار ہوتا ہے۔
- ۲۔ وہ اپنے حقوق و فرائض سے کلیتہً نہ صرف آگاہ ہوتا ہے، بلکہ مستعدی و جانفشانی سے انہیں ادا کرتا ہے۔
- ۳۔ وہ ملکی قوانین کی پابندی کرتا اور حکومت سے تعاون کرنے کا کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کرتا۔



- ۴۔ وہ قیام امن میں حکومت کا ساتھ دیتا ہے۔
- ۵۔ وہ ملک و ملت کے تحفظ و بقا کے لئے کوشاں رہتا ہے۔
- ۶۔ وہ نیکی کی اشاعت کرتا اور اخلاقی و معاشرتی برائیوں کا انسداد کرتا ہے۔
- ۷۔ وہ خدمتِ خلق کے جذبہ سے سرشار ہوتا ہے۔
- ۸۔ وہ ملک میں طبقاتی نسلی اور صوبائی تعصبات کو اجاگر نہیں کرتا۔
- ۹۔ وہ دوسروں کے عیوب کو تلاش نہیں کرتا۔
- ۱۰۔ وہ اخلاقِ حسنہ سے موصوف ہوتا ہے۔
- ۱۱۔ وہ متعصب اور تنگ نظر نہیں ہوتا۔
- ۱۲۔ وہ کسی کو ظلم و تعدی کا نشانہ نہیں بناتا۔

### سوالات

- ۱۔ اسلام غیر مسلموں کے حقوق کا کہاں تک تحفظ کرتا ہے، غیر مسلم رعایا کے متعلق اسلامی احکام کا خلاصہ لکھئے۔
- ۲۔ ایک شہری کے حقوق کیا ہیں، تفصیلاً لکھئے۔
- ۳۔ ایک شہری پر کون سے فرائض عائد ہوتے ہیں، تفصیلاً لکھئے۔
- ۴۔ آپ کے خیال میں ایک اچھا شہری کن اوصاف کا حامل ہونا چاہیے۔
- ۵۔ ایک شہری کے معاشرتی فرائض کیا ہیں، تفصیلاً لکھئے۔



# اسلامی حکومت

داخلی و خارجی انتظامات کے لئے حکومت کا قیام ناگزیر ہے۔  
**حکومت کی ضرورت** ریاست اور حکومت میں فرق یہ ہے کہ حکومت اس ادارہ

کو کہتے ہیں جو کسی ریاست کا انتظام کرتا ہے۔ حکومت ریاست کے زیر اثر ہوتی ہے حکومت کو بدل بھی سکتے ہیں۔ قیام حکومت کے بغیر نہ ملکی حدود کا تحفظ ممکن ہے۔ نہ داخلی انتشار و خلفشار کو روکا جاسکتا ہے، نہ شہری کے کئی حقوق ہیں۔ اسی طرح اس کے ذمہ کچھ فرائض بھی ہیں۔ حکومت کے بغیر حقوق کی حفاظت و نگہداشت کی کوئی صورت ہے۔ نہ فرائض کی عدم ادائیگی پینہ زجر و عتاب کا کوئی امکان ہے۔ ظہور اسلام سے قبل جزیرہ تملے عرب کی یہی حالت تھی۔ منظم حکومت نہ ہونے کے باعث ہر طرف غنڈہ گردی اور شر و فساد کا دور دورہ تھا۔ غارت گردی اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ نہ مظلوم کسی کے آگے داستان غم و ستم بیان کر کے وادخواہی کا طالب ہوتا نہ ظالم کو کیفر کر دارتک پہنچانے کے لئے کوئی قوت حرکت میں آتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مظلومی کی طویل داستان تھی۔ اسلام کی اقتصادی اور سیاسی قوت دن و دن اور رات چوگنی ترقی کرتی گئی۔ سلسلہ میں غزوہ بدر کی شاندار فتح نے مسلمانوں کے لئے قوت و شوکت کا دروازہ کھول دیا۔ ماہ رمضان ۳ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہوا جس نے کفار قریش کے تابوت میں آخری کین ٹھونک دی۔ کفر ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب فائز شان سے مدینہ لوٹے تو اسلامی حکومت کی تشکیل کے احساس نے کروٹ لی۔ آپ نے تاکسیس حکومت کے سلسلہ میں پہلا کام یہ کیا کہ قبائل میں محصلین زکوٰۃ کا تصور فرمایا۔ لیکن دراصل خلافت الہی کے تمام اجزاء اور آخرتاً حجۃ الوداع کے زمانہ میں تکمیل پذیر ہوئے۔ چونکہ آپ کا اصل مقصد دعوت اسلام اصلاح اخلاق اور تزکیہ نفس تھا۔ اس لئے آپ نے ملکی انتظامات اسی حد تک قائم کئے جہاں تک ملکی بدعنوانی کے باعث دعوت توحید میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی۔



اسلام کا تصور حکومت | حکومت کے متعلق اسلامی نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اپنا خلیفہ و نائب بنا کر بھیجا ہے تاکہ جہاں تک ممکن ہو احکام خداوندی کی اطاعت کرے اور اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر شرعی احکام کو دنیا میں نافذ کرے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ انسان کی غایت تخلیق اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت ہے۔ ارشاد فرمایا:

فَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ

میں نے جن و انس کو اس لئے  
پیدا کیا کہ وہ میری عبادت  
کریں۔

الَّذِي يُعْبُدُونِ -

(الذاریات)

عبادت کا اطلاق بندگی اور اطاعت دونوں پر ہوتا ہے۔ آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ انسان دنیا میں خداوند تعالیٰ کی عبادت و اطاعت دونوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ انسان طبعاً اس کے لئے تیار نہیں اس کے مختلف وجوہ اسباب ہیں۔

۱۔ انسان طبعاً تنافل شعبار واقع ہوا ہے۔

۲۔ دنیوی حرص و ہوا عبادت خداوندی سے مانع ہے۔

۳۔ انسان مختلف مصروفیات و مشاغل میں منہمک ہو کر عبادت خداوندی بجالانے سے قاصر رہتا ہے۔

ان امور و اسباب کا تقاضا ہے کہ کوئی بالائی قوت ہونی چاہیے جو انسان سے اوامر خداوندی کی تعمیل کرے اور

سے باطنی ہونے سے بچائے۔ ظاہر ہے کہ یہ اختیار اسی انسان کو ودیعت کیا جاتا ہے جو ہر لحاظ سے اس کا اہل ہوتا ہے۔ اس کو امیر، خلیفہ یا امام کہتے ہیں۔

وَعَدَا اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ

خدا نے تم میں سے ایمانداروں اور نیکو کاروں سے وعدہ کیا ہے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لِيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ

کہ ان کو زمین میں اپنی خلافت اسی طرح عطا کر دے گا جس

فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفْنَا

الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلِيُمَكِّنَنَّ



طرح کہ گزشتہ امتوں کو اس نے اپنی خلافت عطا کی تھی اور ان کے اس دین کو جس کو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے۔ قوت بخشے گا اور ان کی بے امنی کو امن سے بدل دے گا۔

لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَهُمْ أَعْيُنُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ أَعْيُنُهُمْ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكٰفِرِينَ (سورہ زمر)

یہ آیت کریمہ اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے کہ خدا کی اس امانت (خلافت ارضی) کا بار انہی لوگوں میں ڈالا جاتا ہے جو مندرجہ ذیل اوصاف کے حامل ہوتے ہیں۔

۱۔ وہ ایماندار ہوں۔

۲۔ اعمال صالحہ انجام دیتے ہوں۔

۳۔ خدا کی عبادت کرتے ہوں۔

۴۔ شرک سے بے زار ہوں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ پر جو قوم ایمان نہیں رکھتی یا اس کے احکام کو تسلیم نہیں کرتی خواہ وہ کس قدر طاقت ور بااقتدار اور زور آور ہو وہ خلافت الہی سے بہرہ ور نہیں ہو سکتی۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حاکمیت مطلقہ صرف خدا کی ذات کے لئے ہے دنیا میں جو حاکم ہوگا وہ صرف خدا کا خلیفہ ہوگا۔ دوسرے یہ کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام مومن خلیفہ بننے کے مستحق ہیں اور جو خلافت ان کو ملے گی وہ عمومی حیثیت رکھے گی۔ کسی ایک شخص یا خاندان یا نسل یا طبقہ میں محدود نہ ہوگی۔ بالفاظ دیگر ہر مومن خدا کا خلیفہ ہے اور اسی حیثیت سے خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔

مدینہ منورہ تشریعت لاکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت الہیہ کی تشکیل فرمائی۔ آپ کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس عظیم امانت سونپی گئی۔ خلافت راشدہ صحیح معنی میں حکومت الہیہ اور نبیائے نبوت تھی۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ خلفاء



راشدین بایمان مخلص عبادت گزار اور نیکو کار تھے، انہی صفات کی بنا پر اس عظیم امانت کے لئے ان کا انتخاب عمل میں آیا۔

خلافت کے لئے امارت اور امامت کے الفاظ بھی استعمال کئے جاتے ہیں، مگر ان کا اطلاق بادشاہی پر بھی کیا جاتا ہے، جب کہ خلافت کا لفظ خاص ہے، اور صرف اسی امارت یا امامت پر بولا جاتا ہے۔ جو جادۂ سنت پر مبنی ہو۔ آج کل حکومت کا لفظ عام معنوں میں بولا جاتا ہے، اس میں خلافت و امامت اور امارت سب شامل ہیں، اسلامی حکومت نہ تو خاص جمہوریت (DEMOCRACY) ہے، کہ جس میں تمام لوگ حکومت کا قانون بناتے ہیں اور اس میں روڈ و بدل کا پورا حق رکھتے ہیں۔ اور نہ ہی یہ وہ تھیو کریسی (THEOCRACY) ہے، جس میں پورے اختیارات مخصوص نہ بنی طبقہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ اور وہ ان کو قوانین الہی کی حیثیت سے نافذ کرتے ہیں، اسلامی حکومت کو الہی جمہوری حکومت کہا جاتا ہے۔ اس حکومت میں لوگوں کی رائے سے ایک مجلس عالمہ بنائی جاتی ہے۔ وہ اس مجلس کو توڑ بھی سکتے ہیں۔

اسلامی حکومت انسانی

اسلامی و غیر اسلامی حکومت کے مابین وجہ امتیاز | ذہن کے اختراع کردہ

قوانین کی مرہون منت نہیں ہوتی، نہ اسے انسانی قواعد و نواہط کا کچھ احتیاج ہوتا ہے، اس کے پاس ایک بنا بنایا دستور ہوتا ہے، جو اس خیلۂ ارضی پر بسنے والے تمام بنی نوع انسان کی ضروریات کا کفیل ہے۔ انسانی تمدن بدلتا رہتا ہے، انسانی ذہن کے سانچے نئے نئے قالب اختیار کرتے ہیں، ہر ملک اور ہر قوم کے جذبات و احساسات طرز بود و باش اور طرز فکر و نظر میں بڑا فرق ہوتا ہے، مگر دستور الہی کبھی نہیں بدلتا اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے، یہ دستور اس قانون ساز حقیقی کا وضع کردہ ہے۔ جو عظیم و خیر اور علام الخیر ہے، اسے انسانی ضروریات کا بخوبی علم ہے اور اس کا وضع کردہ قانون ان سے پوری طرح میل لھاتا ہے۔

اسلامی حکومت میں خلیفہ صرف اس کام کو نافذ کرتا ہے، وضع نہیں کرتا، اس لئے



اقتدار اعلیٰ قانون ساز حقیقی (اللہ تعالیٰ) کے قبضہ میں ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

إِنِ اتَّخَذْتُمُ اللَّاءِلٰہَ ۙ

حکم صرف خدا کا ہے۔

(الانعام - ۵۷)

اس آیت سے خلیفہ و امیر کے حدود اختیار پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ اپنی طرف سے کوئی ایسا حکم نہیں دے سکتا جو اللہ و رسول نے نہ دیا ہو۔ اگر وہ ایسا حکم دے گا تو وہ قابل اطاعت نہیں۔ گویا اطاعت اللہ کی ہے۔ امیر کی نہیں۔ البتہ امیر اس لئے بھی واجب اطاعت ہے کہ وہ خدا کے احکام و نیامیں نافذ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اطاعت امیر پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ قرآن میں فرمایا۔

مسلمانوں اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں ان کی اطاعت کرو۔ پھر اگر کسی بات میں حاکم وقت سے تمہارا اختلاف ہو تو اللہ اور رسول کی اطاعت پر ایمان لانے کی شرط یہ ہے کہ اس امر میں اللہ اور رسول کے حکم کی طرف رجوع کرو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی یہی طریقہ اچھا ہے۔

(سورہ نساء - رکوع ۸)

اس آیت میں اولوالامر و حاکم وقت کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ "مِنْكُمْ" (مسلمانوں) میں سے۔ اکی شرط کا حامل ہو۔ احادیث نبویہ میں اطاعت امیر کی تاکید کی گئی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی حکومت وہ ہے جو انسانی قانون کے بجائے اللہ تعالیٰ کے وضع کردہ قوانین پر عمل پیرا ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ جس ریاست و حکومت میں مسلمان ہو وہ بائیس رکھتے ہوں اور ان کا حاکم بھی مسلمان ہو۔ اس ریاست کو بھی اسلامی کہا جائے۔ اسے مسلم حکومت یا مسلم سٹیٹ تو کہا جاسکتا ہے مگر اسلامی حکومت کے نام سے نہیں پکارا جاسکتا۔



خلافت کا حق پوری ملت کو عطا ہوتا ہے۔ اس ملت کے سب  
**خلیفہ کا انتخاب** افراد نظم و نسق میں حصہ دار ہوتے ہیں۔ افراد ملت میں چند و بندار  
 اور اہل آدمیوں کا انتخاب کر کے ایک مجلس شورے مرتب کی جاتی ہے یہی مجلس شوری  
 خلیفہ کا انتخاب کرتی ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا۔  
 وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنِهِمْ  
 (الشوری - ۳۸)  
 وہ اپنے معاملات مشورہ سے  
 طے کرتے ہیں۔

### شورے

مجلس شوری کے تمام ممبر قابل، دیانت دار اور ہر لحاظ سے اس کے اہل ہوں۔  
 خلیفہ کے انتخاب کے لئے مجلس شوری کا انتخاب بشرط نہیں بلکہ ملت اسلامیہ  
 کی رضامندی اور عام پسندیدگی ضروری ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے  
 وقت کوئی مجلس شوری نہ تھی۔ سقیفہ نبی ساعدہ میں جو لوگ موجود تھے۔ انہوں نے آپ کی  
 بیعت کر لی تھی۔ اس کے بعد عام لوگوں نے بیعت کر لی۔ اور کسی نے ناپسندیدگی کا اظہار  
 نہ کیا۔ حضرت عمر کو حضرت ابو بکر صدیق نے خلیفہ مقرر کیا تھا۔ سب لوگوں نے اس پر خوشنودی  
 کا اظہار کیا۔ حضرت عمر فاروق نے لائق ترین اشخاص کی ایک جماعت کو انتخاب کر کے یہ کہا تھا  
 کہ اپنے میں سے ایک کو خلیفہ چن لیں۔ انہوں نے حضرت عثمان کو خلیفہ منتخب کیا۔ حضرت  
 عثمان کی شہادت کے بعد اہل مدینہ نے حضرت علی کو خلافت کے لئے چنا۔ اہل شام کے سوا  
 سب لوگ آپ کی بیعت پر متفق ہو گئے۔ خلفائے راشدین کا طریق انتخاب گوجاگانہ نوعیت  
 کا تھا مگر جمہوریت کی روح ہر انتخاب میں موجود تھی اور یہی اصل مقصود ہے۔  
 اس سے خلافت اور بادشاہت کا فرق بھی واضح ہو گیا۔ خلیفہ شورے کا انتخاب  
 کر رہا ہوتا ہے۔ بجلات ازیں ایک بادشاہ کو سابق حکمران نامزد کرتا ہے۔ علاوہ ازیں بادشاہ  
 کے ہاتھ میں اقتدار اعلیٰ ہوتا ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے حکومت کرتا ہے۔ مگر خلیفہ اقتدار  
 اعلیٰ پر قابض نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ صرف احکام خداوندی کو دنیا میں نافذ کرتا ہے۔ خود حکم  
 صادر نہیں کرتا۔ دین اسلام میں خلیفہ کے عزل و نصب کا حق پوری قوم کو ہوتا ہے۔ خلافت  
 اسی صورت میں صحیح ہوگی جب اس میں شورے کی روح کارفرما ہو۔ خلافت کا منصب



انسانوں کو بحیثیت مجموعی عطا ہوا ہے۔ لہذا کوئی شخص انفرادی طور پر خلیفہ کھلانے کا مجاز نہیں  
حضرت ابو بکر خلیفہ کھلانے کو ناپسند کیا کرتے تھے۔

اسلامی حکومت کے شرائط | امر بالمعروف ونہی عن المنکر

۱۔ کہ وہ حدود مملکت میں نیکی کو پھیلانے اور فواحش و منکرات کا سدباب کرنے کے  
لئے کوشاں رہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے  
(مسلمان وہ لوگ ہیں) جن کو ہم زمین میں غلبہ عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں گے۔  
زکوٰۃ دیں گے اور لوگوں کو نیک کاموں کا حکم دیں گے۔ اور بُری باتوں سے روکیں گے۔  
اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ (سورہ الحج رکوع ۵)

۲۔ قیام عدل و انصاف۔

عدل و انصاف کا قیام کسی حکومت کی بنیاد ہی ضرورت ہے جس کے بغیر اس کو  
بقاء و استحکام نصیب ہوتا۔

قرآن میں فرمایا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَامُرُكُمْ اَنْ تَتَّقُوْا  
الَّذِيْنَ تَعَالَيْتُمْ فِيْ حُكْمٍ  
وَيَاكُرُوْا اَوْ رَجِبْتُمْ لَوْ  
رَمِيْنَا فَنُصِصْ كُرُوْا  
تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ

(نساء رکوع ۸) انصاف کو ملحوظ رکھو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بادشاہ اس کائناتِ ارضی میں خدا کا سایہ ہے  
پھر مظلوم اسی کے دامنِ عاطفت میں پناہ لیتا ہے۔ جب وہ انصاف کرتا ہے تو  
اسے انصاف کرنے کا ثواب ملتا ہے۔ اور جب ظلم کرتا اور نا انصافی کرتا ہے تو اس پر  
بے انصافی کا بوجھ ہوتا ہے اور رعیت کو چاروں طرف صبر کرنا پڑتا ہے۔ (ترمذی)  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اساتذہ اوسوں کا ذکر کیا جنہیں قیامت کے روز  
خدا کا سایہ نصیب ہوگا۔ ان میں سے ایک عادل حاکم بھی ہے۔ (بخاری)



۳۔ رعایا سے شفقت و مہمروئی۔

حکومت کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ رعایا کی خیر خواہی کرے۔ ان سے مہربانی نرزی اور شفقت سے پیش آئے۔ ان پر ناروا ٹیکس نہ لگائے،

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

”جو شخص کسی قوم پر حاکم ہو، اور اس کی موت اس حالت میں آئے، کہ وہ رعایا کا بدخواہ ہو۔ تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کو حرام کر دیتا ہے۔“  
(بخاری و مسلم)

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی تھی۔

”اللہ! جو شخص میری امت کا حاکم مقرر ہو اور وہ انہیں شفقت میں ڈال دے تو تو اسے مشقت میں ڈال۔ اور جو میری امت کا والی قرار پائے اور ان کے ساتھ نرزی و مہربانی سے پیش آئے۔ تو تو اس پر مہربانی کر۔“ (صحیح مسلم)

۴۔ جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ

رعایا کی جان و مال اور ناموس و آبرو کی حفاظت حکومت کا فرض اولین ہے۔ اگر ملک میں بد امنی اور شرد و ساد کا دور دورہ ہو۔ تو اس کا انسداد کرنا حکومت پر لازم ہے۔ اس کے بغیر نہ جان و مال کی حفاظت ممکن ہے، نہ کسی کی آبرو محفوظ رہ سکتی ہے۔  
۵۔ ملکی دفاع۔

داخلی انتظام کے علاوہ حکومت کا یہ بھی فرض ہے کہ ملک کو بیرونی حملوں سے بچائے اور اس مقصد کے لئے اسلحہ جنگ اور ضروری سامان سے لیس فوج ہر وقت تیار رکھے اگر ضرورت کا تقاضا ہو تو ہر مسلمان کو سپاہیانہ تربیت دی جائے۔

۶۔ کتاب و سنت کی پیروی

اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ احکام کتاب و سنت کی پیروی کرے اور کوئی قانون ایسا نہ بنائے جو قرآن و حدیث کے خلاف ہو۔

۷۔ عہدوں پر مناسب اشخاص ہائے

حکومت کی مشینری قابل اشخاص کے ہل پر زور سے چلتی ہے، لہذا حکومتی عہدوں



پر مناسب اور اہل آدمیوں کا تقرر ضروری ہے۔ اس ضمن میں اقربا نوازی اور کنبہ پروری کے جذبات کا کوئی عنصر شامل نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ حکومت کو اس سے شدید ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

۸۔ اقلیتوں کا تحفظ۔

جو غیر مسلم اسلامی ریاست میں اقامت پذیر ہوں، انہیں ذمہ داری کہا جاتا ہے۔ جس طرح مسلم رعایا کی عزت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت کرنا حکومت پر فرض ہے، اسی طرح غیر مسلم اقلیت کا تحفظ بھی ازسین ناگزیر ہے۔ اسلامی حکومت میں ان کو ہر طرح مذہبی آزادی حاصل ہوگی، معاشی اعتبار سے بھی وہ آزاد ہوں گے، چون سا پیشہ چاہیں، اختیار کریں، بشرطیکہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو اس سے ٹھیس نہ لگتی ہو۔ ان کو مسلمانوں کے ساتھ معاشرتی مساوات بھی حاصل ہوں گی، اہل ذمہ سے فوجی خدمت نہیں لی جاتی، اس کے عوض انہیں ایک معمولی سائیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ جسے جو یہ کہا جاتا ہے، بچے، بوڑھے اور معذور افراد اس سائیکس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔

۹۔ بیت المال کا صحیح استعمال

حکومت کا فرض ہے کہ قومی دولت کو صنائع زکریٰ، اور اسے ضروری کاموں پر

صرف کرے۔

### سوالات

- ۱۔ قیام حکومت کی ضرورت کس لئے لاحق ہوتی ہے، حکومت کے فرائض تحریر کیجئے۔
- ۲۔ اسلام کا تصور حکومت کیا ہے؟ اسلامی حکومت کی خصوصیات لکھئے، اور بتائیے، کہ اسلامی اور غیر اسلامی حکومت میں کیا فرق ہے۔
- ۳۔ خلافت ارضی سے کیا مراد ہے، نظریہ خلافت کی تشریح کیجئے۔
- ۴۔ اسلام میں انتخاب خلیفہ کے لئے کیا طریق مقرر ہے، خلفائے راشدین کا انتخاب کیسے عمل میں آیا۔
- ۵۔ اسلامی حکومت کے فرائض و واجبات کیا ہیں؟ تفصیلاً لکھئے۔



# دنیا کے اسلام

## اُمت

دین اسلام کسی قوم و وطن کے دائرہ کے اندر محدود نہیں۔  
دنیا کے اسلام | اسلام ایک دینی تحریک ہے اور دوسری تحریکوں کی طرح  
 چند اصول و ضوابط رکھتی ہے۔ جس شخص اور جس قوم میں یہ عقائد و اعمال موجود ہوں  
 اسے مسلم قرار دے سکتے ہیں۔ قطع نظر اس نئے کہ وہ کسی ملک میں رہتا ہو۔ کوئی زبان بولتا  
 ہو۔ کسی رنگ و نسل سے وابستہ ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے شہر آفاق  
 خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا۔

”آج کے دن میں نے جاہلیت کے تمام امتیازات اپنے پاؤں تلے روند ڈالے۔  
 گورے کو کالے پر کوئی تفریق ہے نہ عربی کر عجمی پر، میں نے سابقہ حسد و بغض کو ختم  
 کر دیا۔ ہر مسلمان کی عزت و آبرو اور جان و مال دوسرے پر حرام ہے“ (بخاری)  
 یہ آنحضرت کے طویل خطبہ کا مختصر اقتباس ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی  
 ہے کہ اسلام کسی قوم کا دین ہے نہ کسی ملک کے رہنے والوں کی جاگیر جو شخص اس کے عقائد  
 کو اپنے قلب و ذہن میں جگہ دیتا ہے اس کے ارکان پر عمل پیرا ہے وہی مسلمان ہے۔  
 مختلف خطہ ہائے ارضی میں بسنے والے مسلمانوں کے سیاسی اقتصادی اور معاشرتی  
 حالات مختلف ہو سکتے ہیں مگر جہاں تک احکام دین کا تعلق ہے ان میں سرِ موفرق نہیں  
 ایک ملک والوں کے لئے دینی احکام و اوامر اتنے ہی ضروری ہیں جیسے دوسرے ملک  
 والوں کے لئے۔ سب مسلمان اُمت محمدیہ کے افراد ہیں اور اس مضبوط و مستحکم رشتہ  
 کی بنیاد پر بھائی بھائی ہیں۔ احکام دین کو لوگوں تک پہنچانا ہر مسلمان کا دینی فریضہ  
 ہے۔ جب اعداء دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں سنگِ راہ ہوں تو اسلام کی نشر و اشاعت



ہر مسلمان پر فرض عین ہو جاتی ہے

اسلام میں قومیت کے لئے کوئی جگہ نہیں | اسلام میں قومیت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ بلکہ نظریہ قومیت

اسلامی اصول و ضوابط کے منافی ہے۔ ایک جاٹ کا بیٹا جات ہو سکتا ہے، ایک سید زادے کو بھی سید کہہ سکتے ہیں، مگر ایک مسلم سپوت اس وقت تک سچا مسلمان کہلانے کا استحقاق نہیں رکھتا جب تک اسلامی عقائد کی صداقت اس کے دل کی گہرائیوں میں آ کر جائے اس سے واضح ہوا۔ کہ کورہ ارضی کے مسلمانوں کے مابین دین اسلام ایک زبردست رشتہ اتحاد ہے جس نے انہیں تسبیح کے دانے کی طرح ایک شیرازہ میں منسلک کر رکھا ہے۔ اگر یہ تعلق کمزور پڑ جائے، یا ٹوٹ جائے تو قومیت کا کوئی رشتہ انہیں جوڑنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ پاکستان اسی نظریہ کے پیش نظر دنیا کے نقشہ پر معرض وجود میں آیا تھا، کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں، ہندو کا مذہب، تہذیب و ثقافت اور معاشرت بالکل الگ ہے مسلمان باوجود اختلاف افکار و نظریات ایک قوم ہیں۔ اسی نظریہ کے تحت مشرقی پاکستان کو جغرافیائی فاصلہ اور اختلاف تہذیب و معاشرت کے باوجود پاکستان کا ایک حصہ قرار دیا گیا۔

نئی پود کے ذہن سے نظریہ پاکستان مٹ گیا، مشرقی پاکستان کے خالص ہندو نما اساتذہ نے نئی پود کے ذہن میں اس بات کو راسخ کر دیا، کہ نظریہ پاکستان کوئی چیز نہیں۔ اس طرح مشرقی و مغربی پاکستان کو جوڑنے والی طاقت جو کہ دین اسلام تھی، کمزور پڑ گئی تو اس کے نتیجے میں دسمبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان نے بغاوت کا اعلان کر دیا، اور "بنگلہ دیش" کی نام نہاد حکومت وہاں قائم ہو گئی۔

مغربی پاکستان میں بھی چار قوموں کا پروپیگنڈہ زور شور سے جاری ہے، اگر اس کا اسناد نہ کیا گیا، اور طلباء کو نظریہ پاکستان سے روشناس کرانے کی کوشش نہ کی گئی تو کچھ بعید نہیں کہ خدا نخواستہ پاکستان کا وجود ہی باقی نہ رہے اور قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی مساعی جملہ بے کار ہو کر رہ جائیں، خدا نہ کرے کہ یہ روز بد مسلمانوں



کو دیکھنا پڑے۔

بعض عرب ممالک عرب قومیت کا گمراہ کن پروپیگنڈہ کر کے اسلامی نظریات کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس سے ان کا مقصود یہ ہے کہ قلوب و اذان سے دینی حس کھینچ کر مضمود ہو جائے اور مسلمانوں کو ایک شیرازہ میں پروانے کے لئے صرف عربی قومیت کا نظریہ باقی رہے۔

**اتحاد ممالک اسلامی** | مختلف اکناف ارضی کے مسلمان نظریاتی طور پر متحد ہیں، توحید اور نبوت، خانہ کعبہ اور دیگر اسلامی ارکان و شعائر کی وحدت نے ان کو ایک زبردست رشتہ ۲ اتحاد میں پروردگار کا ہے۔ تاہم تاریخ کے بعض ادوار میں یہ تحریک اٹھتی رہی کہ انہیں کھینچ کر بھی متحد کر دیا جاتے، یہ مساعی حیلہ اپنی جگہ قابل تحسین ہیں۔

**امت کا مفہوم** | عربی زبان میں امت کا لفظ ان معانی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ۱۔ نعمت و برکت ۲۔ شان و شوکت ۳۔ خوش حالی ۴۔ نارغ البالی ۵۔ فرقہ ۶۔ امانت ۷۔ کسی نبی کے پیرو، قوم قبیلہ گروہ ۸۔ چہرہ ۹۔ مدت۔ عرصہ (القاموس)

اسلامی اصطلاح میں امت کا لفظ افراد کے اس مجموعے پر بولا جاتا ہے جو کسی خاص نبی کی پیروی کرتا ہو۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروں کو موسوی امت کہیں گے، حضرت عیسیٰ کی اطاعت کرنے والوں کو عیسائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معتقدین کو امت محمدیہ قرآن کریم میں فرمایا:

ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا (جو لوگوں سے کہتا ہے) صرف خدا کی عبادت کرو اور شیطان سے بچو۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا  
أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا  
الطَّاغُوتَ

(انگل۔ ۱۳۶)



اس آیت میں امت کا لفظ ہر نبی کے پیروؤں کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ لفظ امت کا اطلاق ایک شخص پر بھی کیا جاتا ہے۔

قرآن میں فرمایا۔

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً

ابراہیم ایک امت تھے۔

(النحل - ۱۲۰)

اللہ تعالیٰ نے تمام نبی نوح انسان پر بحیثیت مجموعی بھی لفظ امت کا اطلاق کیا

ہے فرمایا۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً

پہلے سب لوگ ایک ہی امت تھے

اس آیت میں سب انسانوں کو امت فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بعثت انبیاء کی علت غائی اور مختلف اقوام دائم میں

تفرق و انقسام کی غرض بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

”پہلے سب لوگ ایک ہی امت تھے۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہو گئے تب اللہ

نے انبیاء کو بھیجا جو بشارت دینے والے اور عذاب سے ڈرانے والے تھے اور

ان پر سچی کتاب اتاری تاکہ حق کے بارے میں جو لوگوں کے درمیان جھگڑا ہوا ہے ان

کا فیصلہ کریں۔ اختلاف ان ہی لوگوں نے کیا تھا۔ جن کو حق کا علم دیا گیا تھا اور واضح

احکام ان کے پاس آگئے تھے۔ یہ آپس میں بغاوت اور زیادتی کی غرض سے تھا۔ پس

اللہ نے ایمان والوں کو اپنے حکم سے سچائی کی طرف رہنمائی کی جس کے بارے میں اختلاف

ہوا تھا اور اللہ جیسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

(سورۃ بقرہ - رکوع ۲۶)

دوسری جگہ ہے۔

تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم

نے خاص شریعت اور خاص

راستہ تجویز کیا ہے اور اگر اللہ کو

منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی

لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَ

مِنْهَا جَا طَ وَ كَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجْعَلَكُمْ

أُمَّةً وَ أَحَدَةً وَ لَكِن



لَيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ  
فَأَسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ط إِلَى اللَّهِ  
مَرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا  
كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ "

سورہ مائدہ

رکوع ۷

اُمت بنا دیتا، لیکن ایسا نہیں  
کیا، یہ دین تم کو دیا ہے، تاکہ اس  
میں تم سب کا امتحان لے۔ تم  
مضید باتوں کی طرف سبقت کرو،  
تم سب کو خدا کے پاس جانا ہے۔  
پھر وہ تم سب کو حیلادے گا۔  
جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام نبی نوع انسان کو ایک ہی رشتہ  
بذہب و ملت میں منسک دیکھنا چاہتے تھے، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کا امتحان کرنا چاہتا  
ہے کہ کون شخص راہ راست اختیار کرتا ہے اور کون سیدھی راہ سے بھٹک جاتا ہے  
اس لئے انہیں آزادی دے دی کہ وہ اپنے لئے جو شئی راہ چاہیں، اختیار کر لیں۔

سابقہ آیات سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ ظہور اختلاف سے قبل سب نبی نوع  
انسان توحید اور پیغمبری حقائق پر متفق تھے، جب باہمی اختلافات کی بنا پر وہ توحید کی  
سیدھی راہ سے ہٹ گئے، تو ان کے اختلافات نے ایک دائمی صورت اختیار کر لی، اگر  
منشاء از وہی یہ ہوتا کہ جبر و کراہ سے سب لوگوں کو ایک ہی راستہ پر گامزن کر دیا جائے  
تو وہ ایسا کر سکتے تھے، مگر راستہ ایسا نہیں کیا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اُمت محمدیہ میں شامل ہونے کا  
شرف عطا فرمایا ہے، ہم سب کا خدا ایک ہے، رسول ایک ہے اور کتاب ایک ہے۔  
اس امر کا تقاضا یہ تھا کہ سب مسلمان باہم بھائی بھائی ہو کر رہتے اور ایک دوسرے  
سے اس قدر یگانگت اور محبت کا سلوک کرتے کہ دوسرے مذہب والے ہمارے اتحاد  
کو دیکھ کر ہماری طرف کشاں کشاں کھینچے چلے آتے، لیکن افسوس ایسا نہیں ہے۔ اور  
ایک اُمت میں ہونے کے باوجود مسلمان مختلف گروہوں میں بٹ گئے، حالانکہ اللہ  
تعالیٰ نے مسلمانوں کو وحدت و اتحاد کے مرکز پر رہنے اور اختلاف و تفرقہ سے



بچنے کی تلقین فرمائی ہے۔

جس طرح قرآن کریم نے نازل ہو کر  
امت محمدیہ کی وسعت و جامعیت | آسمانی کتابوں کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے

بند کر دیا۔ اور سابقہ کتب منسوخ قرار پائیں۔ اسی طرح ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم  
 نے ابدالاً باتک رسالت اور نبوت کے سلسلہ کو ختم کر دیا۔ اب نہ کوئی تشریحی نبی آسکتا  
 ہے نہ غیر تشریحی۔ نہ ظلی نہ بروزی۔

آپ نے فرمایا۔

انَّ الرِّسَالَاتِ وَالنَّبُوَّةَ  
 قَدْ انْقَطَعَتْ فَلَ رَسُولٌ  
 لِّعَدِي وَلَا نَبِيٌّ لِّعَدِي  
 اس میں ذرا شک نہیں کہ رسالت  
 اور نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔  
 اب میرے بعد نہ کوئی رسول آئے  
 گا نہ نبی  
 (ترمذی)

سلسلہ کتب و رسل کے اختتام کے بعد  
امت محمدیہ کا خاتم الامم ہونا | امت محمدیہ کا آخری امام ہونا ایک بدیہی  
 بات ہے۔ جب نبی کریم کے بعد کوئی نبی پیدا ہو کر مبعوث نہیں کیا جاسکتا۔ تو امت  
 محمدیہ کے بعد کوئی امت بھی عالم وجود میں نہیں آسکتی۔ جس طرح نبی کریم کی رسالت ہمہ گیر  
 ہے۔ کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ کسی خطہ ارضی تک محدود نہیں۔ کسی قوم کے  
 اندر محصور نہیں۔ اسی طرح امت محمدیہ کی وسعت و جامعیت کا دائرہ بھی غیر محدود ہے۔  
 اس کی رکنیت کا دروازہ ہر ایک کے لئے ہر وقت کھلا ہے۔ قومی، نسلی یا جغرافیائی  
 تفریق سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ہر رکن اس عالمگیر ادارے کی مسادات سے بہرہ اندوز  
 ہو سکتا ہے۔ امت محمدیہ کا کوئی منصب کسی کا ورثہ نہیں۔ علم و روحانیت بھی کسی خاندان  
 میں محدود نہیں۔ اس میں ہندوؤں کی طرح برہمن اور شوروں کی کوئی تقسیم نہیں۔ ہر  
 مومن احکام شریعت کی اطاعت کر کے اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ حاصل کر سکتا ہے۔  
 قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔



قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا  
 آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں  
 تم سب کی طرف رسول ہو کر آیا  
 ہوں۔ (سورۃ اعراف)

دوسری جگہ فرمایا ہے۔  
 وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً  
 لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا  
 ہم نے آپ کو سب لوگوں کی طرف  
 بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔  
 (سورۃ سبأ)

متذکرہ صدر دونوں آیات سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کو تمام جہان کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کمرۃ ارض کا کوئی گوشہ آپ کے جاں نثاروں سے خالی نہیں۔

ہر وہ شخص جو توحید و رسالت  
 امت محمدیہ میں شمولیت کے شرائط

پر ایمان رکھتا ہے، امت محمدیہ میں شامل ہے۔ خواہ وہ شمال میں رہتا ہو یا جنوب میں، مشرق میں ہو یا مغرب میں، عربی ہو یا عجمی۔ گورا ہو یا کالا۔ اس کا رکن بننے کے لئے رسمی فارم پڑھ کر پڑھنے یا چندہ جمع کرنے کی ضرورت نہیں، سب یکساں طور پر واجب الاحترام ہیں۔ عز و شرف کا مدار نسبی شرف پر نہیں بلکہ تقویٰ پر ہے جو شخص جتنا زیادہ متمسک ہے، وہ اسی قدر بارگاہ ایزدی میں زیادہ واجب العزت ہے۔ کوئی قومی یا نسلی یا جغرافیائی تفریق امت مسلمہ کے افراد کی یکسانیت و یکگانگی میں حائل نہیں ہے۔ کلمہ طیبہ پڑھ کر ہر شخص اس کا رکن بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ کسی بنیادی عقیدہ کا منکر نہ ہو، ہمیں کسی کے دل کا حال معلوم نہیں، اگر کوئی شخص دل سے مسلمان نہ بھی ہو، تو ہم اسے اس وقت تک خارج از اسلام قرار نہیں دے سکتے جب تک وہ علانیہ کسی بنیادی عقیدہ کا منکر نہ ہو جائے۔ امت اسلامیہ کی کیفیت کا دروازہ ہر ایک کے لئے ہر وقت کھلا ہے، امت کا کوئی بھدہ یا منصب متواتر نہیں ہوتا، علم اور روحانیت کسی کی میراث نہیں، یہاں تک کہ ایک کلمہ حبشی غلام بھی



خلافت کے منصب پر فائز ہو سکتا ہے۔

متعدد آیات قرآنیہ و احادیث نبویہ میں اُمتِ محمدیہ کی فضیلت آئی ہے۔ فرمایا:

«وَكذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ  
أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا  
شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ»

اور ہم نے تمہیں ایک بالانصاف  
امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ  
رہو۔

(سورۃ بقرہ، آیت ۱۴۳)

یعنی ایسی اُمت جو ہر اعتبار اور معیار سے معتدل ہے۔ ہر کجی اور ہر افراط و تفریط سے پاک، وسط کا لفظ عربی زبان میں خاص مدح کے موقع پر آتا ہے۔ اُمتِ اسلامیہ انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے ساری دنیا کے لئے بطور نمونہ کے تیار کی گئی ہے۔ کائنات کی ہر امت کو اسی سانچہ میں ڈھلنا اور اسی معیار پر پورا اترنا چاہیے۔ آیت سے کمال درجہ کی فضیلت اُمتِ اسلامیہ کی ثابت ہو رہی ہے۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

«كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ  
لِلنَّاسِ» (آل عمران - ۱۱۰)

تم بہترین اُمت ہو جسے لوگوں  
کے لئے ظاہر کیا گیا ہے۔

اس آیت میں اُمتِ محمدیہ کو خیر اُمت و بہترین امت کے شاندار لقب سے نوازا گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت نے فرمایا: مجھے ان انعامات سے مشرف فرمایا گیا جو کسی دوسرے کے حصّہ میں نہیں آئے۔

- ۱۔ دشمنِ اسلامی لشکر سے ایک ماہ کے فاصلہ پر سے ہر اس سال ہو جاتا ہے۔
- ۲۔ مجھے روئے زمین کی کنجیاں عطا کی گئیں (یعنی سب کمرۃ ارضی میرے زیر نگیں دیا)
- ۳۔ مجھے احمد کے نام سے پکارا گیا (احمد کے معنی ہیں کثیر الصفات)
- ۴۔ مٹی کو میرے لئے پاک کر دیا گیا (کہ بوقتِ ضرورت اس سے تیمم کیا جا سکتا ہے)



- ۵۔ میری امت کو سب امتوں کی سرداری عطا کی گئی (مسند امام احمد)  
 بخاری و مسلم میں یہ خصوصیات مزید بیان فرمائیں۔  
 ۶۔ میرے لئے مالِ غنیمت کو جلال قرار دیا گیا۔  
 ۷۔ مجھے شفاعت کرنے کا حق ارزانی کیا گیا ہے۔  
 ۸۔ میری بعثت کے ساتھ نبوت کو ختم کر دیا گیا۔ (نیل الاوطار للشوکانی جلد اول)

### سوالات

- ۱۔ امت کے لفظی و اصطلاحی معنی بیان کیجئے۔  
 ۲۔ امتِ محمدیہ کی خصوصیات پر سیر حاصل تبصرہ کیجئے۔  
 ۳۔ سابقہ امم سے تعابلی کر کے امتِ محمدیہ کی فضیلت ثابت کیجئے۔  
 ۴۔ قومیت کا تصور کہاں تک درست ہے، دلائل سے اس کی تردید یا تائید کیجئے۔  
 ۵۔ قوم اور امت میں کیا فرق ہے، امتِ دعوت اور امتِ اجابت کا فرق واضح کیجئے۔



## اسلامی اخوت

سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل عرب ایک دوسرے کے دشمن اور جان لیوا تھے ہمیشہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ سے برسریکا رہتا، لڑائی کا سلسلہ جب ایک بار چھڑ جاتا تو کہیں رکنے کا نام نہ لیتا، حرب و ضرب کے محرکات بھی کچھ اہم نہیں ہوتے تھے، کبھی حرب اس بات پر لڑائی ٹھن جاتی کہ اونٹوں کو پیلے پانی کون پلائے گا، کبھی گھوڑ دوڑ کا میدان سیف و سناں (تلوار و نیزہ) کی جلوہ گاہ بن جاتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرماتے مدینہ ہوئے تو یہاں بھی وہی سماں نظر آیا، مدینہ کے دو مشہور قبیلے اوس و خزرج باہم نبرد آزار رہتے تھے، اسلام نے اگر انہیں شیر و شکر کر دیا، اسی نعمت کو جلاتے ہوئے قرآن میں فرمایا:

اور تم اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم دشمن تھے۔ اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا پھر تم اس کی سربانی سے بھائی بھائی ہو گئے۔

وَ اذْكُرُوا الْفَصْحَةَ اللّٰهَ  
عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءُ  
فَاَلَّفَ بَيْنَ بَيْنِكُمْ  
مَا كُنْتُمْ بَيْنَكُمْ  
اِخْوَانًا

(آل عمران - رکوع ۱۱)

اوس و خزرج کے دلوں میں الفت و محبت کی یہ تخم ریزی عین عنایت ایزدی سے ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر نبی کریم اس کے لئے مال و دولت کے انبار خرچ کر دیتے تو بھی اس کا حصول ممکن نہ تھا۔ فرمایا:

اگر آپ زمین کی ساری دولت خرچ کر دیتے، تو بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے مگر خدا نے الفت پیدا کر دی

لَوْ اَلْفَقْتُمْ مَا فِى الْاَرْضِ  
بَيْنِيَا مَا اَلَفْتُ بَيْنَ  
قُلُوبِهِمْ وَ لَكِنِ اللّٰهُ  
بَيْنَهُمْ اِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ



سورۃ انفال رکوع ۶) بے شک وہ غالب اور مصلحتوں

سے آگاہ ہے۔

مسلمانوں کو مہر و محبت اور جذباتِ لطف و کرم کا خوگر بنانے کے سلسلے

میں بتا کر فرمایا۔

اور اللہ تعالیٰ اور اس کے  
رسول کی اطاعت میں لگے رہو  
اور آپس میں جھگڑانا نہ کرو ورنہ  
تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہارا ہی ہوا  
اکھڑ جائے گی۔

وَاطِيعُوا لِلَّهِ وَرَسُولَهُ  
وَلَا تَنَازَعُوا فِي الْأَمْرِ  
الَّذِي كُنْتُمْ  
وَتَذَكَّرَ فِيكُمْ  
(سورۃ انفال رکوع ۶)

۱۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع  
کے موقعہ پر کم و بیش ایک لاکھ صحابہ

احادیث نبویہ اور احادیث

سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

”اے لوگو! میری بات سنو۔ اچھی طرح جان لو کہ ہر مسلمان  
دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ سب اہل اسلام کی ایک برادری ہے  
کسی شخص پر اس کے بھائی کا مال حلال نہیں جب تک وہ خود اپنی  
خوشی سے نہ دے، ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔“ (ترمذی)

۲۔ آنحضرت کا ارشاد ہے کہ خدا تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا۔ باہم محبت  
رکھنے والے کہاں ہیں۔ مجھے اپنی عظمت کی قسم آج میں انہیں اپنے ساتھ میں  
جگہ دوں گا۔ آج میرے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہیں ہے۔ (مسلم)

۳۔ آپ نے فرمایا۔ مسلمان آپس میں ایک عمارت کی طرح ہیں جس کا ایک حصہ دوسرے  
کو مضبوط کرتا ہے۔

۴۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔  
وہ اس سے خیانت نہیں کرتا۔ اس سے چھوڑ نہیں پڑتا اور نہ شکایت کے وقت



اسے تنہا چھوڑتا ہے۔ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی آبرو، مال اور خون  
حرام ہے۔ (ترمذی)

۵۔ ایک شخص کسی دوست کی ملاقات کے لئے دوسرے گاؤں گیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس راستہ میں ایک فرشتہ مقرر کر دیا۔ جب یہ شخص فرشتہ  
کے پاس پہنچا، تو اس نے دریافت کیا، کہاں جا رہے ہو؟ اس نے جواباً کہا، میں  
اپنے بھائی سے ملنے جا رہا ہوں۔ فرشتہ نے دریافت کیا، تم اس پر کوئی  
احسان کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ اس شخص نے کہا، نہیں میں صرف رضائے  
الہی کے لئے اسے ملنا چاہتا ہوں۔ فرشتہ نے کہا، غور سے سنتے رہیں خدا کا بھیجا  
ہو فرشتہ ہوں۔ اور تمہیں اس بات سے آگاہ کرنے آیا ہوں۔ کہ خدا تجھ سے  
محبت کرتا ہے (صحیح مسلم)

۶۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری سے مخاطب  
ہو کر فرمایا۔

”اے ابوذر تم جانتے ہو، کہ ایمان کا کون سا کڑھ مضبوط ہے؟“  
حضرت ابوذر نے جواب دیا کہ ”خدا اور اس کا رسول ہی خوب جانتا ہے۔“  
آپ نے فرمایا ”صرف خدا کے لئے باہم دوستی رکھنا اور صرف خدا ہی کے  
لئے کسی سے محبت اور صرف خدا ہی کے لئے کسی سے دشمنی رکھنا۔“  
(مشکوٰۃ شریف)

۷۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”تم مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے  
اور محبت و شفقت میں جسم انسان کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو میں تکلیف  
ہو، تو بدن کے سارے اعضاء بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔“  
(بخاری)

بعثت کے بعد مکہ میں ۱۳ سال منطومی کی زندگی بسر کر کے جب  
آپ نے مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو مکہ سے آنے

مواخاتِ مدینہ



والے مہاجرین اور انصار مدینہ کے مابین ایک بھائی چارہ قائم کیا جسے تاریخ اسلام نے مواخات کے نام سے محفوظ رکھا ہے۔ یہ بھائی چارہ ایسی مستحکم بنیاد پر استوار کیا گیا تھا کہ مصنوعی اور حقیقی بھائیوں میں امتیاز و شعور تھا۔ اکثر نے اپنی نصف اہلک اپنے بھائی کے حوالے کر دیں جس کی دو بیویاں تھیں، اس نے اپنے مہاجر بھائی کے حق میں ایک بیوی سے دست بردار ہو جانے کی پیشکش کی، بشرطیکہ وہ نکاح کے لئے رضامند ہو۔ ایک بھائی کے مرنے کے بعد دوسرا بھائی حقیقی بھائی کی طرح اس کا وارث قرار دیا جاتا تھا۔ قرآن میں جب وراثت کے احکام نازل ہوئے تو حقیقی رشتہ داروں کو وارث قرار دیا گیا۔ البتہ مسلمان باہم لطف و کرم سے پیش آتے رہے۔ تاریخ اسلام کے ادراک ایسے واقعات سے پر ہیں جب ایک بھائی نے اپنی جان پر کھیل کر دوسرے کی جان بچائی۔ یا دوسرے کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ تاریخ عالم اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے کہ کسی قوم نے مذہبی رشتے کی بنا پر ایسے عظیم المثال ایشار کا مظاہرہ کیا ہو۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے ساتھ  
**قطع تعلق کی ممانعت** | تعلقات منقطع کرنے سے منع فرمایا۔ حضور کا ارشاد

ہے۔ مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ مسلمان بھائی سے تین روز سے زیادہ تعلقات منقطع رکھے (بخاری) آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اصلی مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور

ہاتھ سے دوسرے مسلمان کو ایذا نہ پہنچے۔ (بخاری)

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

”ہاں حسد نہ کرو۔ صرف کسی چیز کی قیمت بڑھانے کے ارادے سے بولی نہ دو۔

آپس میں بغض نہ رکھو۔ ایک دوسرے سے منہ نہ موڑو۔ دوسرے کے سودے پر

سودا نہ کرو۔ اسے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔

نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اس کا ساتھ چھوڑتا ہے۔ نہ اس سے جھوٹ بولتا ہے اور

نہ اسے حقیر سمجھتا ہے۔ آپ نے تین دفعہ سینہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: تقوے یہاں ہے



ایک آدمی میں اتنی ہی برائی بہت ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے بہر مسد  
دوسرے مسلمان کا خون، مال اور عزت حرام ہے۔ (مشکوٰۃ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مسلمان کے دوسرے  
بائمی حقوق | مسلمان پر چھ حق ہیں۔

- ۱۔ جب ملے تو اسلام علیکم کہے۔
- ۲۔ اس کی دعوت قبول کرے۔
- ۳۔ جب چھینک مارنے والا الحمد للہ کہے تو سننے والا یرحمک اللہ کہے۔ پھر  
چھینک مارنے والا اس کے جواب میں یہ الفاظ کہے۔  
يَهْدِيْكُمْ اللّٰهُ وَيُصَلِّحْ بِاَلْكَلِمِ
- ۴۔ بیمار ہو تو اس کی بیمار پرسی کو جائے۔
- ۵۔ جب فوت ہو جائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ جائے۔
- ۶۔ مسلمان بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے (ترمذی)  
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ  
سے مسلمان محفوظ ہوں یعنی اس کے ہاتھ اور اس کی زبان سے کسی مسلمان کو تکلیف نہ  
پہنچے۔ اسی طرح قرآن کریم میں غیبت سے منع کیا گیا ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوا

وَلَا يَخْتَبُ لِبَعْضِكُمْ  
بَعْضًا اِيْحَبُّ اَحَدُكُمْ  
اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ  
مَيْتًا فَكْرِهْتُمْ اَوْ كَا

اور تم میں سے کوئی ایک دوسرے  
کی غیبت نہ کیا کرے۔ کیا تم میں  
سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اپنے  
مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔

تم اس کو ضرور ناپسند کر دو گے۔

(الحجرات) جب حضور سے غیبت (جہلی) کی تعریف دریافت کی گئی تو آپ نے فرمایا۔

اپنے بھائی کا ذکر اس انداز سے

ذِكْرِكَ اَخَاكَ يَمَانَا



یَسْرًا ۸ (صحیح بخاری) کرنا جو اسے ناگوار نہ ہو۔

صحابہ نے عرض کیا حضور! اگر فی الواقع اس میں وہ عیب موجود ہو تو کیا پھر بھی اسے غیبت کہیں گے؟ فرمایا "اگر اس میں وہ عیب موجود ہو تو غیبت ہے۔ ورنہ بہتان ہے جو غیبت سے بھی بڑا گناہ ہے، ان کے علاوہ بھی بہت سے حقوق ہیں، مثلاً

۱۔ مسلمان کی پردہ پوشی کی جائے۔ اس کے عیوب و نقائص کو اجاگر نہ کیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ بروز قیامت اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے۔

۲۔ مسلمان کے خیر خواہ سے۔ آپ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے وہی بات پسند نہ کرے جو اپنے لئے کرتا ہے۔ (مشکوٰۃ)

۳۔ اپنے ذاتے پر ترجیح :- ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ دوسرے مسلمان کو اپنی

ذات پر ترجیح دے اور اس کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھے۔ تاریخ اسلام میں مواخاتِ مدینہ کا واقعہ اپنی ذات پر ترجیح دینے کی درخشندہ مثال ہے۔

۴۔ کسی مسلمان کی عدم موجودگی میں اس کے عیوب نہ بیان کرے نہ دوسروں سے سنے۔

۵۔ اگر مسلمان بھائی پر ظلم ہو رہا ہو تو حسی الامکان اس کا انسداد کرے۔

۶۔ مسلمان کو چاہیے کہ جماعت سے وابستہ رہے اور ملتِ اسلامیہ کے نفع و ضرر

اور دکھ تکھ میں برابر کا شریک رہے۔

۷۔ ضرورت مند مسلمان کی حاجت روائی کرے۔

۸۔ اگر مسلمان سے کوئی خطا سرزد ہو جائے تو اسے معاف کر دے۔

۹۔ کسی مسلمان کو بلاوجہ شک و شبہ کی نگاہ سے نہ دیکھے۔

۱۰۔ مسلمان کی جان و مال اور عزت و آبرو کو نقصان نہ پہنچائے۔

یہاں باہمی حقوق و فرائض کا تمام و کمال احاطہ کرنا مقصود نہیں۔ خلاصہ کلام ہے کہ ایک مسلمان وہی کام کرے جس میں دوسرے بھائی فائدہ پہنچنے کی توقع ہو۔



اس کی ضرورت سانی ہرگز پیش نظر نہ ہو۔

### سوالات

- ۱۔ اخوت کے مفہوم کی وضاحت کیجئے اور بتائیے کہ دین اسلام کس حد تک اخوت کے قیام میں معاون ثابت ہوا۔
- ۲۔ اخوت کی تائید میں کتاب و سنت کے دلائل سے استشہاد کیجئے اور بتائیے کہ اسلام میں اس کی کیا اہمیت ہے۔
- ۳۔ مسلمانوں کے باہمی حقوق کی وضاحت کیجئے۔
- ۴۔ اسلامی اخوت کے تقاضے کیا ہیں۔ تفصیلاً لکھئے۔



## تبلیغ

تبلیغ مصدر ہے۔ اس کا مادہ بلوغ ہے۔ بلوغ کا لفظ متعدد معانی کے لیے  
مفہوم آتا ہے۔

تبلیغ کے معنی ہیں پیغام پہنچانا۔ شرعی اصطلاح میں خدا کے احکام بندوں تک بلا کم و  
کاست پہنچانے کو تبلیغ کہتے ہیں۔  
قرآن کریم میں لفظ تبلیغ کے علاوہ اندازِ دعوت اور تذکیر کے الفاظ بھی آئے ہیں۔  
یہ سب متحد المعنی ہیں۔ ان کا مفہوم بھی ایک ہے۔ نیز الفاظ بھی اسی مفہوم کو  
ادا کرتے ہیں۔

۱۔ انداز ہوشیار اور آگاہ کرنے کو کہتے ہیں۔

۲۔ دعوت کے معنی ہیں بلانا اور پکارنا۔

۳۔ تذکیر کے معنی ہیں یاد دلانا اور نصیحت کرنا۔

تبلیغ کی غرض یہ ہے کہ انسان جو نیکی کا کام خود  
تبلیغ اور ادیانِ عالم کر رہا ہو، جو اعتقاد رکھتا ہو۔ اسے دوسروں  
تک پہنچانے کی کوشش کرے۔ ادیانِ عالم میں یہ شرفِ اسلام کو حاصل ہے کہ اس  
نے تبلیغ کی اہمیت کو سمجھا۔ اپنی کتابِ ہدایت میں اس کے واضح احکام صادر کئے اور  
اپنے عمل سے اس بات کی تائید فرمائی۔

دیگر مذاہبِ عالم دو وجوہات کے پیش نظر تبلیغ کے قائل نہ تھے۔

۱۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک قبولیتِ حق کا اعزازِ پیدائش سے حاصل ہوتا

ہے۔ کوشش سے نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ شرف اسی شخص کو حاصل ہوتا ہے جو

خاندانی اعتبار سے اس کا اہل ہونے کوئی اور نئے شخص سعی و جہد سے یہ مقام

حاصل نہیں کر سکتا۔



۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حتی جو ان کے پاس ہے وہ اس قدر پاکیزہ ہے کہ ان کے مقدس خاندان کے علاوہ اسے دوسرے ناپاک لوگوں تک پہنچانا اس مقدس مذہب کی توہین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے ایک دفعہ جب ایک یونانی عورت نے ان سے برکت چاہی تو فرمایا:

”میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھینچڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھینچا گیا۔“ (متی ۱۵-۲۵)

پھر فرمایا۔

”مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی (بنی اسرائیل کا مذہب) کتوں (غیر اسرائیلی قوموں) کو پھینک دیں۔“ (متی ۱۵-۱۶)

حضرت مسیح علیہ السلام نے مزید فرمایا:

”وہ چیز جو پاک ہے۔ کتوں کو مت دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ پھینکو۔“ (متی ۶-۷)

ہندوؤں نے اسی لئے اپنے مذہب کو تمام قوموں سے چھپا کر رکھا کہ وہ اپنا مذہب اچھوتوں کو سکھا کر اس کو ناپاک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہودیوں کا بھی خیال تھا کہ غیر اسرائیلی لوگ اس نعمت کے اہل نہیں۔

**تبلیغ اور دین اسلام** | سید سلیمان ندوی تبلیغ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”نبی کا سب سے پہلا اور اہم فریضہ دعوت و تبلیغ ہے۔ یعنی جو سچائی اس کو خدا کی طرف سے ملی ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دینا اور جو علم اس کو عطا ہوا ہے اس سے اوروں کو بہرہ ور کرنا۔ خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے، وہ لوگوں کو سنا دینا۔ اُس نے اس کو جس صداقت سے آگاہ کیا ہے اس سے اپنے ہم جنسوں کو باخبر کرنا۔ جو مالی، جانی، زبانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس کو بخشی گئی ہیں ان کو اس میں صرف کرنا۔ اس



اعلانِ دعوت میں جو تکلیف بھی آئے۔ اس کو راحت جاننا جو مصیبت بھی درپیش ہو اس کو آرام سمجھنا۔ حق کی آواز کو دبانے کے لئے جو قوت بھی سراٹھاتے اس کو کچل دینا۔ اور مال و متاعِ اہل و عیال الغرض جو چیز بھی اس سفر میں تنگِ راہ ہو کر سامنے آئے اس کو ہٹا دینا۔ اس کی اس ساری کدو کاوش کا مقصد خدا کی رضا مندی، مخلوق کی خیر خواہی اور اپنے فرض رسالت کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں جس قدر پیہر آئے انہوں نے اپنے فرض کو اسی ایشیا اور قربانی کے ساتھ سرانجام دیا۔ اور ایک لمحہ بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی۔ آج دنیا میں جو کچھ خدا کی محبت، بھائیوں کا پیار، انسانوں کی ہمدردی، بکسیوں کی مدد، غریبوں کی اعانت اور دوسری نیکیوں کا اس سطح زمین پر اثر ہے۔ وہ سب بواسطہ یا بلاواسطہ، دانستہ یا نادانستہ انہی کی دعوت و تبلیغ اور جدوجہد کا اثر اور نتیجہ ہے۔

(سیرت النبی جلد چہارم)

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔ اس کا دائرہ جملہ اقوام عالم اور جمیع ازمینہ و امکانہ

## تبلیغ کی ضرورت و اہمیت

کو محیط ہے۔ اس لئے ہر دور کے مسلمانوں پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ ہمہ تن تبلیغ اسلام کے لئے تیار رہیں اور جس مذہب کو انہوں نے حق سمجھا کہ اختیار کیا ہے۔ دوسروں کو بھی اس سے روشناس کرائیں۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

تمہارے اندر ایک ایسی جماعت کا وجود ناگزیر ہے۔ جو لوگوں کو نیکی کی دعوت دیتی۔ نیکیوں کا حکم دیتی اور برائی سے باز رکھتی ہے۔

”وَلَتَكُنَّ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ  
إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ  
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ“  
(آل عمران - ۱۰۴)

اس آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا کہ امت مسلمہ میں مبلغین کی ایک جماعت کا وجود از بس ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دین اسلام ایک کامل و اکمل دین ہے۔ اور



اس کے مبلغ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء تھے۔ جن کے بعد رسالت و نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ اب آپ کے بعد دین کی اشاعت و تجدید کے لئے کوئی نیا نبی مبعوث ہو کر نہیں آئے گا، بلکہ تاقیام قیامت اصحاب علم مسلمان خطہ ارضی کے دور افتادہ کونوں تک اس کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے رہیں گے۔ دنیوی مشاغل میں منہمک ہو کر جب دینی جذبات سرد پڑ جاتے ہیں تو ان کو گرمانے اور از سر نو زندہ کرنے کے لئے بھی تبلیغ کی ضرورت ہوتی ہے، بنا بریں مسلم و غیر مسلم دونوں کو دینی احکام سے روشناس کرانے کے لئے ہر دور میں تبلیغ کی شدید ضرورت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے خطرات سے بے پرواہ ہو کر پیام الہی کو لوگوں تک پہنچائیے، اور اگر ایسا نہ کیا تو آپ نے فریضہ رسالت انجام ہی نہیں دیا۔

ارشاد ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ  
إِلَيْكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ  
فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ  
وَاللَّهُ لَخَبِيرٌ  
بِالنَّاسِ

(المائدہ - ۶۷)

دوسری جگہ فرمایا۔

وَذِكْرُ فَإِنَّ الذِّكْرَى  
تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ

(قاریات ۳)

اے رسول تیرے پروردگار کی  
طرف سے جو کچھ تیری طرف اترتا  
ہے۔ اس کو پہنچا دے، اگر تو  
نے ایسا نہ کیا تو تو نے خدا کا  
پیغام نہیں پہنچایا اور تجھ کو خدا  
لوگوں سے پچلے گا۔

اور نصیحت کرو کہ نصیحت اہل  
ایمان کو فائدہ پہنچاتی ہے۔

تم بہترین امت ہو جو لوگوں

نیز فرمایا۔  
كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ



کے لئے ظاہر کی گئی رتم اچھی باتوں  
کا حکم دیتے ہو۔ اور بڑی بات  
سے روکتے ہو۔

لِنَّاسٍ تَامِرُونَ  
بِالْبَحْرِ وَتَنْهَوْنَ  
عَنِ الْمُنْكَرِ رَأَىٰ عَمْرَانُ (۱۱۰)

اس آیت میں امت مسلمہ کو "خَيْرَ أُمَّةٍ" (دوبہترین امت) قرار دیا۔ اور اس  
کی وجہ بھی بتادی کہ تم اچھی باتوں کا حکم دیتے اور منکرات و فواحش سے روکتے ہو۔  
اس سے یہ واضح ہوا کہ تبلیغ و دعوتِ عظمت و شرف کی موجب ہے امت محمدیہ کو یہ فضیلت  
محض تبلیغ کی وجہ سے حاصل ہوئی۔

ار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت  
علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا اے علی!

اجادیت نبویہ میں تبلیغ کی تاکید

تمہاری کوشش سے ایک آدمی کا دین حق کو قبول کر لینا بڑی سے بڑی دولت  
سے بھی بڑھ کر ہے۔  
(صحیح مسلم)

۲۔ آپ نے فرمایا۔

تم میں سے جو شخص بھی کوئی برائی  
دیکھے۔ تو اسے اپنے ہاتھ سے  
رد کے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو  
پھر زبان سے منع کرے۔ اور  
یہ ممکن نہ ہو۔ تو اسے دل میں برا  
سمجھے (آخری صورت) کمزور  
ترین ایمان ہے۔

مَنْ رَأَىٰ مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُفِزْهُ  
بِيَدِهِ فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ  
وَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذَلِكَ  
أَضْعَفُ الْإِيمَانِ

(مشکوٰۃ شریف)

۳۔ آنحضرت نے فرمایا۔ نبی اسرائیل میں جب بھی خرابی پیدا ہوئی، تو لوہے کی  
کہ جب کوئی اپنے بھائی کو گناہ کرتا دیکھتا تو اسے منع کرتا تھا۔ پھر دوسرا دن  
آتا۔ تو نہ روکتا۔ کیونکہ اس کا ہم خیال ہو جاتا تھا۔ اس کے بارے میں لُحَيْنُ  
الَّذِي كَفَرُ امِينُ بَنِي إِسْرَائِيلَ سے فَاسْتَوْنَ يَمْكُ قُرْآنِ نَازِلٍ هُوَ. آنحضرت صلی اللہ



علیہ وسلم مسند سے تکیہ لگائے ہوتے تھے۔ یہ آیت پڑھ کر بیٹھ گئے اور صحابہ سے فرمایا۔ "تم برائی کو روکنے سے ہرگز نہ رکننا۔ جتنا کہ ظالم کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے حق کی طرف جھکا دو" (ترمذی)

۴۔ ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ خدا کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ اچھے کاموں سے حکم دیتے رہیں۔ اور لوگوں کو برائی سے باز رکھیں ورنہ کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ تم پر عذاب بھیج دے۔ پھر تم اسے پکارو گے۔ اور تمہیں کوئی جواب نہیں ملے گا۔ (ترمذی)

۵۔ آپ نے فرمایا۔

بَلِّغُوا عَنِّي وَاَوْ آيَةً  
مجھ سے سن کر آگے پہنچاؤ  
اگرچہ یہ ایک ہی آیت ہو۔ (بخاری)

۶۔ آپ نے فرمایا۔

"خدا اس شخص کو مسرور و شادمان رکھے جو میری بات کو سن کر حفظ کرے اور اسے آگے پہنچائے۔ اس لئے کہ بہت سے اہل علم و علمی باتوں کو ان لوگوں سے بھی زیادہ یاد رکھتے ہیں جنہوں نے اسے براہ راست (شارح علیہ السلام) سے سنا۔ (بخاری)

**تبلیغ کے اصول** | قرآن کریم نے نہایت اختصار کے ساتھ اپنے پیروؤں کو بتایا کہ پیغام الہی کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے۔ اور کس طرح ان کو قبول حق کی دعوت دی جائے۔ تاریخ اسلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ہمیشہ تبلیغ سے پھیلا ہے۔ اس سلسلہ میں علماء اور صوفیائے کرام نے نہایت بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ آتش پرست تانائرنے تقریباً اڑھائی اسلامی دنیا کو تہہ و بالا کر دیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اس دین کے نام لپو ہو گئے۔ ارشاد فرمایا۔



اپنے پروردگار کی راہ کی طرف  
لوگوں کو دانائی اور عمدہ نصیحت  
کے ذریعہ سے بلایتے۔ اور  
نہایت عمدہ طریقے سے مناظرہ  
کیجئے۔

أَدْخِ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ  
بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ  
الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ  
بِالَّتِي لَهَا أَحْسَنُ  
(نحل - ۱۲۵)

مذکورہ صدر آیت کریمہ میں دعوت و ارشاد کے تین اصول بیان کئے گئے ہیں۔

- ۱- عقل و حکمت
- ۲- موعظہ حسنہ
- ۳- جدال احسن

ان طریقہ باتے سے گمانہ کی توضیح یہ ہے کہ جب ہم کسی کے سامنے کوئی نئی بات  
پیش کرنے کے اس کے قبول کی دعوت دیتے ہیں، تو عموماً تین طریقے استعمال کئے  
جاتے ہیں۔

- ۱- اس بات کے ثبوت اور تائید میں دل نشین دلائل پیش کرتے ہیں۔
- ۲- اس کو مخلصانہ نصیحت کرتے ہیں اور موثر انداز سے اس کو نیک و بد اور  
نشیب و فراز سے آگاہ کرتے ہیں۔
- ۳- اس کے دلائل کی بہ طریق احسن تردید کر کے اس کی غلطی کو اس پر واضح  
کرتے ہیں۔

پہلے طریقہ کا نام حکمت، دوسرے کا نام موعظہ حسنہ اور تیسرے کا نام جدال  
بطلق احسن ہے۔ دعوت و ارشاد کے لئے اسلام نے یہی تین طریقے بتائے ہیں، تبلیغ و  
ارشاد کے بڑے بڑے اصول حسب ذیل ہیں

ارزق و نرمی

ایک داعی اور مبلغ کے لئے نرم گفتگو، شیریں بیانی اور لطف و نحل کی سخت



ضرورت ہے قرآن کریم نے اپنے پیغمبروں کو ہدایت کی ہے کہ شدید ترین دشمن سے بھی نرم لہجہ میں بات کریں۔ حضرت موسیٰ و ہارون کو فرعون جیسے سرکش کے سامنے پیغام ربانی لے کر جانے کی ہدایت کی تو فرمایا:

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ۔ اس نے سرکشی کی ہے اس سے نرم گفتگو کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرے یا خدا سے ڈرے۔ سورۃ طہ - ۲

دعوت و تبلیغ میں نرم گفتاری کی تعلیم کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی اس لئے کہ کوئی داعی اور مبلغ پیغمبروں سے بہتر نہیں ہو سکتا اور فرعون سے بڑھ کر کوئی مجرم نہیں ہو سکتا ہے۔

## ۲۔ اعراض اور قول بلیغ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ  
فَاعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ  
وَقُلْ لَهُمْ فِي الْقِسْمِ  
قَوْلًا بَلِيغًا

تو ان سے درگزر کر اور ان کو نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کر جو ان کے دلوں میں اثر کرے۔

والنساء - ۶۳

اس آیت میں تین باتوں کا حکم دیا۔

۱۔ اقل یہ کہ دعوت و ارشاد میں مخالفت کی بد تہذیبی اور درشت کلامی کو برداشت کرنا چاہیے۔

۲۔ تیسرے یہ کہ گفتگو کا طرز انداز بڑا دل نشین ہونا چاہیے۔

## ۳۔ سہولت و بشارت

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل اور ابو موسیٰ اشعری کو مین میں دعوت اسلام کے لئے متعین فرمایا تو رخصت کرتے وقت یہ



نصیحت سرمانی

يَسْرًا وَلَا تَعْبِرُوا وَلَا تُنْفِرُوا

دین اسلام کو آسان کر کے پیش  
کرنا سخت بنا کر نہیں، لوگوں کو  
خوشخبری سنانا۔ نصرت نہ دلانا

(بخاری)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے سامنے اور صحابہ نے تمام مسلمانوں  
کے سامنے اسی طریقہ کے مطابق دین الہی کو پیش کیا اور کامیابی حاصل کی۔

۴۔ تدریج

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کا ایک اور اصول یہ سکھایا کہ کسی نئی قوم  
کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکام کا بوجھ ایک دفعہ اس کی گردن پر  
نہ ڈالا جائے، بلکہ رفتہ رفتہ وہ اس کے سامنے پیش کئے جائیں، پہلے توحید اور رسالت  
کو پیش کرنا چاہیے۔ اس کے بعد عبادت کو عبادت میں بھی اہم پھر اہم کے اصول کو  
پیش نظر رکھنا چاہیے۔

۵۔ تالیف قلب

تالیف قلب کے معنی ہیں مائل کرنا۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ جس کو اسلام کی  
طرف مائل کرنا ہو، اس سے لطف و محبت اور امداد و اعانت اور غم خواری اور ہمدردی  
کا سلوک روا رکھا جائے، کیونکہ انسان طبعاً شریفانہ جذبات کا ممتون  
ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے لوگوں کو اسی طریقہ سے حلقہ بگوش  
اسلام بنایا تھا۔ چنانچہ مکہ کے بعض رئیس اس جذبہ سے متاثر ہو کر اسلام لاتے تھے۔  
آنحضرت نے جنگ حنین کی غنیمت کا سارا سامان ان ہی میں تقسیم کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ  
پھر حق کے خلاف ان کی گردنیں کبھی نہ اٹھ سکیں۔



۶۔ دین میں جبر نہیں

اسلام پہلا مذہب ہے جس نے چودہ سو سال پیشتر یہ نعرہ لگایا تھا کہ  
لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ  
دین میں زبردستی نہیں

سورۃ بقرہ۔ ۲۲

ظاہر ہے کہ جو مذہب اپنی اشاعت کے لئے صرف دعوت و تبلیغ کی تلقین کرتا ہو۔  
جس نے اس کے اصول بتائے ہوں جس نے ہر معاملہ میں لوگوں سے عقل و دانش  
اور فہم و تدبیر سے مطالبہ کیا ہو۔ ہر قدم پر عقلی استدلال اور مصلحت و حکمت کا اظہار کیا ہو  
وہ کیونکر جبر و اکراہ کے طریقہ کو اختیار کر سکتا تھا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا  
وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ  
الْبَلَاغُ

پس اگر وہ اسلام لائیں۔ تو  
انہوں نے ہدایت پالی اور اگر وہ  
منہ موڑ لیں تو آپ کے ذمہ  
صرف پہنچانا ہے۔

(سورۃ کہف)

۷۔ عمل سے تبلیغ

تبلیغ کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ قول کے بجائے عمل اور اخلاق سے تبلیغ  
کی جائے۔ تبلیغ خواہ کس قدر خوش بیان ہو۔ جب تک اس میں اخلاقی کشش نہ ہو۔  
اس کا کلام موثر نہیں ہو سکتا۔ اسلام کی نشر و اشاعت بڑی حد تک آنحضرت کی اخلاقی  
کشش کی رہن منت تھی۔

قرآن مجید نے یہ نکتہ خوب بیان کیا ہے۔ فرمایا

كُونُوا حَسَنَةً قَلْبًا غَلِيظًا الْقَلْبِ  
لَا تَنْفَضُّوا مِنْهُ لَكُمْ

محمدؐ اگر تم درشت طبع اور  
سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے



آل عمران - ۶) پاس سے چل دیتے۔

آپ کی یہی معجزہ کشش تھی جو کشاں کشاں لوگوں کو دائرہ اسلام میں لے آئی  
حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے بہت سی بکریاں مانگیں، آپ نے دیا  
اس پر آپ کی فیاضی کا اس قدر اثر پڑا کہ اس نے اپنے قبیلہ میں آکر کہا، لوگو!  
مسلمان ہو جاؤ کیونکہ محمدؐ اس قدر دیتے ہیں کہ ان کو تنگ دست ہونے کا مطلق خوف  
نہیں ہوتا۔ (بخاری و مسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودی عالم کے مقررہ وقت پر تھے، اس نے تقاضا کیا  
تو آپ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں، اس نے کہا میں تو لے کر ٹلوں گا،  
آپ نے فرمایا اب میں تمہارے ساتھ بیٹھتا ہوں۔

چنانچہ آپ ظہر سے لے کر فجر کی نماز تک اس کے ساتھ بیٹھے رہے، صحابہ نے  
اس کی گستاخی پر ناراضی ظاہر کی، اور عرض کی یا رسول اللہ! آپ کو ایک یہودی نے روک  
رکھا ہے، آپ نے فرمایا "ہاں مجھے خدا نے اس سے منع کیا اور کہا کہ میں کسی ذمی یا  
اور کسی شخص پر ظلم کروں۔"

دن چڑھا تو یہودی نے کلمہ پڑھا اور کہا کہ میرا صفت مال خدا کی راہ میں  
صدقہ ہے، میں نے یہ گستاخی صرف اس لئے کی کہ تورات میں نبی آخر الزماں کے جواد صفت  
مذکور ہیں ان کا تجربہ کروں۔ (مشکوٰۃ کتاب فتن)

فتح مکہ میں جب صفوان بن امیہ مجبوراً اسلام لایا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے  
اس کو تین سو اونٹ دے دیئے۔

صفوان کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو اس قدر دیا کہ آپ  
پہلے میرے نزدیک منغوس ترین خلق تھے، لیکن اس فیاضی سے محبوب ترین شخص  
بن گئے۔ (صحیح مسلم)

ابوسفیان کی بیوی ہندہ خاندان نبوت کی قدیم ترین دشمن تھی، جنگ احد میں  
سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ اسی نے چبایا تھا، اور آپ کے ناکہ



کال کاٹ کر کھانے کا مار بنایا تھا۔ فتح مکہ میں حبیبیوں کو آپ کی خدمت میں اسلام لانے کے لئے جانے ہوئی۔ مگر گستاخی سے باز نہ آئی۔ دربار رسالت میں بیٹھ کر آپ کے سینے خلو سے اس قدر متاثر ہوئی کہ کم سے کم خستہ بار بول اٹھی۔ برسوں اللہ علیہ السلام نے آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانہ مجھے ناپسند نہ تھا لیکن آج آپ نے گھرانے سے کوئی گھرانہ محبوب تر نہیں۔

آپ نے یہ سن کر فرمایا کہ خدا کی قسم ہمارا بھی یہی حال ہے۔ (صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۰۱) آپ کی اخلاقی و عملی تبلیغ کا جو نتیجہ برآمد ہوا۔ وہ پروفیسر مارگو لیتھ کے الفاظ میں سنئے۔

”محمد کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا۔ آپ ایک سلطنت کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ آپ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا۔ آپ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا۔ اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا۔ جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔“

(دلائل آف محمد مارگو لیتھ صفحہ ۱۶۱)

### سوالات

- ۱۔ تبلیغ کا معنی اور اصولی مفہوم بیان کیجئے۔
- ۲۔ آداب و سنت کے دلائل سے تبلیغ کے مفہوم کی اہمیت واضح کیجئے۔
- ۳۔ تبلیغ اسلام کے بارے میں اسوۂ نبوی کیا تھا۔ تاریخ اسلام سے مثالیں پیش کیجئے۔
- ۴۔ دین اسلام میں تبلیغ کے اصول کیا ہیں۔ مفصلاً لکھئے۔
- ۵۔ تبلیغ کی اہمیت و ضرورت کے بارے میں کم از کم دو احادیث لکھئے۔



# جہاد

**معنی و مفہوم** | جہاد اور مجاہدہ فعال اور مفاعلہ کے وزن پر مصدر میں۔ ان کا مادہ جہد ہے۔ یہ لفظ عربی میں متعدد معانی کے لئے مستعمل ہے (جہد بفتح الجیم و القلم) طاقت، مشقت اور محنت کو کہتے ہیں۔

جہاد۔ ایکسیر الجیم، کوشش، دشمن سے لڑنا۔ مجاہدہ کے بھی یہی معنی ہیں۔  
اجتہاد کے معنی ہیں کوشش کرنا، طاقت استعمال کرنا۔  
(ان موسس المحيط جلد ۱)

**اسطلاحی مفہوم** | شرعی اعتبار سے جہاد وہ اس سعی و جہد کا نام ہے جو

جسم و جان سے دین کی سر بلندی اور نشر و اشاعت کے سلسلہ میں انجام دیا جائے۔  
خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن نعمتوں سے سزا دیا ہے ان سے نوازا ہے  
خواہ ان کا تعلق انسان کے جسم و جان سے ہو یا مال و مسکن سے۔ انسانیت و دین کی  
خاتم صرف کرنے کا نام جہاد ہے۔ یہاں تک کہ اس کے لئے بن عزیز، اناب، بی، اول و  
عیال کی، خاندان و قوم کی جان تک قربان کر دینا اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کو  
کو توڑنا۔ ان کی تدبیروں کو انہیگاں کرنا ان کے عملوں کو روکنا اور اس کے لئے جنگ  
کے میدان میں کودنا پڑے تو کوڑیٹا جہاد ہے جو اسلحہ، ہتھیار، دست بڑاکن اور  
عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔

**جہاد اولیٰ اہمیت** | جہاد اولیٰ اہمیت اور نہ وہ جس اور نہ وہ کا دشمن کے بغیر کون  
کام انجام نہیں پاتا۔ اگر کسان کی کوششیں شامل حال نہ ہو۔  
نوکھیلیاں خشک ہو جائیں، ہرے بھیرے کھینوں کا نام و نشان نظر نہ آئے۔ تجارتی  
زندگی میں جو چہل پہل نظر آتی ہے، یہ تاحسبوں کے سرمایہ و دولت کی کوششیں ہی ہیں۔



علم و ادب کے میدان میں بند پایہ ادبا اور مصنفین اگر تحقیق و تدقیق کے گھوڑے نہ دوڑاتے تو آج علمی کتب کا نام و نشان بھی نظر نہ آتا۔ دینِ حق کی نشر و اشاعت اگرچہ خداوند کریم نے اپنے ذمہ لی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا

وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَنُورِهِ  
انكافرون اللہ - ۸

تاہم اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ قلم و زبان اور سیف و سناں سے اس کے نشو و رتقا کے لئے کوشاں رہے بنا بریں جہاد فکری، فولی، عملی اور مالی ہر لحاظ سے ہو سکتا ہے۔ علوم و فنون میں غور و فکر، دعوتِ حق کی راہ میں مجاہدانہ سرفروشی، میدانِ عمل میں جسم و جان کی سخت کوشی اور مال و متاع کی قربانی سب جہاد میں شامل ہے۔

قرآن میں فرمایا

مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں۔ اس میں دگرگاہیں نہیں اور خدا کے راستہ میں اپنی جان اور اپنے مال سے کوشش کریں یہی سچے لوگ

ہیں۔ - سورۃ حجرات - ۱۲

وَمَنْ جَاهِدْ فَإِنَّمَا  
يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ  
لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ  
سورہ عنکبوت

وہ جو کوئی جہاد کرتا ہے،  
بے شک اللہ جہان کرتا ہے  
بے شک اللہ جہان والوں کے  
بے نیاز ہے۔

یورپ کے نام مہاد علماء عام طور سے اس غلط فہمی  
کا شکار ہیں۔ کہ جہاد کا لفظ جنگ کا مترادف  
نہیں۔ ان کے نزدیک اسلام کے بنائے جہاد سے زیادہ بہت ناک اور مہیب  
کوئی لفظ نہیں، وہ جس انداز میں اسلامی جہاد کی تصویر کشی کرتے ہیں  
فی الواقع ایسی خطرناک ہے۔ یہ لفظ جہاد کے معنی و مفہوم سے ان کی ناواقفیت ہے۔



بڑی شہوت ہے، جنگ کے لئے عربی زبان میں متعدد الفاظ مستعمل ہیں مگر عربوں نے لفظ جہاد کو عام جنگ کے معنی میں کبھی استعمال نہیں کیا۔ جنگ کے محرکات عام طور پر جذبات بغض و عناد، قدیم عداوت یا ہوس زر و مال ہوتی ہے۔ شرافت و انتقام ایسے نیک احساسات کا جنگ سے کوئی واسطہ نہیں۔ بخلات ازیں جہاد کے عوامل و محرکات کبھی بڑے نہیں ہوتے۔ جو کام بھی رضائے الہی کے پیش نظر انجام دیا جائے اور دوسرا کوئی جزیرہ اس کا محرک نہ ہو۔ وہ جہاد ہے۔ تاجر کی تجارت، کسان کی زراعت، طالب علم کی شبانہ روز محنت و کاوش اگر خدا کی خوشنودی کے حصول کے لئے عمل میں آئے تو عین جہاد ہے۔ قرآن پاک میں جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ کے الفاظ الگ الگ استعمال کئے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں الفاظ الگ معانی کے لئے استعمال ہونے میں۔

مقام حیرت و استعجاب ہے کہ اہل یورپ نے جہاد کے وسیع مفہوم کو صحت دین کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کے محدود معنی میں محصور کر دیا۔ جہاد کی حقیقت یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس شریعت کو لے کر دنیا میں آئے وہ محض نظریہ اور فلسفہ نہیں بلکہ سراپا عمل ہے۔ آپ کے مذہب میں نکاحات کا استحقاق گوشہ گیری رہبانیت اور گیان دھیان پر موقوف نہیں بلکہ خدا کی توحید، رسولوں اور کتابوں اور فرشتوں کی سچائی، قیامت اور جزا و سزا کے اعتقاد کے بعد ان کے مطابق نیک عمل، نیک کرداری کی جدوجہد پر مبنی ہے۔ اس سعی و کاوش کو جہاد کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں جہاد کے مقابلہ میں قحود و بیہ رینا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے تغافل و تکاسل مفصود ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

مسلمانوں میں سے وہ جن کو کوئی

جہاد فی سبیل اللہ سے محروم ہو اور بھڑک

مٹیٹے رہیں، اور وہ جو خدا کی راہ

کالیستوی القاعدون

والنموت منین غار

أولی البصیر والجماد



فِي سَبِيلِ اللَّهِ مَا تَوَالَّفْتُمْ  
وَأَنْفُسِهِمْ  
میں اپنی جان و مال سے جہاد کرے  
ہوں۔ برابر نہیں۔

(سورہ نساء - ۱۳)

بیٹھنے اور "جہاد" کرنے کے باہمی تقابل سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جہاد کی حقیقت بیٹھے بسستی کرنے اور راحت پسندی کے سراسر خلاف ہے۔ یہ جذبہ و عمل جس کو جہاد کہتے ہیں، ہر قسم کے کی سعادت و ترقی کے حصول کا ذریعہ ہے، اسی جذبہ جہاد اور اسی کے حصول ثواب کی آرزو تھی جس کے سبب سے مکہ میں مسلمانوں نے ۱۳ برس تک ہر قسم کی تکلیفوں کا بہادرانہ مقابلہ کیا، ریگستان کی جلتی دھوپ، پتھر کی بھاری سل طوق و زنجیر کی گراں باری، بھوک کی تکلیف، پیاس کی شدت، نیزہ کی نوک، تلوار کی دھڑ پال بچوں سے علیحدگی، مال و دولت سے دست برداری اور گھر سے دوری کوئی چیز بھی ان کے استقلال کے قدم کو ڈگر گانہ نہ سکی، اور پھر دس برس تک یہینہ منورہ میں انہوں نے تواریخوں میں جس طرح گزارے وہ دنیا کو معلوم ہے۔

جب جہاد کے معنی محنت سعی، بلیغ اور جدوجہد کے ہیں، تو ہر نیک  
اقسام جہاد | کام اس میں داخل ہو سکتا ہے۔

۱۔ جہاد بالنفس :- صوفیہ کی اصطلاح میں جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم اپنے نفس سے جہاد کرنا ہے۔ اسے جہاد اکبر کہتے ہیں، خطیب بغدادی تاریخ بغداد میں حضرت جابر سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم نے ان صحابہ سے فرمایا، جو ابھی ابھی لڑائی کے میدان سے واپس آ رہے تھے۔

"تمہارا آنا مبارک، تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو سب  
جہاد اپنی نفسانی خواہشات کو روکنا ہے۔"

اسی طرح حضرت ابو ذر روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بہترین جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرے۔

(کنز العمال)



یہ سونف کی اصطلاح ہے۔ بہادری کا عام مفہوم یہ ہے کہ اپنی جان کو خطر  
 میں کرنا اور نجات دینے کا فریضہ ادا کیا جائے۔ ایسے لوگوں کو دینی اعتبار سے مجاہد  
 و بہادر کہنا کہا جاتا ہے۔ اگر غازی و مجاہد راہ خدا میں اپنی جان عزیز قربان  
 کر دے۔ تو اسے شہید کے لقب سے پکارا جاتا ہے عشق و محبت کی راہ  
 کے شہید زندہ جاوید ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق  
 ثبت است بر جس بریدہ عالم دوام ما

شہدار کے بارے میں فرمایا ہے۔

خدا کی راہ میں جان دینے والوں کو مردہ نہ کہو۔ درحقیقت وہ زندہ ہیں۔ لیکن  
 تم اس بات کو سمجھتے نہیں (البقرہ)  
 مردہ ہی نہیں کہ زبان سے ان کو مردہ نہ کہو۔ بلکہ دل میں بھی یہ خیال نہ کرو کہ وہ  
 مردہ ہیں۔ وہ ابھی زندگی حاصل کر چکے ہیں  
 شاد ہوتا ہے۔

وَلَا تَحْسَبِ الَّذِينَ قُتِلُوا  
 فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْواتًا  
 بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ  
 يُرِيتُونَ  
 (آل عمران - ۱۶۹)

جو لوگ خدا کی راہ میں شہید  
 ہوئے ان کو اپنے دل میں بھی  
 مردہ خیال نہ کرو۔ وہ دراصل  
 زندہ ہیں۔ اپنے رب کے ہاں  
 انہیں رزق ملتا ہے

۲۔ جہاد بالعلم  
 نیا کا تمام شر و فساد و جہالت کا نتیجہ ہے۔ اس کا دور کرنا بہ  
 حق طالب کے لئے ضروری ہے۔ ایک انسان کے پاس اگر عقل و  
 معرفت اور علم و دانش کی روشنی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے تا ایک  
 دلوں کو فائدہ پہنچائے۔ تلوار کے زور سے کسی کے دل میں وہ طمانیت پیدا نہیں ہو  
 گی۔ دلیل و برہان کی قوت سے لوگوں کے سینوں میں پیدا ہوتی ہے۔ یہی ہے



ارشاد کا یہ نظریۃ جہاد کی ایک قسم ہے۔ اسی کا نام جہاد بانہ ان ہے۔ اسی کو جہاد بانہ سے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

امام ابو بکر حبیبی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں اس پر بڑی عمدہ بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ جہاد بالعلم کا وزجہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں سے بڑھ کر ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ حق کی حمایت اور دین کی تائید و نصرت کے لئے علم و عقل، فہم و بصیرت حاصل کرے۔ اور ان کو اس راہ میں صرف کرے۔ یہ علم کا جہاد ہے جو اہل علم پر فرض ہے۔

قرآن کے ایک عالم کو قرآن کی صداقت کے لئے قرآن سے باہر کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ روحانی امراض کے ازالہ کے لئے آنکھوں کو یہی نسخہ اکسیر دیا گیا تھا۔ اور اسی سے کفار و منافقین کے شکوک و شبہات کو دور کیا گیا۔

جہاد بالعلم کے پیش نظر ہر مسلمان کا فرض ہے۔ کہ حق کی حمایت اور اس کی نصرت و تائید کے لئے عقل، فہم علم اور بصیرت حاصل کرے اور ان کو اس راہ میں صرف کرے۔ اور وہ تمام علوم جو اس راہ میں کام آسکتے ہوں۔ ان کو اسی لئے حاصل کرے کہ ان سے حق کی اشاعت اور دین کی مدافعت کا فریضہ انجام پائے گا یہ علم کا جہاد ہے جو اہل علم پر فرض ہے۔

۳۔ جہاد بالمال دین حق کی نشر و اشاعت کے لئے مال صرف کرنے کو جہاد بالمال کہتے ہیں۔ جسمانی جہاد یعنی لڑائی کی ضرورت ہر وقت پیش نہیں آتی۔ لیکن جہاد مالی کی ضرورت ہر وقت ہوتی ہے۔ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ مال کی محبت جان کی محبت پر اکثر غالب آجاتی ہے۔

گر جان طلبی مضائقہ نیست

گر ز طلبی سخن دریں است

قرآن کریم میں جہاں جہاں جہاد بالنفس کا ذکر آیا ہے۔ وہاں جہاد بالمال کا ذکر پہلے آیا گیا ہے اور جہاد بالنفس کا بعد میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جسمانی اعتبار سے



سب لوگ جہاد میں حصہ لینے کے اہل نہیں ہوتے، بعض چھوٹی عمر کے ہوتے ہیں بعض بڑے اور بعض جسمانی کمزوری کی ذریعہ جہاد میں شرکت نہیں کر سکتے۔ اس لئے مال کا کوئی خاص معیار مقرر نہیں۔ کم و بیش حسب استطاعت جو سرمایہ ہو اشاعت دین کے لئے بہت زیادہ ہے۔

دوسرا بہت سے تحریکوں کی طرح اسلام کو بھی اپنی ہر قسم کی تحریکات اور مدار بہت زیادہ ہے۔ سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اس سرمایہ کا فراہم کرنا جہاد بالمال ہے۔ صحابہ کرام نے عسرت و افلاس کے باوجود نہایت اڑھے وقت میں جس طرح مالی جہاد کیا ہے، وہ تاریخ اسلام کا روشن باب ہے۔ ان ہی کی حالتانہ دنیا غنیوں سے دین کے کا باغ چھین آئے تھے تبت کے مانتوں سرسبز و شاداب ہوا، اور اسی لئے اسلام میں ان بزرگوں کا بہت بڑا مرتبہ ہے۔

قرآن میں فرمایا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَ هَاجَرُوا وَ  
جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ  
فِي سَبِيلِ اللَّهِ

یہ تک جو مال ایمان لائے  
اور ہجرت کی اور اپنے مال و جان  
سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔

رسورہ انفال ۱۰

جہاد کی ان اقسام کے علاوہ ہر ایک اور ہر قسم کی ادائیگی میں اپنی مال و مال اور اپنی وفاقی قوت صرف کرنے کا نام ہے۔ تمام میں جہاد ہے سید سلیمان ندوی اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”لڑنے مرنے کا بیوقوفہ ہر مسلمان کو کم و بیش ہی پیش آتا ہے۔ مگر جی  
کی راہ میں دینی جہاد جہاد ہے جو ہر مسلمان کو ہر وقت پیش آ  
سکتا ہے۔ اللہ علیہ وسلم کے ہر امتی پر یہ فریضہ ہے کہ  
دین کی خاطر علم دین کی اشاعت، حق کی نصرت، سزائیوں کی در  
پرزسوں کی اصلاح، کاروں کی ہدایت، امر بالمعروف نہی منکر



تقامتِ عدل و عدلِ عالم اور یہ اللہ کی قسمیں ہیں ہمہ تن اور ہمہ وقت  
 لگا ہے یہاں تاکہ اس کی زندگی کی سرحدیں و سکون ایک جہاد بن  
 جائے۔ اور اس کی پوری زندگی جہاد کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آئے۔  
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین اور انہیں کی مکی زندگی  
 مظلومی اور ستم رسیدگی کی غویل داستان تھی۔ خندہ پیشانی  
 سے کفار مکہ کے مظالم برداشت کرتے رہے اور آفت تک نہ کی، مدینہ طیبہ کی ہجرت  
 نے حالات کا دھارا یکسر بدل دیا۔ عسکری اور سیاسی کمزوری قوت اور شوکت  
 میں بدل گئی۔ حالات کی تبدیلی کس شریعی احکام میں تغیر کا موجب ہوئی۔ اور  
 بارگاہِ ایزدی سے حکم ملا کہ اب مظلوموں کو انتقام لینے کی اجازت ہے۔  
 ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اَذِنَ لِلَّذِينَ لَقِيتُوا  
 بِاَنظِلُّمُ ظَلَمْتُمْ اِذِ ان اللّٰه  
 عَلٰی نَصْرِكُمْ اَقْدِرُ  
 جن لوگوں سے لڑا جاتا تھا۔  
 ان کو انتقام لینے کی اجازت  
 دی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ مظلوم  
 ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان کی

ادا دینے قادر ہے۔ (الفتح - ۲۱)

مفسرین سمجھتے ہیں کہ یہ اولین آیت ہے جس میں مسلمانوں کو جہاد کی اجازت  
 دی گئی ہے۔ اذن جہاد کے ساتھ ساتھ اس کی وجہ بھی بیان فرمادی کہ وہ مظلوم ہیں۔  
 مظلومی کو اللہ تعالیٰ کی عتق قرار دینے سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ اسلامی  
 نواہیاں جارحانہ مقاصد کے پیش نظر نہیں لڑی گئیں۔ بلکہ ان کا مقصد بڑی حد تک  
 دفاع اعداء تھا۔ مولانا شبلی نے سیرت النبی صلبہ اول میں یہ دلائل ثابت کیا ہے۔  
 کہ آنحضرت نے کوئی لڑائی جارحانہ مقاصد کے تحت نہیں لڑی۔ بلکہ سب غزوات میں  
 آپ نے صرف مدافعت پر اکتفا فرمایا۔



اللہ تعالیٰ نے مسن عام کے قیام کے لئے جہاد

کی ضرورت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک

دوسرے کے ذریعے بازنہ رکھتا

تو زمین میں فساد پیدا ہو جاتا

لیکن اللہ تعالیٰ سب جہانوں

پر رحم کرنے والا ہے۔

لَوْ لَا دَفَعَ اللَّهُ النَّاسَ

أَبْضَاقَهُمْ بَبَعْضِهِمْ لَفَسَدَتِ

الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّا اللَّهُ

ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ

(سورہ بقرہ - ۱۵۰)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاد و رحمت خداوندی ہے اور اس سے ظالم کا دفاع کیا جاتا ہے۔ دین اسلام بلا وجہ جہاد کی اجازت نہیں دیتا بلکہ خاص مواقع پر اس کی اجازت ہے۔

۱۔ اعدائے دین دینی احکام پر پیش قدمی نہ کر سکتے ہوں۔

۲۔ جب دشمن اسلامی حکومت پر حملہ آور ہو۔

۳۔ جب دشمن معاہدہ توڑ کر اسلامی حکومت پر پورکشی کرنا چاہتا ہو۔

۴۔ جب دشمن مسلمانوں کو گھروں سے نکال دے اور فتنہ بازی کا

خواہاں ہو۔

۵۔ جب اسلامی عبادت گاہوں کو مسمار کیا جا رہا ہو۔

مذکورہ بالا صورتوں میں سے کوئی صورت پیش آجائے تو اس کا سدباب کرنے

کے لئے جہاد کی اجازت ہے۔

ظہور اسلام سے قبل جنگ کا لفظ

ہیبت ناک تھا۔ اس کے تصور سے

جنگ میں اصلاحات

جنگ میں اصلاحات

ہی روز کی گھڑے ہو جاتے تھے۔ اسلام نے اگر اسے رحمت قرار دیا۔ اور اس کے

تصور نو میسر ہوا دیا۔

پانے فرمایا۔



۱. بچوں۔ بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہ کیا جائے۔
۲. دشمن کے مکانات نہ جلائے جائیں۔
۳. بھلا اور درخت نہ کاٹے جائیں۔
۴. فصلوں کو بلاوجہ نقصان نہ پہنچایا جائے۔
۵. از مسلمانوں میں سے کوئی شخص کسی کافر کو امان دے تو اس سے کچھ تعرض نہ کیا جائے۔

جب کوئی فوج بھیجنا چاہتے تو ان کے سپہ سالار کو ہدایت فرماتے۔ میدان جنگ میں آغاز جہاد سے قبل دشمن کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت دو۔ اگر وہ مستبول کر لے تو حملہ کرنے سے رک جاؤ۔

- ۱۔ دشمن کو اسلام کی دعوت دو۔ اگر وہ مان لے تو جنگ سے رک جاؤ۔
- ۲۔ دشمن سے کہتے کہ وہ اسلامی ملک ہیں آجائے۔ اسے شہری حقوق حاصل ہوں گے۔ اگر وہ نہ آئے تو اس کی حالت بدو مسلمان کی سی ہوگی۔ اس پر مسلمانوں کا قانون جاری ہوگا۔ اور ان کو مال غنیمت سے حصہ نہیں ملے گا۔
- ۳۔ اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو وہ جزیہ دے کر اسلامی حکومت میں رہے اور اگر وہ تسلیم کر لے تو اس سے منٹ لڑیے۔ اور اگر وہ یہ تسلیم نہ کرے تو پھر توفیق ایزدی اس سے جنگ کیجئے۔ صحیح مسلم

اصول و قواعد سے مقصود یہ تھا۔ کہ خونریزی سے احتراز کیا جائے۔ کہ کسی کو مجبور کر کے بزورِ شمشیر مسلمان بنایا جائے۔ عہد صحابہ میں جب ایرانیوں سے لڑائی ہوئی۔ تو تین دن تک مسلمانوں نے تلوار نہ اٹھائی۔ حضرت سلمان فارسی تین روز تک ان کو سمجھاتے رہے کہ میں تمہاری طرح ایرانی ہوں۔ لیکن دیکھتے ہو۔ جو کہ عرب میرے تابع فرمان ہیں۔ اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو تم کو بھی وہی حقوق ملیں گے جو ہمارے ہیں۔ اگر تم اپنے ہی مذہب پر رہنا چاہتے ہو تو جزیہ دے کر



اسلامی جہاد کی تازہ ترین مثال پاکستان و بھارت  
پاک بھارت جنگ | کی سابقہ جنگ ہے جسے دنیائے اسلام کے علماء

نے جہادِ عظیم قرار دیا۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارت نے اچانک بین الاقوامی سرحد  
عبور کر کے ظلمتِ شب میں پاکستان پر بزدلانہ حملہ کر دیا۔ پاکستانی فوجوں نے اپنی روایتی  
جراتِ مندی شجاعت اور عزمِ محکم سے پاکستان کی تاریخ میں ایک شاندار باب کا  
اضافہ کیا اور ایک بار پھر دنیا کو دکھا دیا کہ پاکستانی مسلمان ایک زندہ اور متحد قوم  
کی حیثیت میں ہر وقت اپنی مقدس سر زمین کی حفاظت کے لئے ہمہ تن مستعد ہیں۔ مگر  
دسمبر ۱۹۶۱ء کی پاک بھارت جنگ نے ایک نیا انداز اختیار کیا۔ ۱۹۶۵ء کے  
بالکل برعکس اس جنگ میں نہ صرف مشرقی پاکستان مسلمانوں کے ہاتھوں سے جاتا رہا  
بلکہ مغربی پاکستان کے قریباً پانچ ہزار مربع میل پر بھارت کے ہرمنوں نے قبضہ کر لیا  
اس جنگ کی وجہ سے روئے زمین کے مسلمان رسوا ہو گئے۔ ۱۹۶۶ء کی جنگ میں  
اسرائیل کی حکومت نے جس کی آبادی صرف چھپیس لاکھ یعنی لاہور کی آبادی کے برابر  
ہے۔ ۶۰ لاکھ کے جو علاقے چھین لئے تھے ابھی (۱۹۶۳ء) تک وہ اس سے

واپس نہیں لے سکے۔ حالانکہ عرب ممالک کی مجموعی تعداد چونتیس ہے  
اسے کاش! کہ یہ دو رسوا کن اور ذلت آمیز شکستیں خوابیہ مسلمانوں کو جگا  
سکتیں۔ اور ان کے لئے ہر مرتبہ چشمِ عبرت و بصیرت ثابت ہوتیں۔ مگر افسوس  
سے کہنا پڑتا ہے کہ آثار اس کی شہادت نہیں دے رہے۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احسان نہیاں جاتا رہا

غلام احمد سرسیدی عفریہ



## سوالات

- ۱۔ جہاد کا مفہوم، عرض و غایت اور تحقیقت بیان کیجئے
- ۲۔ اسلام کا تصور جہاد کیا ہے۔ تشریح کیجئے اور بتائیے اسلام نے جنگ میں کیا اصلاحات کیں
- ۳۔ جہاد کی اقسام بیان کیجئے اور کتاب و سنت سے اس پر روشنی ڈالئے
- ۴۔ ابن یوہنا کا یہ خیال کہاں تک صحیح ہے کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیل گیا۔ کن حالات میں جہاد کی اجازت ہے تفصیلاً لکھئے
- ۵۔ پاکستان اور بھارت کی حالیہ جنگ کیا جہاد تھی یا نہیں؟ جو موقف اختیار کریں۔ اسے دلائل کی روشنی میں ثابت کریں



وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ط  
اور ہم نے آپ کو سب جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے

حصہ دوم

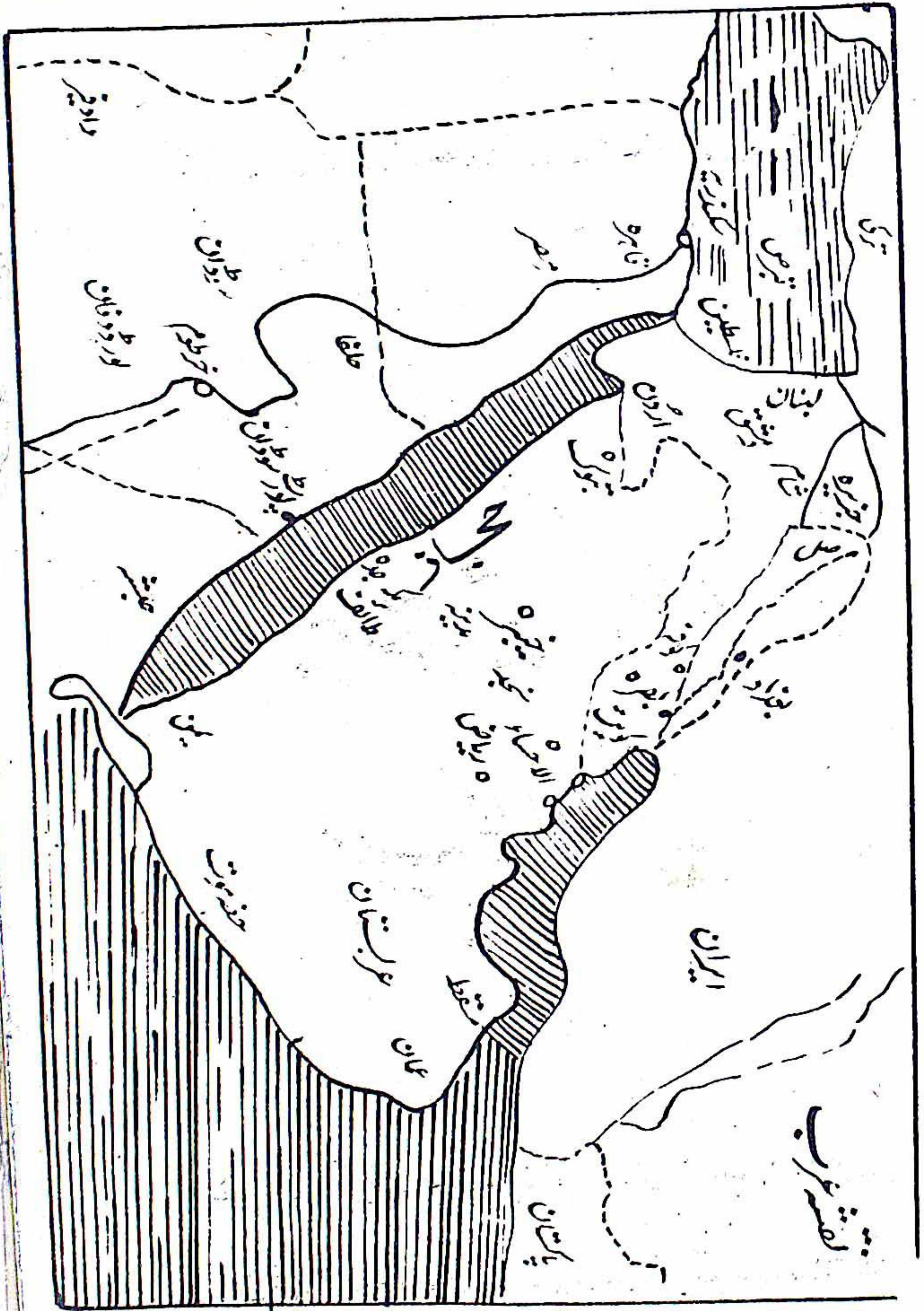
سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

عرب کا جغرافیہ

اور

عرب کے قبلے از اسلام سیاسی  
مذہب اور تمدنی حالت







## پہلا باب

### جزیرہ عرب

**وجہ تسمیہ** | دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ نما عرب بارہ لاکھ مربع میل کے رقبہ پر مشتمل ہے عرب والے اسے جزیرہ العرب کہتے ہیں۔ عربی میں جزیرہ دیکھو اور قطعہ کو کہتے ہیں۔ عرب کی وجہ تسمیہ میں دو قول مذکور ہیں۔ ایک یہ کہ عرب کے لفظی معنی فیصح اللسان اور زبان آور کے ہیں۔ چونکہ عرب اپنی شیریں بیانی اور زبان آدوری کے مقابلہ میں ساری دنیا کو بیچ سمجھتے تھے اس لئے اپنا نام عرب یعنی فیصح و بیفح اور دوسری قوموں کا غبم یعنی گونگا رکھا تھا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ عرب کا لفظ عربہ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی صحرا و بیابان کے ہیں۔ چونکہ عرب کا بڑا حصہ تنق و دق میدانوں اور بیابانوں پر مشتمل ہے اس لئے سارے ملک کو عرب کہنے لگے۔

**محل وقوع** | عرب ایک جزیرہ نما ہے جس کے تین طرف پانی اور ایک جانب خشکی ہے۔ یہ پاکستان کے مغرب اور ایشیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے اس کے مشرق میں بحر ہند، خلیج فارس اور خلیج عمان ہے۔ مغرب میں بحیرہ تسلیم اربنئے سوئز اور بحیرہ روم ہے۔



جنوب میں بحر ہند اور شمال میں شام و عراق کے ممالک ہیں۔

**رقبہ و آبادی** | عرب کی اب تک باقاعدہ پیمائش اور مردم شماری نہیں ہوئی۔ تاہم رقبہ تقریباً بارہ لاکھ مربع میل ہے جو جرمنی

اور فرانس سے چوگنا ہے۔ آبادی ایک کروڑ سے زیادہ ہے ملک کا بڑا حصہ ریگستان اور صحرا پر مشتمل ہے ملک بھر میں پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے عراق، یمن اور شام کے خطے شاداب و زرخیز ہیں۔ محل وقوع کے اعتبار سے ہر مقام کی آب و ہوا مختلف ہے لیکن عموماً گرم و خشک ہے۔

**عرب کی طبعی تقسیم** | طبعی اعتبار سے جزیرہ نمائے عرب مندرجہ ذیل خطوں میں بٹا ہوا ہے :-

۱۔ **حجاز** | یہ عرب کا سب سے بڑا صوبہ ہے جس کا رقبہ ڈیڑھ لاکھ مربع میل ہے اس میں ریگستان اور صحرا کثرت سے ہیں۔ جنوب میں یمن سے لے کر مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ شمال میں ملک شام تک پھیلا ہوا ہے اس کے شمال میں خلیج عقبہ اور مشرق میں نجد ہے۔ اس کے مشہور شہر مکہ مدینہ اور طائف ہیں۔

**مکہ معظمہ (MECCA)** آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت گاہ ہے یہاں بیت اللہ شریف ہے جہاں تمام دنیا سے ہر سال لاکھوں مسلمان قرینہ حج ادا کرنے کے لئے آتے ہیں۔ مکہ بہت بڑا شہر ہے۔ یہ شہر چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔

**مدینہ منورہ (MEDINA)** یہ مکہ مکرمہ سے جانب شمال دو سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہجرت سے پہلے اس کا نام یثرب تھا پھر اسے مدینۃ النبی (نبی کا شہر) کہنے لگے۔ بعد ازاں صرف مدینہ



کے نام سے مشہور ہوا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ اطہر اور مسجد نبویؐ  
اسی شہر میں ہے۔

**طائف (TAIF)** مکہ سے جنوب مغربی جانب پچاس میل کے فاصلہ پر  
واقع ہے یہ شہر سطح سمندر سے تقریباً چھ ہزار کی فٹ کی بلندی پر واقع ہے  
اس لئے عرب کا صحت انزا مقام اور نہایت پر رونق شہر شمار ہوتا ہے۔ یہاں  
شہد اور ہر قسم کے پھل بکثرت ملتے ہیں۔

**جدہ (JADDA)** ایک بندرگاہ ہے جو مکہ کے قریب ساحل سمندر پر واقع  
ہے اس کی آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے۔

۲۔ **نجد :- (NEJUD)** نجد کے لغوی معنی ہیں بلند۔ یہ صوبہ

عرب کے وسط میں واقع ہے یہاں پہاڑوں اور خمدار وادیوں کا جال  
پھیلا ہوا ہے۔ یہ علاقہ آج کل تیل کے چشموں کے لئے مشہور ہے۔ اس  
علاقے میں عمدہ قسم کے گھوڑے اور اونٹ ملتے ہیں۔ آج کل نجد کا صدر  
مقام ریاض (RIYADH) ہے۔

۳۔ **یمن (YEMEN)** مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ صوبہ حجاز کے جنوب

میں واقع ہے اس کا رقبہ ۷۵ ہزار مربع میل ہے سرسبز و شاداب علاقہ

ہونے کی وجہ سے گنجان آباد ہے آبادی تقریباً چالیس لاکھ ہے۔ جنوبی

حصے میں بندرگاہ عدن (ADEN) اور کچھ ملحقہ علاقہ انگریزوں کے

قبضے میں ہے۔ جہاں آج کل حصول آزادی کے لئے عربوں نے انگریزوں کے

خلاف جنگ شروع کر رکھی ہے۔ یمن کی خاص پیداوار جو، گنم، باجرہ

اور کافی ہے آج کل اس کا صدر مقام صنعاء (SANA) ہے

۴۔ **حکفر موت۔** یہ علاقہ بحیرہ عرب کے ساحل کے ساتھ یمن اور عمان



کے درمیان واقع ہے۔ اس میں ایک بہت لمبی موسمی ندی بہتی ہے۔ ساحلی علاقہ زیادہ آباد ہے خاصاً پیداوار کھجور ہے۔

۵۔ عمان - یہ صوبہ عرب کے بالکل مشرق میں واقع ہے اس کا رقبہ بیس ہزار مربع میل ہے اور موجودہ آبادی پانچ لاکھ پچاس ہزار ہے۔ مسقط (MUSCAT) صدر مقام ہے۔ پہاڑی علاقہ کے قرب و جوار میں کاشت کا کام ہوتا ہے کھجور یہاں کی خاص پیداوار ہے۔

۶۔ الأحساء :- یہ صوبہ عمان کے شمال مغربی جانب واقع ہے۔ پچیس میل کا ایک ریتلا قطعہ اس کو خلیج فارس سے جدا کرتا ہے الأحساء کے جن حصوں میں نہروں سے آبپاشی ہوتی ہے۔ وہ شاداب ہیں۔ یہاں کھجور بکثرت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعض علاقوں میں چونے کا پتھر ملتا ہے آجکل دہران میں تیل کے چشمے پھوٹتے ہیں۔

۷۔ بحرین :- خلیج فارس میں ایک چھوٹا سا جزیرہ بحرین (BAHREIN) ہے جس کا رقبہ تقریباً ۲۱۳ مربع میل ہے بحرین کا علاقہ تیسل کے چشموں اور سمندر کے موتیوں کے لئے مشہور ہے

۸۔ ہتھامہ - ہتھامہ کے لغوی معنی ہیں ساحلی علاقہ۔ اس نام کا اطلاق اس تنگ قطعہ پر ہوتا ہے۔ جو یمن، حجاز، اور سمندر کے درمیان ہے۔ یہ میدانوں اور پہاڑوں کا مجموعہ ہے۔ آب و ہوا گرم خشک ہے۔

۹۔ رابع خالی :- یہ عرب کا صحرائے اعظم ہے۔ رقبہ میں عرب کے چوتھے حصے کے برابر ہے۔ آبادی اس میں بالکل نہیں۔ اس لئے الرُّبْعُ الخَالِي کہلاتا ہے۔

اس کے بعض سرحدی علاقوں میں اونٹ پالے جاتے ہیں یہاں کے



اونٹ بہت بیش قیمت ہوتے ہیں۔ صحرا میں کہیں کہیں نمکین پانی کے چستے ملتے ہیں۔ انسان ان کا پانی نہیں پی سکتے۔ اس لئے وہ اونٹنیوں کے دودھ پر گزارہ کرتے ہیں۔ رابع خالی میں ریت کے بڑے بڑے ٹیلے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ جہاں سے گزرنا ممکن نہیں ان علاقوں میں کبھی عاود نمود کی پر شکوہ تو میں آباد تھیں آج وہاں ان کی آبادی کا کوئی نشان نہیں ملتا صحرا کے کناروں پر آج کل تیل کے چستے ابل رہے ہیں۔ اور سخت سڑکوں کا حال بچھایا جا رہا ہے۔

عرب کی آب و ہوا سخت گرم و خشک ہے۔  
**آب و ہوا اور پیداوار**  
 بارش شاذ و نادر ہی ہوتی ہے پہاڑوں

میں موسم قدرے معتدل ہوتا ہے ملک میں چونکہ دریا نہیں ہیں اس لئے پانی کیاب ہے۔ موسمی ندی نالے کافی تعداد میں ہیں مگر وہ ہمیشہ جاری نہیں رہتے۔ ان کی گزرگاہیں وادیاں کہلاتی ہیں گرمی میں سخت گرمی پڑتی ہے اور بادِ سموم چلتی ہے۔ بارش نہ ہونے کے باعث زراعت نہیں ہو سکتی۔ زیادہ تر لوگ بکریاں اور اونٹ پالتے ہیں۔ عربی گھوڑے بہت خوبصورت اور تیز رفتار ہوتے ہیں۔ عرب گھوڑوں کو بہت عزیز رکھتے ہیں اور بچھینروں کو اولاد کی طرح پالتے ہیں اونٹ سواری اور بار برداری کے کام آتا ہے۔ جہاں پانی موجود ہے وہاں شہر اور گاؤں آباد ہیں۔ یہاں کا مشہور پھل کھجور ہے۔ کہیں کہیں باجرہ، جو اور گیہوں بھی پیدا ہوتے ہیں۔ طائف کے پھلوں میں انار اور انگوہ بہت لذیذ اور مشہور ہیں۔ عربوں کا انحصار زیادہ تر کھجور پر ہے وہ اس کی گٹھلی بھی صنایع نہیں کرتے اس سے کو کو بناتے ہیں یا اونٹوں کو کھلاتے ہیں۔ کھجور کے درخت سے ستون اور شہیر بناتے ہیں اس کی چھال کو روئی کی جگہ گدوں میں بھرتی ہے



اور اس سے رسیاں بناتے ہیں۔ ستو عربوں کی محبوب غذا ہے جنوب کے ساحلی علاقوں میں روئی۔ کافی۔ گرم مہصا لے اور خوشبو میں کافی مقدار میں ہوتی ہیں۔ انہیں دور دور کے ملکوں میں درآمد کیا جاتا ہے آج کل عرب میں تیل کے کنوؤں کی بہتات ہو رہی ہے۔ یہ کنوئیں بحرین احساء کویت اور ان سے اوپر کے شمالی رقبوں میں ہیں ان علاقوں کے ساحل کے ساتھ سمندر کے نیچے سے بھی تیل نکالا جاتا ہے

عرب کے باشندے | جزیرہ عرب کے باشندوں کی دو قسمیں ہیں

۱۔ شہروں اور دیہات میں رہنے والے حضری کہلاتے

ہیں۔ حضری لوگ عام طور سے تجارت۔ کھیتی باڑی یا صنعت و حرفت کے ذریعہ پیٹ پالتے ہیں۔

۲۔ صحرا اور بادیہ نشین بدوی کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ اونٹ اور بھیڑ بکری پال کر گزارہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ نقل مکانی کرتے رہتے ہیں جہاں گھاس اور پانی کی فراوانی ہوئی وہاں پہنچ گئے۔ جب گھاس اور پانی ختم ہو گیا۔ تو یہ وہاں سے چل دیئے۔

عرب کے تمام قبائل سامی نسل سے تعلق رکھتے ہیں نسلی اعتبار سے عربوں کو تین قسموں میں منقسم کیا گیا ہے۔

۱۔ عرب باندہ ۲۔ عرب عاریہ ۳۔ عرب مستعربہ

عرب باندہ :- زمانہ قدیم میں ملک عرب میں عاد اور ثمود وغیرہ قبیلے آباد تھے۔ نادی اعتبار سے انہوں نے بہت اونچا مقام حاصل کیا تھا۔ آخر خدا کے نافرمان ہو کر اس کے غضب کا شکار ہوئے اور صفحہ ہستی سے ہمیشہ کیلئے مٹ گئے۔ اسی لئے ان کو عرب باندہ کہلا کر شہ عرب کہتے ہیں۔

۲۔ عرب عاریہ :- یہ مین کے رہنے والے بنو قحطان ہیں جو عرب باندہ



کے بعد اس ملک کے اصل باشندے ہیں ان کا اصلی وطن یمن تھا۔ وہاں سے عرب  
بھریں پھیل گئے۔ چونکہ یمن کا ایک تختانی بادشاہ ہمیشہ سرخ لباس پہنتا تھا  
اس لئے اس کا خاندان حمیری (سرخ لباس والا) کہلانے لگا۔ اور تختانی حمیری  
کے نام سے بھی مشہور ہوئے ان کو یمنی بھی کہتے ہیں۔

۳۔ عرب مستعربہ :- یہ بنو اسمعیل ہیں جو زیادہ تر حجاز میں  
آباد تھے۔ ان کا دوسرا نام عدنانی یا مضری بھی ہے یہ حضرت اسمعیل کی اولاد میں  
سے ہیں اس کے بعد ایک دوسرے سربراہ خاندان نہر کی وجہ سے جس کا لقب قریش تھا  
تمام خاندان قریش کہلانے لگا۔

ظہور اسلام کے وقت اور اس کے بعد یہی نام استعمال ہوتا رہا۔ خانہ کعبہ کے  
متولی ہونے کی وجہ سے قریش کو تمام عرب میں عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھا  
جاتا تھا۔

عرب کے رہنے والے مختلف قبائل میں بڑے ہوئے تھے ہر قبیلے کا اپنا سردار  
ہوتا تھا۔ قبیلے کے سب افراد اپنے سردار کی اطاعت کرتے تھے قبائلی زندگی نے  
عربوں میں خاندانی اتحاد اور یک جہتی پیدا کر دی تھی۔ خون اور نسب اتحاد کا بڑا  
ذریعہ تھا۔ ہر شخص کا فرض ہوتا تھا کہ خاندان اور قبیلے کی ناموس و آبرو کی حفاظت  
کرے قبیلے کا سردار امن کے زمانے میں اپنے علاقے کا بادشاہ ہوتا تھا۔ اور جنگ کے  
زمانے میں سپہ سالار بن جاتا تھا تلوار، نیزہ اور تیرچہ عربوں کے مشہور ہتھیار تھے۔

## ظہور اسلام کے وقت عربوں کی حالت

ظہور اسلام کے وقت عرب سپاہی معاشرتی اور مذہبی لحاظ سے حد درجہ پست



تھے۔ ظہور اسلام کے قبل کے زمانہ کو "دور جاہلیت" کہا جاتا ہے اس وقت وہ لوگ نظری ذہانت، زبان دانی، جرأت و شجاعت اور قوت خطابت کے باوجود ضلالت و جہالت کی تاریکی میں گھرے ہوئے تھے۔

**سیاسی حالت** | ظہور اسلام کے وقت جزیرہ عرب میں کوئی باقاعدہ نظام حکومت موجود نہ تھا۔ آپس کے جھگڑوں کے تصفیہ کے لئے کوئی عدالت نہ تھی امن قائم رکھنے کے لئے پولیس کا محکمہ نہ تھا۔ بیرونی حملوں کی روک تھام کے لئے کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی عربوں کے ہاں اپنا کوئی سکھ اور ٹھکانا بھی موجود نہ تھا۔

جزیرہ عرب کے باشندے مختلف قبیلوں میں منقسم تھے ہر قبیلہ چند خاندانوں کا مجموعہ ہوتا تھا۔ ان قبیلوں کے نام ان کے کسی بزرگ کے نام پر ہوتے تھے مثلاً بنی ہاشم، بنی عدنان، بنی عباس وغیرہ

ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا تھا۔ جو شیخ کہلاتا تھا اہل قبیلہ اس کا انتخاب کرتے تھے عموماً اس شخص کو سردار چنا جاتا تھا جو مجموعہ صفات ہوا کرتا تھا۔ اس کو سارے قبیلہ پر حاکمانہ اختیارات حاصل ہوتے تھے وہ تمام امور قبیلہ کے ممتاز لوگوں کے مشورے سے انجام دیتا تھا۔ ان قبائل میں ذرا ذرا سی بات پر جھگڑا ہو جاتا۔ جو بڑھ کر جنگ کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ اگر اتفاق سے دو قبیلوں کے درمیان لڑائی پھڑپھڑ جاتی تو اکثر حالتوں میں اس لڑائی کی آگ کسی نسلوں تک سلگتی رہتی۔

اور بسا اوقات بہت سے قبیلے اس کی پیٹ میں آجاتے۔ جب بھی کسی قبیلے کو موقع ملتا وہ اپنے حریف قبیلے پر حملہ کر کے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیتا قبیلہ بکر اور تغلب کے درمیان جو ایک اذیتنی کے باعث جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا



تھا۔ اس کا سلسلہ چالیس سال تک جاری رہا۔

ادبِ عربی میں یہ واقعہ جنگِ بسوس کے نام سے مشہور ہے اسی طرح ایک مرتبہ گھوڑے دوڑانے پر بنو عبس اور ذبیان کے درمیان تنازعہ ہو گیا اس کو جنگِ داحس و غراء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دونوں قبیلے برسوں تک باہم نبرد آزار ہے۔

عربوں کے ادبی میلے

عرب کے مختلف مقامات پر لوگ ہر سال اکٹھے ہوتے تھے ان میلوں میں تجارتی

کاروبار ہوتا اور شعر و ادب کی گرم بازاری رہتی تھی۔ پرنے جھکڑے چکائے جاتے تھے۔ ان میلوں کو اتنی اہمیت حاصل تھی کہ اہل عرب محرمِ اربعہ ذیقعد اور ذی الحجہ کے مہینوں میں لڑائی کو حرام سمجھتے اور ان مہینوں میں اجتماعات منع کیا کرتے۔

تین تین ہفتوں تک ایک ہی میلہ لگا رہتا۔ سب سے بڑا میلہ مکہ کے قریب عکاظ کے بازار میں لگتا تھا۔ جہاں تمام عرب قبیلوں سے لوگ جمع ہوتے تھے۔

عرب حکومتیں

قبائلی نظام کے علاوہ ظہور اسلام سے قبل چند عرب حکومتوں کا پتہ بھی ملتا ہے۔ یہ حکومتیں باقاعدہ

طور پر صاحبِ تخت و تاج حکمرانوں کے زیرِ نگیں تھیں۔ — مین کے علاقے میں معینی اور سبائی دو شاہی خاندان بہت مشہور تھے۔

حکومت معینی بڑی دولت مند اور صاحبِ ثروت تھی اس کی تجارت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی دولت معینہ کا پتہ آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے چلا ہے۔ اس سلطنت کے ۲۶ حکمرانوں کے نام ملے ہیں اس کی حکومت بحران اور حضرموت کے درمیان کے علاقوں میں تھی۔ اس کا عہد حکومت ۳۳۰ء



سے ۶۵ قبل مسیح تھا۔

مذہباً ربقیس اسبائی خان دان میں سے تھیں اس خاندان کا عہد حکومت از ۹۵ تا ۱۱۵ قبل مسیح تھا۔ صنعک کے علاقے کی حکومت سب سے بڑی تھی۔ اس کا بادشاہ یوسف ذونواس یہودی ہو گیا تھا

ایک دفعہ روم سے کچھ لوگ عیسائیت کی تبلیغ کے لئے صنعک آئے یوسف ذونواس نے ان لوگوں پر بڑا ظلم کیا اور انہیں آگ میں ڈال دیا۔ یہ حادثہ ۵۳ء میں پیش آیا۔ قیصر دستاہ روم نے اپنے ماتحت بادشاہ نجاشی (شاہ حبشہ) کو اس ظلم کا بدلہ لینے کا حکم دیا۔

حبشہ سے ایک سردار اریاط فوج کا ایک دستہ لے کر آیا لیکن ذونواس نے خودکشی کر لی۔ کچھ عرصہ کے بعد اریاط کے امیر فوج ابرہہ نے اریاط کو قتل کر دیا۔ اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ ابرہہ پکا عیسائی تھا۔ اس نے صنعک میں ایک بڑا گرجا بنوایا اور عرب بھر میں اعلان کروادیا کہ آئندہ لوگ خانہ کعبہ کے بجائے اس کا طواف کیا کریں۔ لیکن عرب لوگ چونکہ خانہ کعبہ کا بہت احترام کرتے تھے۔ اس لئے ابرہہ کے حکم کی پرواہ نہ کی۔ ابرہہ ایک لشکر جرار لے کر ۵۷ء میں مکہ کی طرف روانہ ہوا تاکہ خانہ کعبہ کو مٹا کر اہل عرب کو اپنے خود ساختہ گرجا کی زیارت پر مجبور کرے لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ جب مکہ کے قریب آیا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر عذاب نازل کیا۔ اور پرندوں کے غول کے غول بھجی دیئے جو پتھر کی کنکریاں برساتے تھے۔ ان کنکریوں کے بادلوں نے اس زور کا طوفان اٹھایا کہ ابرہہ کے اٹھی گھبرا کر پھیننے لگے۔ اور اپنے ہی آدمیوں کو روند ڈالا چنانچہ ابرہہ کی فوج تباہ و برباد ہو گئی۔ قرآن حکیم کی سورہ العنیل میں یہ واقعہ مذکور ہے۔



اگر مہرہ کے بعد اس کے بیٹے حکمران بنے۔۔۔ پرانے بادشاہوں کی اولاد میں سے کچھ لوگ باقی تھے جنہوں نے شاہ ایران کی مدد سے دوبارہ یمن پر قبضہ کر لیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ایران کے بادشاہ نے اپنا حاکم بھیج کر یمن کو ایرانی صوبہ بنایا۔ یمن کے علاوہ عراق میں سلطنت حیرہ اور شام کی سرحد پر غنمائی حکومت قائم تھی۔ جس کا حاکم عیسائی ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ تک غنمائی لوگ عیسائی تھے پھر اسی عہد میں مسلمان ہو گئے۔

ظہور اسلام سے قبل عرب تمدنی لحاظ سے بہت پست تھے۔ لہذا تہذیب و تمدن کے اعتبار سے ان کی حالت یکساں نہ تھی دراصل تمدن اور معیشت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

### تمدنی اور سماجی حالت

عرب کے جن علاقوں کی معاشی حالت اچھی تھی۔۔۔ وہاں تمدن نے بھی ترقی کی۔ جنوبی عرب یعنی یمن کے علاقوں میں رہنے والے چونکہ خوش حال تھے اس لئے وہاں تہذیبی ترقی کے آثار بھی ملتے ہیں۔ صنعاء اور اس کے قریب جن عظیم الشان قلعوں اور فیصلوں کے آثار ملتے ہیں ان سے اہل یمن کی تمدنی حالت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے یہی حالت حضرت موت کے علاقہ کی تھی۔ وہاں کے آثار تدبیر سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہاں ایک ترقی یافتہ قوم آباد تھی۔ سب کے دار الحکومت مآرب کا بند اور اس سے آب پاشی کا انتظام مستمدن الناسوں کا کارنامہ تھا۔

اسی طرح حیرہ اور حوران جو عراق و شام کی سرحد پر عربی حکومتوں کے دار الحکومت تھے خاصے ترقی یافتہ تھے۔ ان کا رہن سہن اور معاشی نظام اپنے قرب و جوار کی ایرانی اور رومی سلطنتوں کے مطابق تھا۔ لیکن عرب کے اندرونی مقامات کی یہ حالت



نہ تھی۔ عربی زبان نہایت وسیع ہے مگر اس کے باوجود جن چیزوں کا تمدن اور اسباب معاشرت سے تعلق ہے ان کے لئے خاص عربی زبان میں کوئی لفظ نہیں ملتا مثلاً سکہ۔ چراغ۔ کوزہ۔ طشت درہم و دینار وغیرہ کے لئے جو لفظ عربی زبان میں رائج ہوئے وہ سب دوسری زبانوں سے لئے گئے تھے عربی زبان ادبی لحاظ سے بہت مالدار ہے اور اہل عرب کو اپنی زبان مذہبی پر اتنا فخر تھا کہ وہ غیر عرب لوگوں کو عجم یعنی گونگ کہتے تھے۔ عرب میں شعور شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ چونکہ عام طور پر عرب کھنڈا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ اس لئے ان کے یہاں تصنیف و تالیف کا کوئی سلسلہ نہ تھا۔ لوگ اشعار کو زبانی یاد کر لیتے تھے عربوں کی قوت حافظہ ضرب مثل کی حد تک مشہور ہے۔ اشعار میں زیادہ تر جنگوں کے حالات یا اپنے قبیلہ کی بہادری کا تذکرہ ہوتا تھا۔ اخلاقی پستی کا یہ عالم تھا کہ شاعر اپنی محبوبہ کا نام لے کر اشعار میں اس کی تعریف کرتا تھا۔ ادبی میلوں میں شاعر اپنا کلام سناتے اور حسبِ قابلیت خراج تحسین وصول کرتے تھے۔

عرب عام طور پر معاشی بد حالی کا شکار تھے بارش کی کمی کے باعث کھیتی باڑی نہ ہو سکتی تھی۔ اس لئے لوگوں کا عام پیشہ اونٹ اور بھیڑ بکری پالنا تھا۔ اونٹ عربوں کی بہت بڑی دولت تھا۔ مویشی پالنے کے علاوہ کچھ لوگ دوسرے ممالک سے بھی تجارت کرتے تھے چونکہ اہل عرب رزمیہ کی چیزوں کو اپنے ہاتھ سے تیار کرنے کو باعثِ شرم سمجھتے تھے اس لئے صنعت و حرفت سے واقف نہ تھے۔ یمن میں البتہ چادریں اور کپڑے بنتے ہیں اس کے علاوہ کہیں کہیں آلات جنگ بھی تیار کئے جاتے تھے۔

عرب بڑے سادہ مزاج تھے ان کے قومی اخلاق میں سخاوت مہمان نوازی ایفائے عہد اخوت شجاعت اور باہمی ہمدردی کے اوصاف نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ وہ آزادی کے شیدائی اور زبان دانی میں بے مثال تھے۔ عربی شاعری حقیقت نگاری کی آئینہ دار ہوتی تھی عرب اپنے خاندانوں اور قبیلے کی عزت و ناموس کے لئے اپنی جان پر کھیل جانے کو ایک معمولی بات سمجھتے تھے۔ اپنے عورتوں کی عزت اور قبیلے کی نیک نامی کی خاطر وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار رہتے تھے۔ امیر و غریب سب مسافروں اور مہمانوں کی خاطر مدارات میں کوئی کسر اٹھانہ نہ رکھتے تھے۔ سخاوت میں حاتم طائی ایسے لوگوں کے نام آج بھی مشہور ہیں عرب دوسرے



کے بڑے پکے ہوتے تھے۔ اور وعدہ حلاقی کو ایک نہایت بُرا فعل قرار دیتے تھے۔ آزادی اور خود مختاری بھی جاہل عربوں کا توئی کردار تھا۔ سب انفرادی اور قومی آزادی کو ہر طرح اور ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ انہیں یہ ہرگز گوارا نہ تھا۔ کسی شخص یا قبیلے کی آزادی چھین جائے۔

زمانہ جاہلیت کے عربی معاشرہ میں عورتوں کو اچھی خاصی آزادی حاصل تھی۔ عورت کاروبار اور تجارت کر سکتی تھی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ عرب عورتیں مردوں کے ساتھ میدان جنگ میں جاتیں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں اور لڑائی کے وقت مردوں کو بہادری اور بے جگری سے لڑنے پر اکساتی تھیں۔ مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل تھی۔ مرد چینی بیویاں چاہے رکھ سکتا تھا بعض قبائل میں کسی شخص کے مرنے پر اس کی بیویاں لڑکے کے حصے میں آجاتی تھیں صرف حقیقی ماں مستثنیٰ تھی۔ عرب معاشرہ میں عورت کو ورثہ نہیں ملتا تھا۔

زمانہ جاہلیت کے عرب معاشرہ میں جہاں بہت سے اوصاف

## مذموم رسوم و عادات

اور خوبیاں موجود تھیں وہاں یہ معاشرہ کئی بری رسموں اور بد عادتوں کا شکار تھا۔ قدیم عرب اس حد تک بے رحم تھے۔ کہ نشابہ کے لئے زندہ جانوروں اور پرندوں پر مشق کرتے تھے۔ زندہ اونٹ کے جسم سے گوشت کاٹ کر کھا جلتے تھے۔ دشمن واپو میں آجاتا تو اسے سنگدلی سے قتل کرتے تھے۔ ایک ایک کر کے اس کے اعضا کاٹتے تھے یا اسے درخت سے باندھ کر تیر کا نشانہ بناتے تھے۔ عرب بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ توہم پرست بھی تھے۔ مہبوت پریت ان کی رگوں پر سوار رہتے تھے۔ مردوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ مردے کا روح اُوبن کر اس کی قبر پر ٹھکانہ کر لیتی تھی۔ ان میں کہانت یعنی فال گیری اور جادو کا بہت رواج تھا۔ اس فن کے ماہرین عورتوں میں بہت مقبول ہوتے تھے۔ کاہن عورتوں سے خوب دولت کماتے تھے۔

شراب نوشی عربوں کی گھٹی میں پڑی تھی شراب نوشی کا ذکر اپنے استعار میں فخریہ کرتے تھے۔ قمار بازی بہت عام تھی۔ سودی کاروبار پر کوئی پابندی نہ تھی ضرورت پڑنے



پر لوگ اپنے بیوی اور بچے رہن رکھ کر رقم حاصل کر لیتے تھے۔ افلاس اور عاری کی وجہ سے بعض قبیلے رطکیوں کو بیوندِ خاک کر دیتے تھے جب کسی کے ہاں سچی پیدا ہوتی تو اس کا سر ندامت سے جھک جاتا بے حیائی کا یہ عالم تھا کہ مردوزن ننگے ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے۔ غلامی کا رواج عام تھا۔ غلاموں کی حالت از حد خراب تھی ان کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کیا جاتا تھا غربت اور ناداری کی وجہ سے لوٹ مار اور چوری ڈکیتی عام تھی۔ عرب اس کو بہادری اور جواں مردی خیال کرتے تھے۔

ملک بھر میں کہیں کوئی مدرسہ نہ تھا۔ حجاز میں جو چند لوگ کھنا پڑھنا جانتے تھے۔ وہ وہی تھے جو تجارت کے سلسلے میں شام و عراق جاتے رہتے تھے۔ مدینہ کے لوگ کسی حد تک زیادہ تعلیم یافتہ تھے کیونکہ وہاں یہود کے کسی قبیلے آباد تھے۔ جن سے انہوں نے پڑھنا کھنا سیکھ لیا تھا۔ صنوبر کی بعثت کے وقت تک گنے چنے چند لوگ مکہ میں کھنا جانتے تھے۔

### مذہبی حالت

عرب میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید کا تصور پھونکا اور خدائے واحد کی پرستش کے لئے مکہ میں سب سے پہلا گھر بنایا رفتہ رفتہ لوگوں کے دلوں سے صدائے توحید کا اثر زائل ہو گیا تھا اور نہ صرف عرب بلکہ ساری دنیا میں خالص خدا کا نام لینے والا کوئی باقی نہ رہ گیا تھا۔ پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ کرہ ارضی کے کسی حصے میں کوئی حقیقی خدا شناس قوم باقی نہ رہی۔ جن قوموں میں ذرا الہی کی کوئی کرن تھی بھی۔ تو اس پر ضلالت اور جہالت کے اتنے پردے پڑ گئے تھے۔ کہ ان کی اصلی صورت پہچانی نہ جاتی تھی۔

ملک عرب جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید الہی کی روح پھونکی تھی اور خدا کی عبادت کے لئے سب سے پہلا خانہ خدا بنایا تھا۔ دوسری قوموں سے کسی طرح بہتر نہ تھا عرب دین ابراہیمی کے پیرو کہلاتے تھے۔ مگر اس دین کی صورت مسخ ہو چکی تھی توحید کا رخ زینا، شرک اور بت پرستی کے اداہم میں چھپ کر رہ گیا تھا۔ خدائے واحد کے ساتھ اور بہت سے کار ساز شرک ہو گئے تھے۔ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ سینکڑوں بتوں کو



خدا کا منظر ہان کر ان کی پوجا کرتے تھے۔ ان میں لات منات ہبل اور غڈی زیادہ مشہور تھے۔ ہبل خانہ کعبہ کی چھت پر نصب تھا۔ تمام عرب اس کی پرستش کیا کرتا تھا۔ مختلف قبائل کے بت الگ الگ تھے منات اوس اور خزرج کا بت تھا۔ لات قبیلہ ثقیف کا اور غڈی غطفان کا۔

غڈی کی پرستش ارکان حج میں داخل تھی۔ ان بتوں کے نام پر ساند چھوٹے جاتے تھے۔ ان پر انسانوں کی قربانیاں ہوتی تھیں ان کے علاوہ سینکڑوں لکڑی اور مسالے کے خانہ ساز خدا تھے۔

بتوں کے علاوہ عرب تاروں اور چاند سورج کو بھی پوجتے تھے کچھ قبیلے بھرت پریت کی بھی پوجا کرتے تھے اور ان کے بارے میں عجیب و غریب عقائد رکھتے تھے تہامی عرب کے قبائل ایرانیوں کی تقلید میں آگ کو پوجنے لگے تھے کچھ لوگ ایک خدا کو بھی ملتے تھے۔ مگر وہ عیسائی ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ یہودی اور زرتشتی مذہب نے لوگ بھی موجود تھے عیسائی اور یہودی دونوں اپنے اصل مذہب سے بہت دور ہٹ چکے تھے۔ عیسائی تین خداؤں کے قائل تھے ان کے بشمار فرقے تھے۔ جو آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ یہودی بھی انتہائی پستی میں گرے ہوئے تھے مال و دولت کی ہوس ان میں حد سے زیادہ ہو گئی تھی۔ دہم پرستی، جادو اور عملیات کو انہوں نے مذہب کا جزو بنا لیا تھا۔ یہودی علماء نے تورات میں ترمیمیں کر دی تھیں اپنی روٹیوں کی خاطر ساری قوم کو مبتلائے فریب کر رکھا تھا۔

ان مذاہب کے علاوہ مختلف قسم کے خیالات اور عقائد پائے جاتے تھے کچھ ملحد تھے جو سرے سے خدا کے وجود ہی کے منکر تھے غرض کوئی ایسا عقیدہ نہ تھا جو عربوں میں رائج نہ ہو۔ اہل عرب ایسے صنعت کار نہ تھے۔ ان کے بت کمو مانا تراشیدہ پتھر یا لکڑی کے ہوتے تھے۔ عربوں کی متلون مزاجی بتوں کے باب میں بھی عجیب شگونے کھلاتی تھی کوئی پہلے سے زیادہ خوبصورت پتھر ملا تو اسے معبود بنا ڈالا اور پہلے کو اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ رابن ابیرا ایندھن کی حاجت ہوئی تو لکڑی کے بت ہی کو توڑ کر جلا لیا۔ لیکن شوق



چرایا تو آٹے کا صنم بنالیا۔ پھر جھوک گئی تو اسے توڑ کر پیٹ کی تذر کر دیا۔ بہت کم بت  
سروں کی تم ظریفی سے محفوظ رہتے تھے۔

جزیرہ عرب میں مکہ مکرمہ بڑا مشہور اور مرکزی شہر ہے تمام علاقہ  
کعبہ

بندرگاہ سے تقریباً ۵۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے  
مکہ کوام القدری۔ بکد امین اور بکتہ کے ناموں سے بھی یاد کیا  
جاتا ہے۔ اس مقدس شہر کی عزت و عظمت بیت اللہ کی وجہ سے ہے جسے حضرت ابراہیمؑ  
اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل نے بنایا تھا۔ کعبہ عمارت ہونے کی وجہ سے اسے کعبہ کا  
نام دیا گیا ہے جب حضرت ابراہیمؑ نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ کو مکہ میں آباد کیا  
تو آپ نے دعا مانگی تھی۔

مے اللہ۔۔۔ میں نے ان لوگوں کو بے آباد اور غیر زرعی بستی میں بسایا ہے۔ تو  
مہربانی فرما اس شہر کو امن و سلامتی کا مرکز بنا دے۔ اور لوگوں کے دلوں کو اس کی طرف  
مائل کر دے۔

کعبہ کی تعمیر سے پہلے اس مقام دیکر آپ کوئی آبادی نہ تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے  
اثر اور کعبہ کی کشش سے لوگ رفتہ رفتہ یہاں آکر آباد ہونے لگے۔ اور سب سے پہلے جوہریم کا  
قبیلہ یہاں آکر آباد ہوا۔ کعبہ کا انتظام حاجیوں کی خدمت اور مکہ کی حکومت پہلے آل اسماعیل  
اور پھر بنو جرہم کے ہاتھ میں رہی۔ حضرت اسماعیل نے اس قبیلہ کے سردار کی لڑکی سے شادی  
کی اس سے بارہ بچے تولد ہوئے حضرت ابراہیمؑ کی زندگی ہی میں کعبہ کو سارے عرب میں  
مرکزیت حاصل ہو گئی تھی۔ بنو جرہم اس تسلط کی بناء پر مغرور ہو گئے انہوں نے تولیت کعبہ  
کے گھنٹہ میں بڑی بد عنوانیاں شروع کر دیں۔ خانہ کعبہ کا چڑھا دکھا جاتے۔ حجاج کو  
تلتے۔ جب بنو جرہم کے مظالم حد سے بڑھ گئے تو آل اسماعیل نے انہیں مکہ سے نکال کر پھر  
کعبہ کی تولیت واپس لے لی۔

یہ مرتضیٰ نسلاً بعد نسلاً۔۔۔ نان تک پہنچا۔ یہ بڑا تاریخی شخص ہے آنحضرت صلی اللہ



علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کا سلسلہ نسب اسی پر منتهی ہوتا ہے عدنان کی اولاد بہت پھیلی پھولی۔  
 زبیدیہ، حمزہ، اور قضاہ کے نامور قبائل اسی کی نسل سے تھے جنہوں نے عرب کی پرانی  
 تاریخ میں بڑی عظمت و شان حاصل کی عرب کے تمام حصوں میں ان کی حکومتیں پھیلی ہوئی  
 تھیں ان کا خاص پیشہ تجارت تھا۔

**قریش** | اگے چل کر عدنان کی نسل سے نہر نامی ایک بزرگ پیدا ہوئے  
 جس سے خاندان قریش کی بنیاد پڑی نہر کا لقب قریش تھا۔ اس کا  
 نسبت سے اس کی نسل قریشی کہلاتی ہے قریش کے رب خاندان اسی کی نسل سے تھے اس کی  
 پانچویں پشت میں قریش کا تاریخی شخص قصی پیدا ہوا۔ قریش کی اجتماعی اور سیاسی زندگی  
 کا آغاز اسی نامور شخص سے ہوا اس نامور شخص نے قریش کے مختلف خاندانوں کو اکٹھا کر کے ان  
 میں اتحاد پیدا کیا۔ اور خود بیت اللہ شریف کا زینا مذہبی سردار اور مکہ شریف کا پہلا جمہوری  
 حاکم قرار پایا۔

قصی نے یہ چھوٹی سی ریاست جمہوری اصول پر قائم کی اس کے کئی شعبے تھے۔ جو  
 مختلف قبائل میں تقسیم تھے۔ بڑے شعبے تین تھے۔

۱۔ فوجی ۲۔ عدالتی ۳۔ مذہبی

پھر یہ تینوں کئی شعبوں میں منقسم تھے۔ قصی کے جمہوری نظام میں چار چیزیں خاص  
 طور پر قابل ذکر تھیں :-

۱۔ دارالندوہ :- قصی نے دارالندوہ دیکھی گھرا کی بنیاد رکھی۔ دارالندوہ

عربوں کا پہلا اسمبلی ہال تھا۔ یہاں قریش کے تمام سردار جمع ہوتے اور سیاسی  
 اجتماعی اور مذہبی مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔ شادی بیاہ کے معاملات بھی یہیں طے  
 پاتے چالیس برس سے کم عمر کے لوگ دارالندوہ کے رکن نہ بن سکتے تھے دارالندوہ  
 وزارت داخلہ اور عدلیہ کے برابر تھا۔

۲۔ اللہوا :- یعنی علم انبوی جھنڈا کا شعبہ دراصل وزارت دفاع کے برابر تھا  
 جنگ کے تمام امور اس حکم کے سپرد تھے۔



۳۔ کعبہ شریف کی پاسبانی :- یہ شعبہ بنو عبد الدار کے سپرد تھا۔ متولی کے بغیر دوسرا کوئی شخص کعبہ کا دروازہ کھولنے کا مجاز نہ تھا۔ بیت اللہ کی کبھی متولی کے پاس رہتی تھی۔ کعبہ کی تمام خدمات متولی کے سپرد تھیں جسے عرب حاجب کعبہ کعبہ کا دربان و پاسبان کہتے تھے۔

۴۔ حاجیوں کے کھانے پینے کا اہتمام :- لوگ دور دراز سے حج بیت اللہ کے لئے مکہ مکرمہ میں آتے اہل مکہ حاجیوں کے پینے کے لئے زمزم کے پانی سے بہت سے حوض مہر دیتے اور کھجوریں ڈال کر پانی کو شیریں بنا دیتے تھے ظہور اسلام کے وقت پانی پلانے کا انتظام عباس بن عبدالمطلب کے سپرد تھا۔ خانہ کعبہ سارے عرب کا مرکز تھا۔ حج کے موقع پر ہزاروں آدمی جمع ہوتے تھے قصی سے پہلے ان کی آرام و سائیش کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ سب سے پہلے قصی نے اس طرف توجہ کی اور قریش سے کہا۔ کہ لوگ دور دور سے حرم کی زیارت کے لئے آتے ہیں ان کی میزبانی ہمارا فرض ہے۔

اس تحریک پر قریش نے اس کام کے لئے سالانہ ایک رقم مقرر کر دی جس سے منی میں حاجیوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ مکہ ایک خشک اور بے آب دگیاہ مقام ہے قصی نے چری حوض بنوا کر پانی کا معقول انتظام کیا۔

قصی کی موت کے بعد اس کا بیٹا عبدمناف حاجیوں کی مہمان نوازی کے کا انتظام کرتا رہا۔ عبدمناف کے چھ ارٹھ تھے۔ ان میں ہاشم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا سب سے زیادہ بااثر تھے۔ چنانچہ مہمان نوازی کی خدمت ان کے حقد میں آئی۔ پھر ہاشم کا بیٹا عبدالمطلب۔ پھر ان کے بیٹے ابوطالب اور عباس یکے بعد دیگرے یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

ہاشم :- کعبہ کے متولیان میں ہاشم بڑے رتبہ کے آدمی تھے انہوں نے اپنے زمانہ میں خاندان قریش کی بڑی عزت و عظمت قائم کی۔ قریش کا آبائی پیشہ تجارت تھا۔ وہ مختلف ملکوں میں پھر کر تجارت کرتے تھے۔ ہاشم نے کوشش کر کے قیصر و نجاشی کے حدود سلطنت میں



قریش کے تجارتی مال کو ٹیکس سے مستثنیٰ کر آیا۔ عرب کے راستے محفوظ نہ تھے۔ ہاشم نے دورہ کر کے تباہی سے معاہدہ کیا کہ وہ قریش کے کاروان تجارت سے کوئی تعرض نہ کریں گے۔ ہاشم حرم سے متعلق خدمات نہایت خوبی سے ادا کرتے تھے۔ ان وجوہ و اسباب کی بنا پر وہ قریش میں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کا اصلی نام عمرو تھا۔ ایک دفعہ مکہ میں قحط پڑا انہوں نے لوگوں کو شور بہ میں روٹیاں چورا کر کے کھلائیں اس کے بعد لوگ ان کو ہاشم و چورا کرنے والا کہنے لگا۔

عبدالمطلب ہاشم نے مدینہ کی ایک خاتون سلمیٰ سے شادی کی وہ خزرج کی ایک شاخ بنو نجار سے تھیں۔ سلمیٰ کے بطن سے عبدالمطلب پیدا ہوئے۔ ہاشم کے جانشین ان کے بھائی مطلب تھے۔ اور ان کے بعد عبدالمطلب بن ہاشم۔ حضرت عبدالمطلب کا پیدائشی نام شیبہ تھا۔ نہایت حسین اور بادشاہت تھے۔ مکہ کے رئیس اعلیٰ تھے انہی کے ہند تولیت میں ابرہہ حبشی نے مکہ پر ناکام حملہ کیا تھا۔ چاہے زفرم ایک مدت سے آنا پڑا تھا لوگوں کو اس کا نشان تک معلوم نہ تھا۔ حضرت عبدالمطلب کو خواب میں بشارت ہوئی اور اور یہ کہ وہ دوبارہ کھو دا گیا۔ عبدالمطلب نے منت مانی تھی کہ اگر وہ اپنی زندگی میں اپنے دس لڑکوں کو جو ان دیکھ لیں گے، تو ان میں سے ایک لڑکا خدا کی راہ میں قربان کر دیں گے۔

جب یہ آرزو برآئی تو سب لڑکوں کو لے کر کعبہ گئے عبد اللہ کے نام، جو سب لڑکوں سے محبوب تر تھے۔ قرعہ نکلا۔ عبدالمطلب بہت پریشان ہوئے آخر میں قریش نے مشورہ سے عبد اللہ کے بجائے سواذرت قربان کر کے منت پوری کی۔ دسیرت ابن ہشام جلد اول ص ۸۲) عبد اللہ نے اس واقعہ کے بعد عبدالمطلب نے قبیلہ بنو زہرہ کے ایک معزز رئیس وہب بن عبدمنات کی لڑکی حضرت آمنہ سے عبد اللہ کی شادی کر دی۔ شادی کے محوڑے دنوں کے بعد عبد اللہ کا مدینے میں انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر پچیس سال تھی۔ عبد اللہ کی وفات کے چند ماہ بعد عین بہار کے موسم میں ۲۰ اپریل ۵۷۰ء میں ۱۲ ربیع الاول کو عبد اللہ کے گھر میں فرزند تولد ہوا۔ بوڑھے دادا عبدالمطلب



پوتے کے تولد کی خبر سن کر گھرائے اور نومولود بچے کو خانہ کعبہ میں لے جا کر اس کے لئے دعا مانگی۔ ساتویں دن عقیقہ کر کے محمد نام رکھا۔ سب قریش کی دعوت کی۔ محمد کا نام عرب میں بالکل نیا تھا۔ قریش نے اس نامانوس نام رکھنے کا سبب پوچھا۔ عبدالمطلب نے کہا۔ تاکہ میرا فرزند ساری دنیا میں مدح و ستائش کا سراوار قرار پائے۔

سیرت ابن ہشام جلد اول والیوالفداء جلد اول

### سوالات

- ۱۔ جزیرہ نمائے عرب کا مختصر جغرافیہ بیان کیجئے۔
- ۲۔ عرب کے باشندے کس نسل سے تعلق رکھتے ہیں ان کے طرز بود و ماند اور مخصوص حالات پر روشنی ڈالئے۔
- ۳۔ ظہور اسلام کے وقت عرب کی معاشرتی، سیاسی اور مذہبی حالت بیان کیجئے۔
- ۴۔ عربوں کے محاسن و معائب پر تبصرہ کیجئے۔
- ۵۔ عربوں کے قومی اخلاق و اوصاف تحریر کیجئے۔
- ۶۔ کعبہ اور قریش کے حالات بالاختصار تحریر کیجئے۔
- ۷۔ قصی بن کلاب و عبدالمطلب کے کارنامے نمایاں پر روشنی ڈالئے۔



## سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

## رسول اللہ کی ابتدائی زندگی

**تربیت** | مکہ مکرمہ کے شرفا کا دستور تھا۔ کہ وہ اپنے دودھ پیتے بچوں کو اچھی تربیت کے لئے صحرا یا دیہات میں بھیج دیا کرتے تھے تاکہ ننھے بچے کھلی اور صحت بخش تازہ ہوا میں پرورش پائیں۔

ولادت باسعادت کے چند روز بعد ابو لہب کی آزاد کردہ لونڈی ثویبہ نے آپ کو دودھ پلایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ کو بھی اسی ثویبہ نے دودھ پلایا تھا۔ بناء بریں حضرت حمزہؓ آپ کے رضاعی بھائی بھی تھے۔ چھ ماہ بعد عبدالمطلب نے اپنے پوتے کو نبی سعد کی ایک خاتون حلیمہ کے سپرد کر دیا۔ جو بچوں کی تلاش میں مکہ میں آئی ہوئی تھیں چار برس تک آپ نے حلیمہ سعدیہ کی گود میں پرورش پائی۔ پھر وہ آپ کو والدہ ماجدہ کے پاس لے آئیں۔

**مدینہ کا سفر** | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چھ برس کے ہوئے تو حضرت آمنہ آپ کو ہمراہ لے کر مدینہ تشریف لے گئیں عبدالمطلب کے نھیال مدینہ

میں تھے۔ نیز وہاں آپ کے والد محترم عبد اللہ کی قبر بھی تھی۔ واپسی پر مقام ابوا میں والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اور یتیم بچہ چھ ہی برس کی عمر میں ماں کی محبت سے بھی محروم ہو گیا عبدالمطلب کو شروع سے یتیم پوتے کے ساتھ حد درجہ محبت تھی۔ بہو کے انتقال کے بعد یہ محبت خیفگی کی حد تک پہنچ گئی ہر وقت پوتے کو ساتھ رکھتے ایک پل کے لئے آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتے آپ کی ادب شناسی اور سلیقہ نوازی کو دیکھ دیکھ کر مسرور ہوتے تھے اور آپ کے شاندار مستقبل کی پیش گوئی کیا کرتے تھے (البدایہ والنہایہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمر کے آٹھویں برس میں تھے کہ عمر رسیدہ دادا نے اس جہان



سے سفر کیا دنات سے قبل آپ کو حقیقی چچا ابوطالب کے پیرو کر گئے ابوطالب نے آپ کی خبر گیری میں کوئی کسر اٹھانے رکھی آپ کو اپنے بیٹوں سے بھی بڑھ کر چاہتے تھے بہر وقت بڑے لطف و کرم کا مظاہرہ کرتے اور جہاں جاتے ساتھ جاتے تھے۔ آپ کی ذات مبارک فیض و سعادت کا سرچشمہ تھی ایک دفعہ خشک سالی ہوئی حضرت ابوطالب نے آپ سے دعا کرائی۔ اچانک گھٹا امڈ آئی اور بارش برس گئی۔ حضرت ابوطالب نے اس واقعہ کو ایک قصیدہ میں نظم کیا۔

بارہ برس کی عمر میں آپ اپنے شفیق چچا ابوطالب کے ہمراہ  
**سفرِ شام** ملک شام تشریف لے گئے۔ گو ابوطالب آپ کو ایک لمحہ کیلئے جدا نہیں کرتے تھے لیکن چلتے وقت آپ چچا سے پیٹ گئے۔ اس لئے وہ ساتھ لے جانے پر مجبور ہو گئے۔

یہ آپ کا پہلا سفر تھا۔ اس سفر میں بچہ راہب سے ملاقات ہوئی اس نے آپ میں علامات نبوت دیکھ کر اپنی قوم کو طلب کیا۔ اور آپ کی نبوت سے ان کو مطلع کیا۔ راہب مذکور نے ابوطالب کو مشورہ دیا کہ ان کو واپس مکہ بھیجیں اور ملک شام میں ساتھ نہ لے جائیں کیونکہ یہودیوں کی طرف سے خطر ہے۔ چنانچہ آپ کو وہیں سے واپس مکہ بھیج دیا گیا۔ پھر دوبارہ آپ حضرت خدیجہ کا سامان تجارت لے کر ان کے غلام یسیرہ کے ہمراہ شام تشریف لے گئے۔ منظور راہب کی طرف جب آپ کا گزر ہوا اس نے آپ میں شان نبوت دیکھ کر یسیرہ کو آپ کے حالات سے آگاہ کیا اس نے واپسی پر حضرت خدیجہ کو سب واقعات سنائے حضرت خدیجہ نے یہ سن کر اپنے آپ کو آنحضرت کی زوجیت میں دینے کا ارادہ کیا (تاریخ ابن خلدون جلد اول)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا کے زیر سایہ پرورش پا کر  
**عالم شباب** آہستہ آہستہ جوانی کی عمر کو پہنچے مگر لڑکپن میں لڑکوں کے ساتھ کھیلے اور نہ جوانی میں جوانوں کی بری صحبت میں بیٹھے ہمیشہ بیکار مشاغل اور جاہلیت کی خرافات سے دور رہے آپ کی یاقوت اور فراست اور خوش تدبیری کی بہت قدر تھی!



امانت و دیانت کی بنا پر آپ کو "الامین" کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

**حِلْفُ الْفُضُولِ** | آپ نے اپنے ملک کے رواج کے مطابق بچپن میں کھنے پڑھنے کی طرف توجہ نہ دی۔ البتہ تجارتی لین دین خوب سیکھ لیا۔ بیس برس کی عمر میں آپ نے ایک جنگ میں حصہ لیا جسے حربِ انجار کہتے ہیں یہ لڑائی قریش اور قیس کے قبیلوں کے درمیان برپا ہوئی تھی۔ اس جنگ میں آپ نے ہتھیار نہیں چلائے صرف اپنے چچاؤں کو تیراٹھا کر دیتے تھے۔ حربِ انجار کے بعد قریش نے آنحضرت کے چچا زبیر کی تحریک سے ایک قرارداد پاس کی کہ آئندہ ہم ہر مظلوم کی مدد کریں گے۔ خواہ وہ مکہ کا ہو یا باہر کا۔ عربوں کی مدد کریں گے اور مظلوموں کو ظالموں کے پنجے سے چھڑائیں گے۔ آنحضرتؐ بھی اس معاہدے میں شریک تھے۔ آپؐ زمانہ اسلام میں فرمایا کرتے تھے کہ اگر اس معاہدے کے بدلے مجھے سرخ اونٹ دیئے جاتے تو بھی میں نہ لیتا۔ اور آج بھی اس قسم کا اگر کوئی معاہدہ ہوا تو میں اس میں شرکت کے لئے تیار ہوں۔ چونکہ اس معاہدہ میں ایسے متعدد اشخاص نے سمولیت کی تھی جن کا نام فضل تھا۔ لہذا اسے حِلْفُ الْفُضُولِ دِ بِنِصْلِ نَامِ وَالْوَلِیِّ كَا مِعَاہِدِہ) کہا جانے لگا۔

(ابن ابی شیبہ مستدرک حاکم)

**حضرت خدیجہ سے نساوی** | حضرت خدیجہ قریش کی ایک معززہ پاکیزہ اخلاق اور دولت مند بیوہ تھیں ان کا تجارتی کاروبار نہایت وسیع تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تجارتی تجربات اور دیانتداری کا شہرہ سن کر انہوں نے درخواست کی کہ میرا سامان فروخت کرنے کیلئے شاملے جلیئے جو معاوضہ میں دوسروں کو دیتی ہوں اس سے دگنا آپ کو دوں گی۔ آپ نے منظور کر لیا اور حضرت خدیجہؓ کا سامان لے کر بھری تشریف لے گئے۔ اس سفر میں حضرت خدیجہؓ کا غلام مہسیرہ بھی ساتھ تھا۔ اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ اور واپس آ کر حضرت خدیجہؓ سے بیان کیا۔ وہ آپ کے پاکیزہ اخلاق سے پہلے ہی متاثر تھیں مہسیرہ کے بیان سے مزید تصدیق ہو گئی ان کو اپنا کاروبار چلانے کے لئے ایک پاکیزہ اخلاق اور



ابن شوہر کی ضرورت تھی۔ اس لئے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کی درخواست کی آپ نے منظور فرمایا۔ اور ابو طالب نے نکاح پڑھا دیا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۲۵ سال اور حضرت خدیجہ کی چالیس کی تھی۔ پانچویں پشت پر دونوں کا نسب مل جاتا ہے۔ حضرت خدیجہ کے بطن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چار لڑکیاں ہوئیں حضرت زینب حضرت رقیہ حضرت ام کلثوم اور حضرت فاطمہ۔ چار صاحبزادے تھے حضرت تقم۔ حضرت طیب حضرت طاہر اور حضرت عبداللہ بن ہاشم۔ چاروں صاحبزادے قبل اسلام رحلت فرم گئے (تاریخ طبری۔ زرقانی۔ ابن ایشرا)

**تجدید کعبہ**  
خانہ کعبہ کی عمارت نشیب میں تھی۔ بارش کے زمانہ میں پانی بھر جاتا تھا۔ اس سے بچانے کے لئے بند بندھوایا گیا لیکن وہ ٹوٹ جاتا تھا خانہ کعبہ کی عمارت بوسیدہ ہو چکی تھی اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تشریف لائے اسے از سر نو تعمیر کرنا چاہا۔ اس وقت آپ کی عمر پینتیس برس تھی۔ جب حجر اسود لضب کرنے کا موقع آیا تو اس شرف کے حصول کے لئے قبائل میں تلواریں نکل پڑیں۔ آخر یہ طے ہوا کہ دوسرے دن سویرے جو شخص سب سے پہلے کعبہ میں آئے۔ وہی اس کا فیصلہ صادر کرے

اتفاق سے دوسرے دن سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے آپ کی امانت و دیانت پر سب کو اعتماد تھا۔ آپ نے ہتھکڑا اٹھانے کی یہ صورت نکالی کہ چادر بچھا کر حجر اسود اس میں رکھ دیا۔ اور فرمایا۔

”ہر قبیلہ کا ایک ایک آدمی چادر پکڑ کے اٹھائے جب چادر اس جگہ کے برابر آگئی جہاں حجر اسود کو لضب کرنا تھا۔ تو آپ نے اسے اٹھا کر سوزوں جگہ پر رکھ دیا اس حسن تدبیر سے ایک خونریز جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔

(تاریخ ابن خلدون جلد اول)



## سوالات

۱۔ خاندان نبوی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔ قریش نے کس طرح عروج حاصل کیا۔؟

۲۔ آغاز نبوت سے پہلے رسول اللہ کی زندگی کے اہم واقعات بیان کیجئے۔

۳۔ مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھیے۔

حلف الفضول۔ حرب بن جبار۔ بحیرہ راءب۔ حضرت خدیجہ بنت







سے دیا۔ اور کہا کہ پڑھ۔ پھر یہ آیات تلاوت کیں۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ  
خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝  
اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي  
عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ  
مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝

پڑھ اپنے خدا کے نام سے، جس نے  
پیدا کیا۔ جس نے انسان کو گوشت کے  
لوٹھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا  
خدا کریم ہے وہ جس نے قلم کو سکھایا  
وہ جس نے انسان کو وہ

باتیں سکھائیں۔ جو اسے معلوم نہ تھیں۔

آپ نے ان آیات کو دہرایا پھر وہ فرشتہ واپس چلا گیا۔ یہ جبریل امین تھے۔ تمام انبیاء  
پر وحی ان ہی کے واسطے سے آتی رہی ہے آپ گھر واپس آئے تو جلال خداوند سے لبریز تھے حضرت  
خدیجہؓ سے واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے تسلی دی کہ آپ پریشان نہ ہوں خدا کبھی آپ کا ساتھ  
نہ چھوڑے گا۔ حضرت خدیجہؓ آپ کو اپنے ایک عزیز رتہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ یہ توریت  
و انجیل کے عالم تھے انہوں نے یہ ماجرا سن کر کہا۔ یہ تو وہی ناموس ہے جو موسیٰ پر اترا تھا!  
کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا۔

جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی۔ اس وقت آپ کی مدد کرتا۔ اس کے بعد حضرت  
جبریلؑ کے ذریعہ آپ پر اصل حقیقت منکشف ہوئی اور آپ نے اپنا فرض سر انجام دینا  
شروع کر دیا۔ (بخاری شریف)

اس واقعہ کے بعد چھ ماہ تک وحی رکی رہی۔ ان ایام کو فَتْرَةٌ أَلْوَحْيِ دَوْقَةٌ  
(وحی) کا زمانہ کہتے ہیں۔ اس کے بعد ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راہ پر چلے جاتے تھے  
کہ اوپر سے ندا آئی آپ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو حضرت جبریلؑ نضا میں ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے  
نظر آئے۔ آپ پر دہشت طاری ہو گئی۔ گھر تشریف لائے اور فرمایا: دَشْرُونِي دَشْرُونِي  
مجھے چادر اٹھاؤ! گھر والوں نے تعیل ارشاد کر دی۔ تب یہ آیات نازل ہوئیں۔

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنْذِرْ ۝  
وَدَّبَّكَ فَكَبِّرْ وَتُبَّا بِكَ فَطَهِّرْ ۝

اے چادر اڑھنے والے! اٹھٹے اور لوکل  
کو غدا اب الہی سے ڈرائے اور اپنے رب



وَالسُّرْحَانَا هَجْرًا

کی بڑائی بیان کیجئے۔ اور اپنے کپڑے  
صاف رکھیے اور گندگی سے دور رہیے۔

اس کے بعد وحی کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ پہلی وحی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب  
رسالت سے آگاہ کیا گیا تھا۔ دوسری وحی میں تبلیغ و ہدایت کا حکم ہوا حضرت جبریلؑ نے  
آپ کو وضو اور نماز کا طریقہ بھی سکھایا۔ فجر اور عصر کی دو دو رکعت کی نماز فرض ہو گئی  
تاریخ طبری و ابن اثیر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام کا آغاز کر دیا لیکن

**دعوتِ اسلام**

ایک ایسی قوم کو دعوتِ اسلام دینا آسان نہ تھا۔ جو صدیوں تک  
شُرک اور ضلالت و بت پرستی میں مبتلا تھی اس لئے آپ نے پہلے خفیہ تبلیغ کو مناسب خیال  
کیا اور صرف اپنے خاص خاص دوستوں اور عزیزوں کو دعوتِ حق دی۔ جو لوگ آپ کے عادات و  
اخلاق سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے بلا تامل اس دعوت کو قبول کر لیا۔ چنانچہ عورتوں  
میں سب سے پہلے آپ کی رفیقہ حیات حضرت خدیجہؓ ہر دوں میں آپ کے رفیقِ قدیم و محرم راز  
حضرت ابوبکر صدیقؓ غلاموں میں آپ کے محبوب غلام زیدؓ نوجوانوں میں آپ کے چچیرے  
بھائی حضرت علیؓ اسلام سے مشرف ہوئے۔ آپ تین سال تک خاموشی کے ساتھ اس  
فرض کو ادا کرتے رہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ بڑے بااثر تھے۔ ان کے اثر و رسوخ سے حضرت عثمان بن عفانؓ،  
زبیر بن عوامؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، طلحہ بن زبیرؓ حلقہ بگوشِ اسلام  
ہوئے اس کے بعد اسلام کے دائرہ میں وسعت آتی چلی گئی۔ چنانچہ حضرت خیابؓ، عمار بن یاسرؓ  
سعید بن زیدؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عثمان بن مظعونؓ، ابوعبیدہؓ، صہیبؓ، اور ارقم رضی اللہ  
عنہم نے اسلام قبول کیا۔ آزاد کردہ غلاموں میں حضرت بلالؓ مسلمان ہوئے۔ اسلام کا نام رازداری  
کے باوجود دور دور تک پہنچ گیا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ باہر سے آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ حق  
پرست پر بیعت کی۔ د البیاء والنہایہ ابن کثیر



**علائقہ تبلیغ** | سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جن مقاصد کے عالم  
دجود میں آئی تھی۔ وہ چند آدمیوں کے مسلمان ہو جانے سے پورے  
نہیں ہوتے تھے۔ اس لئے تین سال کے بعد علائقہ تبلیغ کا حکم نازل ہوا۔

فَاَصْبَحَ بِمَا تَوَجَّهْتُمْ (الحجر) جس امر کا آپ کو حکم دیا جاتا ہے اسے کھل کر  
کہہ دیجئے

اس آیت کے نازل ہونے پر آپ نے کھل کر دعوتِ اسلام کا آغاز کیا۔ اس کے  
بعد وحی آئی :-

فَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (الشعراء — ۲۱۴)

”اپنے قریبی رشتہ داروں کو خدا کے عذاب سے ڈرائیے“

چنانچہ آپ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر قریش کو پکارا اور جب وہ جمع ہو گئے۔ تو آپ  
نے پوچھا۔۔۔۔۔ اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑ کی دوسری طرف تمہارے دشمنوں کا ایک  
شکر جمع ہے۔ اور تم پر حملہ کرنے والا ہے۔ تو کیا تم میرا یقین کرو گے۔۔۔۔۔ تمام قریشی سرداروں  
نے کہا۔۔۔۔۔ بیشک کیونکہ ہم جانتے ہیں۔ کہ آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔۔۔۔۔ پھر  
آپ نے ارشاد فرمایا۔۔۔۔۔

اللہ ایک ہے اور میں اس کا رسول ہوں۔ اگر تم ایمان نہ لائے اور خدا کا پیغام نہ مانا  
تو تم پر سخت عذاب نازل ہوگا۔۔۔۔۔ یہ سن کر آپ کا چچا ابو لہب بہت بگڑا اور کہنے لگا  
۔۔۔۔۔ تو (غزوۃ بالئد) ہلاک ہو۔ کیا ہمیں اسی لئے بلایا تھا۔۔۔۔۔ لوگ ناراض ہو کر  
چلے گئے۔

ابو لہب کے گستاخانہ فقرے کے جواب میں ایک سورت نازل ہوئی جس میں ابو لہب  
کی ہلاکت کی پیش گوئی تھی۔ (صحیح مسلم)

اس واقعہ کے چند دن بعد آپ نے ایک دعوت کا انتظام کیا اور عبدالمطلب کی اولاد  
کو جمع کر کے ان سے فرمایا۔

”میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دنیا و دین کی نلاح و بہبود کی ضامن ہے۔ اور اس



بارگراں کو اٹھانے میں کون میرا ساتھ دیتا ہے۔۔۔۔۔  
 رب خاموش رہے۔ حضرت علی نے جواب دیا۔۔۔۔۔ گو میری آنکھیں دکھتی ہیں۔ میری  
 ٹانگیں تپتی ہیں۔ اور نو عمر ہوں۔ لیکن میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ ان کے علاوہ سب خاموشی کے  
 ساتھ لوٹ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ کہ تم لوگوں  
 میں یہ میرا بھائی اور خلیفہ ہے۔ اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ لوگ مذاق اڑانے  
 لگے۔ اور ابوطالب سے کہا۔ کہ لو کہتے بیٹے کی اطاعت کا حکم ہو رہا ہے۔

(تاریخ طبری۔ ابن اُمیر۔ البدایہ والنہایہ)

کفار کی ایذا رسانی | اب مسلمانوں کی تعداد چالیس تک پہنچ چکی تھی اس لئے  
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن حرم میں جا کر توحید کا  
 اعلان کیا اس جرم پر مشرکین ٹوٹ پڑے حدیث بن ابی ہالہ نے آپ کو بچانے کی کوشش  
 کی اس میں وہ جان سے مارے گئے۔

یہ راہ خدا میں پہلا خون تھا اب تک مشرکین نے اسلام کی دعوت کو زیادہ اہمیت  
 نہ دی تھی۔ لیکن جوں جوں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا مشرکین  
 کی مخالفت بڑھتی جاتی تھی۔ سب قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کمر بستہ  
 ہو گئے۔ شروع میں انہوں نے سختی کے بجائے صلح و اُشتی سے آپ کو دعوت اسلام  
 سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ جب اس میں بایوسی ہوئی تو معززین قریش کا ایک وفد  
 آپ کے چچا ابوطالب کے پاس گیا۔ انہوں نے سمجھا سمجھا کر واپس کر دیا۔ لیکن آنحضرت  
 صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فریضہ سے دستکش نہیں ہو سکتے تھے۔ قریش نے جب دیکھا کہ آپ  
 کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تو دوبارہ ابوطالب کے پاس پہنچے اور ان سے کہا  
 کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کو برا کہتا ہے۔ ہمارے مذہب کی مذمت کرتا ہے اس لئے  
 یا تو تم درمیان سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ پھر میدان میں آؤ۔ کہ ہم تم فیصلہ کر لیں۔۔۔۔۔ یہ  
 صورت حال دیکھ کر ابوطالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا کر سمجھایا۔ کہ بیٹا چچا  
 پر ناقابل برداشت بوجھ نہ ڈالو اور اپنی قوم کی مخالفت چھوڑ دو۔ آپ کا ظاہری



سہارا جو کچھ تھے ابو طالب تھے۔ ان کی زبان سے اس قسم کی باتیں سن کر آپ ابدیدہ ہو گئے۔ اور فرمایا — چچا جان — خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک اٹھ بے آفتاب اور دوسرے پر ہاتھ لاکر رکھیں جب بھی میں اس فریضہ سے دستکش نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ میں کامیاب ہوں۔ یا اسی راہ میں میری جان کام آجائے۔“ ابو طالب یہ جواب سن کر سخت متاثر ہوئے اور کہا — ”جاؤ — جو دل میں آئے کرو میں کسی حالت میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔“

(سیرت ابن ہشام جلد اول صفحہ ۸۹)

جب دھمکیوں سے کچھ کام نہ چلا تو کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لاپس دینے کی کوشش کی اس مقصد کیلئے رئیس قریش عتبہ بن ربیعہ کو آپ کے پاس بھیجا اس نے مکہ کی سرداری مال و دولت کسی معزز گھرانے میں شادی غرض ہر قسم کا لاپس دیا۔ تاکہ آپ کفہ کے بتوں کو برا کہنا چھوڑ دیں — مگر آپ نے اس کے جواب میں صرف قرآن پاک کی چند آیتیں پڑھ کر سنائیں جن میں وحدانیت کی تعلیم اور شرک سے بچنے کی تلقین تھی۔ عتبہ نہایت غور سے ان کو سنارہا۔ یہاں سے واپس ہوا تو اس کا زنگ بدل چکا تھا۔ چنانچہ قریش سے جا کر کہا۔ کہ — ”مگر جو کلام پیش کرتے ہیں وہ نہ سحر ہے نہ کہانت نہ شاعری۔ وہ کچھ اور ہی چیز ہے۔ اس سے بہتر کلام آج تک میرے کانوں نے نہیں سنا میرے سامنے میں تم ان کو ان کی حالت پر تھوڑو۔ اگر وہ کامیاب ہوئے تو بھی تمہاری عزت ہے اور اگر عرب کامیاب ہوئے جب بھی تمہاری عزت ہے لیکن قریش نے ان کی رائے منظور نہ کی۔“

(سیرت ابن ہشام جلد اول صفحہ ۱۵۴)

دور ابتلا | ہر طرح بالوں زدن کے بعد قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو طرح طرح کی اذیتیں دینا شروع کیں۔ آپ کی راہ میں کانٹے

بچھا دیتے۔ ناز پڑھتے میں پشت مبارک پر نجاست کا بار لاکر لا دیتے۔ بدزبانی کرتے۔ ایک مرتبہ آپ حرم میں ناز پڑھ رہے تھے۔ عقبہ نے گردن مبارک میں اپنی چادر رسی کی طرح ڈال کر اس زرد سے کھینچی کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے آپ ان تمام سختیوں کو خذہ پیشانی کے ساتھ



برداشت کرتے تھے۔ اور اپنا فرض برابر ادا کئے جاتے تھے۔ (صحیح بخاری)

کفار مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکالیف پہنچانے کے ساتھ ساتھ عزیز اور بیس مسلمانوں پر منظام توڑنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا مجبور اور بے بس مسلمانوں پر تو عرصہ حیات ہی تنگ کر دیا۔ غلاموں پر طرح طرح کے تم ڈھاتے اور انہیں جسمانی سزائیں دیتے تھے۔ انہیں تکانے کیلئے نئے نئے انداز ستم ایجاد کئے جاتے تپتی دوپہر کے وقت گرم سنگریزوں پر لٹا کر سینہ پر بھاری پتھر رکھ دیتے۔ کہ عزیز ہلنے نہ پائیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹاتے اور اس وقت تک جنبش نہ کرنے دیتے جب تک زخموں کی رطوبت سے آگ بجھ نہ جاتی۔ پانی میں غوطہ دیتے رسی باندھ کر گھسیٹتے۔ حضرت بلال خباب، عمار، صہیب رضی اللہ عنہم اس ستم رسیدہ جماعت کے سرخلی تھے۔ مرد تو مرد عورتیں تک ان ظالموں نے ظلم سے محفوظ نہ تھیں حضرت بلال وغیرہ کی طرح حضرت سُمیرہ رضی اللہ عنہا اور لُبیدہ رضی اللہ عنہا پر بھی منظام ڈھائے گئے۔

سُمیرہ کو ابو جہل نے نینے سے چھید چھید کر ہلاک کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہما قبل از اسلام لُبیدہ کو اتنا مارتے کہ وہ حواس باختہ ہو جاتیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو ستم دیکھتے تو کہتے میں نے نہیں اس نے چھوڑا ہے کہ ذرا دم لے لوں۔ یہ پکیر استقامت جواب دیتیں۔ اگر تم اسلام قبول نہیں کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم سے یہ سلوک کرے گا۔ حضرت زُنیرہ رضی اللہ عنہا نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے اکتوں بہت دکھا اٹھائے۔ ظالم ابو جہل نے انہیں مار مار کر اندھا کر دیا۔ اور کہا کہ لات و عزیٰ نے تمہارا بیانی لے لیا ہے۔

زُنیرہ بولیں۔۔۔ لات و عزیٰ بھلا کیا ہیں۔۔۔

میرا رب میری بیانی لوٹانے پر قادر ہے اگلی صبح آنکھیں روشن ہو گئیں۔ دشمنوں نے کہا یہ لغو وبال اللہ محمد کا جادو ہے۔ (ابن اثیر۔ البدایہ والنہایہ)

اہل اسلام نے ہمت و استقلال سے مصائب کا مقابلہ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں صبر کی تلقین فرماتے تھے۔

ایک دفعہ ایک صحابی نے عرض کیا کہ آپ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کریں آپ نے فرمایا۔۔۔ تم سے پہلوں پر یہاں تک گزری۔ کہ انہیں گڑھا کھود کر اس میں کھڑا



کیا گیا۔ اور آ رہ سے دو نیم کر دیئے گئے۔ لیکن یہ بات انہیں دین سے روک نہ سکی۔ لوہے کی کنگھیوں سے ان کے گوشت اور پٹھے الجھڑ دیئے گئے۔ لیکن وہ دین پر قائم رہے۔ اس دین کو پہل تک قبول حاصل ہوگا۔ کہ صنتاء سے حضرات تک لوگوں کو سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کا خوف نہ ہوگا۔ مگر تم جلدی سے کام لے رہے ہو۔

(ترمذی شریف)

حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کا قبول اسلام | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام سے متاثر

ہو کر عمرؓ بن الخطاب مسلمان ہو گئے وہ دیگر رؤسائے قریش کی طرح اسلام اور مسلمانوں کے سخت دشمن تھے۔ اور اپنے بہن اور بہنوئی کو جو مسلمان ہو چکے تھے اسلام کے جرم میں سزا دینے لگے تھے۔ لیکن قرآن کی آیتیں سن کر مسحور ہو گئے۔ اگرچہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد خاصی ہو چکی تھی۔ لیکن وہ بڑی بے کسی کی حالت میں تھے۔ ان کے لئے علانیہ نماز پڑھنا بھی ممکن نہ تھا۔ حضرت عمرؓ بہت بہادر تھے ان کے مسلمان ہوتے ہی دفعہ حالت بدل گئی انہوں نے بھرے مجمع میں اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ مشرکین نے پہلے ان پر بڑی سختی کی۔ لیکن ان کی ثابت قدمی نے کفار کو شکست دی۔ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کو لے کر علانیہ حرم میں نماز ادا کی۔ اور اس وقت سے اسلام کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

(سیرت ابن ہشام جلد اول صفحہ ۱۸۶)

ہجرت حبشہ | رسول خدا کی پیغم کو مششوں سے جب اسلام کا دائرہ وسیع ہو گیا اور اکابر قریش حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو کفار مکہ آگے بگولا ہو گئے اور انہیں طرح طرح کی تکلیفیں دینے لگے۔ جب غریب مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا تو وہ کسی جگہ پناہ کی تلاش کرنے لگے۔ اہل عرب کے اہل حبشہ سے دستاورد مراسم تھے۔ وہاں کا عیسائی بادشاہ جس کا نام اسمعہ تھا۔ اور جو نجاشی کہلاتا تھا۔ اپنی رحمدلی اور الفت پندی کیلئے مشہور تھا۔

نبوت کے پانچویں سال مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کا ارادہ کیا تاکہ ہندو داہرہ متاثر نہ



دنيا میں وہ ایک طرف تو کفار کے مظالم سے نجات حاصل کر سکیں۔ اور دوسری طرف کامل مکیوں سے دین اسلام کی پیروی اور اشاعت بھی کر سکیں۔

مندرجہ صدر حقائق کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ حق پرستوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ جس میں گیارہ افراد اور چار عورتیں تھیں حضرت عثمان کے زیر قیادت رات کی تاریکی میں مکہ سے چلا مکہ والوں کو علم ہوا تو وہ تعاقب میں دوڑے لیکن ساحل تک جا کر مایوس لوٹ آئے۔

اتفاق دیکھے کہ مہاجرین جوں ہی ساحل پر پہنچے انہوں نے وہاں دو جہاز تیار پائے جنہیں حبشہ کو جانا تھا۔ چنانچہ وہ جہاز میں سوار ہو کر حبشہ پہنچ گئے۔ یہ لوگ تین ماہ تک حبشہ میں اقامت گزیں رہے اسی اثناء میں کسی نے یہ افواہ اڑادی کہ اہل مکہ مسلمان ہو گئے ہیں اس پر یہ لوگ واپس لوٹے مگر مکہ کے قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی۔ اب واپسی مشکل تھی۔ چنانچہ یہ لوگ چوری چھپے مکہ میں داخل ہو گئے۔

مسلمانوں کی یہ پہلی ہجرت دوسری ہجرت حبشہ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ چنانچہ کچھ ہی عرصہ بعد جب کفار اپنے مظالم میں حد سے زیادہ بڑھ گئے تو مسلمانوں کا ایک بہت بڑا قافلہ جس میں قریباً بارہ عورتیں اور ۸۲ مرد تھے۔ حبشہ پہنچے حضرت عثمان اور حضرت زرقیہ مکہ ہی میں مقیم رہے۔

(سیرت ابن مشام)

تقریباً اس ہجرت کا علم ہوا تو انہوں نے عبداللہ بن ربیعہ اور عمر بن العاص کی قیادت میں ایک دند قیمتی تحائف کے ساتھ نجاشی کے پاس بھیجا۔ انہوں نے نجاشی سے کہا۔

”مسلمان ہمارے مجرم ہیں۔ ان کو ہمارے حوالے کیا جائے۔“ نجاشی نے جب مسلمانوں سے حقیقت حال دریافت کی تو حضرت جعفر بن ابی طالب نے اس کے سامنے اسلام کے عروج اور اس کی خوبیوں کے بارے میں ایسی عمدہ تقریر کی کہ بادشاہ بہت متاثر ہوا۔ نجاشی کی فرمائش پر حضرت جعفر نے سورہ بقرہ کی چند آیتیں پڑھ کر انہیں نظام النبی کو سن



بخاشی رونے لگا۔ اور کہا انجیل و قرآن ایک ہی چراغ کی روشنیاں ہیں قریش سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ مسلمانوں کو ان کے حوائج نہیں کر سکتا۔ بخاشی نے بعد ازاں اسلام قبول کر لیا تھا اور نبی مصلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وفات کی خبر سن کر اس کا غائبانہ جنازہ بھی پڑھایا تھا۔  
حبشہ کے مہاجرین کو حکومت کی طرف سے امن و امان حاصل تھا۔ حبشہ کے بعض مہاجرین ہجرت نبوی کے فوراً بعد مدینہ پہنچ گئے۔ باقی جنگ خیبر کے موقع پر وارد مدینہ ہوئے حضرت ابو بکرؓ بھی حبشہ روانہ ہونے کے لئے تیار ہوئے تھے۔ قبیلہ قارہ کا ایک رئیس آپ کو پناہ میں لے کر مکہ واپس لایا۔ حضرت ابو بکرؓ نے چند روز کے بعد اس کی پناہ لوٹادی اور حفاظت حذادندی کو کافی خیال کیا۔

(البیہ والنہایہ)

جب قریش کی سب تدبیریں ناکام رہیں اور ان کے جور و ظلم کے باوجود مسلمانوں کی

## شعب ابوطالب میں محصوری

تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ تو قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے لئے بنو ہاشم اور بالخصوص عبدالمطلب کے خاندان کے خلاف ایک نیا قدم اٹھایا۔  
قریش نے فیصلہ کیا کہ عبدالمطلب کی اولاد اور خاندان بنوت سے قطع تعلق کر کے ان کا دانہ پانی بند کر دیا جائے۔ ان سے کسی قسم کا ربط و ضبط نہ رکھا جائے۔ مشرکین کی شرطیں ایسی تھیں کہ کوئی با اہمیت آدمی انہیں پورا کرنے کے لئے تیار نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے ابوطالب اپنے خاندان کو لے کر ایک گھاٹی میں جو انہی کی نسبت سے شعب ابی طالب مشہور تھی چلے گئے۔ اور تین سال تک انتہائی صعیبتوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔ باہر سے ان کے کھانے پینے کی کوئی چیز پہنچنے نہ پاتی تھی۔ بعض رحم دل کچھ غلہ چرا چھپا کر پہنچا دیا کرتے تھے۔ جس پر ان لوگوں کی زندگی کا دار و مدار تھا۔ آخر قریش کے چند افراد کو بنو ہاشم اور بنو مطلب کے حال پر رحم آیا اور انہوں نے طے کیا کہ اس عہد نامے کو ختم کر دیا جائے۔ اور خاندان بنوت کو شعب ابی طالب سے باہر نکالا جائے۔ چنانچہ قریش کے چند سرداروں نے یہ عہد نامہ چاک کر دیا اور جاکر بنی ہاشم کو قید سے نکال لائے۔

(تاریخ طبری و سیرت ابن ہشام)



## عام الحزن

نبوت کے دسویں برس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دو شدید صدمے پہنچے اور وہ یہ کہ آپ کے چچا ابوطالب وفات پلگئے۔ ان کی عمر

اسی برس سے زائد تھی تین روز بعد حضرت خدیجہ بھی جنت کو سدھاریں ان دو سہیلیوں کے دم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سہارا تھا۔ ان کے اٹھ جانے سے یہ سہارا جاتا رہا۔ آپ کے لئے یہ غم کا سال تھا۔ اس لئے اسے عام الحزن کہتے ہیں۔

کفار کے حوصلے بڑھ گئے۔ ان کی اب بیباکی اور سفاکی کو کون روک سکتا تھا ایک دن جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم صحن حرم میں نماز پڑھ رہے تھے۔ ابو جہل اور اس کے ساتھی قریب بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ کون ہے جو ادنیٰ کی ادب اٹھا لائے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ میں جائیں تو آپ پر ڈال دے

عقبہ اٹھا۔ قریب سے ایک ادب اٹھا لایا اور حضور جب سجدہ میں گئے۔ تو آپ کے کندھوں پر رکھ دی۔ آپ اٹھ نہ سکے۔ کفار دیکھتے تھے اور ہنستے ہنستے ایک دوسرے پر گرتے پڑتے تھے۔ حضرت فاطمہ الزہراء شریف لائیں اور آپ سے یہ بوجھ دور کیا۔

(بخاری۔ السیرہ والنہایہ)

## معراج اور فیض نماز

نبوت کے دسویں سال ۲۷ رجب کو معراج واقعہ پیش آیا۔ معراج ہی میں نماز پنجگانہ فرض

ہوئی۔

## طائف کا سفر

ابوطالب کی وفات کے بعد قریش کی شرارتیں حد سے بڑھ گئیں اس ظلم و تعدی کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

مناسب سمجھا کہ کوئی اور قبیلہ تلاش کیا جائے۔ جو اسلام کی دعوت کو قبول کرنے کی اہلیت اور استعداد رکھتا ہو۔

چنانچہ آپ نے طائف جا کر وہاں کے سرداروں کو اسلام کی طرف بلایا۔ طائف شہر مکہ سے تریبا پچاس میل دور ہے اس زمانے میں بھی یہ ایک شاداب اور پر رونق شہر تھا۔ یہاں نبوتِ حق تعالیٰ سے رقیبہ از چشم رکھتے تھے۔ آنحضرت صلی



علیہ وسلم نبوت کے دسویں سال شوال کے مہینہ میں طائف تشریف لے گئے۔ آپ کے ہمراہ آپ کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ بھی تھے۔

(ابن اثیر)

طائف کے لوگوں نے آپ کی آواز پر کان نہ دھری بلکہ اللہ ابے ادبی سے پیش آئے اور اہل مکہ سے زیادہ سنگدل ثابت ہوئے طائف کے شہر لوگوں نے پتھر مارے اور آپ کو لہو لہان کر دیا۔ آپ دُکھ سے مجبور ہو کر بیٹھ جاتے۔ تو آپ کو بازو سے پکڑ کر کھڑا کرتے آپ قدم اٹھاتے تو سنگباری کرتے۔

زید بن حارثہ نے آپ کی حفاظت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ان کے سر پر چوٹیں آئیں۔ اسخراک شہر کے بعض لوگوں نے آپ کو حفاظت میں لے لیا اور شہر سے باہر ایک باغ میں چھوڑ آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی۔

”لے خداوند تعالیٰ — تیرے ہی حضور اپنی ناتوانی دکھ سامانی کاشکوہ اور لوگوں کی ’تحقیر کا کھڑتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو ہی عاجز نواز اور میرا پروردگار ہے تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے۔ کیا ایسے ظالم سے کہ جو مجھ سے بددماغی کرے یا ایسے دشمن کے، جسے تو نے مجھ پر قدرت دیدی ہے تجھ سے عرض گزار ہوتا ہوں کہ تو مجھ سے راضی رہ — تمام — قوت تیرے ہاتھ میں ہے۔“

(ابن اثیر و ابن ہشام)

جبریل امین خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور کہا آپ فرمائیں تو یہ پہاڑ طائف والوں پر گرا دوں — آپ نے فرمایا — نہیں، مجھے توقع ہے کہ ان کی اولاد سے اہل ایمان اٹھیں گے۔“

(بخاری شریف)

طائف کے لوگوں کی بدسلوکی دیکھ کر آپ مکہ میں واپس تشریف لے آئے سَطِیْم بن عدی نے آپ کو اپنی حمایت میں لے لیا۔ اور اس کی امان میں آنے کے بعد آپ نے اور زیادہ وسعت کے



ساتھ اپنا فرض ادا کرنا شروع کر دیا۔ عام محبوں اور مسیلوں میں تشریف لے جا کر دعوت اسلام دیتے۔ دشمن اسلام ابولہب ہر جگہ ساتھ جاتا تھا اور کہتا تھا۔

”یہ دین سے پھر گیا ہے۔ جھوٹ کہتا ہے۔ اس کی باتیں زکسو۔“ مگر آپ اس کی بدگوئی اور بہتان طرازی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنا فرض ادا کرنے میں مشغول رہتے (سواہب لدنیہ از زرقانی جلد اول صفحہ ۳۶۲)

مکہ اور طائف والوں سے جب آپ دل برداشتہ ہو گئے۔ تو رحمت الہی سے اشاعت اسلام

اور دروازہ کھل گیا۔ حضور کا معمول تھا کہ حج کے زمانہ میں جب دور دراز کے قبائل اور مکہ کے قریب ٹھہرتے تو آپ ایک ایک قبیلے کے پاس جا کر توحید اور احکام الہی کی تبلیغ فرماتے اس عرصہ میں آپ نے عرب کے اکثر قبائل کو دعوت اسلام دی۔

ایک طرف حضور کی یہ جدوجہد جاری تھی۔ دوسری طرف اہل مکہ کی ایذا رسانی میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ مدینہ میں اوس و خزرج قحطانی نسل کے دو قبیلے تھے۔ اگرچہ یہ بھی مشرکین مکہ کی طرح بت پرست تھے۔ لیکن یہودیوں کی ہمسائیگی کی وجہ سے مذہبی کتابوں سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ ان پر یہودیوں کا بڑا اثر و اقتدار تھا۔ مدینہ کے قریب و حواریں ان کے بہت سے قلعے تھے۔ یہ بھی حج کے لئے مکہ آیا کرتے تھے۔

اوس و خزرج کا پیشہ زیادہ تر زراعت تھا۔ پہلے مدینہ میں ان کا بہت زور تھا لیکن خانہ جنگی میں مبتلا ہو کر قوت کھو بیٹھے۔ یہودیوں نے موقع دیکھا اور ان پر بالادستی قائم کر لی یہود ان کی باہمی عداوت کو اور ہوا دیتے تھے۔

موسم حج میں تبلیغ کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور قبائل عرب کے ساتھ قبیلہ خزرج کے چند آدمیوں کے سامنے بھی جو مکہ میں آئے ہوئے تھے اسلام پیش کیا۔ ان میں سے سات آدمیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ جب یہ لوگ وطن واپس گئے تو اسلام کا پیغام دوسرے لوگوں تک پہنچایا۔ اب یثرب کے گھر گھر میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ چاہونے لگا۔



اگلے سال نبوت کے گیارہویں برس بارہ آدمی مدینہ سے

## بیعت عقبہ اولیٰ

حج کے لئے مکہ آئے۔ عقبہ کے قریب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ملاقات ہوئی۔ عقبہ عربی میں بلند پہاڑی راستہ کو کہتے ہیں ان بارہ آدمیوں نے پہلی مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باضابطہ بیعت کی۔ یہ بیعت عقبہ اولیٰ کہلاتی ہے۔ اس کی شرائط یہ تھیں۔ کہ شرک، چوری، زنا، قتل اولاد اور بہتان طرازی سے دور رہیں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم مانیں گے۔ ان حضرات نے آپ سے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ کسی معلم کو بھیجے۔ آپ نے حضرت مصعب بن عمیر کو بھیجا۔ اوس کے سردار سعد بن عبادہ اور خزرج کے رئیس سعد بن معاذ جو پہلے اسلام کے بہت مخالف تھے مشرف باسلام ہو گئے۔ حضرت مصعب نے گھر گھر جا کر اسلام کی دعوت دی۔ ان کی کوششوں سے چند دنوں میں اچھا خاصہ اسلام پھیل گیا۔

(نور الایمان بلاذری و سیرت ابن ہشام)

اگلے سال حضرت مصعب حج کے لئے مکہ آئے تو ان کے

## بیعت عقبہ ثانیہ

ساتھ تہتمرد اور دو عورتیں تھیں۔ انہوں نے عقبہ کے مقام پر بیعت کی۔ ان لوگوں نے آپ کو یثرب چلے جانے کا مشورہ دیا۔ آپ کے چچا حضرت عباسؓ بھی جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے پہنچ گئے اور آپ کو کہا کہ سوچ سمجھ کر یثرب جانے کا فیصلہ کریں۔ حضورؐ نے ان مسلمانوں سے عہد لیا کہ یثرب میں اگر کوئی آپ پر حملہ کرے تو وہ لوگ آپ کی مدافعت کریں گے۔ سب نے آپ کی ہدایت پر عمل کرنے اور اسلام کی خاطر لڑنے کا عہد کیا۔

قریش نے آپ کے یثرب چلے جانے کا ارادہ کا حقوڑا سا چرچا ہوا۔ لیکن ان مسلمانوں کے سوا کسی کو اس واقعہ کا صحیح علم نہ تھا۔ اس لئے معاملہ دبا رہا۔ اس کے بعد جو لوگ اسلام لائے یثرب چلے جاتے۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے اہل یثرب کے مسلمانوں کے ہر خاندان کا ایک سردار مقرر کر کے کل بارہ سردار بنا دیئے جو اپنے اپنے خاندان کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے۔



## سوالات

۱۔ آپ کی زندگی میں دعوتِ اسلام کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بنی مضر کے لوگوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کا خلاصہ لکھیے۔

۲۔ حبشہ کی پہلی اور دوسری ہجرت کے اسباب و حالات کی تفصیلات بیان کیجئے۔

۳۔ رسولِ کریم کے قیامِ مکہ کے دوران اسلام کو کس قدر فروغ حاصل ہوا مختصر بیان کیجئے۔

۴۔ مکہ میں قیام پذیر ہوتے ہوئے آنحضرت کے ابتدائی ساتھیوں نے جو تکلیفیں اٹھائیں ان کا مختصر حال بیان کیجئے۔

۵۔ بیعتِ عقبہ اولیٰ و ثانیہ سے کیا مراد ہے۔ تفصیلاً لکھیے۔

۶۔ شعبِ ابی طالب میں محصوری کے واقعات لکھیں۔



# ہجرت مدینہ

**ہجرت کے اسباب** | سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے آبائی شہر مکہ کو خیر آباد کہہ کر مستقل طور پر مدینہ منورہ چلا جانا اور وہاں پر ایک آزاد اسلامی ریاست قائم کرنا تاریخ اسلام کا ایک زریں باب ہے اور یہیں سے اس اسلامی سلطنت کا آغاز ہوا جو آگے چل کر تمام روئے زمین میں دین حق کی اشاعت کا باعث بنی۔ ہجرت کے سبب ذیل اسباب تھے۔

**۱۔ کفار کی ایذا رسانی** | کوئی شخص بخوشی اپنے آبائی وطن کو ترک نہیں کرنا چاہتا۔ اشاعت اسلام کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تکالیف اٹھانی پڑیں اور جس طرح کفار مکہ نے دعوت اسلام کے سلسلہ میں رکاوٹیں ڈالیں انہوں نے آپ کو مجبور کر دیا کہ آپ نبوت کے فرائض منصبی کی ادائیگی کے لئے اللہ کے حکم کے مطابق کوئی ایسی جگہ تلاش کریں جہاں اہل اسلام اطمینان قلب اور پوری تندرہی سے اپنے فرائض ادا کر سکیں۔ اس طرح کفار کی ہٹ دھرمی اور ایذا رسانی ہجرت مدینہ کا باعث بنی۔

**۲۔ مسلمانوں پر مظالم** | کفار قریش نے نہ صرف آنحضرت کو جھٹلایا بلکہ خود ذات اقدس اور دیگر مسلمانوں پر کھلم کھلا سختیاں شروع

کریں غریب اور غلام مسلمان جن میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ جیسے عظیم اور صاحبِ عزم و استقامت صحابی شامل تھے خاص طور پر سخت مہیبت میں مبتلا تھے۔ ان مصائب سے بڑھ کر وہ معاشی و معاشرتی تعلق تھا جس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم



کے خاندان کو تین سال تک نہایت بد حالی میں شعب ابی طالب میں زندگی بسر کرنا پڑی۔  
مختصر یہ کہ مکہ میں مسلمانوں پر زندگی اجیرن ہو چکی تھی۔ چنانچہ آپ مسلمانوں کی تکالیف  
کے ازالہ اور دین اسلام کیلئے سازگار ماحول پیدا کرنے کے لئے مکہ چھوڑ کر مدینہ تشریف لے  
جانا چاہتے تھے۔

۳۔ ہجرت حبشہ کی کامیابی

ہجرت حبشہ کے کامیاب تجربے نے مسلمانوں  
پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اپنے وطن سے دور رہ  
کر ہی اپنے خالق حقیقی کی عبادت آزادی سے کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک تو وہ جگہ بہت دور تھی  
دوسرے وہاں کا بادشاہ ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا۔ اس لئے حبشہ میں دعوت اسلام کا کام  
انجام دینا آسان نہ تھا۔ لہذا ہجرت کے لئے مدینہ سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی۔

۴۔ رسول اللہ کے قتل کی سازش

مزیہ برآں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
نے مکہ چھوڑنے کا ارادہ اس وقت کیا جب  
کفار نے آپ کو قتل کرنے کی سازش کی۔ بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد مدینہ میں جب اسلام پھیلنا  
شروع ہوا تو کفار آگ بگولا ہو گئے۔

ایک رات بہت سے قبیلوں کے افراد نے مل کر آپ کو قتل کرنا چاہا۔ آپ کو اس سازش  
کا برداشت پتہ چل گیا۔ اور آپ نے مکہ چھوڑ کر مدینہ میں آباد ہونے کے ارادے کو عملی شکل دینے  
کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اور تمام ساتھیوں کو ہجرت کیلئے ہدایات دیں۔

۵۔ اہل مدینہ سے آنحضرت کے مراسم

مدینہ کا شہر مکہ سے جانب شمال  
ناہموار پتھر کی سطح پر واقع ہے چاروں  
طرف پہاڑ ہیں۔ شہر میں داخل ہونے کے لئے تنگ درے ہیں۔ شمالی جانب کھلی ہے۔ مدینہ  
قریباً دس میل طول و عرض میں پھیلا ہوا ہے۔ آج کل مدینہ ایک گنجان آباد شہر ہے مرکزی  
اور قدیم ترین بستی کا نام یثرب تھا۔ اس کے نام سے سارا شہر یثرب کہلاتا تھا۔ آنحضرت وہاں  
تشریف لے گئے۔ تو اس کا نام مدینۃ النبی رجبی کا شہر پڑا۔ رفتہ رفتہ مختصر ہو کر صرف  
مدینہ کہلانے لگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کو طیبہ بھی کہا کرتے تھے۔ مدینہ میں دو قسم



لوگ آباد تھے۔

۱ :- یہود

۲ :- اوس و خزرج کے قبیلے۔ جو بعد میں انصار کہلائے۔

یہودیوں میں تین قبیلے زیادہ ممتاز تھے۔

۳ :- بنو قینقاع

۲ :- بنو شریظہ

۱ :- بنو نضیر

یہود کا ذریعہ معاش صفت کاری۔ کھیتی باڑی۔ سود خوری اور تجارت تھا۔ مدینہ کی منڈیوں اور بازاروں پر ان ہی کا تسلط تھا ان کا سودی جال بہت دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ یہود کفار کے غازی ضرور تھے مگر مدینہ نہ تھے۔ مکہ کے مقابلہ میں مدینہ مالداروں اور زمینداروں کا شہر تھا۔ مگر یہاں کے لوگوں میں اتحاد مفقود تھا۔ وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ عرب قبیلوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو پناہ دی اور ہر طرح کی مدد کا وعدہ کیا۔ اس لئے ہجرت کے بعد یہ لوگ "انصار" (مددگار) کہلائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ کے لوگوں سے ہجرت کے وقت ہی تعلق قائم نہیں ہوا بلکہ اس سے پہلے بھی ان کے مدینہ والوں کے ساتھ گہرے مراسم تھے۔ آنحضرت کی والدہ مدینہ کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس طرح مدینہ آپ کا ننھیال تھا۔ جب آنحضرت ص کی عمر چھ سال کی تھی۔ تو آپ نے اپنی والدہ کے ساتھ مدینہ جا کر چند روز بیتام بھی کیا تھا۔

نبوت کے دسویں سال سے آپ کا مدینہ کے لوگوں سے براہ راست تعلق پیدا ہوا اس سال آپ نے حج کے موقع پر جو اہل مدینہ آئے تھے۔ ان کو دعوتِ اسلام دی۔ دوسرے سال مدینہ کا ایک بارہ اشخاص پر مشتمل وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ نبوت کے بارہویں سال حج کے موقع پر مدینہ کے ۷۳ آدمی پوشیدہ طور پر آنحضرت سے عقبہ کے مقام پر ملے اور اسلام قبول کیا۔ یہ بیعت عقبہ ثانیہ کہلاتی ہے اس وفد کی واپسی کے بعد مدینہ کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ مکہ کے مسلمان رفتہ رفتہ مدینہ میں پناہ گزین ہو گئے۔ یہاں تک کہ مکہ میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکرؓ، حضرت علیؓ اور چند دیگر صحابہ رہ گئے۔



## ہجرت نبوی

ہجرت سنت انبیاء علیہم السلام ہے۔ اسلام کی پہلی ہی صدی  
سن کردرقہ بن نوفل نے ہجرت کی پیشگوئی کی تھی۔ نبوت کے پانچویں  
برس صحابہ کی ایک جماعت حبشہ کی طرف ہجرت کر گئی تھی۔ باقی جماعت کے لئے مناسب وقت کا  
انتظار تھا ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت مدینہ سے پہلے خواب میں دیکھا تھا کہ آپ  
نخلستانی زمین میں ہجرت کر گئے ہیں آپ کا خیال تھا کہ یہ یامہ کی سرزمین ہوگی۔

دخبا ری و مسلم

خداوند کریم نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار قریش کے مذموم ارادہ سے  
آگاہ کیا اس لئے آپ عازم مدینہ ہوئے۔ آپ کے ذمہ اہل مکہ کی کچھ امانتیں تھیں حضرت علی  
کو بلا کر یہ امانتیں سپرد کیں اور فرمایا۔

”میں آج مدینہ روانہ ہو جاؤں گا۔ تم میرے پلنگ پر سو رہو۔ صبح کو سب امانتیں بنچا  
دینا۔“ خدا کو بلا پناہ دینا مکمل کرنا تھا اس لئے مشرکین کو نیندا گئی۔ اور انہیں غافل  
پاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر نکل آئے اور پر حسرت لہجے میں فرمایا۔  
”کہ تو مجھے ساری دنیا سے زیادہ غریز ہے۔ لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں  
دیتے۔“

پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لائے یہاں سامان سفر پہلے سے تیار تھا۔ فوراً  
دونوں روانہ ہو گئے۔ اور مکہ سے تین میل چل کر غار ثور میں روپوش ہوئے تین دن تک  
اس غار میں مقیم رہے۔ اس اثناء میں حضرت ابو بکر صدیق کے صاحبزادے عبداللہ رات  
کو غار میں ساتھ رہتے اور صبح سویرے مکہ چلے آتے اور وہاں کے حالات کا پتہ چلا کر شام کو  
آکر ان کو اطلاع دیتے۔

ادھر مکہ میں جب محاصرہ کرنے والوں کی آنکھیں کھلیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے  
بجائے حضرت علی کو بستر پر پایا۔ یہ بہت کمسن تھے اس لئے معمولی تہنہہ کر کے چھوڑ دیا اور حضور  
کی تلاش میں نکلے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار ثور کے دہانہ تک پہنچ گئے۔ حضرت ابو بکر رضی  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال سے گھبرائے آپ نے اطمینان دلایا۔ ”گھبراؤ نہیں



خدا ہمارے ساتھ ہے۔

اس اعتماد نے دستگیری کی۔ اور تلاش کرنے والوں کی نظر آپ پر نہ پڑی اور وہ ناکام لوٹ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چوتھے دن غار سے نکل کر آگے بڑھے قریش نے اعلان کر رکھا تھا۔ کہ جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر کے لائے گا۔ اس کو سوا دن دیتے جائیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ سے نکلنے وقت ایک شخص سراقہ بن جحشم نے دور سے آپ کو دیکھا تھا۔ لیکن اس کو پورا یقین نہ تھا۔ قریش کے اعلان کے بعد وہ بھی تعاقب میں نکلا۔ اور تلاش کرتے کرتے قریب پہنچ گیا۔ لیکن اس کے گھوڑے نے پیسٹھ کریں کھائیں اور قریب پہنچ کر اس کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ ان بدشگونوں سے اسے خیال ہلا کہ یہ آثار تو کچھ اور ہیں۔ اس لئے اس نے گرفتاری کا خیال ترک کر دیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب جا کر آپ کو قریش کے اعلان سے آگاہ کیا۔ سراقہ لوٹ گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے۔

(بخاری — باب الحجرة)

آپ صبر کے ذریعہ عام راستہ چھوڑ کر ایک دوسرے راستے سے شرب روانہ ہوئے حضرت عمر نے مدینہ میں پہنچ کر بتا دیا تھا۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عنقریب مدینہ میں رونق افروز ہونے والے ہیں۔ بدھیز روز اسلحہ سے مزین ہو کر شہر سے باہر آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتظار میں اُنکھیں فرش راہ کئے رہتے۔ اور دپہر کی تپش سے مجبور ہو کر لوٹ جاتے ایک دن لوگ اسی طرح ستم کش انتظار ہو کر مگروں کو جا چکے تھے۔ کہ ایک یہودی نے اپنے تلوے سے نکل کر ایک سعید پوشی تانہ دیکھا وہ بے اختیار پکار اٹھا۔

”اے گروہ عرب! جن کا ہمیں انتظار تھا۔ وہ تشریف لارہے ہیں۔ تکبیر کا کلمہ بلند ہوا اور خلق خدا اٹھ اُٹھی یہ دو شنبہ کا روز تھا۔ اور ربیع الاول کی بارہ تاریخ۔“

(بخاری البدایہ والنہایہ - ابن اثیر)

قبائیس وروو :- مدینہ کا جنوبی حصہ تھا کہلاتا ہے جناب سرود کائنات صلی اللہ علیہ



دلم یہاں کے ایک رئیس کلثوم کے اہل اناست گزین ہوئے۔ تین روز بعد حضرت علی بھی تشریف لے آئے پیدل چلنے کی وجہ سے ان کے پاؤں سوج گئے تھے۔ حضور نے انہیں سینے سے لگا لیا۔ آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے۔ آپ نے حضرت علیؑ کے پاؤں پر لعابِ مبارک لگایا۔ پاؤں ایسے کھٹک ہوئے۔ کہ زندگی بھر دوبارہ شکایت نہ ہوئی۔

### (کامل این اٹیرا)

قبائیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ روز قیام فرمایا۔ یہاں آپ نے ایک مسجد کی بنا رکھی جسے مسجد قبایا مسجد تقویٰ کہتے ہیں تعمیر مسجد کے بعد مدینہ روانہ ہوئے راستہ میں نبی سالم کے محلہ میں پہلی نماز جمعہ ادا کی۔ سارا مدینہ استقبال کے لئے ٹوٹ پڑا تھا تباہی سے مدینہ تک دورویہ انصار کی قطاریں تھیں سارا مدینہ جوش استقبال میں اٹھ آیا۔ عورتیں گاتی ہوئی چھتوں پر چڑھ گئیں۔ معصوم لڑکیاں دن بجا بجا کر گاتی تھیں۔ جب حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان کے پاس پہنچے۔ تو سب سے مزبانی حاصل کرنے کیلئے سخت کشمکش ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ میری اونٹنی خدا کی طرف سے مامور ہے وہ جہاں جا کر بیٹھ جائے گی۔ وہی میری قیام گاہ ہوگی۔ چنانچہ یہ سعادت حضرت ابو ایوب کے حصہ میں آئی۔ آپ نے سات ماہ ان کے یہاں قیام فرمایا۔

حضرت ابو ایوب کے مکان سے متصل زمین کا ایک ٹکڑا بیکار پڑا تھا۔ یہاں قبرستان تھا۔ اور کھجور

### مسجد نبوی کی تعمیر

کے کچھ درخت تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تعمیر مسجد کا ارادہ کیا۔ زمین کے مالک بنو بخار کے دو یتیم بچے سہل اور سہیل تھے۔ انہوں نے زمین مفت دینا چاہی مگر آپ نے منظور نہ فرمایا۔ اور حضرت صدیق اکبرؓ سے قیمت دیوادی تعمیر کا کام شروع ہوا آپ نے حسب عادت مزدوروں کی طرح اس میں حصہ لیا۔ مسجد کی دیواریں کچی اینٹوں کی ستون کھجور کے تنوں کے اور چھت بتوں کی تھی۔ قریب ہی نادار مسلمانوں کے لئے ایک چبوترہ تعمیر فرمایا۔ جو تاریخ



میں صفحہ کے نام سے مشہور ہوا اس مسجد کو مسجد البقی کہا جاتا ہے مسجد سے متصل آنحضرت کی سکونت کیلئے ایک مکان بنایا گیا جس کے دو چھوٹے سے کمرے تھے ایک حضرت سوادہ رضی اللہ عنہا کے لئے اور ایک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لئے۔ مسجد کی طرح یہ بھی کچھ تھے۔

امام زہریؒ اور شعبیؒ سے مروی ہے کہ تعمیر کعبہ

## سینا بھری کا آغاز

سے پہلے عرب حضرت ابراہیم کے آگ میں ڈالے جانے کے واقعہ سے تاریخ کا حساب کرتے تھے۔ پھر جب کعبہ کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ تو عرب تعمیر کعبہ سے تاریخ کا حساب کرنے لگے۔ صحابہ انصاری کے واقعہ کے بعد عربوں نے اس واقعہ سے تاریخ کا حساب لگانا شروع کیا۔ یہ طریقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک جاری رہا۔ حضرت سعید بن المسیب کے بیان کے مطابق حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سب کو جمع کر کے پوچھا۔ کس دن سے تاریخ لکھی جائے۔ حضرت علیؑ نے کہا جس روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی اور کفر و شرک کی سرزمین کو خیر آباد کہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کو قبول کر لیا۔

مؤرخ طبری کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲ ربیع الاول بروز شنبہ مدینہ تشریف لائے تو گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول کریم کے مدینہ وارد ہونے سے دو ماہ بارہ دن قبل۔ یعنی محرم سے جو سال کا پہلا مہینہ ہے۔ تاریخ کی ابتدا کی ہے۔

(تاریخ طبری جلد اول)

مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد نماز باجماعت کا اہتمام

## اذان کی ابتداء

تو ہو گیا تھا مگر ابھی اذان کا حکم نہیں ہوا تھا۔

صحابہ میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا۔ کہ نماز کے لئے مسلمانوں کو کیسے بلایا جائے۔ اس ضمن میں مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ کوئی آدمی نماز کے لئے پکارا کرے اس کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ نماز کے وقت الصلوات جامعۃ پکارا کرتے تھے۔ ایک دن حضرت عبداللہ بن زید انصاریؒ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے۔ کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص قبر رو ہو کر اللہ کی



اللہ اکبر لپکار رہا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ یہ خواب سچا ہے پھر حضرت عمرؓ نے آکر اسی قسم کا خواب سنایا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے اس سے پہلے بذریعہ وحی اذان کا حکم مل چکا ہے۔ چنانچہ حضرت بلال کو اذان دینے کے لئے مامور کیا گیا۔

(بخاری و مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ کہ دو شنبہ کے دن رسول کریم

## دو شنبہ کے دن کی اہمیت

پیدا ہوئے۔ دو شنبہ کے دن آپ کو نبوت ملی۔ دو شنبہ کے دن آپ ہجرت کے لئے نکلتے چلے۔ دو شنبہ کے دن دینے پہنچے اور دو شنبہ کے دن آپ کی ذات ہوئی۔

(تاریخ طبری جلد اول)

مواخات بھائی چارہ کو کہتے ہیں عزیز الوطن جن کو اسلامی اصطلاح میں مہاجر کہتے ہیں بالکل بے سروسامان مدینہ

## مواخات

آئے تھے۔ اگرچہ ان میں بہت سے مالدار بھی تھے۔ لیکن ایسی حالت میں وطن چھوڑا تھا۔ کہ کوئی چیز مکہ سے ساتھ نہ لاسکتے تھے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا بہارا قائم کرنے اور ان کی اجنبیت دور کرنے کے لئے ان میں اور انصار میں رشتہ اخوت قائم کر دیا۔ یہ اخوت حقیقی رشتہ داری سے بڑھ گئی۔ اس موقع پر انصار نے جس اثبار و نیاہنی کا ثبوت دیا۔ تاریخ اس کی مثال سے قاصر ہے۔ انہوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنے مال و دولت زمین و جائیداد، کھیتی باڑی اور اپنی سب کائنات میں برابر کا شریک کر لیا۔ اس کی حد یہ ہے کہ حضرت سعد بن ربیع نے جن کے دو بیویاں تھیں ایک بیوی کو طلاق دے کر اپنے مہاجر بھائی حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کے سامنے نکاح کیلئے پیش کرنا چاہا۔ لیکن انہوں نے اظہار تشکر کے ساتھ اس سے انکار کر دیا (بخاری - کتاب المناقب) اکثر مہاجرین نے کھوٹے سرمایہ سے تجارتی کاروبار شروع کر دیا۔

مدینہ کے یہودی بڑے دولت مند تھے انہوں نے اپنی حفاظت کے لئے مدینہ کے اطراف میں چھوٹے چھوٹے مضبوط

## میشاق مدینہ



قلعے بندے ہوئے تھے۔ یہودی بڑے بزدل اور کم ہمت تھے لیکن دوسروں کو لڑانا اور سازشیں کرنا ان کا فطری رجحان تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ انصارِ مدینہ باہم لڑتے جھگڑتے رہیں۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دور رس نگاہوں سے مدینہ کے حالات کا جائزہ لیا۔ اور سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مدینہ کے یہودیوں سے تحفظِ امن کی خاطر ایک معاہدہ لکھوا لیا۔ اس معاہدہ کو صحیفہ مدینہ یا میثاقِ مدینہ کہتے ہیں اس معاہدہ کی شرائط حسب ذیل تھیں۔

۱۔ مدینہ کے سب لوگ امن و امان سے رہیں گے۔ اور امن و امان کے قیام میں برابر کے شریک ہوں گے۔

۲۔ سب شرکائے معاہدہ ایک جماعت ہوں گے۔

۳۔ بیرونی حملہ کی صورت میں دونوں فریق مل کر دشمن کا مقابلہ کریں گے۔

۴۔ فریقین ایک دوسرے کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

۵۔ اس معاہدے کو تسلیم کرنے والے مدینہ کو حرمِ مابین گئے۔ اور اس میں فساد نہیں کریں گے۔

۶۔ وہ ایک دوسرے سے نیک بنتی، خیر خواہی اور مہربانی سے پیش آئیں گے

۷۔ اہل ایمان متفرق و منسلکوں کی مدد کریں گے۔

۸۔ اگر مسلمانوں میں سے کوئی شخص ظلم و تعدی کا مرتکب ہوگا۔ تو سب نیک دل

انسان اس کی مخالفت کریں گے۔

۹۔ کوئی فریق قریش کو پناہ نہیں دے گا۔

۱۰۔ ایک فریق کے حلیف دوسرے کے بھی حلیف سمجھے جائیں گے۔

۱۱۔ فریقین کے مابین جھگڑے کی صورت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ

قطعاً ہوگا۔

۱۲۔ فریقین کو دینی آزادی حاصل ہوگی۔



۱۳۔ ہر گز وہ اپنے اپنے محلہ کے امن و ضبط کا ذمہ دار ہوگا۔

۱۴۔ والستہ قتل کرنے والے سے قصاص یا جلتے گا۔

۱۵۔ ہر مجرم اپنے جرم کا وبال خود اٹھائے گا۔ اس کا حلیف ذمہ دار ہوگا۔

۱۶۔ مشترکہ جنگوں میں یہود اور یومنین کے اخراجات مشترکہ ہوں گے۔

(سیرت ابن ہشام)

اس معاہدہ کا بہت نائدہ ہوا۔ مسلمان بلا امتیاز نسل و خون ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے رہنے لگے۔ دین اسلام کو ہر دنیوی تعلقات پر ترجیح دی گئی۔ انفرادی مقاصد کے مقابلے میں قومی مفاد کو بالاتر سمجھا جانے لگا۔ شہری آزادی سب کیلئے یکساں ہو گئی۔ مسلمان اطمینان سے تبلیغ کرنے لگے۔ دراصل یہ معاہدہ ایک سیاسی اور سماجی منشور تھا۔ جس کے ذریعہ اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ معاہدہ اسلام کے سیاسی نظام میں ایک رنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور دوسری طرف آنحضرتؐ کی سیاسی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ نہ صرف عرب بلکہ ساری دنیا میں اس منشور نے نئے سیاسی فکر و نظر کی بنیاد رکھی۔ خاندانی قبائل اور وطنی تعلقات کو ختم کر کے دینی اور فکری تعلقات پر حکومت کی اساس قائم کی۔ رنگ و نسل کے امتیازات مٹا کر دین اسلام اور عقیدہ توحید کو اتحادِ قوی کا ذریعہ بھڑھرایا۔

اب تک مسلمان بیت المقدس کی جانب جو یہود و نصاریٰ کا

## تحويل کعبہ

قبلاً کعبہ نماز پڑھتے تھے۔ اسلام ایک مستقل مذہب ہے۔ اس کے استقلال و اختصاص کے لئے مستقل قبلہ کی ضرورت تھی۔ اسلام ملتِ ابراہیم کی تجدید کے لئے آیا تھا۔ اس لئے اس کا قبلہ ابراہیمؑ ہی کا بنا کر وہ خانہِ خدا ہو سکتا تھا چنانچہ ہجرتِ مدینہ کے ترہویں مہینہ کے شروع میں بیت المقدس کی بجائے کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم نازل ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر چڑھ کر اس بارے میں خطبہ پڑھا اور دو رکعت نماز کعبہ کی طرف رخ کر کے ادا فرمائی۔ یہ محدث ابن حزم کی روایت ہے بعض تحويل قبلہ کو ہجرت سے اندھیرے میں مہینہ کے آغاز کا واقعہ بتاتے ہیں۔

(تاریخ ابن خلدون جلد اول)



ہجرت مدینہ کا واقعہ تاریخ اسلام میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ہجرت کو اسلام

## ہجرت کے ثمرات

کی فتح عظیم تر اردیا۔ قریش کو ہجرت کا اتنا تعلق تھا۔ کہ چھ برس بعد جب حدیبیہ کی صلح ہوئی تو یہ شرط بکھوائی کہ آئندہ کوئی مسلمان مکہ سے ہجرت نہیں کرے گا۔ ہجرت سے مقصود ایک محفوظ مرکز کی تلاش تھی جہاں قریش اسلام کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈال سکیں۔ ہجرت کا اصل مقصد مدینہ میں ایک دماغی تعمیر اور تبلیغی مرکز قائم کرنا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا۔ کہ ہر مسلمان وہاں پہنچ کر اس کی قوت کا سبب بنے ہجرت سے جو نتائج مطلوب تھے۔ وہ ایک ایک کر کے حاصل ہوئے۔

۱۔ مکہ میں مسلمان ایک اقلیت کی حیثیت میں تھے مدینہ پہنچ کر یہ اقلیت اکثریت میں بدل گئی۔ زہنی گہرا پنہاں ہوا۔ ہر قسم کی مذہبی سیاسی اور اقتصادی آزادی سے نوازے گئے۔ اب ایسے مختار اسلامی ریاست کے ذمہ داران شہزاد بن گئے۔

۲۔ مکہ کے ہزاروں نظام و ماحول سے نبات مل گئی۔ مسلمانوں کو ایک ایسا گھر مل گیا جہاں وہ اطمینان کے ساتھ اپنے اصولوں کی تبلیغ کر سکتے تھے۔ مکہ میں رہ کر مسلمان اپنے مفاد کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے۔ مگر مدینہ میں رسول اللہ نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو اسلامی رنگ دیا۔

۳۔ مدینہ کے مستحارب قبائلی شیر و شکر ہو گئے۔ رسول اکرم نے مہاجرین و انصار کو رشتہ اخوت و انسائیت اور ایثار میں ایسا باندھا کہ وہ ایک ہی خاندان کے افراد نظر آنے لگے۔ آپ نے نسل و قوم، رنگ اور زبان کے فرق کو مٹا دیا۔

۴۔ ہجرت مدینہ سے یہود کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ میثاق مدینہ کی رو سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کا حاکم اعلیٰ تسلیم کر لیا گیا۔ مکہ میں رسول اللہ کی حیثیت ایک مذہبی رہنما کی تھی مگر ہجرت کے بعد آپ نہ صرف مذہبی پیشوا بلکہ سیاسی امور کے بھی رہنما بن گئے تھے۔



۵۔ اسلام کی نشر و اشاعت میں پیش بہا اضافہ ہوا۔

۶۔ عبادت کی آزادی ملی۔ مسجدیں تعمیر ہوئیں اور رضائیں اذان کی صداؤں سے گونجنے لگیں اذان کے ذریعہ سلطوتِ اسلام کا گویا ڈنکا بجنے لگا۔

۷۔ مکہ میں مسلمانوں کی معیشت محدود تھی اب انہیں تجارت کا میدان ملتا ہوا تھا۔

۸۔ ظالموں کے مقابل میدانِ جنگ میں اترنے کی آیات نازل ہوئیں اسلامی جہاد کے ذریعے باطن کا اضافہ ہوا۔

۹۔ مدینہ کی غیر مسلم آبادی کے ساتھ ایک معاہدہ طے ہوا جو اس ریاست کا گویا آئین تھا۔ اسلام کو پہلی بار دیگر ملتوں کے مقابل علی الاعلان برتری حاصل ہوئی۔

۱۰۔ مدینہ میں مسلمانوں کو زندگی کا ٹھکانہ ملا۔ مدینہ نے دارالاسلام بن کر ان کے لئے

آغوشِ محبت ڈال دی۔ مکہ میں سب نمازیں دو دو رکعت تھیں جیسے سفر میں

حکم ہے۔ مسلمان مدینہ میں پہنچے تو گویا اصلی وطن میں وارد ہوئے۔ یہاں حضر کی نماز

پوری چار چار رکعت ادا کرنے کا حکم نازل ہوا۔

مکئی زندگی پر تبصرہ | بعثت کے بعد تیرہ سال تک حضور مکہ میں رہے۔

جب آپ نے دعوتِ اسلام کا آغاز کیا تو مکہ والوں نے

اس کی زبردستی مخالفت کی یہ لوگ صدیوں سے جس مذہب کی پیروی کرتے چلے آئے

تھے اسے دفعتاً چھوڑ دینا آسان نہ تھا۔ چنانچہ آپ کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا

پڑا۔ ابتداءً صرف چند آدمیوں نے اسلام قبول کیا لیکن آپ نے انتہائی صبر و تحمل

اور عزم و حوصلہ سے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔

آپ کی سعی سے دور دراز کے قبائل تک حق کی آواز پہنچ گئی۔ جو لوگ صدیوں

سے بت پرستی اور اعمالِ قبیحہ میں مبتلا تھے۔ ان کی ایک دم کایا بیٹ نہیں ہو سکتی تھی

ذہنی تبدیلی کے لئے وقت دوکار تھا۔

حضورؐ کا پاکیزہ کردار اور اسلام کی سچی اور سادہ تعلیمات آہستہ آہستہ مخالفین

کو متاثر کر رہی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی تصادم کے بغیر بہت سے لوگوں نے اسلام



قبول کر لیا۔ بلکہ مدینہ کے لوگ بھی اسلام سے متاثر ہونے لگے۔ اگر گہری نگاہ ڈالی جائے تو اسلام کے مستقبل کی مصبوط دیوار مکہ ہی میں تعمیر ہونی شروع ہو گئی تھی یہ دوسری بات ہے کہ اس کا اصلی مرکز بننے کے لئے بارگاہِ ازلی سے مدینہ کو منتخب کیا گیا تھا۔

مسلمانوں نے قریش کے ہاتھوں جو مصائب برداشت کئے اس نے بھی بہت سے لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آخر اس دین میں وہ کیا خصوصیات ہیں جن کے لئے یہ لوگ تمام تکالیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے ہیں۔ آخر کار اسی غور و فکر نے ان کے لئے راہِ ہدایت کھول دی۔

اگر ابتدائی مشکلات تین سال کی نظر بندی اور تیشہ بے نلہم دستم کو پیش نظر رکھ کر حضور کی مکی زندگی پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا۔ کہ ان تین سالوں میں زبردست کامیابی حاصل کی تھی۔ کسی نظریہ کی اشاعت کا ابتدائی زمانہ ہی سب سے مشکل اور اہم ہوتا ہے۔

آپ نے ان تمام مراحل کو بڑے تدبیر سے طے کیا اور جس وقت تک سچھوڑا اس وقت اسلامی ریاست کی بنیادیں استوار ہو چکی تھیں۔ اور جانثارانِ اسلام کی ایک ایسی مصبوط جمعیت بھی تیار ہو گئی تھی۔ جس نے مدنی عہد کی عظیم فتوحات کو ممکن بنایا۔

## سوالات

- ۱۔ ہجرت مدینہ کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے بتائیے کہ یہ واقعہ تاریخ اسلام میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔
- ۲۔ کن واقعات نے رسول کریم کو مدینہ میں ہجرت کرنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے مدینہ پہنچ کر مسلمانوں کی حفاظت کے کیا انتظامات کئے۔
- ۳۔ ميثاق مدنیہ کیا مراد ہے اس کی اہمیت اور بڑی بڑی دفعات بھی بیان کیجئے۔
- ۴۔ رسول مقبول کے انصار مدینہ سے تعلقات کا مختصر حال تحریر کیجئے۔
- ۵۔ ہجرت کے فوائد و ثمرات بیان کیجئے۔
- ۶۔ مکی زندگی میں آپ کس حد تک کامیاب رہے۔ ان حضور کی مکی زندگی پر تبصیر کیجئے۔



## غزوات النبی

”سنور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے اور مسلمانوں کو ایک جائے پناہ مل جانے کا تشریح کو سخت رنج تھا وہ تین سو میل دور بیٹھے بھی حد کی آگ میں جل رہے تھے جب ان کا معلوم ہوا کہ مسلمان مدینہ میں بڑے امن و امان سے زندگی بسر کر رہے ہیں اور اسلام کو بڑا فروغ ترقی حاصل ہو رہا ہے تو ان کی آتش غضب اور بھڑک اٹھی۔ انہوں نے اسلام کو مٹانے کے لئے سب سے موثر طریقہ یعنی جنگ کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔

مدینہ میں مسلمانوں کو پورا اطمینان میسر نہ تھا کیونکہ منافقین اور یہودی مسلمانوں کی ترقی سے خوش نہ تھے۔ اور کفار سے ساز باز کر رہے تھے۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جہاد کے احکام موصول ہوئے۔ جہاد ذاتی حفاظت اور دین کے تحفظ کی خاطر راہِ خدا میں لڑنے کا نام ہے۔

مندرجہ ذیل امور غزوہ بدر کے محرک ثابت ہوئے۔

۱۔ جب سے مسلمان مدینہ آئے تھے۔ کفار مگر اس کو شیش میں تھے کہ ان کی یہ جائے پناہ بھی چھین لی جائے چنانچہ

### غزوہ بدر کے اسباب

انہوں نے مدینہ کے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کوکھا۔

”تم نے ہمارے آدمی کو پناہ دی ہے یا تو محمد کو مدینہ سے نکال دو۔ یا قتل کر دو۔

ویرہ ہم تم پر حملہ کر کے ہمیں تباہ کر دیں گے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کا پتہ چلا تو عبداللہ کے پاس جا کر اس کو سمجھایا



جس سے وہ کوئی عملی قدم نہ اٹھا سکا۔ ادھر قریش نے مدینہ کے یہودیوں سے بھی خط و کتابت شروع کر رکھی تھی۔ چنانچہ کفار مکہ پیور اور منافقین کی یہ سازشیں معرکہ بدر کی صورت میں نمودار ہوئیں۔

۲ :- کفار مکہ اپنے کو کعبہ کا پاسبان خیال کرتے تھے۔ وہ شرک اور بت پرستی کو دین تصور کرتے تھے اس کا تحفظ وہ اپنا فرض مضبی جانتے تھے۔ ان کو ڈر تھا کہ اس میں غفلت کی تو عرب کی روحانی پیشوائی سے اٹھ دھو بیٹھیں گے۔

۳ :- کفار مکہ انصار کے بھی دشمن ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کی پشت پناہی کرتے تھے۔ انہیں یہ خطرہ دامنیگر تھا کہ اگر مسلمانوں کے قدم مدینہ میں جم گئے تو کہیں وہ شام کا راستہ بند کر کے ان کی تجارت کو ختم نہ کر دیں۔ جس پر کہ ان کی معاشی خوشحالی کا اعضار تھا۔ اس لئے انہوں نے ہر قیمت پر مسلمانوں کو مدینہ سے لگانے کا فیصلہ کر لیا۔

۴ :- مدینہ کی نوزائیدہ شہری مملکت کو اور مضبوط کرنے اور کفار کی شرارت کا سدباب کرنے کے لئے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارد گرد کے بہت سے قبائل سے سیاہی معاہدے کئے تریشی نے اسے جنگی تیاری تصور کر لیا اور رطائی پر آمادہ ہو گئے۔

۵ :- ایک تریشی سردار گرز بن جابر فہری نے مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کر کے مسلمانوں کے کچھ مویشی چھین لئے چنانچہ آئندہ ایسے حملوں کا سدباب کرنے کے لئے مسلمانوں نے بھی چھوٹے چھوٹے ہتھیار بند دستوں کو اپنی سرحدوں کی حفاظت پر مامور کر دیا۔ تاکہ دشمن کو یہ معلوم ہو جائے کہ مسلمان تیار ہیں اور ہر وقت شام کا تجارتی راستہ بند کر کے ان کی اقتصادی خوشحالی کو ختم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مدینہ سے مکہ طور پر مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کی تجاویز پر غور کرنا شروع کر دیا۔

۶ :- سرحدوں پر مامور دستوں میں سے ایک دستے کے سردار عبداللہ بن جحش بھی تھے۔ اتفاق سے وہاں پر قریش کے ایک چھوٹے سے قافلے سے ان کی بھڑپ ہو گئی۔ جس میں عمرو بن الحفزی نامی ایک تریشی مارا گیا۔ اور دو گرفتار ہوئے۔ کچھ مال غنیمت بھی اٹھا آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب پتہ چلا تو بہت ناراض ہوئے کفار مکہ اس خبر سے سخت برہم ہوئے اور اس



طرح ابن المحضری کا قتل اہل مکہ اور مسلمانوں کے درمیان ایک مستقل جھگڑے کا باعث بن گیا۔  
 ۷۔ ابن المحضری کے قتل کے بعد ایک اور واقعہ فوری طور پر جنگ بدر کا باعث بنا۔ قریشی سردار ابوسفیان کی سرکردگی میں قریش کا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ ساروسامان سے لدا ہوا شاہ سے مکہ واپس آرہا تھا۔ راستے میں اسے ابن المحضری نے قتل کا قصہ معلوم ہوا اسے ڈر پیدا ہوا کہ کہیں مسلمان قافلے کو لوٹ نہ لیں۔ چنانچہ اس نے رئیس مکہ ابوجہل کو دکھا کہ اس کی مدد کو پہنچے یہ شخص مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن تھا اس نے مشہور کر دیا کہ مسلمانوں نے ہمارے تجارتی قافلے پر حملہ کر دیا ہے۔ چونکہ اس قافلے میں اکثر قریش کا روپیہ لگا ہوا تھا۔ اس لئے قریش کا ایک لشکر مسلمانوں سے زلزلے کے لئے مدینہ کی طرف چل پڑا۔ ادھر ابوسفیان راستہ بدل کر صحیح سمت نہ پہنچ گیا۔ چنانچہ کفار کے لشکر نے جو نواح مدینہ میں پہنچ چکا تھا واپس کا ارادہ کیا۔ ابوجہل نے ان سے کہا کہ آپ آئے ہیں تو مسلمانوں کو ختم ہی کیوں نہ کرتے چلیں تاکہ روز بروز کا جھگڑا ختم ہو جائے۔

خلاصہ یہ — کفار نے حملہ کی غرض سے مدینہ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا اور شہر سے ۸۰ میل دور بدر کے مقام پر فرودکش ہو گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان حالات کی اطلاع ہوئی۔ تو آپ نے صحابہ کو جمع کیا۔ اور واقعہ بیان کیا۔

## غزوہ بدر

مہاجرین جنگ کے لئے تیار تھے لیکن حضور انصار کا ارادہ معلوم کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ انہوں نے بیعت کے وقت یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر دشمن مدینہ پر حملہ کرے گا تو ہم تلوار اٹھائیں گے۔ سعد بن عبادہ تبید خزرج کے سردار نے اٹھ کر عرض کیا۔ کہ کیا حضور کا اشارہ ہماری طرف ہے۔ خدا کی قسم آپ حکم دیں تو ہم سندر میں کود پڑیں۔ یہ سن کر حضور کا چہرہ چمک اٹھا۔ غرض ۱۲ رمضان المبارک ۳ھ میں ۳۱۳ مسلمانوں کو لے کر جن میں ساٹھ مہاجرین اور باقی انصار تھے۔ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ اسی اثنا میں قریش کا لشکر جس میں ایلہزار پیدل اور سو سوار تھے عقبہ بن ربیعہ کی قیادت میں مدینہ کے قریب پہنچ کر مناسب جگہوں پر قبضہ کر چکا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چاہ بدر کے قریب اس کی اطلاع ملی آپ وہیں بھڑ



گئے۔ یمن قریب کوئی کنواں نہ تھا۔ اس لئے آئے بڑھ کر ایک چشمہ پر خمیرہ زن ہوئے اور  
رات بھر دعائیں مضرورت ہے۔ صبح کو فوج مرتب کر کے دعا فرمائی۔

”خدا یا!۔۔۔ تو نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اسے پورا کر۔۔۔ اگر آج تیرے یہ  
چند بندے مر گئے۔ تو پھر قیامت تک تیری عبادت کرنے والا اور کوئی  
نہ ہوگا۔“

(سیرت ابن ہشام)

یہ بڑے استحسان و ایتلا کا موقع تھا۔ جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ تو  
مسلمانوں کو نظر آیا کہ خود اہل کے بزرگ اور ان کے جگر پارے تلواروں کے سامنے ہیں لیکن  
اسلام کی محبت نے تمام رشتوں کو بھلا دیا تھا۔ چنانچہ میدان جنگ میں حضرت ابو بکر رضی  
کی تلوار اپنے لخت جگر عبد الرحمان کے مقابلہ میں بے نیام رہتی حضرت عمر رضی کی تلوار اپنے  
ساموں کے خون سے رنگیں ہوئی حذیفہ رضی کو اپنے والد عتبہ کے مقابلہ میں آنا پڑا۔

پہلے فرداً فرداً مقابلہ ہوا اور دونوں فوجوں میں سے ایک ایک آدمی میدان میں  
آیا۔ مقتول عمر بن الحضرمی کے بھائی عامر کو حضرت عمر رضی کے غلام نے قتل کیا۔

قریش کے سپہ سالار عتبہ کا کام حضرت حمزہ رضی اور حضرت علی رضی نے تمام کیا۔ عتبہ نے  
بھائی شیبہ کو علی رضی کی تلوار سے ختم کیا۔ عبیدہ بن سعید کو حضرت زبیر نے مارا اس کے بعد  
عام جنگ شروع ہو گئی۔ اور دونوں فوجیں آپس میں گتھ گتھیں۔ حضور نے مسلمانوں کی صفوں  
کو خود درست کیا تھا آپ کے ہاتھ میں ایک تیر تھا۔ اس کے اشارے سے ترتیب قائم  
فرماتے جاتے تھے۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں کفار کی فوج تلگنی تھی۔ ان کا ساز و سامان بھی  
بہت عمدہ تھا۔ مگر کے تمام سربراہان اور بہادر موجود تھے۔ دوسری طرف نصرت و مایہ  
خداوندی مسلمانوں کے شامل حال تھی۔

درد نصاریٰ نوجوان معوذ اور معاذ ابو جہل کی تاک میں تھے۔ ابو جہل کو دیکھتے ہی  
اس کا کام تمام کر دیا۔ ابو جہل نے لڑنے سے جھپٹ کر معوذ پر تلوار تار یا اترنا  
سے ٹک گیا۔ صرف تیر لگا رہ گیا۔ مگر وہ اس وقت بھی لڑتے رہے۔ شاہو ہوا ہاتھ



تو ارچلانے میں مزاحم ہوتا تھا اس لئے تسرہ کاٹ کر الگ کر دیا۔ جنگ تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابو جہل کی لاش ڈھونڈو۔ ایک صحابی نے دیکھا تو ابھی اس میں کچھ جان باقی تھی انہوں نے داڑھی سے پکڑ کر کہا۔ کیا تم ابو جہل ہو۔ اس نے سرور سے جواب دیا۔ کیا مجھ سے بڑھ کر کوئی شخص ہو سکتا ہے۔ کیا ہوا جو تم نے مجھے قتل کر دیا۔  
(بخاری کتاب المغازی)

مشرکین نے تیر لاکھ میدان جنگ میں پھوڑ کر مہلکے ستر گرفتار ہوئے سارا ساز و سامان مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ حضرت علی کی مشہور تلوار ذوالفقار اسی جنگ میں بہت آئی۔ مسلمان شہداء کی تعداد چودہ تھی۔ آٹھ الفجار تھے اور چھ مہاجرین ابو جہل کے علاوہ قریش کے اور بھی کسی پوٹے کے سردار مارے گئے۔ ان میں اسید بن خلف بھی تھا جو حضرت بلال پر ظلم کیا کرتا تھا۔ مشرکین کے سب مردوں کو ایک کڑھے میں ڈال کر دفن کر دیا گیا۔  
(صحیح مسلم)

فتح کی خوشخبری دو قاصدوں کے ذریعہ مدینہ کو روانہ کر دی گئی۔ لوگوں کو مشرکہ بن کر حیرت ہوئی جب قیدی پہنچے تو پورا یقین آیا۔ آنحضرت نے تین روز بدر کے میدان میں قیام فرمایا۔ پھر عازم مدینہ ہوئے۔

(النبایہ والنہایہ)

مشرکہ بدر کے سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کے لئے نکلے تھے۔ تو آپ کی بیٹی حضرت رقیہ زوجہ عثمان بیمار تھیں آپ ان کی تیمارداری کے لئے حضرت اسامہ بن زید اور حضرت عثمان کو پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ جب قاصد فتح کی بشارت لے کر مدینہ پہنچا تو حضرت رقیہ کو دفن کیا جا رہا تھا۔

تین سو تیرہ پیدل آدمیوں کا جو پوری طرح مسلح بھی  
**فتح کے اسباب** نہ تھے۔ ایک ہزار کی جمیعت پر جس میں سو مسلح سوار بھی شامل تھے غلبہ پانا تا تیر ہائی کے سوا کسی طرح ممکن نہ تھا تاہم اس کے کچھ ظاہری اسباب بھی تھے۔



۱۔ مسلمانوں کی قیادت رسول اللہ کے ہاتھ میں تھی جن پر مسلمانوں کو پورا بھروسہ تھا۔ وہ جان نثاری کے جذبہ کے ساتھ میدان میں آئے تھے۔ اور ان کو اپنی فتح کا یقین تھا۔

۲۔ قریش میں اتحاد مفقود تھا۔ قائد شکر عبیدہ لوطی کے خلات تھا۔ ابو جہل نے اس کو لڑنے کے لئے مجبور کیا تھا۔ میدان جنگ میں کفار قریش ایک پہ سالار کے ماتحت ہو کر نہیں لڑتے تھے ہر نامور سردار اپنے آپ کو سالار فوج سمجھتا تھا۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو پوری تنظیم کے ساتھ حرکت میں لانے تھے جبکہ کفار میں نظم و ضبط موجود نہ تھا۔

۴۔ لڑائی سے ایک روز پہلے رات کو بارش ہو گئی تھی۔ چونکہ مسلمان دوپہا جبکہ یہ تھے اسی لئے وہ جگہ اور بہتر ہو گئی۔ کفار شیب میں تھے۔ اس لئے ان کی قیام گاہ میں کچر ہو گئی۔ اور ان کے مسلح سواروں کو چلنے پھرنے میں دشواری ہوئی۔

۵۔ لڑائی کے وقت سوز مسلمانوں کی پشت پر تھا اور کفار کے سامنے تھا اس لئے باعث ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں۔

۶۔ کفار مسلمانوں سے مرعوب ہو گئے تھے اور ان کی تعداد ان کو دہنی نظر آئی تھی۔

۷۔ شروع کے انفرادی مقابلہ میں کفار کے تین مشہور سردار مطلبہ ولید اور شیبہ مارے گئے اس سے ان کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔

۸۔ مسلمان رات بھر آرام سے سو کر تازہ دم اٹھے تھے اس کے برعکس قریش بے اطمینانی کی وجہ سے پریشان رہے تھے۔

یہ معرکہ اسلام کی شوکت و ہیبت اور دبدبہ کا نگ بنیاد بنا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدر کی

**غزوة بدر کے نتائج**

اہمیت آئی تھی کہ جن اشخاص نے اس میں حصہ لیا تھا وہ قطعاً طور پر جنتی قرار دے دیئے گئے۔

۲۔ سورہ آل عمران نے پیش نظر جنگ بدر سردار معجزہ تھی۔ اس جنگ میں اللہ



تعالیٰ کی وہ پیشین گوئیاں پوری ہوئیں۔ جو مسلمانوں سے مکہ میں کی گئی تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ فلاں کا فلاں قتل گاہ ہے۔ میدان جنگ میں یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔

۳۔ فتح بدر نے اسلام کو فوقیت و برتری بخشی اور باطل کو مٹا کر دنیا بھر میں اشاعتِ دین کے دروازے کھول دیئے۔ آنحضرت اب صرف داعی نہ تھے بلکہ اسلام کی حفاظت کرنے والے سرکبھت مجاہد بھی تھے۔ غزوہ بدر میں تاجدارِ رسل صلی اللہ علیہ وسلم کے پر والوں نے تاریخ کے صفحات پر دینی عزت اور قومی حمیت کے لازوال نقش ثبت کئے تھے صداقت کا ایسا نیرت انزور دس دے گئے کہ دنیا میں وہی قوم زندہ رہتی ہے جو اللہ کی راہ میں دل کی خوشی سے خون کی زکوٰۃ ادا کرے۔ اس جنگ سے سارے عرب میں موحدین کی دھاک بیٹھ گئی۔ قبائل نے جان لیا کہ مسلمان کوئی تر نوالہ نہیں۔

۴۔ قریش کے بڑے بڑے سردار مارے گئے ان کے جہنم رسید ہونے سے جہاں ایک طرف قریش کی قوت ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ وہاں مسلمانوں کو بہت تقویت حاصل ہوئی۔

۵۔ مدینہ میں اسلامی اقتدار کے پادوں جم گئے مدینہ کے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے بھی بظاہر اسلام قبول کر لیا۔

۶۔ قریش کی معاشی حالت گر گئی مدینہ کی شاہراہ بند ہو جانے سے شامی تجارت کا سلسلہ رک گیا۔

۷۔ فتح بدر سے مسلمانوں کے لئے بہت بڑھ گئے اور انہیں تائید انزوی کا یقین ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی بھی دشمن کی کثرت سے مرعوب نہ ہوئے

۸۔ غزوہ بدر کی فتح کے نتیجے میں یہودی اور زیادہ حاسد ہو گئے اور ان کی سازشوں کی وجہ سے ہر وقت خدشہ رہنے لگا۔

۹۔ جنگ بدر کے بعد پہلی مرتبہ صلح و جنگ سے متعلق قوانین مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی اور اس طرح اسلام میں بین الاقوامی قوانین کی بنیاد پڑی۔



۱۰۔ اس جنگ سے یہ ثابت ہو گیا کہ فتح و کامرانی کے لئے ساز و سامان اور فوج کی تعداد ہی ضروری نہیں بلکہ اللہ کی راہ میں عزم راسخ اور یقیناً محکم ہی اصل کامیابی ہے۔

ذوالحجہ ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

## ۲۔ کے دیگر واقعات

نے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی حضرت فاطمہ کی شادی حضرت علی سے کر دی۔ حضرت فاطمہ کی عمر اس وقت اٹھارہ برس کی تھی حضرت علی کے پاس ایک زرہ تھی ایک بھینٹ کی کھال اور ایک پرانی چادر تھی یہ سب چیزیں مہر میں حضرت فاطمہ کو دے دیں۔ اسی سال صدر نظر کا حکم نازل ہوا ابو لہب نے جنگ بدر کے سات روز بعد چیمپک سے وفات پائی۔ لڑکے لوگ طاعون اور چیمپک کے مردے سے بھاگ جاتے تھے ابو لہب کے بیٹے گھر سے نکل گئے اس کی لاش سے بدبو پھیل گئی۔ تو لوگوں نے مجبور ہو کر شہر سے باہر نکالی اور دور سے پتھر پھینک پھینک کر ڈھانپ دیا۔

۲ھ میں رمضان کے روزے فرض ہوئے اور پہلی مرتبہ عید گاہ میں نماز عید ادا کی گئی

(طبقات ابن سعد ذوقانی جلد دوم)

## غزوة احد

مدینہ منورہ کے شمال میں تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ ہے جسے احد کہتے ہیں یہ پہاڑ شرقاً غرباً پھیلا ہوا ہے۔ کوہ احد کے دامن میں مسلمانوں اور کفار کے درمیان ایک جنگ ہوئی۔ جو تاریخ اسلام میں غزوة احد کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل اسباب تھے۔

۱۔ جنگ بدر میں ناکامی کا داغ دھونے اور قریش کے بڑے سرداروں کے قتل کا بدلہ چکانے کے لئے قریش نے زبردست

## اسباب وجوہ

تیاری شروع کر دی۔ ابوسفیان کو سپہ سالار مقرر کیا۔ مشرکین مکہ اور عرب قبائل کو مسلمانوں کے خلاف خوب بھڑکایا گیا۔ سال بھر ساز و سامان جمع ہوتا رہا ابوسفیان نے قسم



کھائی کہ جب تک میں مسلمانوں سے بدلہ نہ لے لوں گا نہ نہادوں گا اور نہ سر میں تیل ڈالوں گا۔  
 ۲۔ مکہ کے رئیس صفوان نے جس کا باپ بدر کے میدان میں مارا گیا تھا۔ ایک شخص عمیر  
 بن وہب کو آمادہ کیا کہ یہ شہید طور سے مدینہ جا کر محمد کو قتل کرادے جس نہاد عرض اتار  
 دوں گا۔ اور تمہارے اہل و عیال کا خرچ اٹھاؤں گا۔ دونوں نے نہایت رازداری سے  
 کام لیا۔ عمیر نے تلوار زہر میں بھجوائی اور مدینہ پہنچا۔ مسجد نبوی کے دروازے پر جا کر  
 ازبٹ بٹھایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھ لیا اور بارگاہ نبوت میں عرض کیا کہ عمیر کی نیت  
 نیک معلوم نہیں ہوتی چند صحابہ نے پکڑ کر اسے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے  
 وہ تمام گفتگو بیان کر دی جو عمیر اور صفوان کے درمیان ہوئی تھی۔ عمیر نے اقرار کیا اور  
 کہا۔ کہ اس کا علم میرے اور صفوان کے سوا کسی کو نہ تھا۔ آپ سچے نبی ہیں اور میں اسلام  
 لاتا ہوں۔ صفوان کی مراد پوری نہ ہوئی۔ عمیر مسلمان ہو کر لوٹا اور اس کا تبلیغ سے کئی  
 آدمی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ دیگر مشرکین بھی اس قسم کی سازشوں میں مشغول رہا کرتے  
 تھے۔ (سیرت ابن ہشام)

۳۔ بدر کی شکست سے قریش پر یہ حقیقت واضح ہو گئی۔ کہ مسلمان جب چاہیں شام کا تجارتی  
 راستہ بند کر کے ان کی اقتصادی ناکہ بندی کر سکتے ہیں چنانچہ اپنی معیشت کو برقرار رکھنے کے  
 لئے انہوں نے مدینہ کی اسلامی ریاست کو گھٹانا ضروری خیال کیا  
 ۴۔ قریش نے شام سے آئے ہوئے تجارتی قافلے کا سارا نفع مسلمانوں کے خاتمہ کے لئے الگ  
 کر لیا تھا۔ اور زور شور سے تیاریاں کر رہے تھے۔

۵۔ قریش کے ایک خاص وفد نے مختلف قبائل کا دورہ کر کے انہیں مسلمانوں کے خلاف  
 دیر انداز کیا۔

۶۔ جب بن اشرف یہودی مدینہ سے چل کر نکلا آیا۔ اس نے قریش کو مسلمانوں کے خلاف  
 جھڑکایا۔ جو اس ایگز ستر کہے اور قریش کی مدد کا عہد کیا۔

(البدایہ والنہایہ)



## جنگ کے واقعات

کفار قریش ماہ شوال ۳ھ میں بڑے ساز و سامان سے جانب مدینہ روانہ ہوئے حضرت عباسؓ نے جو اسلام لا چکے تھے اور مکہ ہی میں مقیم تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خفیہ اطلاع بھجوا دی اس فوج میں سات سو زره پوش اور دو سو سوار تھے۔ کمان ابو سفیان نے سجھائی قریشی سپاہ مدینہ پہنچی تو مغزبانہ سے ہو کر شہر کی شمالی جانب میں پڑاؤ ڈالا یہ لوگ بدھ کے روز پہنچے اور آہستہ آہستہ اُحد کی طرف بڑھنے لگے۔

بہشت کے روز تک ان کے خیمے اُحد کے میدان میں لگ گئے۔ جمعہ کے روز صبح کو آپؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا اکثر مہاجرین اور مختبر بہ کار انصار نے مشورہ دیا کہ شہر میں پناہ گزین ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ لیکن جو شیعے نوجوان باہر نکل کر صف آرائی کرنا چاہتے تھے ان کے اصرار پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہزار مسلمانوں کے ساتھ اُحد کی طرف جہاں مشرکین مکہ خیمہ زن تھے بڑھے۔ عبداللہ بن ابی منافق بھی تین سواروں کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ہوا تھا۔ مگر پھر غار رنگ کر کے واپس لوٹ گیا اور مسلمانوں کی تعداد صرف سات سو رہ گئی۔ اُحد پہنچ کر پہاڑ کی پشت پر صف آرائی ہوئی۔ پہاڑ کی پشت سے مشرکین کے حملے کا خطرہ تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس آدمیوں کا دستہ اس کی حفاظت پر متعین کر کے تاکید فرمادی کہ قلعہ دشکت کسی حال میں بھی تم لوگ اپنی جگہ نہ چھوڑنا قریشی تعداد اور ساز و سامان ہر چیز میں مسلمانوں سے زیادہ تھے۔ انہوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ صف بندی کی۔ عیمنہ پر خالد بن ولید۔ علیہ رہ پر عکرمہ بن ابی جہل سواروں پر صفوان بن امیہ تیر اندازوں پر عبداللہ بن ربیعہ علم مملو کے ہاتھ میں تھا۔ قریش کے لشکر سے پہلے ابو عامر اور پھر طلحہ دار لشکر طلحہ آگے بڑھا اور طنز یہ لپکارا۔

کون ہے جو مجھے جہنم بھیجے یا میں اسے جنت میں پہنچا دوں اس کے جواب میں حضرت علیؓ نے ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کے بعد عام جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت علیؓ نے حضرت حمزہؓ اور ابو جہلہ انصاریؓ نے بے پناہ حملوں سے مشرکین کی صفیں درہم برہم کر دیں حضرت حمزہؓ نے جوش شجاعت میں دور تک دشمن کی صفوں میں گھستے چلے گئے۔ مجیبہ بن مطعم



کے غلام وحشی نے جو آپ کی تاک میں تھا نیزہ مار کر شہید کر دیا۔

(بخاری)

قریش بڑی بہادری سے لڑ رہے تھے۔ ان کے علمبردار بیہیم قتل ہو رہے تھے۔ لیکن علم سرنگوں نہیں ہونے پاتا تھا۔ حضرت علیؑ اور ابو دجانہ انصاری کے حملوں نے آخر قریش کے پاؤں اکھڑا دیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک تلوار تھی۔ آپ نے اسے دکھا کر فرمایا۔ کون اس کا حق ادا کرے گا۔ حضرت ابو دجانہ اٹھے اور سوال کیا۔ یا رسول اللہ۔ اس کا حق کیا ہے۔ فرمایا۔ اس کو دشمن پر چلاتے جاؤ۔ جتنے کٹیڑھے ہو جلتے۔ عرض کیا۔ میں یہ خدمت بجا لاؤں گا۔ حضور نے تلوار انہیں عطا فرمائی ابو دجانہ نے سر پر سرخ رومال باندھا جو جنگ کے وقت ان کی علامت ہوتا تھا۔ نخر کی چال سے صفوں کے درمیان نکلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تمہارے اس چال سے ناراض ہوتا ہے لیکن ایسے موقع پر نہیں ابو دجانہ دشمن کی صفیں چیرتے ہوئے پہاڑی کے دامن میں پہنچے تو مکہ کی عورتیں دف بجاری بھیتیں ایک نغمہ نوازی کر رہی تھیں۔ ابو دجانہ نے اس کے سر پر تلوار تولی اور پھر روک لی۔ انہیں پسند نہ آیا کہ سرد کائنات کی تلوار ایک عورت کے خون سے آلودہ ہو۔ یہ عورت ہندہ زوجہ ابو سفیان تھی۔

(البدایہ والنہایہ)

بہادریں دیکھتے ہی دیکھتے دشمن پر چھا گئے۔ دشمن کے بیس سے زائد آدمی مارے گئے مگر گن گن کر بھاگے۔ ان کی عورتیں بھاگتی ہوئی نظر آئیں اسلامی فوج غنیمت پر بھی پہاڑ کی پشت پر جو دستہ متعین تھا اس نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اس کے ہٹتے ہی خالد بن ولید نے پشت سے حملہ کر دیا۔ مجیر بن مطعم نے جواب تک اپنی جگہ پر تھے چند جاں بازوں کے ساتھ رد کا گرسب شہید ہوئے۔ خالد نے بڑھ کر لوٹنے والے مسلمانوں پر حملہ کر دیا یہ لوگ بالکل غافل تھے اس لئے وہ ناگہانی حملہ کی تاب نہ لاسکے اور ایسے بدحواس ہوئے کہ اپنے بیگانے کی تیز نثری۔ ایسی ہی میں ایک دوسرے کو مارنے لگے۔ مصعب بن عمیر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے شہید ہو گئے اور یہ خبر اڑ گئی۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت پائی۔ اس خبر نے مسلمانوں کے ہر سبے اداں بھی خطا کرتے اور بڑے بڑے بہادروں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ



علیہ وسلم کے گرد صورت بارہ جاں نثار باقی رہ گئے۔ لیکن ذوالفقار حسیدی اس وقت بھی بجلی کی طرح چمک رہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے دل شکستہ ہو کر تلوار پھینک دی کہ اب لڑنے سے کیا حاصل ہے۔

ابن نصر انصاریؒ نے کہا — اب زندہ رہ کر کیا کریں گے۔ اور لڑتے لڑتے ہنسید ہو گئے۔

(بخاری و سیرت ابن ہشام)

بہت سے جاں نثار اب بھی لڑ رہے تھے۔ عین اس وقت کعب بن مالکؓ کی نظر آپ پر پڑی۔ انہوں نے پہچان کر لپکارا مسلمانوں — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر ہیں۔ یہ آواز سنتے ہی ٹوٹی ہوئی ہمت پھر بندھ گئی۔ اور مسلمان اس طرف اُگے کفار نے بھی ہر طرف سے سمت لڑا دھر کا رخ کیا۔ ان کا ریلادیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دی۔ کون مجھ پر جان دیتا ہے۔ اس آواز پر سات انصاری بڑھے اور ایک ایک کر کے نثار ہوتے گئے۔

(صحیح مسلم)

عبداللہ بن قعیم بڑھتے بڑھتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گیا اور چہرہ انور پر تلوار ماری آہنی خود کی دو کڑیاں رخسار میں پورست ہو گئیں یہ دیکھ کر جان نثاروں نے آپ کو حصار میں لے لیا۔ ابو جابر آپ کے سامنے جھک کر سینہ سپر ہو گئے جو تیرا آتا تھا اسے پیٹھ پر رکھتے تھے۔ حضرت طلحہؓ تلوار کے دار اٹھ پر رکھتے تھے۔ ایک ہاتھ کٹ کر الگ ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تیروں کی بارش ہو رہی تھی لیکن رحمت عالم کی زبان پر اس وقت بھی یہ الفاظ تھے

”ہذا یا میری قوم کو بخش دے وہ جانتے نہیں۔“

چہرہ انور سے خون جاری تھا حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ نے زخم دھویا اور چٹائی کا ٹکڑا جلا کر اسے زخم میں مچھرا اس سے خون رک گیا۔

(صحیح بخاری جلد دوم)



مشرکین کا حملہ رکا تو آپ چند جان نثاروں کے ساتھ پہاڑی کے اوپر چڑھ گئے مگر  
کی فوج میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر پھیل گئی۔ ابوسفیان نے اس کی  
اقتدائی کے لئے پہاڑی پر چڑھ کر آواز دی۔

”محمد یہاں ہیں۔۔۔۔۔“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو جواب دینے سے  
منع کر دیا۔ ابوسفیان نے جواب نہ پا کر ابو بکرؓ کو آواز دی اس پر بھی جب کوئی جواب نہ  
دلا تو اس نے لغزہ لگایا۔ کہ ”سب مار سکے۔“

حضرت عمرؓ سے صنبلہؓ ہوسکا بولے۔۔۔۔۔ ”دشمن خدا۔ ہم سب زندہ ہیں۔“  
یہ سن کر ابوسفیان نے ہیل کا لغزہ لگایا۔ اُحِبُّ اَھْلَہٗ جِئَہُ صحابہؓ نے  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جواب دیا۔ اللہ اعلیٰ و اَجَلٌ ”مسلمانوں کے  
سنبھلنے کے بعد قریش کی ہمت لپٹ ہو گئی۔ اور وہ لوٹ گئے۔

(بخاری۔ لغزہ احمد)

اس ستر کے میں ستر مسلمان شہید ہوئے جن میں زیادہ تر انصار تھے۔ حضرت حمزہؓ جیسے نامور  
بہادر نے بھی اسی جنگ میں جہلم شہادت کو شہ کیا ان کو جبیر بن مطعم کے ایک حبشی غلام وحشی نامی  
نے شہید کیا۔ جبیر کا ایک چچا بدر کی جنگ میں مارا گیا تھا۔ وہ اس کا انتقام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
کے چچا سے لینا چاہتا تھا۔ اس نے وحشی سے وعدہ کیا تھا کہ تم نے یہ کام انجام دیا تو آکر ہو کر دوں گا  
وحشی سے ہند نے بھی بہت انعام کا وعدہ کیا تھا۔ یہ سب ہند کے باپ طیبہ کو حضرت حمزہؓ نے فرود  
پدر میں ہٹاک کیا تھا۔

وحشی نے کارزار میں حضرت حمزہؓ کی گھات میں رزم حضرت حمزہؓ کو قتل کر دیا۔  
کی صفیں الٹا ہے۔ کہ وحشی نے اورٹ میں بیٹھ کر حرم گھمایا۔ اور ناک کر حضرت حمزہؓ پر پھینکا  
جو ان کے زیر ناست لگا۔ حضرت حمزہؓ نے ہند سے ہند نے ان کا پیٹ چاک کیا کھینچ لگا لا اور  
ہند نے اول کر چبانے لگی۔ تکلی نہ سکی اور اگل رہا۔ اس نے شہداء کے ناک کان کاٹے اور ان کے  
بار بار پتھ اپٹ سونے کے زیورات وحشی کو پیش دیئے پھر ایک اور چچا پہاڑی پر جا کر بلند آواز  
سے فتح کا گیت گانے لگی۔  
(تاریخ طبری بخاری)



اس غزوہ میں مسلمان عورتوں نے بھی بڑی بہادری اور جاں فروشی دکھائی حضرت عائشہؓ اور

ام سلمہؓ مشک میں پانی بھر کر لاتی تھیں اور زخمیوں کو پلاتی تھیں۔ (بخاری)

مشرکین کے عام حملہ کے وقت جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف چند جاں نثار

باقی رہ گئے تھے۔ آپ کی حفاظت کے لئے حضرت ام عمارہ آپ کے پاس پہنچیں جو مشرک آپ

کی طرف بڑھتا تھا اس کو تیرا اور تلوار کے ذریعہ روکتی تھیں۔ ابن قیس کا فریب آنحضرت کے

پاس پہنچ گیا تو ام عمارہ نے بڑھ کر اسے بھی روکا۔ اس میں ان کا شانہ زخمی ہو گیا انہوں نے بھی

تلوار چلائی لیکن ابن قیس وہری زرہ پہنے ہوئے تھا اس لئے بچ گیا۔

(سیرت ابن ہشام جلد اول)

حضرت حمزہ کی بہن اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چھوٹی بہن حضرت صفیہؓ مدینہ منورہ کی شکست

کی خبر سن کر مدینہ سے نکلیں مشرکین نے حضرت حمزہؓ کی لاش کو بگاڑ دیا تھا اس لئے آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہؓ کے صاحبزادے حضرت زبیر بن عوامؓ کو بلا کر حکم دیا کہ صفیہؓ کی

لاش زردیچھنے پائیں انہوں نے ان سے کہا وہ بولیں

میں صبا کی کاجراں چکی ہوں لیکن راہِ خدا میں یہ کرتی بڑی قربانی نہیں ہے۔ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت لے کر لاش پر گھسی عزیز بھائی کے بدن کے ٹکڑے دیکھ کر اِنَّا لِلّٰہِ

وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ " پڑھ کر خاموش ہو گئیں اور معفرت کا دعانا لگی۔

(ہمارے شیخ طبری)

ایک انصاری خاتون کے باپ بھائی اور شوہر جنگ میں مارے گئے تھے ان کے ابد و گرس

تینوں حادثوں کی خبر پڑی یہ ہر مرتبہ پوچھتی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہوئے۔ انہوں

نے کہا بخیریت ہیں۔ انہوں نے پاس مبارک چہرہ مبارک دیکھا اور بتا دیا کہ انہوں نے

کُلُّ مَصِیْبَةٍ لَعْنَةٌ حَبْلُکَ " (ہر قسم کی مصیبتیں آپ کے ہونے والی ہیں۔)

قریش کے واپس جانے کے بعد مسلمان بھی مدینہ آئے اس وقت مدینہ میں ایک عورت تھی جو

ہر گھوڑے پر اکہرام بٹا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دل بھرا گیا۔ آپ نے کہا کہ یہ عورت

آپ کے چچا حمزہؓ ہونے کوئی روئے اور انہوں نے یہ لفظ سنا تو یہ عورت نے کہا کہ میں نے



دیکھ کر اپنی عورتوں کو حضرت حمزہؓ کا سوگ منانے کے لئے بھیجا۔ لیکن آپ نے شکر یہ کے ساتھ واپس کر دیا۔ کہ مردوں پر تو حسہ کرنا جائز نہیں۔

(مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۸۴)

اسی سال حضرت حسنؓ پیدا ہوئے حضرت

سلسلہ کے متفرق واقعات

حَفْصَةُ ۱۱ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں۔ حضرت عثمانؓ کے ساتھ آپ کی صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ کی شادی ہوئی دراصلت کا تازن نازل ہوا اور شرک عورتوں سے مسلمانوں کا نکاح حرام قرار پایا۔

یہ جنگ دراصل ایک فیصلہ کن جنگ نہ تھی جانی

غزوہ اُحُد کے نتائج

اعتبار سے ضرور مسلمانوں کو کفار کے مقابلہ میں زیادہ نقصان اٹھانا پڑا کیونکہ ۲۲ کفار کے مقابلہ میں ستر صحابہ شہید ہوئے تھے۔ مگر کفار کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ مدینہ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرتے دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے بعد میں کفار کا تعاقب بھی کیا اس طرح یہ شکست نہیں بلکہ فتح ہی معلوم ہوتی ہے تاہم اس جنگ کے نتائج مسلمانوں کے لئے سود مند ثابت نہ ہوئے۔

۱۔ اس جنگ سے مسلمانوں کے دہار کو بڑا نقصان پہنچا جنگ بدر نے مسلمانوں کی جو دھاک سمٹا دی تھی وہ جاتی رہی اسلام کی ترقی میں ایک حد تک رکاوٹ پیدا ہو گئی۔

۲۔ مدینہ کے اطراف میں جو عرب قبائل پر مسلمانوں کا رعب غالب ہو گیا تھا وہ جاتا رہا ان قبائل نے مسلمانوں سے ڈر کر جو دوستانہ معاہدے کر لئے تھے وہ توڑ کر مخالفت پر آمادہ ہو گئے کئی قبائل نے اپنے یہاں مبلغین کو آنے کی دعوت دی اور جب وہ وہاں پہنچے تو ان کو دھوکے سے قتل کر دیا۔

۳۔ جنگ بدر کے بعد کفار کے حوالے پست ہو گئے تھے وہ پھر بلند ہو گئے۔ اور وہ مسلمانوں کو برباد کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔ وہ مسلمانوں سے ایک فیصلہ کن لڑائی لڑنا چاہتے تھے۔ کچھ ہی عرصہ بعد انہوں نے مدینہ پر پھر چڑھائی کر دی۔

۴۔ مسلمانوں کو یہ سبق مل گیا کہ رسول اللہ کی اطاعت نہ کرنے سے تائید یعنی بھی ان کا ساتھ چھوڑ



دیتی ہے۔ اور وہ اپنی دینی زندگی میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

۵۔ اس جنگ نے جان نثارانِ اسلام کے انفرادی کردار کو نمایاں کر دیا لوگوں نے جس طرح رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت کا ثبوت دیا۔ وہ ہمیشہ قابل تقلید رہے گا۔

۶۔ مسلمانوں کی کمزوری کے باعث یہودیوں کی شرارتوں میں اضافہ ہوا اور آخر ان کے قبیلہ

بنو نضیر کو مدینہ سے نکالنا پڑا۔

۷۔ قریش فتح کے ارمان لے کر آئے تھے لیکن یہ ارمان تشریحی رہ گئے ابھی دو ٹوک فیصلہ باقی تھا

اس نے ابوسفیان اگلے برس کے لئے پھر جنگ کا اعلان کر گیا تھا۔ الغرض یہ جنگ ایک اور

جنگ کا پیش خیمہ تھی۔

## یہود کا مدینہ سے اخراج

یہود بڑی مدت سے مدینہ پر تاجن تھے ان کے تین مشہور قبیلے بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو  
قیظاع مدینہ کے گرد نواح میں آباد تھے۔ مذہبی معاشی اور سیاسی لحاظ سے یہ لوگ اپنے آپ کو مدینوں  
پر فائق تصور کرتے تھے۔

ہجرت مدینہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے حالات کا جائزہ لے کر یہودیوں سے  
مسادہ لکھوایا تھا۔ تاکہ مسلمانوں کو ان کی طرف سے شرارتوں اور سازشوں کا خدشہ نہ رہے لیکن اپنے  
اقتدار کا زوال دیکھ کر اندر ہی اندر سازشیں کرنے لگے مسلمانوں سے دشمنی کے اسباب مندرجہ  
ذیل تھے۔

یہودی دین موسوی کو سب مذاہب پر فوقیت دیتے تھے۔ لیکن عملی طور

پر جھوٹے حرام کھانے والے طرح طرح کے گناہ کرنے والے سود خور اور لوگوں

مذہبی

کا مال خورد برد کرنے والے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کے اخلاقِ قبیحہ کا رازناش کیا۔ چنانچہ یہودی مسلمانوں

سے سخت عداوت رکھنے لگے۔



## اقتصادی

مہاجرین نے تجارت میں دلچسپی لی اور بھٹوڑے ہی طرح میں بڑے مالدار ہو گئے۔ انصارِ مدینہ بھی یہودیوں کے سودی قرضوں سے بچ گئے۔ خود یہودیوں کی تجارت بھی ماند پڑ گئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ یہودی مسلمانوں سے کینہ رکھتے تھے۔

## سیاسی

ہجرت سے پہلے یہودیوں کو سیاسی خودیت حاصل تھی وہ ادنیٰ و خراج کے تباہ سے لڑ کر اپنی مقصد برآری کر لیا کرتے تھے۔ اسلام کی وجہ سے یہ دونوں قبیلے متحد ہو گئے۔ اور یہودیوں کی سیاست کا خاتمہ ہونے لگا۔ معاہدہ مدینہ کی وجہ سے بھی مدینہ کی سیاست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تھی اسی وجہ سے یہودی مسلمانوں کے بھی دشمن بن گئے۔

ان وجوہ کی بہت اور پر یہودی مسلمانوں کے نزدیک قابل اعتماد نہ رہے تھے یہود نے اب کھلم کھلا عداوتِ اسلام کا ثبوت دینا شروع کیا۔

سوال سترہ کا واقعہ ہے کہ ایک انصاری عورت بنو قینقاع کے بازار میں آئی۔ ایک یہودی نے اس خاتون کی بے عزتی کی چنانچہ ایک عبورِ مسلمان نے اس یہودی کو قتل کر ڈالا ایک یہودی نے اس مسلمان کو مار ڈالا۔ اطلاع ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور یہودیوں کو سمجھایا کہ ان حرکتوں سے باز آ جاؤ ورنہ تم پر بھی بدر کی طرح عذاب نازل ہوگا۔ یہودیوں نے کہا کہ ہم تباہی لگے کر جنگ کیوں لڑی جاتی ہے۔

چونکہ یہودیوں کا آغاز یہود کی جانب سے ہوا تھا۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر حملہ کا حکم دیا۔ یہودی قلعہ میں گھس گئے۔ پندرہ دن تک محاصرہ رہا۔ بالآخر تنگ آ کر یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور کہا کہ

”ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ منظور ہے۔ آپ نے ہمیں منافقین عبد اللہ بن ابی کی درخواست پر بنو قینقاع کے تمام یہودیوں کو، جن کی تعداد سات سو تھی۔ مدینے سے جلا وطن کر دیا۔“

یہودیوں کا دوسرا قبیلہ بنو نضیر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی پر تلا ہوا تھا ایک



وقف آنحضرتؐ اسی قبیلہ میں یہودیوں سے ایک خون بہا کی رتم وصول کرنے کے لئے گئے۔ آپ ایک دیوار کے سایہ میں تشریف فرما تھے کہ یہودی دوسری طرف آپ کے قتل کی سازش کرنے لگے ایک شخص کو مکان کی چھت پر چڑھایا تاکہ وہ اوپر سے آپ پر بھاری پتھر گرا دے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگاہ کر دیا۔ چنانچہ آپ واپس تشریف لے آئے اور صحابہ کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ اور بنو نضیر دونوں کو نیا عہد نامہ لکھنے کے لئے کہا بنو نضیر نے انکار کر دیا لیکن بنو قریظہ راضی ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ربیع الاول سنہ ۷ھ کو بنو نضیر پر چڑھائی کی۔

بنو نضیر قلعہ بند رہے آخر تنگ آ کر جاں بحقی کی درخواست کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھی جلا وطنی کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ تمام مال و متاع لاپا کر اور شام کی طرف چلے گئے۔ اسی طرح بنو قریظہ کو بھی اپنی گستاخوں کی سزا ملی جس کی تفصیل غزوة خندق میں آئے گی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ام المومنین حضرت

زینب بنت خویلد سے نکاح ہوا پہلے وہ حضرت

## ۴۴ کے متفرق واقعات

عبداللہ بن عباس کے نکاح میں تھیں عبداللہ نے احد کے واقعہ میں زینب بنت خویلد سے نکاح کیا۔

۲۔ حضرت عثمان غنی کے بیٹے جناب عبداللہ نے چھ برس کی عمر میں دنیا سے رحلت کی آپ حضرت رقیہ کے لہج سے تھے۔

۳۔ ماہ شعبان میں حضرت حسینؑ پیدا ہوئے۔

۴۔ حضرت ام سلمہؓ آنحضرت کے نکاح میں آئیں۔



## غزوة خندق

مسلمانوں اور کفار کی تیسری بڑی لڑائی جنگ احزاب یا جنگ خندق کے نام سے مشہور ہے۔ چونکہ اس لڑائی میں عرب کے مختلف قبیلوں کی متحد فوج لڑنے آئی تھی اس لئے یہ جنگ احزاب کہلائی۔ اس کو جنگ خندق اس لئے کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس موقع پر اپنے ذمہ کے لئے خندق کھودی تھی۔

۱۔ جنگ احد کے بعد یہودیوں کی سرگرمیاں تیز ہو گئی تھیں ان کا ایک قبیلہ تو پہلے ہی جلاوطن ہو چکا تھا البقیہ

دو قبیلوں سے نقص امن کا خطرہ تھا اور جنگ احد میں بھی ایک مستقل دلدہر بنے تھے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے تجدید معاہدہ کے لئے کہا۔ بنی قریظہ تو اس کے لئے تیار ہو گیا مگر بنی نضیر نے چنانچہ ان کا محاصرہ کرنے انہیں مدینہ سے جلاوطن کر دیا گیا یہ لوگ خیبر جا کر آباد ہو گئے تھے۔ اور وہاں مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مشغول ہے۔

۲۔ جنگ احد ایک فیصلہ کن جنگ نہ تھی۔ اس لئے کفار مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے بڑے زور شور سے تیاریاں کرنے لگے۔

۳۔ قریش مسلمانوں کے دشمن قبائل کو مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے اکٹھا کرتے تھے۔ ان قبائل کی سرگرمیاں بڑھ گئی تھیں اور آنحضرت کو ان کا کئی بار مقابلہ کرنا پڑا مسلمانوں کی اس کامیابی نے قبائل کے انتقام کی آگ کو بھڑکا دیا۔ اور وہ قریش کے ساتھ ہی متحد ہو گئے۔

۴۔ چونکہ مسلمانوں نے وسطی عرب پر بھی اپنا اثر قائم کر لیا تھا۔ اس لئے قریش کی عراق سے تجارت کا سلسلہ بند ہو گیا تھا۔ ملک شام کی تجارت پہلے ہی ان کے ہاتھ سے چلی گئی تھی اسی اقتصادی زبرد کاوٹ نے ان کو اور بھی مشتعل کر دیا۔

۵۔ جنگ احد کے موقع پر ابوسفیان نے مسلمانوں سے بدر کے مقام پر مقابلہ کرنے کا بیخ دیا تھا اور وہ دو ہزار کفار کو لے کر وہاں پہنچ بھی گیا۔ مگر جب مسلمان مقابلہ کو آئے تو وہ بھاگ کھڑا ہوا اس ہزیمت کا وہ پوری تیاری کے ساتھ بدلہ لینا چاہتا تھا۔



## واقعات جنگ

یہود کو مدینے سے نکل جانے کا بڑا دکھ تھا۔ وہ مسلمانوں سے

اس کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے یہودیوں

نے قریش مکہ کے پاس پہنچ کر انہیں مسلمانوں کے خلاف لڑنے پر اکسایا اور اپنی امداد کا یقین بھی دلا دیا۔ قریش پہلے ہی تیار بیٹھے تھے بس پھر کیا تھا تمام قبیلوں کو ایک جھوٹے صلے جمع کر کے دس ہزار کا بھاری لشکر لے کر مدینہ پر دھاوا بونے کے لئے چل دیئے۔

حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا حضرت سلمان فارسی ایران کے جنگی طریقوں سے واقف تھے انہوں نے مدینہ شریف کے گرد خندق کھودنے کی رائے دی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ رائے پسند کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے بھی بذریعہ الہام خندق کا حکم ملا ہے۔ کفار نے مدینہ پہنچ کر ہر طرف سے محاصرہ کر لیا اور ایک مہینہ تک اس شدت کے ساتھ محاصرہ قائم رکھا کہ مسلمانوں پر کئی کئی فالتے گزر گئے۔ ایک دن بیتاب ہو کر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پیٹوں پر بندھے ہوئے پتھر دکھائے جب محاصرہ کی شدت خطرناک حد تک پہنچ گئی۔ تو آپ نے جماعت صحابہ سے خطاب فرمایا کہ ————— "کوئی ہے جو محاصرہ کرنے والوں کی خبر لائے۔"

اس کے جواب میں حضرت زبیرؓ کی آواز آئی۔ اس جا بجا رہی کے صلے میں ان کو حواری

کا معزز لقب عطا ہوا۔

چند دن تک کفار خندق کے پار سے تیرا در پتھر برساتے رہے۔ جب اس سے کوئی نتیجہ نہ نکلا تو ایک دن قریش کے چند شاہسواروں نے بازی لگا دی۔ ایک جگہ خندق کچھ کم چوڑی تھی۔ وہ گھوڑے دوڑا کر اندر کود آئے۔ اسلامی لشکر کے مقابل ایک کھلے میدان میں گھوڑے دوڑنے لگے۔ ان میں عرب کا مشہور پہلوان عمرو بن عبدود بھی تھا۔

عمرو بن عبدود کی عمر نوے برس تھی۔ بدر کے معرکے میں شامل ہوا تھا۔ اور زخمی ہونے کی وجہ سے احد میں شریک نہ ہو سکا۔ نزوہ خندق میں لڑائی کا مسلم بن کر آیا تھا۔ حضرت اہلی نے عرض کیا میں اس کا مقابلہ کروں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو اپنی تلوار عطا فرمائی۔ اور اپنا عامرہ بندھوا کر حضرت فرمایا (طبقات ابن سعد)



حضرت علیؓ چند مجاہدین کو لے کر روانہ ہوئے اور اس جگہ کو روک لیا جہاں سے  
قریشی شہسواروں نے چھلانگ لگائی تھی۔ شاہسواروں نے گھوڑے ان کی طرف دوڑائے  
مخرو بپکارا۔ "مجھ سے کون طاقت آزمائی کرے گا۔ حضرت علیؓ سامنے آئے اور فرمایا  
اے عمرو۔ تم نے عہد کیا ہوا ہے۔ کہ قریش سے جو شخص ہتھیاروں کی دعوت دے گا  
تو ان میں سے ایک کو ضرور قبول کرے گا۔ عمرو نے جواب دیا۔ "ہاں۔" حضرت علیؓ  
نے فرمایا۔ میں ہتھیاروں اور اس کے رسول اور اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔" مخرو بولا  
مجھے اس کی حاجت نہیں۔" اچھا اب ہتھیاروں کی دعوت دیتا ہوں کہ میرے  
ساتھ جنگ کے لئے اتر دو۔"

عمرو نے کہا اے بیعتیہ کیوں۔ اللہ کی قسم میں ہتھیاروں سے چاہتا ہوں۔ کہ تمہارے  
خون میں اترے۔"

حضرت علیؓ نے فرمایا۔ "خدا کی قسم۔ میں تمہارا خون بہانا چاہتا ہوں۔"  
عمرو اس جواب پر تھک گیا۔ گھوڑے سے اتر۔ اور حضرت علیؓ کے مقابلہ میں آیا  
کچھ دیر پیٹیرے بدلنے کے بعد عمرو نے علیؓ پر ضرب لگائی۔ حضرت علیؓ نے ایک ہی وار  
میں اسے ڈھیر کر دیا۔ اور بکیر کا لغزہ بلند کیا۔

(البدایہ والنہایہ)

عمرو کے باقی ساتھی بھاگے ان میں سے ایک خندق میں گر گیا۔ حضرت علیؓ نے اس  
کا سر تسلیم لیا ایک تیر کا زخم آیا وہ ڈالپسی میں مکہ کی راہ میں اسی زخم سے ہلاک ہوا۔  
دن بھر لڑائی جاری رہی۔ آنحضرتؐ کی کئی نمازیں قضا ہو گئیں لیکن جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہوا محاصرہ  
کی ظوالت کفار مکہ کے لئے سخت تکلیف کا باعث تھی۔ اس لئے کہ دہزار فوج کی رسد کا سامان  
آسان نہ تھا۔ اسی آفتاب میں ایک دن اس زور کی آندھی آئی کہ خمیوں کی طنائیں اٹھڑ اٹھڑ  
گئیں۔ عین اس موقع پر نعیم بن مسعودؓ نے جو درپردہ مسلمان ہوئے تھے۔ قریش اور یہود میں  
بھوت ڈلوا دی۔ مشرکین کو معلوم نہ تھا۔ کہ وہ اسلام لائے ہیں نعیم نے انہیں بد دل اور  
ہراساں کرنا شروع کیا۔ بنو قریظہ کو یہ سبق دیا کہ خیریت درکار ہے۔ تو قریش سے چند آدمی



بطور ضمانت طلب کر کے اپنے قبضہ میں رکھ لو۔ تاکہ قریش تمہیں تنہا نہ چھوڑ جائیں۔ بنو قریظہ نے فوراً یہ مطالبہ کر دیا۔ قریش نے نہ مانا۔ بدگمانی اور بڑھی۔ بنو قریظہ الگ ہو گئے۔ دشمن کے دل اکھڑ چکے تھے ایک رات اللہ تعالیٰ نے اس زور کی ہوا بھجی کہ ان کے قدم بھی اکھڑ گئے۔ ٹھنڈی اور تیز ہوا میں آگ جلتی تھی نہ ہانڈیاں ٹپکتی تھیں اور نہ شیخے کھڑے رہ سکتے تھے۔ اوسفیان نے سب کو بلا کر کہا۔ "ادھر بنو قریظہ نے غذا کی اور ادھر ہوا دشمن ہو رہی ہے میں تو گھر جاؤں تم بھی سفر کر دو۔" اوسفیان اپنے اونٹ کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اونٹ کے گھٹنے بندھے تھے اوسفیان نے بدحواسی میں اسے مارنا شروع کیا لیکن بے سود۔ ایک اور آدمی نے اس کی رسی کھوئی تو اٹھنے کے قابل ہوا۔

(تاریخ طبری۔ البدایہ والنہایہ)

جب صبح ہوئی تو خندق پار کا علاقہ دشمن کے وجود سے صاف تھا۔ قریش کے بعد بنو قریظہ نے میدان چھوڑ دیا اس جنگ میں مسلمانوں کا کم نقصان ہوا صرف ایک صحابی حضرت سعد بن معاذ زخمی ہوئے اور اس عہدہ سے جانبر نہ ہو سکے۔

بنو قریظہ کی بدعہدی کی وجہ سے مسلمانوں کو جنگ اذیاب میں بہت پریشانی ہوئی تھی۔ قریش کے واپس لوٹتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کا رخ کیا یہودیوں نے ندامت اور معذرت کے بجائے تلعبند ہو کر مقابلہ کرنا چاہا۔ اور آنحضرت کو گالیاں بھی دیں۔ مسلمانوں نے قریباً ایک ماہ تک محاصرہ جاری رکھا۔ آخر جنگ آکر یہودیوں نے درخواست کی کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ اور جو فیصلہ حضرت سعد بن معاذ فرما کریں گے۔ اسے منظور ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست منظور فرمائی۔ حضرت سعد بن معاذ نے فیصلہ دیا۔ کہ لڑنے والے قتل کئے جائیں۔ عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا جائے۔ اور ان کا سامان مال غنیمت قرار دیا جائے یہ فیصلہ یہودیوں کی اپنی آسمانی کتاب تورات کے مطابق تھا چنانچہ چار سو مردوں کو قتل کیا گیا۔ مقتولین میں ایک عورت بھی تھی جس نے ایک مسلمان پر پتھر گرا کر اسے مار ڈالا تھا۔

(تاریخ طبری)



غزوہ خندق کے نتائج | ۱۔ غزوہ خندق میں دشمن کی ناکامی کا فیصلہ آندھی اور طوفان نے کیا تھا۔ اس تا یہ غیبی کو دیکھ کر

اہل اسلام کی قوت ایمانی میں بیش بہا اضافہ ہوا

۲۔ اس جنگ میں کفار کی تعداد چوبیس ہزار اور ایک روایت کے مطابق دس ہزار تھی کفار نے اتنی بڑی جمیعت کے ساتھ مسلمانوں پر کبھی حملہ نہ کیا تھا۔ اس سے مسلمانوں کو یہ اندازہ ہوا کہ کفار اپنے سب ذرائع استعمال کرنے کے باوجود بھی مسلمانوں کو مغلوب نہیں کر سکتے۔

۳۔ مسلمانوں کے لئے مدافعہ جنگ کا دور ختم ہو گیا۔ اس کے بعد دشمنوں کو کبھی اتنی نہمت نہ ہوئی کہ وہ مسلمانوں پر حملہ کر سکیں۔

۴۔ جنگ خندق میں کفار کی پسپائی سے مدینہ کے آس پاس کے قبیلوں پر بڑا اچھا اثر پڑا۔ اب وہ مسلمانوں کی فوجی قوت سے مرعوب ہو کر ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے لگے۔ اور اس طرح اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔

۵۔ اس جنگ میں مدینہ کے یہودی تبید بنو قریظہ کی غداری پوری طرح واضح ہو گئی۔ اس لئے کفار مکہ کے واپس جاتے ہی ان کو سزا دی گئی۔

۶۔ قریش کی اقتصادی حالت تباہ ہو گئی۔ انہوں نے اپنا تمام سرمایہ جنگ میں جھونک دیا تھا۔ ان کے پاس اب حسرت و ارمان کے سوا کچھ نہ رہا۔

۷۔ قریش کا عرب میں بہت بھرم تھا جو کھل گیا۔ عرب میں قریش سے بدظنی عام ہو گئی اور ان کی روحانی پیشوائی کا آئینہ پاش پاش ہو گیا۔

شہ کے دیگر واقعات | اسی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب بنت جحش سے نکاح کیا زینبؓ آپ کی چھوٹی اہلیہ

کی صاحبزادی تھیں ان کا نکاح حضورؐ نے اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ سے کیا تھا میاں بیوی میں نباہ نہ ہوا اور طلاق ہو گئی۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب سے نکاح کر لیا اس وقت تک عمر میں جاہلیت نے طریقہ پر بے پردہ نکلتی تھیں اسی



سال پردہ کا حکم نازل ہوا اسی سال عورتوں پر ہمت لگانے والوں پر حد جاری کرنے کا حکم اور سزا دینے کا طریقہ جاری ہوا پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمم کی اجازت ملی۔ اور نماز خوف کا حکم نازل ہوا۔  
(فتح الباری)

## سوالات

- ۱۔ جنگ بدر کے وجوہ و اسباب بیان کیجئے۔
- ۲۔ جنگ بدر کے نتائج اور اسکی اہمیت واضح کیجئے۔
- ۳۔ جنگ اُحمر کن حالات کی پیداوار تھی۔ اور اس سے کیا نتائج برآمد ہوئے؟ نیز بتائیے کہ اس جنگ میں مسلمانوں کی شکست کے کیا اسباب تھے۔
- ۴۔ جنگ خندق کے اسباب و واقعات بیان کیجئے اور بتائیے کہ تاریخ اسلام میں اس جنگ کو کیا اہمیت حاصل ہے؟
- ۵۔ رسول مقبول کے یہودیوں سے تعلقات پر بحث کیجئے۔
- ۶۔ ہجرت کے بعد پیغمبر اسلام کے خلات اہل مکہ کی جارحانہ جنگوں کا مختصر حال لکھئے۔ ان جنگوں میں مسلمانوں کی فتح کا راز کیا تھا۔



## صلح حدیبیہ

عمرہ کیسے روانگی | جب سے مسلمان مکہ سے نکلے گئے تھے یعنی چھ سال سے انہوں نے کعبہ کو بالکل نہ دیکھا تھا اس لئے ذی قعدہ ۱۱ھ میں آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ عمرہ کی نیت سے مکہ روانہ ہوئے اور اس خیال سے کہ قریش کو جنگ ویزہ کا شبہ نہ ہو یہ احتیاط فرمائی کہ احرام باندھ کر قریش کے اونٹ ساتھ لے لے۔ مسلمانوں کو حکم دیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ چلے صرف تلوار ساتھ ہو۔ وہ بھی نیام کے اندر ذوالحلیفہ پہنچ کر قریش کی ابتدائی رسمیں ادا کیں قریش کو خبر ہوئی تو انہوں نے آپ کو روکنے کے لئے بڑی زبردست تیاریاں کیں اور پیغام بھیج کر تمام متحدہ قبائل کو جنگ کے لئے جمع کیا۔ خالد بن ولید کو جو ابھی تک اسلام نہ لائے تھے۔ عتہ بڑی سی فوج کے ساتھ پتہ لگتے کے لئے بھیجا انہوں نے جا کر قریش کو خبر دی کہ مسلمان غنیمت کے مقام تک پہنچ گئے ہیں ان کے جانے کے بعد مسلمان آگے بڑھ کر مقام حدیبیہ میں پھڑے یہ مقام مکہ کے علاقہ میں شامل ہے قرآن حکم نے اسے بطین مکہ (دادی مکہ) کہا ہے اس کا صرف ایک حصہ حرم میں داخل ہے۔ جہاں مسلمان اترے وہ جگہ حرم سے باہر ہے اور مکہ کے شہر سے بارہ تیرہ میل دور جدہ اور مکہ کی سڑک پر واقع ہے۔

تیسرا خزانہ مسلمانوں کا حلیف تھا۔ اس کے رئیس بدیل بن ورقانہ نے جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ قریش مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ آپ نے فرمایا قریش سے جا کر کہہ دو کہ ہم لڑنے کے لئے نہیں آئے ہیں بلکہ عمرہ کی عمرت سے آئے ہیں۔

(طبقات ابن سعد)

بہتر ہے۔ کہ قریش ہم سے ایک خاص مدت کے لئے معاہدہ کر لیں۔ اور اگر اس پر وہ



رائی نہیں ہیں تو اس خدا کی قسم، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ میں اس وقت تک لڑوں گا جب تک میری گردن الگ نہ ہو جائے۔ اور خدا اپنا فیصلہ پورا نہ کر دے۔ بدیل نے جا کر قریش کو یہ پیغام لکھنا چاہا۔ تو وہ اس کے سننے کے لئے بھی تیار نہ تھے۔ تاہم تجربہ کار لوگوں نے آبادگی ظاہر کی۔

بدیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیام اور آپ کی شرائط سنائیں یہ شرائط سن کر ان کی جماعت کے ایک تجربہ کار شخص عمرو بن مسعود ثقفی نے کہا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم انے بڑی معقول شرطیں پیش کی ہیں۔ مجھ کو اجازت دو میں جا کر خود معاملہ طے کر لوں " قریش کو ان پر پورا اعتماد تھا۔ اس لئے انہوں نے ان کی جانب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر گفتگو کی اور کہا محمد! فرض کرو۔ تم نے قریش کو ختم کر دیا۔ کیا دنیا میں اس کی مثالی مل سکتی ہے۔ کہ کسی شخص نے اپنی قوم کو خود اپنے ہاتھوں سے برباد کیا ہو۔"

عمرو بن مسعود نے گفتگو کر کے لڑا آیا۔ عمرو نے قریش سے کہا۔ "خدا کی قسم — میں نے شاہی دربار دیکھے ہیں جتنی تعظیم محمد کے سامنے آپ کی کرتے ہیں — وہ بادشاہوں کو ان کے درباروں میں نصیب نہیں — آپ بھٹکتے ہیں تو صحابہ اہل حق پر لیتے ہیں اور منہ اور بدن پر لٹتے ہیں۔ جب آپ کوئی حکم صادر فرماتے ہیں تو صحابہ فوراً تعمیل کرتے ہیں آپ وضو فرماتے ہیں تو صحابہ نیچے ہوئے پانی کے لئے گویا جان مارتے ہیں آپ جب بولتے ہیں تو صحابہ اپنی آواز پست کر لیتے ہیں ادب سے آپ کی عزت تہر نہیں اٹھاتے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مصالحت کی گفتگو کے لئے خراش بن امیہ کو بھیجا۔ قریش نے ان کو قتل کرنا چاہا۔ مگر ان کے قبیلہ کے آدمیوں نے بچایا۔

خراش کی داپھی کے بعد قریش نے مسلمانوں پر حملہ کے لئے ایک دستہ بھیجا مگر وہ گرفتار کر لیا گیا۔ صحابہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے درگزر سے کام لے کر اسے چھوڑ دیا۔ قریش کی محاذ انہ ریش کے پیش نظر آپ نے دوبارہ حضرت عثمان کو قریش کے پاس بھیجا انہوں نے آپ کو روک لیا



مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی۔ کہ عثمان قتل کر دیئے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت صدمہ ہوا۔ آپ نے مقاصد کے لئے صحابہ سے جانبازی کی بیعت لی (بخاری)

صلح حدیبیہ | بیعت رضوان تاریخ اسلام میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا۔ کہ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کی خبر غلط تھی۔ اس دوران میں قریش کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ مصالحت کے لئے آمادہ ہو گئے اور اپنے خطیب ہشیل بن عمرو کو مصالحت کی گفتگو کے لئے بھیجا اور مندرجہ ذیل صلحنامہ لکھا گیا۔  
یہ مصالحت محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ہشیل بن عمرو کے درمیان طے ہوئی ہے انہوں نے یہ سمجھوتہ کیا ہے۔ کہ۔

۱۔ دس برس جنگ نہ ہوگی۔ سب لوگ امن و امان کے ساتھ رہیں گے۔ کوئی کسی پر ظلم و تعدی نہیں کرے گا۔

۲۔ فریقین اپنے جذبات پر قابو رکھیں گے۔ اور ایک دوسرے سے خیانت نہیں کریں گے۔

۳۔ اگر مکہ سے کوئی شخص اپنے ولی کے اذن کے بغیر محمدؐ کے پاس جائے گا تو اسے واپس کر دیا جائے گا۔ اور اگر محمدؐ کے اصحاب سے کوئی شخص قریش کے پاس آئے گا۔ تو اس کی واپسی نہیں ہوگی۔

۴۔ جو چاہے محمدؐ کا حلیف اور ہم عہد ہو جائے۔ اور جو چاہے قریش کا حلیف ہو جائے کسی پر کوئی پابندی نہیں۔

۵۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی سال واپس چلے جائیں۔

۶۔ حضرت محمد قریش کی موجودگی میں مکہ تشریف نہیں لائیں گے۔

۷۔ اگلے برس قریش تین روز کے لئے مکہ سے نکل جائیں گے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان

ایام میں اپنے اصحاب کے ہمراہ یہاں تشریف فرما ہوں گے۔

۸۔ مسلمان مکہ میں بے نیام اسلحہ نہیں لائیں گے۔

(بخاری دسیرت ابن ہشام)

ابھی یہ معاہدہ لکھا جا رہا تھا کہ ہشیل کے لڑکے ابو جندل جو مسلمان ہو چکے تھے اور







اور مسلمان اب معاشرتی اور معاشی سرگرمیوں کی طرف توجہ دینے لگے۔  
۳۔ اس معاہدہ کے بعد جب فضا سازگار ہو گئی۔ اور مسلمان مکہ آنے جانے لگے تو اہل  
اسلام کی صالح زندگی نے قریش مکہ پر بڑا خوشگوار اثر ڈالا۔ اور وہ لوگ جو حق در  
جوق اسلام قبول کرنے لگے۔

۴۔ چونکہ یہ معاہدہ مسلمانوں کی امن پسندی کا بیج ثبوت تھا۔ اس لئے جو قبائل شک  
میں مبتلا تھے۔ اس سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے مسلمانوں سے دستار  
مراحم قائم کر لئے۔

۵۔ عرب قبائل اب مسلمانوں سے شیوہ شکر ہو گئے جس کے نتیجہ کے طور پر اسلامی معاشرہ  
دسیح سے دسیح تر ہوتا چلا گیا حضرت خالد بن ولید اور حضرت عمرو بن العاص  
جیسے لوگ اس معاہدہ کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے۔

۶۔ صلح حدیبیہ نے مکہ اور مدینہ کے درمیان جو کشیدگی تھی وہ دور کر کے سیاسی وحدت  
کے لئے راستہ ہموار کر دیا۔

۷۔ قریش سے جنگ و جدل کے خاتمہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا موقع  
ملا۔ کہ عین ممالک کے لوگوں کو اسلام کا پیغام پہنچائیں۔

۸۔ قریش کا ایک کھلم کھلا ہوا اتر آنا اس حقیقت کا نہایت واضح ثبوت تھا کہ اب  
وہ مسلمانوں کو خلیاں برباد بے سہارا اور اپنے گھروں سے نکالے ہوئے مہاجرین  
سمجھتے تھے۔ بلکہ ایک ہم پلہ اور ایک ہم پایہ ہمسایہ سمجھنے پر مجبور تھے۔  
اور یہی چیز مسلمانوں کی آئندہ ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

۹۔ معمولی سی ظاہری رعایت کے عوض جو آنحضرت نے قریش کو دی اسلام کو گونا  
گوں فائدے پہنچے اسی لئے بہت سے مؤرخین صلح حدیبیہ کو آنحضرت نے سیاسی تدبیر  
کا شاہکار کہتے ہیں اس سے آپ کی دور بینی اور سیاست دانی کا اندازہ ہو سکتا ہے قرآن  
کریم نے اس صلح کو فتح مبین قرار دیا ہے۔



۶ھ کے دیگر واقعات | ۱۔ اس سال حج فرض ہوا  
۲۔ یہ حکم نازل ہوا کہ کوئی مسلمان عورت

کسی مشرک کے نکاح میں نہیں رہ سکتی۔

۳۔ ماہ شعبان ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو مصطلق کے سردار حارث

کی صاحبزادی حضرت جویریہؓ سے نکاح کیا۔

۴۔ اس سال اور بھی کئی چھوٹی لڑائیاں ہوئیں۔

مہم عصر بادشاہوں کو دعوتِ اسلام ۶ھ

صلح حدیبیہ کے  
نتیجہ میں جب

امن و امان کا ماحول پیدا ہوا۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف بادشاہوں اور امرائے  
عرب کو دعوتِ اسلام پر مشتمل خطوط بھیجے۔

قیصرِ روم کے نام آپ کا خطِ وحیہ بن خلیفہ لے کر گئے۔ قیصر نے ان ہی دنوں ایرانیوں  
کے خلاف کامیاب جنگ لڑی تھی۔ اور ادائے شکر کے لئے بیت المقدس آیا ہوا تھا قیصر  
روم ہرقل نے تحقیق حال کے لئے ابوسفیان کو بلوایا جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے  
تھے۔ اور تجارت کے سلسلہ میں شام گئے ہوئے تھے۔ ہرقل نے ان سے متعدد سوالات کئے  
جس سے قیصر کو حضور کی نبوت کا یقین ہو گیا۔ لیکن اپنے امراء اور مذہبی رہنماؤں کی مخالفت  
کی وجہ سے وہ اعلان نہ کر سکا۔

اسی طرح خسرو پرویز شہنشاہ ایران نے پاس حضرت عبداللہ بن حذافہؓ آپ کا  
خط لے کر گئے۔ اس نے نہایت گستاخی کے ساتھ نامہ مبارک ٹکڑے ٹکڑے کر دیا چند ہی روز  
بعد اس کے بیٹے شیروین نے اسے قتل کر دیا۔

تیسرا خط حبش کے بادشاہ نجاشی کے نام لکھا گیا۔ نجاشی کا نام اضمحہ تھا اور نجاشی  
لقب اس کے پاس جب نامہ مبارک پہنچا تو اس نے آنکھوں سے لگایا اور کلمہ پڑھ کر  
اسلام سے مشرف ہوا۔ حضرت جعفرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
کی خدمت میں عقیدت نامہ تحریر کیا۔ نجاشی نے سب سے پہلے دانات پائی۔ آنحضرت صلی اللہ



علیہ وسلم نے اس پر غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی۔

(طبقات ابن سعد)

چوتھا خط حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کی معرفت والی مصر مقتوس کو بھیجا گیا مصر میں عیسائیت کا سکہ رواں تھا یہاں قیصر روم کی طرف سے ایک نائب متعین تھا۔ عہدہ کے لحاظ سے اسے مقتوس کہتے تھے۔ اس کا نام جبرئیل تھا۔ اس کا صدر مقام اسکندریہ تھا مقتوس نے حضرت حاطب کی تعظیم کی اور عزت سے مہمان رکھا۔ مگر مشرف بہ اسلام نہ ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخالفت روانہ کئے۔ ان میں تین کینزیں، ایک غلام اور ایک سفید خچر دلدل نام تھا۔

ایک کینز حضرت ہارون عمیقین ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔

دمشق کے علاقہ میں ان دنوں جبلہ غسانی قیصر روم کی طرف سے حاکم تھا اس کے پاس اسلامی سیفر پہنچا۔ تو اس نے غصہ میں بھڑک کر کہا۔

”میری سلطنت مجھ سے کون چھین سکتا ہے۔ میں اس پر چڑھائی کروں گا۔“ جبلہ نے فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ اور قیصر کو خط لکھا۔ قیصر نے فرمان بھیجا کہ اس ارادے سے باز آؤ اور فوراً میرے پاس پہنچو۔ جبلہ نے حملہ کا ارادہ چھوڑ دیا۔ اور اسلامی سیفر کو زادِ راہ دے کر واپس بھیجا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ دعوت ناموں کے علاوہ اور بھی متعدد تبلیغی خطوط بھیجے جو سلاطین امراء اور علمائے یہود و نصاریٰ کے نام تھے نجاشی۔ مقتوس اور منذر شاہ بحرین کے نام جو خطوط بھیجے گئے تھے وہ ابھی تک زمانہ کی دستبرد سے محفوظ ہیں۔

دعوتِ اسلام پر مثل خطوط کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے حکمران اور ان کی رعایا مشرف بہ اسلام ہوئی۔ اس کے علاوہ دینِ اسلام کا چرچا ساری دنیا میں ہو گیا کئی شاہِ ایران سے مخالفت کا آغاز بھی اسی دور سے شروع ہوا اور اس طرح یہ دور ایک



وسیع اور طاقتور اسلامی مملکت کی بنیادوں کا پیشی خمیر ثابت ہوا۔

## فتح خیبر ششم

**جنگ کے اسباب و واقعات** | عرب میں یہودیوں کی قوت کا سب سے بڑا مرکز خیبر تھا۔ یہ زرخیز وادی مدینہ منورہ سے جانب شمال قریباً ایک سو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں قدیم سے یہود آباد تھے مدینہ سے جو یہودی نکلے گئے تھے۔ وہ سب خیبر میں آباد ہو گئے۔ تھے انہوں نے وہاں مضبوط قلعے بنائے تھے۔ خیبر بھی تلوہ کو ہی کہتے ہیں۔

خیبر ملت اسلامیہ کے خلاف سازشوں کا مرکز بن گیا تھا۔ قریب ہی عرب کا ممتاز قبیلہ عطفان آباد تھا۔ جو یہود خیبر کا حلیف تھا۔ سلام بن الحقیق جو ان دنوں یہود کا سردار تھا: بڑا بااثر تھا۔ اس نے عطفان اور اس کے آس پاس کے قبائل کو اسلام کے خلاف جنگ پر آمادہ کر لیا اور ایک عظیم الشان فوج کے ساتھ مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس فتنہ انگیزی کی خبر ہوئی، تو چند صحابہ نے آپ کے ایما سے خیبر جا کر سلام کو قتل کر دیا۔

(طبقات ابن سعد نیر البدایہ والنہایہ)

سلام بن ابی الحقیق کے بعد ایمر بن رزام مسند ریاست پر بیٹھا۔ اس نے یہودیوں کو جمع کر کے ان سے کہا کہ — "میرے پیشروؤں نے محمد کے مقابلہ میں جو تدبیریں اختیار



کی بھتیں وہ غلط بھتیں خود محمد کے دارالحکومت پر حملہ کرنا چاہیے۔  
 چنانچہ غطفان وغیرہ کا دورہ کر کے مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے ایک لشکر تیار کیا اور  
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی۔ تو آپ نے عبداللہ بن رواحہؓ کو تحقیق حلال کے لئے بھیجا اور  
 انہوں نے تحقیقات کر کے اس کی تصدیق کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مصالحت کے ذریعہ سے  
 اس فتنہ کو دبانے کی کوشش کی۔ عبداللہ بن رواحہؓ کو حکم دیا۔ کہ یہودی سردار اسیر بن رزام سے  
 گفتگو کر کے اسے مصالحت کی عرض سے مدینہ لائیں۔ اسیر تیس آدمیوں کا جتھہ لے کر اسلامی وفد  
 کے ہمراہ روانہ ہوا۔ چونکہ یہود کا اعتبار نہ تھا۔ اس لئے ہزہ یہودی کے ساتھ ایک مسلمان سوار  
 تھا۔ کہ وہ اچانک حملہ نہ کر دیں اس احتیاط کے باوجود اسیر نے غداری کی اس نے بے خبری میں  
 عبداللہ بن رواحہؓ کی تلوار پھینکا چاہی۔ عبداللہ بن نے ایک ہاتھ مارا کہ اس کی ٹانگ اڑا  
 دی۔ باقی صحابہؓ نے بھی تلواریں بے نیام کر لیں اور ہر مسلمان نے اپنے یہودی روایت کو مار ڈالا  
 صرف ایک یہودی زندہ بچا۔

(البدایہ والنہایہ)

یہودی پہلے سے تیاریاں کر رہے تھے۔ اسیر کے قتل سے انہیں ایک بہانہ ہاتھ آ گیا اور  
 وہ مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے بالکل آمادہ ہو گئے۔ محرم ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
 لشکر لے کر عازم خیبر ہوئے صلح حدیبیہ کے بعد فتح خیبر کی بشارت اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل  
 چکی تھی۔ یہ لشکر کٹے حدیبیہ کی جاں سپاری کا مشرہ تھا۔ اس نے خیبر کی کامرانی و منفعت کے حقدار  
 بھی دی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مہم کو اصحاب حدیبیہ کے لئے مخصوص کر دیا۔

(تاریخ طبری)

ردانگی کے وقت فوج کی تعداد پندرہ سو تھی ان میں تین سو سوار تھے۔

(البدایہ والنہایہ)

خیبر میں یہودیوں کے چھ قلعے تھے ان میں بیس ہزار تجربہ کار سپاہی موجود تھے عرب  
 کا مشہور بہادر مرتد بھی یہیں رہتا تھا۔ مسلمانوں کی نقل و حرکت دیکھ کر یہودیوں نے سامان  
 رسد قلعہ نام میں جمع کیا تھا۔ اور فوجیں دوسرے قلعوں میں بھتیں اس لئے مسلمانوں نے



خیبر پہنچ کر سب سے پہلے قلعہ نامہ پر قبضہ کیا لیکن یہاں کوئی بڑی قوت نہ تھی اس لئے آسانی کے ساتھ فتح کر لیا۔

(سیرت ابن ہشام)

چھوٹے چھوٹے قلعے بھی آسانی کے ساتھ تسخیر کر لئے۔ سب سے اہم قلعوں کا قلعہ تھا مرحبہ اسی میں رہتا تھا۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے خاص اہتمام فرمایا۔ پہلے یکے بعد دیگرے حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کو اس مہم پر مامور فرمایا۔ لیکن قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ دوسرے دن علم حضرت علیؓ کو مرحمت فرمایا۔ مرحبہ رجز پڑھتا ہوا مقابلہ میں آیا۔ حضرت علیؓ نے اسے قتل کر دیا۔ اس کے قتل ہوتے ہی یہودی ہمت ہار گئے۔ اور بیس دن کے محاصرہ کے بعد قلعوں کا قلعہ فتح ہو گیا۔ اس سفر کے میں ترانوے یہودی مقتول اور بیس مسلمان شہید ہوئے۔

(سیرت ابن ہشام)

خیبر فتح ہونے کے بعد مسلمانوں نے زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ یہودیوں نے درخواست کی کہ زمینیں ہماری قبضہ میں رہنے دی جائیں ہم اس کے معاوضہ میں نصف پیداوار دیا کریں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرمایا۔ جب بٹائی کا وقت آتا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو بھیجتے وہ غلہ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے کہتے کہ جو حصہ چاہے لے لو یہودیوں پر اس کا یہ اثر پڑا۔ کہ وہ کہتے تھے زمین و آسمان ایسے ہی عدل پر قائم ہیں

(فتوح البلدان بلاذری ص ۲۷)

اس جنگ میں رئیس خیبر کی لڑکی صفیہ قید ہوئی تھیں اور حضرت وحیہ کلبیؓ کے حصہ میں آئی تھیں۔ لیکن لوگوں نے اعتراض کیا۔ کہ قرظیہ اور نصیر کی رئیسہ وحیہ کے حصہ میں نہیں جاسکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کوئی اس کا اہل نہیں ہے۔ ان کے اعتراض پر اپنے ان کو آزاد کر کے اپنے عقد میں لے لیا۔

(صحیح مسلم)

فتح خیبر کی تکمیل میں قریباً ایک ماہ کا عرصہ لگا۔ غزوہ خیبر کا ذکر ہے کہ یہود کا ایک حبشی غلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر اسلام لایا۔ اس کے ہمراہ بکریوں کا ریوڑ تھا



جو وہ چیرا یا کرتا تھا۔ اس نے حضورؐ سے عرض کیا۔ کہ یہ بکریاں میرے پاس میرے مالک کی امانت ہیں۔ ان کو کیا کروں۔ آپؐ نے فرمایا۔ انہیں واپس مانگ دو۔ یہ اپنے مالک کے پاس چلی جائیں گی۔ غلام نے تعمیل ارشاد کر دی۔ غلام نے جہاد میں حصہ لیا۔ اور شہادت پائی۔

(سیرت ابن ہشام)

مرحوبہ کی بھتیجی زینب بنت عارضہ نے آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیافتگی کی اس نے یہود کی سازش سے بکری کے گوشت میں زہر ملا دیا۔ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم چند صحابہ کے ہمراہ کھانے پر بیٹھے آپؐ کو جلد ہی زہر کا علم ہو گیا۔ صحابہ سے فرمایا۔ کھانا چھوڑ دو۔ اس میں زہر ہے۔ آپؐ کے ساتھ ایک صحابی بشر بھی تھے۔ وہ بیمار پڑ گئے۔ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو بلا کر پوچھا تو انہوں نے انکار کیا۔ آپؐ نے اس وقت درگزر سے کام لیا لیکن جب حضرت بشرؓ وفات پگئے۔ تو زینب کو قصاص میں قتل کر ڈالا۔

(البدایہ والنہایہ)

آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر سے واپسی پر فدک کے یہود کے پاس اسلام کا ایک مبلغ بھیجا۔

## فدک اور وادی القریٰ کی فتح

انہوں نے نصف زمین پر مصالحت کر لی خیبر کے بعد مسلمان وادی القریٰ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہودی اس وقت بھی شرارت سے باز نہ آئے۔ اور تیرہ ساکنہ نبی اکرمؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام کو شہید کر دیا۔ اس لئے جنگ ہو گئی۔ لیکن یہودیوں نے معمولی مقابلہ کے بعد ہتھیار ڈال دیئے اور خیبر کی شرائط پر صلح کر لی۔

۱۔ خیبر کی فتح سے یہود کی شرارت پسندی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ اور اس کے بعد وہ مسلمانوں کے سامنے

## اثرات و نتائج

نہ آئے۔

- ۲۔ مدینہ سے باہر اسلامی حکومت قائم ہو گئی یہ اسلامی سلطنت کا سنگ بنیاد تھا۔
- ۳۔ یہ وادیاں شام اور عرب کے درمیان دروازہ کی حیثیت رکھتی تھیں شام کی طرف سے حملہ کا خطرہ تھا۔ اب ناگہانی حملہ کا خطرہ باقی نہ رہا۔



۴۔ یہود کی شکست سے کفار سخت مایوس ہوئے ان کا ایک مصنوب بازو ٹوٹ گیا اور اب وہ مسلمانوں کے مقابلے کے قابل نہ رہے۔

۵۔ خیبر کی فتح سے مسلمانوں کو کثیر مالی نفاذ حاصل ہوئے خیبر سے بے پناہ مال غنیمت ہاتھ آیا اس کے علاوہ ایک وسیع زرعی علاقہ پر قبضہ ہوا۔ حضرت ابن عمرؓ کا قول ہے کہ فتح خیبر سے پہلے ہم نے کبھی سیر ہو کر کھجور نہیں کھائی تھی۔

(البدایہ والنہایہ)

۶۔ خیبر کی فتح سے جو مال غنیمت حاصل ہوا تھا۔ اس سے فتح مکہ کے سلسلے میں کافی مدد ملی۔ فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار کا شکر آپ کے ہمراہ تھا۔ اس کے اخراجات تمام تر خیبر کی آمدنی سے پورے کئے گئے۔

## سلسلے کے دیگر واقعات

۱۔ غزوہ خیبر کے سلسلہ میں اس سال متعدد نئے احکام جاری ہوئے ورنہ جانور پنجہ والے پرندے گدھ اور نچتر حرام قرار پائے۔

۲۔ حضرت صفیہؓ جو خیبر کے رئیس کی بیٹی تھیں جنگ خیبر میں ایسر ہوئیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آزاد کر کے نکاح کر لیا۔

۳۔ حدیبیہ کے مہینہ نامہ میں مسلمانوں کو آئندہ سال زیارت کعبہ کی اجازت مل گئی تھی۔ ہجرت کے ساتویں برس ذی قعدہ کے مہینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کے لئے روانہ ہوئے وہی لوگ آپ کے ساتھ مسافر ہوئے جو حدیبیہ میں موجود تھے۔ یہ قافلہ جب مکہ پہنچا تو شہر والے پہاڑوں پر چلے گئے۔ تاکہ مسلمانوں کو دیکھ نہ سکیں۔ مسلمان تین روز مکہ میں رہے۔ اس کو مکرہ القفار کہتے ہیں۔

(تاریخ طبری)

۴۔ مسجد نبوی میں منبر بنایا گیا۔

۵۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہ بنت حارث سے نکاح کیا۔ یہ نکاح



عمرہ التفساء کے ایام میں کیا۔

## خنگ و موتہ

### جمادی الاولیٰ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حارث بن عمر رضی اللہ عنہما کو شہر جھیل حاکم بصری کے پاس دعوت اسلام پر مشتمل خط لکھ کر بھیجا تھا اس نے ان کو شہید کر دیا۔ آپ کو اس کا سخت مددہ ہوا اور حضرت حارثہ کو تین ہزار کی جمعیت کے ساتھ حارث کے انتقام کے لئے بھیجا اور ہدایت فرمادی کہ اگر زید رضی اللہ عنہ شہید ہوں تو جعفر رضی اللہ عنہ شکر ہوں وہ شہید ہوں تو عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار بنایا جائے۔

شہر جھیل کے جاسوسوں نے اسے مسلمانوں کی پیشقدمی کی خبر دی وہ ایک لاکھ فوج لے کر مقابلہ کرنے آئے بڑھا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کرنا چاہا۔ مگر عبداللہ بن رواحہ نے اسے دیا کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ شہادت ہے۔ چنانچہ جوش شہادت میں تین ہزار مسلمانوں کا یہ کہ وہ ایک لاکھ کے مقابلہ میں آیا۔ اس تناسب کے باوجود مسلمانوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ تین تین ہزار اور ایک لاکھ کا مقابلہ ہی کیا۔ چنانچہ پہلے زید رضی اللہ عنہما لڑتے لڑتے شہید ہوئے ان کے بعد حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے علم سمجھا لیا انہوں نے بھی جام شہادت نوش کیا اس کے بعد عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے جھنڈا اٹھایا یہ بھی مرتبہ شہادت سے سرفراز ہوئے۔ سب سے آخر میں حضرت خالد بن ولید کے ہاتھوں میں علم آیا۔ یہ بڑی بہادری اور خوش تدبیری سے باقی ماندہ فوج کو دشمنوں کے زرعہ سے نکال لائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت سے سخت تعلق ہوا ان کی شہادت کی خبر سن کر آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔

(بخاری و سیرت ابن ہشام)



یہ لڑائی موتہ کے مقام پر ہوئی یہ شام کی ریاست بلقاء کا ایک قبیلہ تھا۔ اور کوہ سینکے  
دامن میں واقع تھا۔

ادھر جنگ کا فیصلہ ہوا اور ادھر مدینہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ  
حضرت جعفرؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی شہادت کی خبر دی اور فرمایا "جہنم کے کو  
سیف صیوف اللہ" اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار انہوں نے سمجھلا ہے  
اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھ پر فتح دی ہے۔ "خالد اسی دن سے سیف اللہ کہلانے لگے۔  
(تاریخ طبری)

جن جنگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود شریک ہوئے وہ غزوات کہلاتی ہیں۔  
اور جن میں آپؐ نے شرکت فرمائی ان کو سر یہ کہتے ہیں۔ جنگ موتہ کو بھی سر یہ موتہ کہا جاتا  
ہے۔ کیونکہ آنحضرتؐ اس میں بنفس نفیس شریک نہیں ہوئے تھے۔

## سوالات

- ۱۔ "ع حدیبیہ کی تفصیلات سمجھئے۔ اور بتائیے۔ کہ شرائط صلح بنظاہر  
مسلمانوں کے خلاف ہونے کے باوجود وہ کیونکر فتح میں تھی۔
- ۲۔ بیعت رضوان کی وجوہات اور اس کی اہمیت بیان کیجئے۔
- ۳۔ صلح حدیبیہ کا عہد نامہ کس طرح مرتب ہوا۔ اس کی دفعات بیان  
کیجئے اور بتائیے کہ یہ صلح امر حقیقت میں عظمت اسلام کی نشانی تھی۔
- ۴۔ صلح حدیبیہ کے اثرات و نتائج پر روشنی ڈالئے۔
- ۵۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہم عصر سلاطین کے نام جو خطوط لکھے ان  
کی تفصیل بیان کیجئے۔
- ۶۔ غزوہ خیبر کے حالات و واقعات اور نتائج بیان کیجئے۔
- ۷۔ سر یہ موتہ کے مختصر واقعات قلمبند کیجئے۔



## فتح مکہ اور دیگر غزوات

**انبیاء و واقعات** | اب تک جو واقعات پیش آئے درحقیقت وہ اصل مقصد کا دیباچہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے مقدم فرض خانہ کعبہ کو تباہ کرنے کی آلائش سے پاک کرنا تھا خانہ کعبہ توحید کا سب سے پہلا اور واحد مرکز تھا۔ لیکن قریش کی دشمنی اور قبائل عرب کی عام مخالفت نے اب تک اس کا موقع نہ دیا تھا۔

صلح حدیبیہ کی بدولت ایک مرتبہ مسلمان یادگار ابراہیمی کو غلط نگاہ انداز سے دیکھ آئے تھے۔ لیکن قریش زیادہ دنوں تک صلح حدیبیہ پر قائم نہ رہ سکے۔ حدیبیہ کی صلح کے سرطابق بنی خزاعہ مسلمانوں کا حلیف ہو گیا تھا اور اس کے حریف بنی بکر قریش کے دوست بن گئے تھے۔ معاہدہ کی رو سے فریقین میں سے کسی کو دوسرے کے حلیف پر اٹھانے کا حق حاصل نہ تھا۔ لیکن بنی بکر کی حمایت میں قریش نے معاہدہ کے خلاف عین حرم میں بنی خزاعہ کو متسلل کیا۔ بنی خزاعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فریاد لے کر آئے آپ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا۔ کہ وہ خون بہا ادا کریں۔ یا بنی بکر کی حمایت چھوڑ دیں ورنہ اعلان کر دیں کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

(تاریخ طبری و طبقات ابن سعد)

قریش نے متبکرانہ انداز میں اعلان کر دیا۔ کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔ جب قاصد لوٹ



گیا۔ تو انہیں اندیشہ ہوا۔ کہ مبادا مسلمان حملہ کر دیں۔ اس لئے انہوں نے فوراً ابوسفیان کو سنجیدہ معاہدہ کے لئے بھیجا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ قریش کے ردیہ سے بہت تنگ تھے۔ اس لئے اپنے انکار فرمایا اس کے بعد آپ نے مکہ پر باقاعدہ چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں اور اپنے حلیف قبائل کو بھی ستیاری کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ احتیاط بھی کیا کہ اہل مکہ کو خبر نہ ہونے پائے جب تیاریاں مکمل ہو گئیں تو آپ دس ہزار کا لشکر لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور مکہ سے ایک منزل کی مسافت پر مرانظران کے مقام پر قیام کیا۔ قریش کو مسلمانوں کی اچانک آمد کا پتہ چلا تو ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ ابوسفیان رات کے وقت عقیقہ حال کے لئے نکلا۔ لشکر اسلام کے چند سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔

مسلمان اس دشمن اسلام کے قتل کے درپے تھے۔ مگر آپ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کی سفارش پر اسے معاف کر دیا۔ اس حسن سلوک کا یہ اثر ہوا۔ کہ ابوسفیان فوراً مسلمان ہو گیا۔ ہزار شاہد اوندی کی تکمیل کا وقت آ گیا۔ وہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو اپنے سہمی بھرا بھتیوں کے ہمراہ رات کی تاریکی میں اپنی جان بچا کر نکلے تھے اس شان سے مکہ میں داخل ہوئے کہ ان کے ساتھ ان کے دس ہزار جاں نثار موجود تھے۔ مکہ میں داخل ہوتے وقت آپ نے اعلان کر دیا۔ کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا۔ یا حرم پاک میں پناہ لے گا۔ یا ابوسفیان اور حکیم بن حزام کے گھر میں پناہ لے گا۔ یا اپنے گھر کے دروازے بند رکھے گا۔ اسے امان دی جائے گی۔

لشکر اسلام گرد ہوں کی شکل میں شہر کے تمام راستوں سے داخل ہوا۔ سوائے جنوب کے راستے کے اور کہیں کوئی مزاحمت نہ ہوئی مگر بن ابوجہل اور اس کے کچھ ساتھیوں نے حضرت خالد بن ولیدؓ کے دستے کو روکنے کی کوشش کی۔ جس کے نتیجے میں ایک بھڑاپ ہوئی تین مسلمان شہید ہوئے۔ اور تیرہ کفار مارے گئے۔

دنیا کی بہذب اور غیر بہذب قوموں کا ہمیشہ سے۔ سوال رہا ہے کہ جب بھی فاتح ذہن منفتح ملتے ہیں۔ داخل ہوتے ہیں۔ تو وہاں کی رہنمائی جان و مال ان کے ہم دربارہ



موتی ہے۔ اور وہ اسے جس طرح چاہیں تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ لیکن جب اسلامی افواج  
 کا خانہ انداز میں مکہ میں داخل ہوئیں۔ تو اسی شہری کو ہاتھ تک نہیں لگایا گیا۔ اسی کافر  
 کا مال نہ لوٹا گیا۔ یہ مسلم مورخین آج تک اس ہیئت انگریز حسن سلوک اور روادی بہ  
 انگشت بندیاں ہیں۔

مکہ میں داخل ہوتے ہی آپ نے تطہیر کعبہ کی طرت تو جبردی اور اسے بتوں سے پاک  
 کیا اس وقت خانہ کعبہ میں تین سو ساڑھے بت تھے۔ بت توڑتے جلتے تھے۔ اور زبان مبارک  
 سے یہ فرماتے جلتے تھے۔

”جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَّقَ الْبَاطِلَ رَاتِ الْبَاطِلِ كَانَتْ زُهُوقًا ط“

حق آ گیا اور باطل مٹ گیا بے شک باطل مٹنے ہی کی چیز ہے۔

اس کام سے نارغ ہو کر آپ کعبہ کے صحن میں آئے وہاں بڑے بڑے دشمنان اسلام  
 موجود تھے جنہوں نے اسلام کے مٹانے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی وہ بھی تھے جنہوں نے  
 آپ کو قتل کرنے کے منصوبے بنائے تھے۔ یہ سب لوگ اب اپنے انجام سے ڈر رہے تھے۔  
 خانہ کعبہ کو شرک کی آلائشوں سے پاک کرنے کے بعد کفار قریش کے رد و توحید و رسالت  
 پر حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا۔ جس کا خطاب نہ صرف عرب بلکہ عالم اسلام سے تھا۔ آپ  
 نے در کعبہ پر کھڑے ہو کر فرمایا۔

”ایک خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔۔۔ اس کا کوئی شریک نہیں اس نے

اپنا وعدہ سچا کر دکھایا اس نے اپنے عاجز بندے کی مدد کی اور تمام حقیقوں کو تنہا  
 چھوڑ دیا۔ جان لو۔۔۔ تمام گھمنڈ اور مال و خون کے دعوے میرے ان قدموں  
 کے نیچے ہیں۔ اے قوم قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا فخر خدانے مٹا  
 دیا۔ تمام انسان آدم کی نسل سے ہیں۔ اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ لوگ دو قسم کے  
 ہیں۔ ایک وہ جو نیک اور پارسا ہیں اور اللہ کی نگاہ میں معزز ہیں دوسرے  
 وہ جو بدکار و بد بخت ہیں۔ اور اللہ کی نگاہ میں ذلیل ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اے لوگو! ہم نے تمہیں نرو مادہ



سے پیدا کیا۔ اور پھر ہمیں خاندانوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا تاکہ ہمیں ایک دوسرے کی پہچان ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں معزز ترین شخص وہ ہے جو تقویٰ میں سب سے بڑھ کر ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہے۔

(ترمذی)

خطبہ کے بعد آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو معززین تشریف سانس تھے۔ ان میں وہ سرکش بھی تھے جو اسلام کو ماننے میں پیش پیش تھے۔ وہ بھی تھے جن کی صلح زانی نے مومنین کے سینے پھلنی کر دیے تھے۔ وہ بھی تھے جن کی ناپاک زبانوں نے اس مقدس ہستی کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں وہ بھی تھے جو تبلیغ کے وقت پتھر پھینک پھینک کر آپ کو زخمی کر دیا کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جو ہتھیار کھایا کرتے تھے۔ کہ ان کی پیاس خون نبوت کے سوا کسی اور چیز سے نہیں بجھ سکتی۔ وہ بھی تھے جن کی نفرت و عداوت کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے اکر مگراتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کی طرف دیکھا۔

اور فرمایا۔

”ہمیں معلوم ہے۔ کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں۔ کیا یہ سن کر ان جابر و ظالم انسانوں کے دل لرز اٹھے لیکن انتہائی لجاجت سے پکارے۔“ تو تشریف لکھائی ہے اور شریعت پھلتی جا۔

آپ نے نظریں اٹھائیں اور ارشاد فرمایا۔ ”آج تم پر کوئی الزام نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔“

فتح بک کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور اسلام کے دشمنوں سے جس عفو و درگزر کا سلوک کیا۔ تاریخ عالم میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ مہاجرین کی جائیداد پر کہ کفار مکہ نے قبضہ کر لیا تھا اب اسے واپس لینا مسلمانوں کا جائز حق تھا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر ناصحین مکہ اس سے بھی دستبردار ہو گئے۔ آپ کے فیاضانہ سلوک اور رحمدلی سے متاثر ہو کر لوگ جوق در جوق آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے جو



لوگ اسلام لانے کے لئے حاضر ہوئے آپ نے ان کے تمام قصور معاف کر دیئے۔ جو خود فرزند ہو کر مکہ سے بھاگ گئے تھے۔ ان کو بھی امان دے کر واپس بلا لیا۔ قریش کے اسلام لانے کے بعد دیگر قبائل بھی جلد ہی مشرکوں سے اسلام ہو گئے۔

نماز کا وقت آیا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بام کعبہ پر چڑھ کر اذان دی قریش کا مخدوم ضرور اگر چہ خانگ میں مل چکا تھا مگر اب بھی جاہلیت کی عیصیت باقی تھی چنانچہ اذان کی آواز سن کر ان کی غیرت مشتعل ہو گئی اور عتاب بن اسید کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ — خدانے میرے باپ کی عزت رکھ لی کہ اس آواز کو سننے کے لئے زندہ نہ رہا۔ تاہم ان کے لئے دامن رحمت کے علاوہ اور کوئی جائے پناہ باقی نہ رہی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ صفحے کے ایک بلند مقام پر تشریف فرما تھے۔ بقار جوق در جوق آکر بیعت اسلام سے مشرف ہوتے تھے آپ مکہ میں پندرہ دن قیام کرنے کے بعد حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو نو مسلموں کی تعلیم کے لئے چھوڑ کر مدینہ واپس تشریف لائے۔

(صحیح بخاری)

فتح مکہ کے نتائج | ۱۔ عرب کا مذہبی مرکز مسلمانوں کی سحر میں آگیا مشرکوں کے لئے کوئی جائے پناہ نہ رہی۔ اور تھوڑی مدت میں شرک کو خیر آباد کہنا پڑا۔

۲۔ فتح مکہ کا اہم ترین نتیجہ خدا کے گھر کا بتوں سے پاک ہونا تھا۔ اگرچہ یہ بت اکثر قدیم انبیاء اور بزرگوں کے تھے۔ لیکن چونکہ اسلام کسی بت یا تصویر کی تعظیم کی اجازت نہیں دیتا اس لئے خانہ خدا سے علامات شرک کا ختم کرنا ضروری تھا۔

۳۔ مشرکین کے دینی سربراہ اسلام لے آئے۔ اب اسلام کے لئے کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ ۴۔ مکہ ایک مدت سے اہل عرب کا تجارتی، سیاسی اور مذہبی مرکز چلا آ رہا تھا۔ اس پر مسلمانوں کا قبضہ اسلام کی بہت بڑی کامیابی تھی۔

۵۔ اصحاب فیل کے حملہ کی عبرت ایگزنا کامی ہوئی۔ واقعہ ابھی اہل عرب کے ذہنوں میں تازہ تھا۔ انہوں نے خیال کیا۔ یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی کامیابی کا ہی راز ہے کہ



آپ حق پر ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ آپ کو مکہ پر قابض نہ ہونے دیتا۔ ان پر اسلام کی صداقت روشن ہو گئی اور خود بخود دین اسلام میں داخل ہونے لگے۔  
(تفسیر خازن)

## غزوة حنین

**اسباب و واقعات** | مکہ فتح ہو چکا۔ تو دو ٹروی قبیلوں بنو ہوازن اور بنو ثقیف نے ناسخین اسلام سے قوت آزمائی کرنا چاہی بنو ثقیف وہی سنگدل قبیلہ تھا۔ کہ جب سرد کائنات صلی اللہ علیہ وسلم دعوت اسلام دینے کے لئے ان کے ہاں تشریف لے گئے۔ تو ان کے سرداروں نے آپ کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ آپ پر پتھر برسائے۔ حتیٰ کہ آپ لہو لہان ہو گئے۔  
ہوازن مکہ اور طائف کے درمیان سکونت پذیر تھے۔ ان دونوں قبیلوں نے اپنے ساتھ بنو نصر اور بنو ہلال کو ملا کر مکہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اور اس عرض سے حنین کے مقام پر جمع ہو گئے۔ مکہ اور طائف کے درمیان حنین نام ایک وادی ہے۔ اسی میں کثرت سے گھنٹیاں اور دشاوار گزار ڈرتے ہیں دشمن کی چار ہزار فوج نے یہیں پڑاؤ ڈالا۔ جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ عورتوں اور بچوں کو بھی ہمراہ لائے کہ ان کی وجہ سے بھاگ نہ سکیں

(کامل ابن اثیر)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان تیاریوں کی خبر ملی تو آپ نے ایک صحابی کو تحقیق احوال کے لئے بھیجا انہوں نے معلوم کیا تو واقعہ صحیح نکلا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سوال رسد میں بارہ ہزار سہاؤں کو لے کر پڑے سازد سامان کے ساتھ جانب حنین روانہ ہوئے۔ پہلا موقع



تھا کہ مسلمان اتنی بڑی تعداد میں دشمن کے مقابلہ میں نکلے تھے۔ چنانچہ بعضوں کی زبان سے  
بیساختہ نکل گیا۔ کہ ————— ” آج ہم پر کون غالب آسکتا ہے — ”

حنین پنچ کر نرہیقین میں مقابلہ ہوا۔ پہلے حملہ میں مشرکین پسپا ہوئے۔ مگر ابھی  
پوری طرح ان کو شکست نہ ہوئی تھی۔ کہ مسلمان مال غنیمت پر متوجہ ہو گئے۔ مشرکین کو  
موتح مل گئی۔ انہوں نے تیرا مذازی شروع کر دی۔

اسلامی فوج میں مکہ کے بہت سے نو مسلم بھی تھے جو دلا سے شریک جنگ نہ تھے۔  
انہوں نے غین موقع پر دھوکہ دیا۔ اس سے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور وہ اس طرح منتشر  
ہوئے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف چند جاں نثار باقی رہ گئے۔ لیکن آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ پر قائم رہے۔ آپ نے انصار کو آواز دی۔ سب نے جواب دیا۔ ” ہم  
حاضر ہیں۔ ”

اس نازک حالت میں آپ سواری سے اتر پڑے اور جلال نبوت کے لہجہ میں فرمایا۔  
” میں خدا کا بندہ ہوں اور اس کا پیغمبر ہوں۔ ”

(بخاری و تاریخ طبری)

حضرت عباسؓ نے آپ کے حکم سے مہاجرین و انصار کو پکا مان کی آواز سنتے ہی مسلمان پلٹ  
پڑے۔ اور اس جان بازی کے ساتھ لڑے کہ دیکھتے ہی دیکھتے لڑائی کا رنگ بدل گیا۔ کفار ان  
کے بے پناہ حملوں کی تاب نہ لاسکے۔ اور میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ بہت سے زندہ گرفتار ہوئے  
اور بے شمار مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ قرین باستر مارے گئے۔ اس کے مقابلہ میں صرف  
چار مسلمان شہید ہوئے۔

غزوة حنین میں جو کمانفر بھاگے تھے وہ تین تھیں

میں بٹ گئے۔ بنو ثقیف اور بنو نہوازن ظائف میں پناہ

غزوة اوطاس

گزین ہوئے۔ ان میں سے کچھ لوگ اوطاس نامی مقام میں جمع ہو گئے۔ ایک گروہ تھلہ کی طرف  
بھاگا۔ اوطاس کی جانب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو عامر اشجریؓ کو روانہ فرمایا ابو  
نامہ بن ہمدان کے جوہر دکھائے۔ یہ وہ دشمنوں کو ہلاک کیا۔ آخر ایک تیر لگنے سے شہادت



پائی۔ ان کی جگہ ان کے چچیرے بھائی ابو موسیٰ اشعریؓ نے کمان سنبھالی اور فتحیاب ہو کر لوٹے۔  
ادطاس کے قیدیوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن حضرت شیماؓ بھی تھیں  
انہیں آپ کے ساتھ پیش کیا گیا۔ آپ بہت اکرام سے پیش آئے۔ اپنی چادر بچھا کر اس  
پر بٹھایا اور فرمایا۔ چاہو تو میرے ساتھ چلو۔ ورنہ اپنے گھر جا سکتی ہو۔ انہوں نے گھر  
جانے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے کچھ تحائف دیئے جن میں ایک لونڈی اور غلام تھا۔

(بخاری و تاریخ طبری)

**مُحَاصِرَةُ طَالُفٍ**  
طائف کے باشندے بنو ثقیف تھے۔ جو ثمود کی اولاد میں  
سے تھے۔ حنین کے میدان سے بنو ثقیف کی شکست خوردہ فوج  
طائف کی فیصل میں پناہ گزین ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ بنو ثقیف اپنی شجاعت و بہادری کے لحاظ سے  
عرب بھر میں متاثر تھے۔ یہ سامانِ رسد اور مقابلہ کے لئے ضروری سامان جمع کر کے قلعہ بند ہو  
گئے تھے۔ اس لئے حنین سے فراغت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت چھوڑ کر  
مقام پر بھجوا دیا۔ اور خود طائف تشریف لے گئے۔ اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ چالیس دن محاصرہ  
جاری رہا۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ چونکہ صرف مدافعت مقصود تھی۔ اس لئے محاصرہ اٹھایا  
اور واپس مکہ تشریف لے گئے۔

(تاریخ طبری)

**تَقْسِيمُ غَنِيْمَتٍ**  
حنین اور ادطاس کے معرکوں میں چھ ہزار عورتیں اور پینچے  
گرفتار ہوئے۔ بیس ہزار اونٹ اور چالیس ہزار بکریاں اور بہت سی  
چاندی ہاتھ آئی۔ یہ غنیمت محفوظ رہی۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے محاصرہ طائف سے  
سے واپس تشریف لانے کے بعد دس روز تک اس کی تقسیم ملتوی رکھی۔ انسا اس انتظار میں  
رہے۔ کہ ہوازن کے لوگ شائد واپس آکر اپنے مال کے لئے درخواست کریں گے۔ لیکن ہوازن  
کا کوئی وفد نہ آیا۔

آپ نے شرعی اصول کے مطابق تمام مالِ غنیمت مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ اور مالِ غنیمت  
قلب کے خیال سے اس کا زیادہ حصہ مکہ کے نو مسلموں کو دیا۔ اس سے انہیں انعام دیا گیا۔



پیدا ہو گئی۔ اور انہوں نے کہا۔

قریش کو مال غنیمت ملتا ہے۔ اور ہم جن کی تلواروں سے قریش کا خون ٹپکتا ہے محروم رکھے جاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے انصار کو بلا کر پوچھا۔ انہوں نے عرض کیا۔ ہمارے سر پر آوردہ لوگوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا۔ ہاں نوجوانوں نے یہ فقرے کہے تھے۔ آپ نے ان کا ملال دور کرنے کیلئے یہ خطبہ دیا۔ آپ نے فرمایا۔

”کیا یہ سچ نہیں ہے۔ کہ تم گمراہ تھے۔ خدا نے میرے ذریعہ سے تمہیں ہدایت کی تو نیک بخشی تم منتشر اور پر اگندہ تھے۔ خدا نے میرے ذریعہ سے تم میں اتفاق پیدا کیا۔ تم مفلس تھے خدا نے میرے ذریعہ سے تم کو دولت مند بنایا۔“ انصار اپنے ہر فقرہ پر کہتے جاتے تھے کہ خدا اور رسول کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔

آپ نے فرمایا۔ ”نہیں“ تم یہ جواب دو کہ محمد جس وقت لوگوں نے تجھ کو جھٹلایا اس وقت ہم نے تیری تصدیق کی۔ جب لوگوں نے تجھ کو چھوڑ دیا۔ اس وقت ہم نے تجھ کو نپاہ دی۔ تو اپنے یہاں سے مفلس آیا تھا۔ ہم نے ہر طرح تیری مدد کی۔ تم یہ کہتے جاؤ۔ میں جواب دیتا جاؤں گا۔ کہ ہاں! تم سچ کہتے ہو۔ لیکن کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اذیت اور بکریاں لے جائیں۔ اور تم محمد کو لے کر اپنے گھر جاؤ۔

یہ سحر آفرین خطبہ سن کر انصار چیخ اٹھے۔ کہ ہم کو صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم مطلوب ہیں اکثر کا یہ حال ہوا کہ روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں اس کے بعد آپ نے انصار کو سمجھایا کہ مکہ کے لوگ جدید الاسلام ہیں ان کو میں نے جو کچھ دیا ہے۔ وہ کسی حق کی بنا پر نہیں بلکہ صرف تالیفِ قلب کے لئے دیا ہے۔

(بخاری و فتح الباری)

۱:- اسی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صلحِ اہلی

حضرت زینتِ صنیٰ نے دنات پائی۔

۸۰ کے دیگر واقعات

۲:- اسی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند ابراہیمؑ حضرت ماریہ قبطیہؑ کے یمن



سے پیدا ہوئے۔

۳۰۔ نجاشی شاہ حبشہ نے وفات پائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی غائبانہ نماز جنازہ

پڑھی۔

۴۰۔ کسی بتکدے مسمار کر دیئے گئے۔ مکہ اور طائف کے درمیان عزیٰ دیوی کا بت تھا اسے

فتح مکہ کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ نے منہدم کیا۔

تبوک عرب اور شام کا سرحدی مقام

**غزوة تبوک، رجب ۹ھ**

ہے۔ یہ رومیوں کی حکومت میں تھا۔ روم

اور عرب کے سرحدی علاقے پر رومی حکومت کی جانب سے عرب سردار حکومت کرتے تھے شہزاد

دانی بصری بھی ان ہی سرداروں میں سے ایک تھا۔ جنگ موتہ کے بعد ہی سے رومیوں نے

عرب پر حملہ کا ارادہ کر لیا تھا۔ اور شام کے غسانی خاندان کو بنسلا عرب اور مذہباً عیسائی

تھا۔ اور رومی حکومت کے ماتحت تھا۔ اس مہم پر مامور کیا تھا۔ اس وقت سے عرب پر ان

کے حملہ کی افواہیں برابر پھیلتی رہتی تھیں۔ اسی زمانہ میں شام کے تاجروں نے مدینہ آکر اطلاع

دی کہ شام میں رومیوں نے بہت بڑی فوج جمع کی ہے۔ یہ افواہیں بھی پھیل گئیں کہ عیسائی

عربوں کی درخواست پر قیصر روم نے چالیس ہزار فوج بھیج دی ہے۔

چونکہ رومیوں کی جانب سے حملہ کا خطرہ تھا اس لئے ان خبروں پر یقین کرنے میں تاثر

نہ ہوا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رجب ۹ھ میں حضرت علیؓ کو مدینہ چھوڑ کر تیس ہزار

مسلمانوں کے ساتھ جس میں دس ہزار سوار تھے شام روانہ ہوئے تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ

حملہ کی افواہیں غلط تھیں۔

تاہم آپ نے بیس دن تک تبوک میں قیام فرمایا۔ ایلہ کے سردار یوحنا نے حاضر ہو کر حزیہ

دینا قبول کیا۔ اور ایک شجر بدیہ کے طور پر پیش کیا۔ دوستہ الحبدال کا حاکم قیصر

روم کے ماتحت تھا۔ اس کی جانب سے خطرہ تھا۔ اس لئے آپ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو

چار سو آدمیوں کے ساتھ دوستہ البجدل بھیجا۔ خالد نے اسے گرفتار کر لیا۔ وہ معالحت پر آمادہ

ہو گیا۔ حضرت خالدؓ نے اسے اس شرط پر رہا کر دیا کہ وہ بارگاہ نبویؐ میں حاضر ہو کر شرائط



صلح پیش کرے۔ بیس دن تبوک میں قیام کے بعد اس پاس کے حکمرانوں کو مطیع بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے۔ دوسرے الجندل کا والی مدینہ حاضر ہوا آپ نے اسے امان نامہ عطا کر کے واپس فرما دیا۔

(طبقات ابن سعد و تاریخ طبری)

## بیچ اکبر ۹

مکہ شہ میں فتح ہو چکا تھا۔ لیکن خانہ کعبہ کا انتظام ابھی تک مشرکین کے ہاتھ میں تھا۔ اور حج کی رسوم زمانہ جاہلیت کے انداز پر ادا کی جاتی تھیں۔ غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد ذی قعدہ ۹ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرؓ کی امارت میں تین سو حجج کا ایک قافلہ حج کے لئے روانہ فرمایا۔ بعد میں سورہ برات کی آیات نازل ہوئیں۔ تو حضرت علیؓ کو ان کی تبلیغ کے لئے مکہ بھیجا تو ان نے اس حج کو حج اکبر کہا ہے۔ اس لئے کہ یہ پہلا موقع تھا جب سنت ابراہیمی کے مطابق حج کے ارکان ادا ہوئے۔ اور خانہ خدا میں عہد جاہلیت کے انقضاء اور حکومت اسلام کے آغاز کا اعلان کیا گیا۔ دور جاہلیت کی تمام رکھیں باطل قرار پائیں۔

حضرت ابو بکرؓ نے لوگوں کو احکام حج سکھائے۔ قرآنی کے دن خطبہ میں مسائل حج بیان کئے حضرت علیؓ نے سورہ برات کی چالیس آیتیں پڑھ کر سنائیں اور اعلان کر دیا۔ کہ اب کوئی مشرک خانہ کعبہ میں داخل نہ ہو سکے گا۔ نہ کوئی برہنہ حج کرنے پلے گا۔ وہ تمام معاہدے جو مشرکین سے ہیں۔ ان کی عہد شکنی کے باعث آج سے چار ماہ بعد ٹوٹ جائیں گے۔

(مسند احمد حنبلی۔ جلد دوم صفحہ ۲۹۹)



## دُفود کی آمد ۹

۹ھ میں اسلام کو بڑا نمایاں فروغ حاصل ہوا۔ فتح مکہ کے بعد قریش کے ایمان لاتے ہی دیگر قبائل جو ق و ر جو ق مدینہ میں حاضر ہو کر اسلام قبول کرنے لگے۔ عرب کے گوشہ گوشہ سے مختلف قبائل کے دُفود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے انہوں نے یا تو اسلام قبول کر لیا یا اسلامی حکومت کی اطاعت کا اقرار کر لیا۔ اس طرح کے تقریباً پنیالیس دُفود آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دُفود کی بڑی آؤ بھگت کی آپ کا ان دُفود کے ساتھ حسن سلوک اچھی رواداری اور فراخ دلی کا کھلا ثبوت تھا۔

مقام نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد صہابہ کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن سلوک نے انہیں بہت متاثر کیا۔ ان دُفود کی آمد کی وجہ سے اسلام بڑی سرعت کے ساتھ پھیلنے لگا۔ آپ مقتدر صحابہ کو اشاعت اسلام کے لئے ان دُفود کے ہمراہ روانہ کرتے۔ تاکہ وہ وہاں کے لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرائیں۔ دُفود کی کثرت کے باعث ۹ھ کو تاریخ اسلام میں عام الودود (دُفود کا سال بھی کہتے ہیں)۔

## ۹ھ کے دیگر واقعات

۱۔ اسی سال عبداللہ بن ابی ریس المناقیہ نے وفات پائی  
۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا عازم فدوک ہوئیں۔

۳۔ چند منافقین نے مسجدِ قبا کے مقابلہ میں ایک مسجد تعمیر کی جس کو مسجدِ ضرار کہا جاتا ہے چونکہ یہ مسجد فتنہ پردازی کی نیت سے تعمیر کی گئی تھی اس لئے اسے یہ نام دیا گیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یہ مسجد جلا دی گئی تھی۔



## سوالات

- ۱۔ فتح مکہ کے اسباب حالات اور واقعات پر روشنی ڈالئے۔
- ۲۔ فتح مکہ کس اہمیت کی حامل ہے؟ اس سے کیا نتائج و ثمرات برآمد ہوئے؟
- ۳۔ غزو حنین میں جو واقعات پیش آئے انہیں قلمبند کیجئے۔
- ۴۔ غزوہ تبوک کے اسباب و نتائج اور واقعات صبط تحریر میں لائیے۔
- ۵۔ حج اکبر سے کیا مراد ہے؟ اس کی تفصیلات بیان کیجئے۔



## حجۃ الوداع

جب سارا عرب نورِ اسلام سے منور ہو گیا۔ خدا کی بھشکی ہوئی مخلوق اپنے اصل مرکز پر آچکی۔ اسلام کے عقائد و اعمال اور اصول و فروع کی تکمیل ہو گئی۔ اس وقت یہ سورہ کریم نازل ہوئی :-

اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ  
النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ  
أَسْرًا - فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ  
وَاسْتَغْفِرْ لَهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا -

جب خدا کی مدد آچکی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ خدا کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں تو خدا کی حمد کی تسبیح پڑھ اور اس سے مغفرت طلب کرو کہ خدا توبہ قبول کر نیوالا ہے۔

اس وحی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر واضح کر دیا کہ دنیا میں آپ کا مشن مکمل ہو چکا۔ اب آپ کا اپنے خالق حقیقی سے ملنے کا وقت آپہنچا۔ چنانچہ سالہ ۶ میں آپ نے حج کا ارادہ کیا اور تمام قبائل کو اس کی اطلاع دیدی۔ یہ سنتے ہی چاروں طرف سے لوگ درجوق حاضر ہونے لگے۔ چنانچہ ۲۶ ذی قعدہ کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے روانہ ہوئے۔ آپ کے ہمراہ ایک لاکھ سے زائد صحابہ تھے (زر قانی) تمام ازواجِ مطہرات ساتھ تھیں۔ ذوا تحلیف پہنچ کر اعرام باندھا۔ ہر طرف انسانوں کا سمندر نظر آتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیک فرماتے تو مسلمانوں کی آواز سے دشت و جبل گونج اٹھتے۔ مکہ کے قریب مقامِ سرف میں قیام فرمایا۔ "دوسرے دن غسل کر کے مکہ میں داخل ہوئے۔ کعبہ کو دیکھ کر فرمایا۔ "اے خدا۔ اس گھر کو اور زیادہ شرف و عورت عطا کر۔" پھر کعبہ کا طواف کیا۔ طواف سے فارغ ہو کر مقامِ ابراہیم میں دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر کوہِ صفا پر تشریف لے



گئے اور یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔

”خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کے لئے سلطنت، ملک اور حمد ہے۔ وہ مارتا اور زندہ کرتا ہے اور تمام چیزوں پر قادر ہے۔ کوئی خدا نہیں مگر وہ اکیلا خدا ہے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندہ کی مدد کی اور اکیلے تمام قبائل کو شکست دی۔“  
(ابوداؤد، کتاب الحج)

**خطبہ حج** ۹۔ ذوالحجہ کو نماز فجر کے بعد مسلمانوں کے ساتھ میدانِ عرفات میں تشریف لے گئے۔ اور ناقہ پر سوار ہو کر وہ آخری اور مشہور و معروف خطبہ دیا۔ جو تاریخ اسلام میں خطبہ الوداع (آخری خطبہ) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ خطبہ اسلامی تعلیمات کا عطر اور خلاصہ ہے۔ یہ وہ دن تھا کہ سلام اپنے پورے جاہ و خلیل کے ساتھ نمودار ہوا۔ اور جاہلیت کی تمام بیہودہ رسمیں مٹا دی گئیں۔ اس خطبہ میں آپ نے ارشاد فرمایا۔

۱۔ جاہلیت کے تمام دستور و مراسم میرے قدموں کے نیچے ہیں۔  
۲۔ لوگو! یقیناً تمہارا اللہ ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ نہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ عجمی کو عربی پر۔ نہ سرخ کو سیاہ پر فضیلت ہے۔ نہ سیاہ کو سرخ پر۔ فضیلت کا مدار تقویٰ پر ہے۔ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ غلاموں سے برابر کا سلوک کرو۔ جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ۔ جو خود پہنو، وہی ان کو پہناؤ۔  
۳۔ جاہلیت کے تمام خون معاف کر دیئے گئے۔ سب سے پہلے میں ربیعہ بن حارث کا خون معاف کرتا ہوں۔

۴۔ دو در جاہلیت کے تمام سود باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے میں عباس بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں۔

۵۔ اے لوگو! عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ تمہارا عورتوں پر حق ہے اور عورتوں کا تم پر۔ ان سے نرم سلوک کرو اور مہربانی سے پیش آؤ۔



۶۔ جس طرح تم اس پہننے، اس دن اور اس جگہ کی عزت کرتے ہو۔ اسی طرح تمہارا خون اور تمہارا مال ایک دوسرے پر حرام ہیں۔ کوئی چیز جو ایک بھائی کی ملکیت ہے۔ دوسرے کے لئے حلال نہیں۔ جب تک کہ وہ خود اپنی خوشی سے نہ دے۔

۷۔ میں تم میں ایک چیز چھوڑ رہا ہوں۔ اگر تم نے اسے مضبوطی سے تھام لیا تو گمراہ نہ ہو گے اور وہ چیز کتاب اللہ ہے۔

۸۔ لوگو! اگر کوئی حبشی غلام بھی تمہارا حاکم ہو اور وہ تمہیں کتاب کے مطابق چلائے تو اس کی فرمانبرداری کرو۔ اپنے رب کی عبادت کرو۔ نمازیں پڑھو۔ روزے رکھو۔ میرے احکام کی پیروی کرو۔ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

۹۔ عمل میں اخلاص، مسلمانوں کی خیر خواہی اور جماعت میں اتحاد۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جو سینے کو پاک رکھتی ہیں۔

۱۰۔ تمہارے لئے ضروری ہے کہ میری یہ باتیں ان لوگوں تک پہنچا دو۔ جو یہاں موجود نہیں۔ ممکن ہے وہ ان لوگوں سے زیادہ بہتر طور پر ان کو محفوظ رکھنے والے ہوں جو یہاں اپنے کانوں سے سنتے ہیں۔

یہ خطبہ ارشاد فرمانے کے بعد آپ نے حاضرین سے پوچھا۔ "قیامت کے دن اللہ تم سے میرے متعلق دریافت فرمائے گا۔ تو تم کیا جواب دو گے۔" سب نے عرض کیا کہ ہم کہیں گے۔ آپ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا۔ یہ سن کر آپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور ہاتھ اٹھا کر تین مرتبہ فرمایا کہ۔ "اے اللہ! تو گواہ رہنا۔" خطبہ کے بعد وحی نازل ہوئی۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کر لیا۔" (سورہ مائدہ)

اس کے بعد نزول وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا کیونکہ آپ کی بعثت کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ (صحیح مسلم، نیز سیرت ابن ہشام و طبقات ابن سعد و تاریخ طبری) خطبہ سے فارغ ہو کر ظہر و عصر کی نماز ایک ساتھ ادا کی۔ پھر قبلہ رو کھڑے ہو کر



دیر تک دعائیں مصروف رہے۔ غروبِ آفتاب کے بعد مژدلفہ میں مغرب کی نماز ادا فرمائی۔ رات بھر آرام کر کے نماز فجر کے بعد طلوعِ آفتاب سے پہلے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں لوگ حج کے مسائل دریافت کرتے رہے اور آپ جواب دیتے جاتے تھے۔ اس دوران یہ بھی فرمایا۔ "حج کے مسائل سیکھ لو۔ شاید اس کے بعد مجھے دوسرے حج کی نوبت نہ آئے۔" (مسلم)

ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے طریقہ حج میں عربوں نے اپنے اغراض و مقاصد کی بنا پر بہت سی ترمیمیں کر دی تھیں۔ حج کے مہینے میں خونریزی حرام ہے۔ اس لئے جنگجو عرب جنگ کا جواز پیدا کرنے کے لئے مہینوں میں الٹ پھیر کر دیتے تھے۔ اب حج بھی اپنی اصلی شکل و صورت میں نمودار ہو رہا تھا۔ اس لئے آپ نے اعلان فرمایا:-  
"سال کے بارہ مہینے ہیں۔ جن میں چار مہینے قابلِ احترام ہیں۔ تین متواتر ذوقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور چوتھا رجب"

دنیا میں عدل و انصاف اور امن و امان کا انحصار تین چیزوں پر ہے جان، مال اور آبرو کی حفاظت، آپ نے نہایت بلیغ الفاظ میں ان کی تاکید فرمائی۔  
ہادی اکبر صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں کو مخاطب کر کے پوچھا۔ "کچھ معلوم ہے۔ آج کونسا دن ہے؟" لوگوں نے عرض کیا۔ خدا اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔ آپ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا۔ "کیا آج قربانی کا دن نہیں ہے؟" لوگوں نے کہا۔ ہاں، بے شک۔ پھر فرمایا۔ "یہ کونسا مہینہ ہے؟" لوگوں نے پھر اسی طریقہ سے جواب دیا۔ آپ کچھ دیر خاموش رہے پھر فرمایا۔ "کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟" لوگوں نے کہا۔ ہاں بے شک۔ پھر پوچھا۔ "یہ کونسا شہر ہے؟" لوگوں نے وہی جواب دیا۔ آپ نے پھر سکوت کے بعد فرمایا۔ "کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں ہے؟" لوگوں نے عرض کیا بے شک۔

جب لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پوری طرح جاگزیں ہو گیا کہ آج کا دن، مہینہ اور شہر سب قابلِ احترام ہیں۔ یعنی اس دن اس مقام پر جنگ و خونریزی جائز



نہیں۔ تو فرمایا۔

”تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری آبرو تا قیامت اس طرح محترم ہے۔ جس طرح

اس دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں محترم ہے۔“ (فتح الباری)

لوگوں کو حج کے مسائل و احکام بتانے کے بعد آپ نے بقیہ احکام حج ادا کئے۔

۱۳ ذوالحجہ تک متیٰ میں مقیم رہے۔ پھر اسی تاریخ کو وادی محصب میں قیام فرمایا۔

پچھلے پہر کو اٹھ کر خانہ کعبہ میں تشریف لے گئے اور آخری طواف کر کے وہیں فجر کی

نماز ادا کی۔ نماز کے بعد مدینہ کی طرف کوچ فرمایا۔ راستہ میں خیم غدیر کے مقام پر صحابہؓ

کے سامنے ایک مختصر خطبہ دیا۔

”حمد و ثنا کے بعد۔ اے لوگو! — میں بھی بشر ہوں۔ ممکن ہے خدا کا فرشتہ

جلد آ جائے اور مجھے رموت کو قبول کرنا پڑے۔ میں تمہارے درمیان دو بھاری

چیزیں چھوڑتا ہوں۔ ایک خدا کی کتاب۔ جس کے اندر ہدایت اور روشنی ہے۔ خدا

کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑو۔ دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں۔ میں اپنے اہل بیت

کے بارے میں تم کو خدا کو یاد دلاتا ہوں۔ (صحیح مسلم جلد دوم)

## علامت و وفات

۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ

حج سے واپس آ کر آپ امورِ ملک کی طرف متوجہ ہوئے۔ قبیلوں

اور صوبوں کو منظم کیا۔ زکوٰۃ جمع کرنے کا انتظام کیا اور اہل عرب

کی اخلاقی حالت کو بہتر بنانے کے لئے صحابہ کو اطرافِ ملک میں بھیجا تاکہ ان کو تعلیم

دیں۔ چونکہ آپ کا کام ختم ہو چکا اور دین مکمل ہو گیا تھا۔ اس لئے آپ خدا سے

ملنے کی تیاری کرنے لگے۔ زیادہ وقت عبادت میں صرف فرماتے۔ ہجرت کا گیارہواں

سال تھا۔ آپ ۱۸ یا ۱۹ صفر رات کو اٹھے اور قبرستانِ بقیع میں جا کر خوابیدگانِ اہل



کو سلام کہا۔ ایک صحابی ہمراہ تھے۔ ان سے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے۔ کہ آخری انعامات یا دنیوی خزانوں میں سے کسی ایک کو پسند کروں۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کیا۔ قبرستان سے واپس ہوئے تو مزاج ناساز ہو گیا۔ بیماری کی حالت میں بھی آپ اذراہ عدل باری باری سے ازواجِ مطہرات کے گھروں پر آرام فرماتے تھے۔ جب مرض زیادہ بڑھا تو ان سے اجازت لے کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہاں مستقل قیام فرمایا۔ (صحیح بخاری)

مرض بتدریج بڑھتا چلا گیا۔ جمعرات کا روز تھا۔ بخار کی شدت تھی۔ ظہر کی نماز کا وقت ہوا۔ آپ نے غسل فرمایا اور مسجد میں تشریف لے گئے۔ نماز سے قبل اور بعد آپ نے دو خطبے دیئے۔ عشاء کی نماز کا وقت ہوا تو کمزوری اور کئی مرتبہ غشی طاری ہونے کی وجہ سے مسجد میں تشریف نہ لاسکے۔ آپ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما کو امامت کا حکم دیا۔ اتنے میں کچھ افاقہ محسوس ہوا تو مسجد میں تشریف لے گئے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما نماز پڑھا رہے تھے انہوں نے اپنی جگہ چھوڑ کر پیچھے ہٹ جانا چاہا۔ حضورؐ نے انہیں اپنی جگہ کھڑے رہنے کا اشارہ فرمایا اور خود ان کے برابر بیٹھ گئے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما نے آپ کی اقتداء میں اور دوسرے نمازیوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہما کی اقتداء میں نماز پڑھی۔ آپ نے بیٹھ کر نماز ادا فرمائی۔ (بخاری و مسلم نیز طبقات ابن سعد)

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما نے جمعرات کی نمازِ عشاء سے لے کر آپ کی وفات تک کل سترہ نمازیں پڑھائیں۔ آخری نماز پیر کے روز فجر کی تھی (کامل ابن اثیر)

بیماری کے ایام میں آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ الزہراءؑ کو بلا بھیجا۔ وہ تشریف لائیں تو ان کے کان میں کچھ کہا انہوں نے سنا اٹھایا اور رونے لگیں آنحضرتؐ نے دوبارہ ان کے کان میں کچھ کہا اور آپ ہنسنے لگیں۔ بعد میں حضرت فاطمہؑ نے بتایا کہ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے فرمایا تھا کہ میں اس مرض میں وفات پا جاؤ گا۔ میں رو پڑی۔ پھر فرمایا کہ میرے اہل بیت میں سے پہلے تم ہی میری ملاقات کرو گی اور کیا تمہیں پسند نہیں کہ تم اس امت کی خواتین کی سردار ہو؟ (صحیح مسلم و ترمذی)



دوشنبہ (پیر) کا روز تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی میں فجر کی وفات نماز پڑھا رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دروازے کا پردہ اٹھا کر دیکھا۔ رُخ مبارک اور اقی قرآن کی طرح تاباں و درخشاں تھا۔ نمازیوں نے فرط مسرت سے چاہا کہ حضور ہی کی طرف دیکھتے رہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جگہ چھوٹی چاہی کہ شاید حضور نماز پڑھائیں گے۔ آپ نے نماز پوری کرنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد پردہ ڈال دیا۔ مسجد نبوی کی فضا میں رُخ مبارک کی یہ آخری جھلک تھی۔

(بخاری و مسلم)

چوں جوں وقت گذرتا جاتا تھا۔ دنیا پر تاریکی چھانے کا وقت قریب ہوتا جاتا تھا بار بار غشی ہونے لگی۔ بدن تکلیف میں مبتلا تھا۔ چادر کبھی منہ پر ڈال لیتے اور کبھی ہٹا دیتے۔ بار بار فرماتے تھے۔

"یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو۔ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں

کو سجدہ گاہ بنا لیا۔" (صحیح مسلم)

سید مبارک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گود میں تھا۔ پاس پانی کا ایک برتن رکھا تھا۔ اس میں بار بار ہاتھ بھگو کر پیشانی مبارک کو تر کرتے تھے۔ اسی دوران میں ہاتھ اٹھا کر تین مرتبہ فرمایا۔ "بِئْسَ الرَّسِيْقُ الَّذِي كُنْتُ عَلَيْهِ" (بہی رفیق مطلوب ہے) یہ فرما ہی رہے تھے کہ رُوح عالم قدس میں پہنچ گئی (صحیح بخاری) ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ مطابق ۸ جون ۶۳۲ء کو جب کہ آپ کی عمر قریباً حساب سے ۶۳ سال ۳ دن اور شمسى حساب سے ۶۱ سال ۲ ماہ ۲۴ دن کی تھی۔ یہ رُوح اعظم عازم فردوس بریں ہوئی۔

جب آپ کی وفات کی خبر مدینہ میں پھیلی تو ہر طرف کہرام مچ گیا۔ تکفیر و تہنیت مسلمانوں میں سراپنگی پھیل گئی۔ رُغم داندوہ کے باعث معاہدہ کرام رضی اللہ عنہ کے ہوش و حواس گم تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ حال تھا کہ انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا یقین نہ آتا تھا۔ آپ نے سمجھا کہ یہ منحوس خبر کسی منافق نے اڑادی ہے۔ اس لئے آپ تلوار نکال کر کھڑے ہو گئے اور کہا۔ جو شخص یہ کہے گا کہ رسول اللہ



انتقال کر گئے۔ میں اس کا سر قلم کر دوں گا۔ اس وقت حضرت ابو بکر رضی وہاں پہنچے۔ سید  
حضرت عائشہ رضی کے حجرہ میں گئے۔ چادر اٹھا کر چہرہ مبارک دیکھا تو معلوم ہوا کہ آپ  
واقعی رحلت فرما گئے ہیں۔ آپ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ بصیرت افروز تقریر  
فرمائی :-

”اے لوگو! جو شخص محمدؐ کی پرستش کرتا تھا وہ سمجھ لے کہ آپ فوت ہو گئے ہیں اور  
جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا۔ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ  
رہے گا۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی :-

”وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ“

محمدؐ صرف ایک رسول ہیں جن سے پہلے بہت سے رسول گذر چکے ہیں۔ یہ تقریر  
ایسی دلنشین تھی کہ صحابہ کرامؓ کی نگاہوں سے پردہ اٹھ گیا اور وہ مطمئن ہو گئے۔

(بخاری، کتاب الجنائز)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یہ سوال اٹھا کہ آپ کو کس جگہ دفن کیا  
جائے۔ حضرت ابو بکر رضی نے فرمایا کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بخوبی یاد  
ہے کہ نبی اسی جگہ فوت ہوتا ہے جہاں وہ دفن ہونا پسند کرتا ہے۔ قرار پایا کہ حضرت  
عائشہ رضی کے کمرہ میں جہاں وفات کے وقت آپ کی چار پائی پڑی تھی۔ وہیں قبر مبارک  
کھودی جائے۔ (ترمذی۔ کتاب الجنائز)

وفات کے دن شام ہو چکی تھی۔ تجہیز و تدفین اور قبر کنی کے مراحل رات سے  
پہلے انجام نہیں پاسکتے تھے۔ دوسری طرف صحابہ رضی عنہم سے نڈھال اور مہوت ہو رہے  
تھے۔ اس لئے تجہیز و تدفین دوسرے دن سہ شنبہ (منگلوار) کو عمل میں آئی۔ غسل  
دینے میں خاص عزیزوں نے حصہ لیا۔ حضرت علی رضی آپ کی پشت مبارک کو ٹیک  
دئے ہوئے غسل دے رہے تھے۔ حضرت عباس رضی اور ان کے دونوں لڑکے فضل  
اور قثم رضی کو روٹ دلاتے جاتے تھے۔ اسامہ بن زید رضی اور شقران رضی پانی ڈال رہے  
تھے۔ آپ کو کپڑوں سمیت غسل دیا گیا۔ حضرت ابو طلحہ رضی نے قبر کھودی۔ یہی اہل بیت



کی قبریں کھودا کرتے تھے۔ غسل کے بعد آپ کو تین کپڑوں میں کفایا گیا۔ دو سفید تھے۔ اور ایک یعنی چادر تھی۔ چنانچہ سہ شنبہ ۱۳ ربیع الاول ۶۳۲ھ مطابق ۶۳۲ء کو کوفہ میں کی یہ دولت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کی پاک زمین کے سپرد کی گئی۔ (تاریخ ابن خلدون جلد اول)

**نماز جنازہ** تدفین کے بعد صحابہ کا ایک گروہ باری باری جاتا اور بلا امام جنازہ پڑھ کر واپس آجاتا تھا۔ چونکہ کمرہ چھوٹا تھا۔ اس لئے بیک وقت تھوڑے آدمی نماز پڑھ سکتے تھے۔ پہلے مردوں نے، ان کے بعد عورتوں نے پھر لڑکوں نے اور پھر غلاموں نے نماز پڑھنی شروع کی۔

**مردوں کا نماز کا ترکہ** ام المومنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے بھائی عمر و رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال کے وقت کچھ نہیں چھوڑا۔ آپ کے پاس ایک سفید خچر، کچھ ہتھیار اور زین تھی جسے عام مسلمانوں پر صدقہ کر گئے۔ (بخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ دینار چھوڑا نہ درہم، نہ اونٹ نہ بکری اور نہ کسی چیز کی وصیت کی۔ اگر کچھ چھوڑا بھی تو یہی چیزیں تھیں اور ان کے متعلق بھی فرمایا کہ تھے کہ۔ "ہم انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ جو چھوڑا وہ عام مسلمانوں کا حق ہے۔" (بخاری و ابوداؤد)

**حلیہ مبارک** آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ بہت طویل قامت تھے اور نہ زیادہ پستہ قد۔ سر بڑا۔ بھری ہونے والی تھی۔ دونوں بازو اور جسم پر گوشت نہ سرخی مائل گندمی رنگ۔ گول بڑی بڑی سیاہ پُرونق آنکھیں سر کے بال سیدھے۔ پیشانی چوڑی تھی۔ اس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آپ کے بالوں پر پیری کے آثار نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ لیکن بعض کہتے ہیں کہ آپ کی داڑھی میں قریباً بیس پچیس بال سفید تھے۔ جن کو آپ نے کبھی کسی چیز سے نہیں رنگا۔ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ کے سر میں بھی چند سفید بال تھے جو تیل رنگانے اور کنگھی کرنے



سے چھپ جاتے تھے۔ سر کے بال کبھی کندھے تک اور کبھی کانوں تک بڑھے رہتے تھے۔ سر میں تیل بکثرت ڈالتے اور آنکھوں میں سرمہ لگاتے تھے۔ شجاع - خلیق، شیریں کلام، خندہ رو، ظاہری و باطنی محاسن سے مزین تھے۔ تبسم فرمایا کرتے تھے۔ کھل کر کبھی نہیں ہنسے۔ (شمالی ترمذی و تاریخ ابن خلدون جلد اول)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عالم شباب میں صرف  
**ازواج مطہرات** ایک معمر اور بیوہ خاتون حضرت خدیجہ پر قناعت کی۔  
 ابن ہشام نے سیرت میں لکھا ہے کہ تیرہ عورتیں آپ کی زوجیت میں آئیں۔ جن میں انتقال کے وقت نو (۹) موجود تھیں۔

۱۔ حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ سب سے پہلے شادی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہوئی۔ اس وقت حضورؐ کی عمر ۲۵ برس اور ان کی چالیس برس تھی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا شادی کے بعد چالیس برس تک زندہ رہیں۔ نبوت کے دسویں سال وفات پائی۔ ان کے بطن سے چار بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ آنحضرتؐ کو ان سے بڑی محبت تھی۔ ان کی زندگی میں آپ نے دوسرا نکاح نہیں فرمایا۔

۲۔ حضرت سودہ بنت زمعہؓ بیوہ تھیں۔ پہلے خاوند کا نام سکران تھا۔ حضرت سودہ اور سکران نے حبشہ سے ہجرت کی۔ سکران وہاں عیسائی ہو کر مر گیا۔ حضرت سودہؓ کے والد زمعہ نے چار سو درہم مہر کے عوض ان کا عقد آنحضرتؐ سے کر دیا۔ آپ نے مہر ادا کیا۔ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے دسویں برس حضرت سودہ سے نکاح کیا تھا۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے بروایات صحیح خلافت فاروقی کے دور میں وفات پائی۔

۳۔ حضرت عائشہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد نبوت کے دسویں سال آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ عقد کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر سات برس تھی۔ رخصتی تین برس بعد مدینہ میں ہوئی جب کہ ان کی عمر ۹ برس سے کچھ زیادہ تھی۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ۵۵ھ میں وفات پائی۔ اٹھارہ برس کی عمر تھی کہ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا۔ ان کے سوا امہات المؤمنینؓ میں



سے کوئی بھی دو شیزہ نہ تھیں۔ یہ آپ کی محبوب ترین ازواج سے ہیں۔  
 ۴۔ حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا یہ بھی بیوہ تھیں۔ ان کی پہلی شادی خنیس بن حذافہ سے ہوئی۔ خنیس غزوہ بدر میں زخمی ہوئے اور شہادت پائی۔ ان کے انتقال کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے عقد فرمایا۔ ۴۵ھ میں انتقال ہوا۔  
 ۵۔ حضرت زینب بنت عزیمر۔ یہ بھی بیوہ تھیں۔ ان کا پہلا خاوند عبد اللہ بن جحش غزوہ احد میں شہید ہوئے۔ نکاح کے دو تین ماہ بعد فوت ہو گئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئیں۔ انتقال کے وقت تیس سال کی عمر تھی۔ غریب پرور اور رحمدل ہونے کی وجہ سے ام المساکین کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔

۶۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا۔ ام سلمہ کنیت والد کا نام شہیل تھا۔ پہلے ابو سلمہ کے نکاح میں تھیں۔ ابو سلمہ احد میں زخمی ہوئے اور شہادت پائی۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا میں حرم نبوی میں داخل ہوئیں۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد وفات پائی۔ وفات کے وقت آپ کی عمر ۴۷ سال تھی۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرصہ دراز تک زندہ رہیں۔ علمی اعتبار سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بعد انہی کا درجہ تھا۔

۷۔ حضرت زینب بنت جحش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چھو پھیری بہن تھیں ان کی شادی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منبتی اور غلام حضرت زید بن حارثہ کے ساتھ کر دی تھی لیکن درنوں میں نباہ نہ ہو سکا۔ اور طلاق ہو گئی۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ نکاح کر لیا۔ یہ بڑی عابدہ زاہدہ تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ازواج مطہرات میں سب سے پہلے انہی کا انتقال ہوا۔ ۲۷ھ میں بعمر ۴۵ سال وفات پائی۔

۸۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بنو مصطلق کے رئیس حارثہ کی بیٹی تھیں۔ جنگ میں گرفتار ہو کر آئیں۔ آپ نے انہیں آزاد کر کے اپنے عقد میں لے لیا۔ اس رشتہ کا بہ اثر ہوا کہ



مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق کی وجہ سے بنی مصطلق کے تمام ارنڈی غلام آزاد کر دیئے۔ ۵۰ھ میں ۶۵ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

۹۔ حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا۔ اصل نام رملہ تھا اور اُمّ حبیبہ کنیت۔ یہ کنیت سے مشہور ہیں۔ اپنے پہلے خاوند عبید اللہ بن جحش کے ساتھ جلیشہ کو ہجرت کی تھی۔ ابن جحش وہاں عیسائی ہو گیا اور مر گیا۔ آنحضرت ص کو یہ واقعات معلوم ہوئے تو آپ نے نجاشی شاہ حبشہ کی وساطت سے ان کے پاس شادی کا پیغام بھیجا۔ انہوں نے قبول کر لیا۔ نجاشی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے مہر کی رقم ادا کی اور ولیمہ کیا۔ نکاح کے بعد حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو شہر حبیل بن حسنہ کے ساتھ حضور کی خدمت میں مدینہ بھیج دیا۔ انہوں نے ۷۲ھ میں وفات پائی۔

۱۰۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے والد کا نام حارث تھا۔ ان کی پہلی شادی مسعود بن عمرو کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس نے طلاق دیدی تو آپ نے ان کے ساتھ عقد کر لیا۔ یہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی بیوی ام فضل کی بہن تھیں۔ آپ نے عمرہ قضا کے وقت مقام سرف میں ان سے نکاح کیا۔ ان کی وفات ۳۱ھ میں ہوئی۔

۱۱۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا۔ وہ خیبر کے بعد آپ نے حضرت صفیہ سے نکاح کیا۔ یہ پہلے سلام بن مشکم کی زوجہ تھیں۔ پھر کنانہ بن ربیع کے عقد میں آئیں۔ یہ جنگ خیبر میں گرفتار ہو کر آئی تھیں۔ آپ نے ان کو دعوت اسلام دی جسے انہوں نے قبول کیا۔ آپ نے ان کو آزاد کر کے نکاح کر لیا۔ ۳۶ھ کا واقعہ ہے۔ ۳۶ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ مذکورہ صدر گیارہ اہمات المدینہ ہیں۔ جن کو شرف خانہ آبادی سے مشرف کیا گیا۔ ان میں سے دو یعنی خدیجہ رضی اللہ عنہا و زینب رضی اللہ عنہا بنت خنیسہ آپ کی حیات طیبہ میں ہی عازم جنت ہوئیں باقی ۹ اہمات المؤمنین کو چھوڑ کر آپ نے انتقال فرمایا۔ باقی دو بیویاں ایسی تھیں جن سے خانہ آبادی کی نوبت نہیں آئی۔

۱۔ اسماء بنت نعمان کنذیہ۔ ان سے آپ نے نکاح کیا لیکن سفید داغ ہونے کی وجہ سے آپ نے ان کو ان کے خاندان کی طرف لوٹا دیا۔



۲۔ عمرہ بنت یزید کلابیہ۔ یہ جدید الاسلام تھیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے تو انہوں نے آپ سے طلاق کی خواہش کی۔ آپ نے ان کو ان کے خاندان کی طرف واپس بھیج دیا۔

(تاریخ ابن خلدون و تاریخ طبری جلد اول)

**صاحب زادے :-** ۱۔ حضرت قاسم۔ یہ سب سے پہلی **اولاد** اولاد تھے۔ ان کی پیدائش نبوت سے گیارہ برس پیشتر ہوئی تھی بچپن میں ہی فوت ہو گئے۔ آنحضرت کی کنیت ابوالقاسم ان کے نام پر تھی ۲۔ حضرت عبد اللہ ۳۔ حضرت طاہر ۴۔ حضرت طیب یہ چاروں فرزند حضرت خدیجہ کے لطن سے ہوئے اور قبل نبوت وفات پا گئے۔

۵۔ حضرت ابراہیم۔ شہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت ماریہ کے لطن سے تھے۔ ڈیڑھ سال کی عمر میں وفات پائی۔

**صاحب زادیاں :-** حضرت زینب۔ ان کی شادی اپنی خالہ کے بیٹے ابوالعاص سے ہوئی تھی۔ یہ لڑکیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ یہ قاسم کے بعد پیدا ہوئیں۔ زینب نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ہی شہ میں وفات پائی ایک لڑکا علی اور ایک لڑکی اُمّہ یادگار چھوڑی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّہ سے اتنی محبت کرتے تھے کہ نماز کی حالت میں بھی ان کو چُدا نہ کرتے تھے۔

۲۔ حضرت رقیہ۔ ان کی شادی قبل از اسلام ابولہب کے لڑکے عتبہ کے ساتھ ہوئی تھی۔ ظہور اسلام کے بعد ابولہب نے اپنی کینہ پروری میں عتبہ سے طلاق دلوادی طلاق کے بعد حضرت عثمان غنی سے شادی ہوئی۔ ان کا انتقال بھی حضور کی زندگی میں شہ میں غزوہ بدر کے زمانہ میں ہوا۔ انہی کی تیمارداری کی وجہ سے حضرت عثمان غنی بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے۔

۳۔ اُمّ کلثوم۔ رقیہ سے چھوٹی اُم کلثوم تھیں۔ ان کی شادی ابولہب کے دوئم لڑکے عتبہ کے ساتھ ہوئی۔ انہیں بھی ابولہب نے طلاق دلوادی۔ حضرت رقیہ کے



انتقال کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شادی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ کر دی۔ شادی کے چھ سال بعد تک زندہ رہیں۔ ۹۰ سالہ میں انتقال ہوا۔

۲۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا۔ سب سے چھوٹی صاحبزادی فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ جنگ بدر کے بعد یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں۔ ان کے علاوہ آپ کے سب سے بڑے آپ کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ اس لئے آپ ان کو بہت محبوب رکھتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی زندگی میں دوسری شادی نہیں کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے چھ مہینے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا۔ ان کے پانچ بچے تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ، محسن، ام کلثوم، زینب، محسن بچپن ہی میں وفات پا گئے تھے۔

## سوالات

۱۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ دیا۔ اس کا خلاصہ بیان کیجئے؟

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری حج کا حال لکھئے اور خطبہ الوداع کی اخلاقی اور مذہبی تعلیمات کی اہمیت واضح کیجئے؟

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے وفات تک اسلام کی ترقی کا حال لکھئے؟

۴۔ آپ کی علالت، وفات اور پھیز و تدفین کی تفصیلات لکھئے۔

۵۔ آپ کی ازواج مطہرات کا مختصر تعارف پیش کیجئے۔

۶۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولادِ امجاد کا مختصر حال بیان کیجئے۔



## اخلاق النبیؐ

سیر و سوانح کا تحفظ | جس طرح اسلام اپنی تعلیمات کی جامعیت کے لحاظ سے دوسرے مذاہب میں ممتاز ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان تعلیمات کے نمونہ عمل ہونے کے لحاظ سے دوسرے انبیاء و رسل میں امتیاز حاصل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی پیغمبر کی زندگی کے چند خاص واقعات کے سوا اس کے سوانح حیات اور اخلاق و اوصاف محفوظ نہیں ہیں اور ان کا بڑا حصہ افسانوں میں گم ہے۔ اس لئے ان کی زندگی کو عملی نمونہ کی حیثیت سے نہیں پیش کیا جاتا۔ اس کے مقابلے میں حضرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک ایک خدوخال محفوظ ہے۔ آپ نے دنیا کو جن مکارم اخلاق کی تعلیم دی۔ ان پر عمل پیرا ہو کر دکھایا۔ خود قرآن نے آپ کے اخلاق کا یہ جامع مرقع پیش کیا ہے۔ اِنَّكَ لَعَلَىٰ خَلْقٍ عَظِيمٍ (اے محمد! آپ اخلاق کے بڑے درجہ پر فائز ہیں)

آپ کے خلقِ عظیم کے متعلق کچھ لکھنا آسان نہیں۔ ہر وہ خوب جس کا تصور کیا جاسکتا ہے اور ہر وہ اخلاقِ بلندی جو ممکن ہے۔ آپ کے کردار میں موجود تھی۔ آپ انتہائی نرم خو، خندہ جبیں، مہربان اور کریم النفس تھے۔ کوئی آپ کا دشمن بھی خدمت میں حاضر ہوتا تو آپ کے اخلاقِ کریمانہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ بہت سے مشرکین مکہ جو اپنی سنگدلی اور رشتہ گدلی اور کینہ توڑی کے لئے بدنام تھے۔ جب آپ کے سامنے آئے تو موم کی طرح نرم ہو گئے۔ سطور ذیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلقِ عظیم کی ایک جھلک دکھانے کی کوشش کی گئی ہے



**صدق** حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ سچ بولتے تھے۔ آپ نے عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ لین دین، کاروبار، تجارت وغرضیکہ ہر بات میں آپ سچ بولا کرتے تھے۔ اسی واسطے بچپن ہی سے "صادق" مشہور ہو گئے آپ کے جانی دشمن بھی آپ کی سچائی کا اعتراف و اقرار کرتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ حضرت رسول اکرمؐ نے صفا پہاڑی پر کھڑے ہو کر قریش کو آواز دی۔ آپ کی آواز سن کر قبیلے کے بڑے بڑے سردار اس پہاڑی کے نیچے آکر جمع ہو گئے۔ حضرت رسول اکرمؐ نے ان سے پوچھا۔ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑی کے نیچے تمہارے دشمنوں کا ایک لشکر آ رہا ہے تو کیا تم اس بات کو تسلیم کر لو گے؟ سب نے کہا کہ "ہاں! بے شک۔ کیونکہ آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔"

ایک دفعہ ابو جہل نے حضرت رسول اکرمؐ کی سچائی اور صدق کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ "اے محمد! میں تمہیں جھوٹا نہیں سمجھتا لیکن تمہاری تعلیم پر میرا دل نہیں ٹھہرتا۔"

**امانت و دیانت** حضرت رسول اکرمؐ بچپن ہی سے امانت اور دیانت کے لئے مشہور تھے۔ سب لوگ آپ کو "امین" کے

لقب سے پکارتے تھے۔ قریش مکہ کو آپ کی امانت داری پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ لوگ اپنا روپیہ پیسہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس امانت رکھ جاتے تھے۔ حضرت رسول اکرمؐ کی ایمانداری کی وجہ سے قریش اپنا مال اور سرمایہ آپ کے سپرد کر دیتے تھے۔ اس سرمائے سے آپ کاروبار کرتے تھے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی دیانتداری، سچائی اور ایمانداری کو دیکھ کر نکاح کی درخواست کی۔ آپ ہر بات میں سچا وعدہ فرماتے۔ آپ کی تجارت کے ایک ساتھی عبداللہ کا بیان ہے کہ ایک دن میں نے آنحضرتؐ سے اس زمانے میں خرید و فروخت کا ایک معاملہ کیا۔ بات کچھ طے ہو چکی تھی۔ کچھ اڑھوری رہ گئی تھی۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں پھر آکر بات پوری کر لیتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں چلا گیا۔ تین دن بعد مجھے اپنا وعدہ یاد آیا۔ فوراً پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپ



اسی جگہ پہنچے ہیں اور میرے واپس آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔  
مختصر یہ کہ دوست دشمن سب حضرت رسول اکرم کی سچائی، صدق اور امانت و  
دیانت کا اعتراف و اقرار کرتے تھے اور آپ کو صادق اور امین کے معزز القاب  
سے یاد کرتے تھے۔

**عدل و مساوات** | حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اپنے پرانے،  
امیر، غریب سب سے عدل کرتے اور ایک جیسا  
برتاؤ کرتے تھے۔ آپ ہمیشہ مظلوموں کی فریاد سنتے۔ ان سے انصاف کرتے، اور  
ان کا حق دلاتے تھے۔ دشمنوں کو بھی آپ کے عدل و انصاف پر پورا اعتماد تھا۔  
جب تک حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تشریف فرما رہے۔ اہل مکہ  
اپنے جھگڑے آپ کے پاس چکانے کے لئے لے جایا کرتے تھے۔ مدینہ میں تشریف  
لانے کے بعد یہودی اور دوسرے مخالفین بھی اپنے مقدمات میں آنحضرت صلی اللہ  
علیہ وسلم ہی کا فیصلہ تسلیم کرتے تھے۔ آپ کے عدل و مساوات کا یہ حال تھا کہ ایک  
مرتبہ ایک قرظخواہ تقاضے کے لئے آیا اور سخت سست بننے لگا۔ حضرت عمرؓ اسے  
مارنے چلے۔ آپ نے روکا اور فرمایا۔ "عمرؓ! تمہارے لئے یہ زیادہ مناسب تھا کہ  
مجھے ادا کرنے کی نصیحت کرتے اور اسے سبر کی۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
ہمیشہ سب انسانوں کو برابر سمجھتے تھے۔ امیر اور غریب، گورے، کالے، عربی اور  
عجمی میں کوئی فرق و امتیاز روانہ رکھتے تھے۔

**رہم و کرم** | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق عظیم کا غالب ترین صفت  
رضدلی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قرآن کریم میں ارشاد ہے۔  
"وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ" (ہم نے آپ کو سب  
جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے)

ایک دفعہ آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ مشرکین کو بددعا دیجئے۔ فرمایا۔ میں  
بددعا دینے کے لئے نہیں آیا۔ رحمت بن کر آیا ہوں۔ (صحیح مسلم)



آپ کا رحم و کرم سب کے لئے عام تھا۔ آپ دوست دشمن سب پر رحم و کرم فرماتے تھے۔ آپ نے عمر بھر نہ کسی کو ستایا، نہ دکھ دیا۔ وہ ہندہ۔ جس نے جنگ اُحد میں آپ کے پیارے چچا حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبایا تھا۔ جب آپ کے سامنے حاضر ہوئی تو آپ نے اس پر رحم کیا اور اسے معاف کر دیا۔ اسی طرح حضرت حمزہؓ کے قاتل وحشی کو بھی معافی دے دی۔ وہ ابوسفیان جس نے فوج لے کر مدینہ پر چڑھائی کی تھی۔ اس کو صرف معاف ہی نہ کیا بلکہ اس کے لئے رحم و کرم کا وسیع دامن پھیلا دیا۔ فتح مکہ کے دن اس کے گھر کو دارالامان قرار دیا فرمایا۔ "جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا وہ امن میں رہے گا۔"

ایک غزوہ کے بعد آپ کی نظر ایک عورت کی لاش پر پڑی۔ آپ کو معلوم ہوا کہ خالد بن ولیدؓ نے اسے قتل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ خالد سے جا کر کہو کہ رسول اللہ نے عورت بچے اور بوڑھے کے قتل سے منع فرمایا ہے۔ (سیرت ابن ہشام)

**شجاعت** حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بچپن سے ہی بڑے بہادر اور دلیر تھے۔ حضرت علی کا قول ہے کہ جب جنگ گرم ہو جاتی

تو ہم آپ کے سایہ میں عافیت پاتے تھے۔ آپ جنگ میں سب سے آگے ہوتے تھے۔ کمال ابن اثیر، حنین کی جنگ میں اسلام کی ساری سپاہ چھٹ گئی اور دشمن کے تیر چاروں طرف سے برسے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تنہا چرخہ کو دشمن کے لشکر کی طرف بڑھا رہے تھے اور زبان پر یہ ترانہ جاری تھا کہ "میں نبی ہوں اور جھوٹا نہیں ہوں۔" ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر سولہ سترہ برس کی تھی۔ آپ اپنے چچا کے ساتھ یمن گئے۔ قافلہ ابھی راستے میں تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک وادی میں ایک بڑا منہ زور اونٹ ایسا بدکا کہ رسی توڑ کر بھاگ نکلا۔ لوگ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس منہ زور اونٹ کی طرف پلکے اور بے خوف ہو کر اس کو نیل سے پکڑ لائے۔ ایک رات مدینہ میں ایسی آواز آئی کہ ہراس پھیل گیا۔ لوگ آواز کی سمت دوڑے گئے۔ دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم



گھوڑے کی تنگی پشت پر سوار سب سے پہلے ادھر سے ہو کر واپس تشریف لارہے ہیں۔ آپ نے لوگوں کو تسلی دی کہ کوئی خطرہ نہیں۔ تاریخ طبری وغیرہ واث نبوی آپ کی بے مثال بہادری اور شجاعت کے گواہ ہیں۔ غزوہ اُحد اور غزوہ حنین میں آپ نے جس بہادری، استقامت اور شجاعت کا ثبوت دیا۔ اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بڑے روادار تھے۔ اپنے نزدیک اپنے آپ کو بھی لگاؤ رکھتے تھے۔ اگر کوئی دشمن بھی آجاتا تو اس سے بڑی اچھی طرح ملتے اور اس کی ضرورت پوری کر دیتے۔ تکلیف کے وقت دشمن کی مدد کرنے سے بھی دریغ نہ فرماتے تھے۔ ایک دفعہ مکہ میں اتنا سخت قحط پڑا کہ لوگ مردار اور ہڈیاں بھی کھانے لگے۔ ابوسفیان دشمنی کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ یا محمد! آپ تو لوگوں کو قریبی شہ آرو سے نیک سلوک کی تعلیم دیتے ہیں۔ دیکھئے آپ کی قوم بلاک ہو رہی ہے۔ خدا سے دعا کیجئے۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی اور خوب بارش ہوئی۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سب دنیا کے لئے رحمت بن کر تشریف لائے تھے۔ آپ دشمنوں کی بدسلوکی سے حتی الوسع درگزر فرمایا کرتے تھے اور ان کے ساتھ رحم و کرم کا سلوک فرمایا کرتے تھے۔ مکہ کے لوگوں نے آپ پر اور صحابہ پر سخت مظالم ڈھائے تھے لیکن ان میں سے جب کوئی شخص آپ کے قابو آیا۔ آپ نے معاف کر دیا۔

رواداری ایک ایسا لفظ ہے جس کا مفہوم متعین کرنا مشکل ہے۔ رواداری کے معاملہ میں بہت احتیاط اور اعتدال کی ضرورت ہے۔ اس پر دین و وطن کی بہبود اور اخلاق کے اصول قربان نہیں کرنے چاہئیں۔ جو لوگ دیگر مذاہب والوں کے ساتھ اس حد تک رواداری برتتے ہیں کہ دینی حمیت و غیرت کو بھول جاتے ہیں۔ ان کی رواداری درحقیقت رواداری نہیں بلکہ ایمان کی کمزوری اور نفاق ہے۔ رواداری کا مفہوم متعین کرنے کے لئے آنحضرت کے اسوہ کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ آپ بڑا طور پر حق کو حق



اور باطل کو باطل کہتے تھے اور دین و اخلاق کے معاملہ میں کوئی رورعایت نہیں فرماتے تھے۔ جس کی حد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لباس اور وضع قطع میں یہود و نصاریٰ کے تشابہ سے منع فرماتے تھے تاکہ ملت اسلامیہ کے امتیازی خدوخال قائم رہیں۔

### سادگی

حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بڑی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اٹھنے، بیٹھنے، پہننے، اور ٹھننے، کھانے پینے کی چیزوں میں تکلف نہ تھا۔ کھانے میں جو کچھ سامنے آتا کھا لیتے۔ پہننے کو جو مل جاتا پہن لیتے۔ زمین پر، چٹان پر فرش پر جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے۔ لباس میں نمائش کو ناپسند فرماتے تھے۔ سامان کی آرائش سے نفرت تھی۔ مویشی کو چارہ خود ڈال دیتے۔ اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھتے، گھر کی صفائی کر لیتے۔ بکری دوڑ لیتے۔ خادم کے ساتھ بیٹھ کر کھا لیتے۔ خود جا کر بازار سے سودا سلف خرید لیتے۔ خود اسے اٹھالاتے تھے۔ ہر چھوٹے بڑے کو پہلے سلام کہتے، رات دن کا لباس ایک ہی رکھتے۔ جو تاپھٹ جاتا تو خردگانٹھ لیتے۔ اور کپڑے کو خود پیوند لگا لیتے تھے۔ ہجرت کے نویں برس آپ کی ازواج مطہرات نے ایک کر کے مطالبہ کیا کہ ہمارا خرچ بڑھایا جاتے۔ آپ نے انکار کر دیا۔ ازواج بھی ضد پر آگئیں۔ آپ نے ارمانہ ہو کر مہاجرین سے الگ رہے۔ بعد میں ازواج کو اختیار دیدیا کہ چاہو اس زندگی پر۔ مگر کے ساتھ رہو اور چاہو تو طلاق لے لو۔ انہوں نے آپ کے ساتھ رہنا قبول کیا۔ اسی دوران حضرت عمرؓ آپ کے پاس آئے۔ آپ ابک الگ کمرے میں تھے جو آپ کا گودام تھا۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ اس کمرے کی کل کائنات ایک چٹائی ہے۔ جس پر آپ تشریف فرما ہیں۔ بدن مبارک پر چٹائی کی بدھیاں پڑی ہیں۔ ایک کونہ میں چار پانچ سیر جو رکھے ہیں اور اس پر یہ نقشہ دیکھ کر حضرت عمرؓ رو دیئے اور کہا۔ قیصر و کسریٰ تو نہروں اور پھلوں کے مزے لوٹیں آپ اللہ کے رسول اور محبوب ہیں اور آپ کے ذخیرے کا یہ حال ہے۔ فرمایا۔ عمرؓ کیا تم نہیں چاہتے کہ ہمارے لئے آخرت ہو اور ان کے لئے دنیا۔

(مسلم - کتاب الطلاق)



آپؐ وعدہ کے بڑے پکے تھے۔ دوست ہو یا دشمن ہر ایک  
ایمانے عہد سے کئے ہوئے وعدے کو نباہتے تھے۔ بدر کی جنگ میں مجاہدین  
 کی تعداد بہت کم تھی۔ ایک ایک شخص کی مدد درکار تھی۔ لیکن اس حال میں بھی ایمانے عہد  
 کا یہ حال تھا کہ دو صحابی مدینہ کے ارے سے چلے آئے تھے۔ انہیں کفار مکہ نے پکڑ لیا اور اس  
 وعدہ پر چھوڑا کہ سیدھے مدینہ ہی جاؤ گے۔ وہ اسلامی لشکر میں آئے تو آپؐ نے ان کو  
 مدینہ روانہ کر دیا اور فرمایا۔ "ہم وعدہ پورا کریں گے اور اللہ کی مدد پر بھروسہ کریں گے۔"  
 صلح حدیبیہ میں ایک شرط یہ تھی کہ آئندہ مکہ کا کوئی آدمی مسلمان ہو کر مدینہ جائے تو اسے  
 واپس کر دیا جائے گا۔ مکہ کا ایک شخص ابولصیر مسلمان ہو کر مدینہ حاضر ہوا۔ آپؐ نے فرمایا  
 "ہمارے دین میں وعدہ شکنی نہیں۔ تم واپس جاؤ۔"

غزوات نبویؐ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ  
سپہ سالاری علیہ وسلم کو فنون جنگ میں بڑی مہارت تھی۔ آپؐ  
 لشکر کشی، فوجی تربیت، عسکری نظام اور میدان جنگ میں فوج کی قیادت کے اصول  
 سے خوب واقف تھے۔ جنگ اُحد میں آپؐ نے بے مثال فنی مہارت کا ثبوت دیا۔  
 آپؐ نے گھائی کے تیر اندازوں کو حکم دیا تھا کہ وہ گھائی کو ہرگز نہ چھوڑیں۔ اور دشمن کے  
 گھوڑوں پر تیر برساتے رہیں۔ جب گھائی کے محافظوں نے حضورؐ کی ہدایت کے خلاف  
 گھائی کو چھوڑ دیا تو دشمنوں نے موقع پا کر پیچھے سے حملہ کر دیا۔ آپؐ کی ثابت قدمی،  
 استقامت اور شجاعت کی وجہ سے مسلمانوں کی فوج شکست سے بچ گئی۔ جنگ خندق  
 میں صحابہؓ سے مشورہ کر کے حضرت سلمان فارسیؓ کی رائے سے شہر کے گرد خندق کھودنے  
 کا حکم دیا۔ عربوں کے لئے خندق کھود کر شہر کی حفاظت کرنا بالکل نئی چیز تھی۔ وہ اس  
 طریق جنگ سے ناواقف تھے۔ جب قریش اور یہودی ہمت ہار کر ناکام واپس چلے گئے  
 تو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی مہارت و قابلیت اور عسکری قیادت  
 کا سکہ سارے عرب میں بلیٹ گیا۔ صلح حدیبیہ بظاہر مسلمانوں کے مفاد کے خلاف نظر آتی  
 تھی لیکن واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ صلح سیاسی اعتبار سے بہت اہم تھی۔ جنگ



حین میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بے نظیر شجاعت اور استقامت کا ثبوت دیا۔ اپنی بہادری اور ثابت قدمی سے میدان جنگ سے بھاگتے ہوئے مسلمانوں کو دوبارہ جمع کر کے صفوں کو از سر نو ترتیب دیا اور دشمنوں کو مار بھگایا۔

**حلم و انکسار**  
حضرت عدی رضی بن حاتم غسانی تھے۔ وہ حضورؐ کے پاس حاضر ہوئے۔ آپؐ عدی کو گھر لے گئے۔ گھر میں چمڑے کا ایک تکیہ تھا وہ آپؐ نے عدی کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے انکار کیا لیکن آپؐ نے مجبور کر کے ان کے ترالے کیا اور خود زمین پر بیٹھ رہے۔ عدی بہت متاثر ہوئے اور اسلام لے آئے (طبری) آپؐ صحابہ کرام میں برابر کی حیثیت سے بیٹھتے تھے۔ امتیاز پسند نہیں کرتے تھے آپؐ کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ جب آپؐ تشریف لائیں تو صحابہ کرام رضہ تعظیم کے لئے اٹھیں۔ حضرت انس رضہ کہتے ہیں کہ حضورؐ کو بعض دفعہ ہمارے گھر میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا ہمارے ہاں کھجور کے پتوں کی چٹائی تھی جو پرانی ہونے کی وجہ سے سیاہ پڑ گئی تھی۔ ہم اسے دھو ڈالتے وہ سُکھتی تو بچھا دیتے۔ آپؐ اسی پر نماز ادا فرماتے (صحیح مسلم)

**حیا**  
آپؐ کے مزاج میں شرم و حیا بے حد تھی۔ کوئی چیز خلاف مزاج دیکھتے تو زبان سے کچھ نہ کہتے۔ صرف چہرہ مبارک کے تغیر سے صحابہ محسوس کر لیتے تھے۔ حضرت عائشہ رضہ فرماتی ہیں کہ کسی کی غلطی پر اس کا نام لے کر کچھ کہنے کی بجائے یوں فرماتے تھے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ایسی باتیں کہتے یا کرتے ہیں۔ ہمیشہ نگاہ نیچی رکھتے اور مسکراہٹ سے زیادہ کبھی کھل کر نہ ہنستے تھے۔ آنحضرتؐ کے جسم مبارک کا کوئی حصہ کبھی کسی نے کھلا ہوا نہ دیکھا۔

**جو دو سخا** آپؐ بے انتہا سخی تھے۔ حضرت ابن عباس رضہ سے روایت ہے کہ حضورؐ سب سے زیادہ سخی تھے۔ ماہ رمضان میں آپؐ کی سخاوت حد کمال کو پہنچ جاتی تھی۔ جو کچھ گھر میں ہوتا خیرات کر دیتے تھے۔ آپؐ نے گھر میں مال رکھنا کبھی پسند نہ فرمایا۔ جو کچھ آتا، شام کو خرچ کر دیتے تھے۔ بعض اوقات بکثرت مال غنیمت جمع ہو جاتا آپؐ مسجد نبویؐ میں بیٹھ کر تقسیم فرما دیتے تھے۔ اور بسا اوقات گھر میں فاقہ ہوتا تھا۔



آپ عفو و درگزر کا مجسمہ تھے۔ ایک دفعہ حدیبیہ کے میدان میں فزوکش  
عفو صبح کی نماز ادا کر رہے تھے کہ قریش کے ایک دستہ نے آپ کے  
 قتل کے ارادہ سے پہاڑی کی ادٹ سے نکل کر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے سب کو گرفتار کر  
 لیا۔ آپ نے معاف کر دیا (صحیح مسلم و ترمذی) حضور کا فرمان ہے کہ پہلوان وہ نہیں  
 جو دوسروں کو پچھاڑ دے بلکہ وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے کو قابو میں رکھے۔ (بخاری  
 و مسلم)۔

آپ ایک دفعہ کہیں جا رہے تھے کہ ایک بدو نے آپ کی چادر پکڑ کر زور سے کھینچا  
 آپ کے شانہ مبارک پر داغ پڑ گیا۔ بدو نے کہا۔ آپ کے پاس جو مال ہے اس میں  
 سے مجھے بھی دلو ایسے۔ آپ ہنس دیئے اور حکم دیا کہ اسے کچھ دیا جائے۔ (صحیح بخاری و مسلم)  
 حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور  
مہمان نوازی یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ مہمان کی عزت افزائی کرے۔  
 (ریاض الصالحین)

ایک دفعہ ایک صحابی نے آپ سے پوچھا۔ اگر میں کسی کے پاس جاؤں اور وہ  
 میری خاطر مدارات نہ کرے تو کیا جب وہ میرے پاس آئے تو میں اس کے ساتھ ویسا  
 ہی سلوک کروں؟ فرمایا۔ نہیں۔ اس کو تواضع کرو۔ (ترمذی) آپ مہمانوں کی خاطر و  
 مدارات میں عجیب فرحت محسوس کرتے تھے۔ خلاصہ کلام یہ کہ آپ کی ذات گرامی اخلاق  
 جلیلہ و جمیلہ کا مجسمہ اور شرافت انسانی کے جملہ اوصاف و کمالات کی جامع تھی۔

## سوالات

- ۱۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و اوصاف پر سیر حاصل تبصرہ کیجئے۔
- ۲۔ دلائل و شواہد سے ثابت کیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجسمہ اخلاق تھے۔



## تعمیر ملت و نظام حکومت

**دعوتِ اصلاح** جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اہل عرب کی سیاسی، مذہبی اور اخلاقی حالت نہایت پست تھی۔ ملک میں کھلی منظم حکومت نہ تھی۔ ہر قبیلہ ایک سردار کے ماتحت آزادانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ان کا اپنا قانون، تعزیرات اور اپنا ہی ضابطہ اخلاق تھا۔ سینکڑوں بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ بتوں پر انسانی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں۔ باپ کی منکوہ بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی۔ ایک آدمی بے شہ عورتوں سے نکاح کر لیا کرتا تھا۔ قمار بازی، شراب خوری اور زنا کاری کا عام رواج تھا۔ لڑائیوں میں لوگوں کو زندہ جلا دینا، عورتوں کا پیٹ چاک کرنا، معصوم بچوں کو تہ تیغ کرنا، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا عام طور سے رائج تھا۔

آپ کا کام صرف یہی نہیں تھا کہ لوگوں تک توحید کا پیغام پہنچا دیا بلکہ اس بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح بھی آپ کے فرائض میں شامل تھی۔ جاہل اقوام کا خاصہ ہے کہ جب کوئی تحریک ان کے آباؤ اجداد کے عقائد کے خلاف ان کے سامنے آتی ہے تو انہیں سخت برہم کر دیتی ہے۔ یہی مشکلات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو درپیش تھیں۔ آپ کو قیام مکہ کے دوران یہ موقع نہیں ملا کہ آپ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو منظم کر سکتے۔ مدینہ پہنچ کر آپ نے قومی تنظیم کی طرف توجہ دی۔ وہاں آپ نے اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ آپ نے اہل مدینہ سے معاہدہ کیا جو "میثاقِ مدینہ" کہلاتا تھا۔ اس معاہدہ کی رو سے مسلمانوں کو ایک قوم قرار دیا۔ ان کے حقوق و فرائض اور باہمی تعلقات واضح کئے۔ اس کے علاوہ یہودیوں کے حقوق و فرائض متعین کیے۔ اس طرح وہاں معاشرتی



تنظیم کا آغاز کیا اور اسلامی نظام حکومت کی بنا ڈالی۔ آپ نے امور سلطنت مختلف شعبوں میں تقسیم کئے اور قابل اعتماد لوگوں کو ان کی ذمہ داری سونپی۔ آپ نے جو نظام حکومت قائم کیا وہ خلفائے راشدین کے عہد میں اپنی مکمل شکل میں نمودار ہوا۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے عربوں کی خانہ جنگی اور بد نظمی کو دور کر کے ایک مرکزی حکومت کے تحت زندگی بسر کرنے کا طریقہ سکھایا اور ان کو ایک ملت میں تبدیل کر دیا۔

اسلام کے سیاسی نظام میں اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ **مرکزی نظام** وہی اصلی دستور ساز اور مقلد حقیقی ہے۔ انسان دنیا میں اس کے نائب کی حیثیت سے خداوندی قوانین کو نافذ کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ مسلمانوں کے دینی اور دنیوی ہادی و مرشد تھے۔ اس لئے آپ کو تمام اختیارات حاصل تھے۔ آپ بیک وقت عاکم اعلیٰ سرچشمہ انصاف اور سالار فوج تھے۔ اس طرح آپ پورے نظام کے نگران اعلیٰ تھے لیکن آپ کو ایک مطلق العنان حکمران نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ آپ جو قدم بھی اٹھاتے تھے۔ اس میں حکم خداوندی شامل ہوتا تھا۔ جہاں حکم خداوندی موجود نہ ہوتا وہاں صحابہ کرام سے مشورہ کرتے تھے اور جس امر پر اتفاق رائے ہو جاتا اس پر عمل کرتے تھے۔ اس طرح آپ کی حکومت نہ شخصی تھی نہ جمہوری بلکہ دونوں کا حسین امتزاج تھا۔ بہر حال آپ اکثر معاملات میں جمہوری طریقے اختیار کرتے تھے۔ حکومت کا باقاعدہ کوئی دفتر نہ تھا۔ عموماً مسجد نبوی میں مرکزی حکومت کا سارا کام ہوتا تھا۔ وہیں مشورے ہوتے تھے اور اگر ضرورت ہوتی تو عوام کی رائے بھی وہیں معلوم کر لی جاتی تھی۔ آپ نے حکومت کے کام کو بحسن و خوبی چلانے کے لئے مختلف عہدے و شعبے قائم کئے تھے۔ آپ نے چند صحابہ کو مقرر کیا تھا جو دستاویزیں یادداشتیں اور قرآن لکھتے اور آمدنی وغیرہ کا حساب رکھتے تھے۔ یہ لوگ "کامل" کہلاتے تھے۔ ان کی تعداد ۴۲ تھی۔

۱۔ کتابتِ وحی۔ بعض صحابہ کتابتِ وحی کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ یہ لوگ وحی کے نازل ہونے کے بعد اس کو لکھ لیا کرتے تھے۔ وحی کے کاتبوں میں حضرت



زید، حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت ابی بن کعب اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم قابل ذکر ہیں۔

۲۔ رسل و رسائل۔ کچھ صحابہ سلاطین اور امرائے عرب کے ساتھ خط و کتابت کے فرائض انجام دیتے اور حکام اور مبلغین کے نام احکام بھیجتے تھے۔ اس شعبہ میں حضرت زید بن ثابت، حضرت معاویہ، حضرت علیؓ اور عبداللہ بن ارقم کام کرتے تھے۔ آپؐ کچھ صحابہ کو سفیر بنا کر سلاطین کے پاس بھیجتے تھے۔ وہ آپؐ کے خطوط لے کر جاتے تھے۔ شہ میں آپؐ نے اس طرح کے بہت سے سفیر مختلف حکمرانوں کے پاس روانہ کئے تھے۔ آپؐ خطوط اور فرامین پر اپنی ہر لگاتے تھے۔ یہ ہر حضرت جنظلہ رضی بن ربیع کے پاس رہتی تھی۔ ایک صیغہ راز بھی تھا۔ جس کے ذمہ دار حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ تھے۔

۳۔ مالیات۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حساب کتاب کے لئے ایک شعبہ بنایا تھا۔ اس میں کئی صحابہ کام کرتے تھے۔ حضرت زبیر رضی بن عروام اور حضرت جہیم رضی صدقات کی آمدنی کا حساب رکھتے تھے۔ حضرت معیت بن ابی فاطمہ اور حضرت کعب بن عمرو مال غنیمت کا اندراج کرتے تھے۔ حضرت حذیفہ بن یمان کھجوروں کی آمدنی لکھنے پر مامور تھے۔ حضرت منیرہ بن شعبہ اور حنین بن نمیر قرضے اور دیگر تجارتی لین دین کا حساب رکھتے تھے۔

۴۔ دعوت و تبلیغ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ و اشاعت کا خاص طور پر خیال تھا۔ مختلف قبائل جب اسلام سے مشرف ہو کر واپس جاتے تو ان کے ساتھ کسی صحابی کو مبلغ بنا کر بھیجتے تھے۔ آپؐ نے ثابت بن قیس کو خطیب اور حضرت مصعبؓ بن زبیر کو پہلا مبلغ مقرر کیا تھا۔ حضرت عبادہ بن صامت اہل صفہ کو قرآن پڑھاتے تھے۔ آپؐ عورتوں کی تعلیم کی طرف بھی توجہ دیتے تھے۔

۵۔ مردم شماری۔ آپؐ نے مردم شماری کی ابتداء کی اور اس کام کے لئے ایک رجسٹر کی تیاری کا حکم دیا۔



**صوبائی نظام** آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صوبائی منظم و نسق کی داغ بیل ڈالی۔ ملک کو صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ مدینہ مرکزی صوبہ تھا جو براہ راست حضور کی نگرانی میں تھا۔ اس کے علاوہ مکہ، یمن، بحران، تہامہ، عمان، حضرموت اور بحرین دوسرے صوبے تھے۔ صوبے کے حاکم کو والی کہتے تھے اور وہ اپنے علاقے کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ صوبہ کی زکوٰۃ کی فراہمی کے لئے محصل مقرر تھے۔ آنحضرت گورنروں اور محصلوں کو خود مقرر کرتے تھے۔ ان کا تقرر ان کی ذاتی لیاقت، دین داری اور علم و فضل کے پیش نظر کیا جاتا تھا۔ آپ ایسے لوگوں کو مقرر کرتے تھے جو قابل احترام ہوں جن پر لوگ اعتماد کر سکیں اور نامقبول حاکموں کو معزول کر دیتے تھے۔ والیوں کی تنخواہیں نقد یا جنس کی صورت میں ادا ہوتی تھیں۔

اسلام دولت کی مناسب تقسیم پر زور دیتا ہے۔  
**ذرائع آمدنی اور مالی نظام** اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ اور صدقات کی فراہمی کا باقاعدہ انتظام کیا تاکہ غریبوں کو امیروں کی دولت سے کچھ حصہ ملتا رہے۔ آپ کے عہد میں آمدنی کے ذرائع مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ ن کوٰۃ۔ صرف ان مسلمانوں سے لی جاتی جن کی دولت ایک خاص معیار تک پہنچ جائے۔ اس کی شرح میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اور نہ معاف ہو سکتی ہے۔ زکوٰۃ کے وصول کرنے پر عمال مقرر تھے۔ جو زکوٰۃ وصول کر کے مدینہ بھیجتے تھے۔ نقدی کی صورت میں رقم کا ۱/۲ فی صد بیت المال کو دینا پڑتا ہے۔ زکوٰۃ ہر صاحب نصاب عاقل و بالغ پر فرض ہے۔ اس کا منکر کافر اور بلاوجہ نہ ادا کرنے والا فاسق ہے۔

۲۔ عطیات۔ حکومت کا کوئی مستقل بیت المال نہ تھا۔ جب قومی معاملات کے لئے روپیہ کی اچانک ضرورت پڑ جاتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو مالی امداد کی دعوت دینے لگتے۔ صحابہ کرام حتی المقدور مدد کرنے لگتے۔

۳۔ فے۔ اس مال کو کہتے ہیں جو دشمن سے بلا مقابلہ ہاتھ آئے۔ اس قسم کا مال مسلمانوں پر تقسیم نہیں کیا جاسکتا بلکہ مرکزی حکومت کے زیر تصرف رہتا ہے۔ اس کی آمدنی



قومی امور پر فزح کی جاتی ہے

۴۔ **خمس**۔ میدان جنگ میں جس قدر مال غنیمت اکٹھا ہوتا ہے۔ اس کا خمس رہا پانچواں حصہ مرکزی حکومت کو بھیجا جاتا تھا۔ اور چار حصے فوج میں تقسیم کر دیے جاتے تھے۔ خمس کو ریاست کے اخراجات میں دیا جاتا تھا۔

۵۔ **جزیہ**۔ غیر مسلم رعایا سے جبراً فوجی خدمت نہیں لی جاتی۔ چونکہ مسلمان ان کی جان اور مال کی حفاظت کی ذمہ داری لیتے تھے۔ اس لئے غیر مسلم رعایا کو جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ یہ ٹیکس بہت معمولی ہوتا تھا اور معذور اور ضعیف بچے عورتیں اور راہب اس سے مستثنیٰ تھے۔ عہد نبویؐ میں صرف اہل کتاب سے یہ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ مشرکین سے نہیں۔ اگر کوئی غیر مسلم فوجی خدمت سرانجام دیتا تو اس کو جزیہ ادا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شام و بخران کے عیسائیوں اور بحرین کے مجوس سے جزیہ وصول کیا کرتے تھے۔

۶۔ **خراج**۔ جو علاقے مسلمان فتح کرتے تھے اور جن کی زمینیں غیر مسلموں کے قبضے میں رہتی تھیں ان کو لوگان ادا کرنا پڑتا تھا۔ یہ خراج کہلاتا تھا۔ اس کی شرح پیداوار کا نصف حصہ تک مقرر ہوتا تھا۔ خراج کی ابتداء فتح خیبر کے موقع پر ہوئی۔ جب یہودیوں کی زمینیں خراج کی ادائیگی کے وعدہ پر آپ نے ان کو واپس کر دیں۔

۷۔ **عشیر**۔ جو زمینیں مسلمانوں کے قبضہ میں تھیں ان سے پیداوار کا ۱/۱۰ حصہ بطور عشر وصول کیا جاتا تھا۔ اگر زمین کا کوئی قطعہ مصنوعی آب پاشی سے سیراب کیا جاتا تھا تو اس کا مالیہ ۱/۲۰ کی بجائے ۱/۱۰ مقرر کر دیا جاتا تھا۔

۸۔ **صدقات**۔ یہ وہ رقم تھی جو مسلمان خرد ہی بیت المال کے اخراجات پورے کرنے کے لئے دیتے رہتے تھے اس کو "انفاق فی سبیل اللہ" اللہ کی راہ میں خرچ کہتے تھے۔ یہ مسلمانوں کے بندہ بہ ایشار و قربانی کو ظاہر کرتا ہے۔

مندرجہ بالا ذرائع سے جو رقم فراہم ہوتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اپنی مرضی سے خرچ کرتے تھے یا عوام میں تقسیم کر دیتے تھے۔ تقسیم کے وقت اہل اسلام



کی حاجات و ضروریات کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ آمدنی اور خرچ کا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا تھا۔ بیت المال کی کوئی عمارت نہ تھی اور نہ اس کا کوئی مستقل عملہ تھا۔

عہد نبوی میں کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی۔ جہاد ایک بہت بڑی عبادت ہے۔ اس لئے ہر مسلمان سپاہی تھا۔ جب جہاد کا اعلان ہوتا تو مسلمان خود بخود اس میں حصہ لینے کی پیشکش کرتے۔ تلوار، تیر، نیزہ، کمان، برچھی، زرہ اور ڈھال اس زمانہ کے مشہور ہتھیار تھے۔ عہد نبوی میں مسلمان عورتیں بھی جنگ میں شریک ہوتی تھیں۔ ان کا کام یہ ہوتا تھا کہ زخمیوں کی مرہم پٹی کریں۔ مجاہدین کے لئے کھانا پکائیں۔ میدان جنگ میں پانی پلائیں، بیماروں کی خبر گیری کریں، مالِ غنیمت سنبھالیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی فوج کے افسرِ اعلیٰ بھی تھے۔ آپ عموماً خود ہی فوج کی قیادت کرتے تھے۔ اگر کسی مہم پر خود تشریف نہ لے جاتے تو کسی صحابی کو اس کام پر مامور فرماتے تھے۔ چونکہ رسول اللہ ہمیشہ اطاعتِ امیر پر زور دیتے تھے۔ اس لئے اسلامی فوجوں کا نظم و ضبط بہت اعلیٰ ہوتا تھا۔ فوج کا سپہ سالار مالِ غنیمت کی تقسیم کا ذمہ دار بھی ہوتا تھا۔ اس زمانے میں فوج کی کوئی وردی نہیں ہوتی تھی۔ شناخت کے لئے خاص الفاظ زبان سے پکارتے تھے۔ ان کو شعار کہتے تھے

قرآن حکیم اسلامی قانون کا سرچشمہ تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ترجمان تھے۔ اس اعتبار سے آپ اسلامی ریاست کے منصبِ اعلیٰ بھی تھے۔ آپ نے عدلیہ کی تنظیم کی طرف بھی توجہ دی۔ عدلیہ کا ایک شعبہ فتاویٰ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس میں بلا معاوضہ قانون مشورہ دیا جاتا تھا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر صحابہ فتوے دیتے تھے۔ دوسرا شعبہ الفوائد سے تعلق رکھتا تھا۔ اور مقدمات فیصل کرتا تھا۔

مدینہ منورہ کے علاوہ عام صوبوں میں قاضی مقرر کیے گئے تھے۔ مدینہ میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم خود مقدمات کا فیصلہ صادر فرماتے تھے۔ بعد ازاں آپ نے



عبداللہ بن نوفل رضی اللہ عنہ کو پہلا قاضی مقرر کیا تھا۔

اگرچہ پولیس کا محکمہ اس وقت وجود میں نہیں آیا تھا۔ تاہم رسول اللہ کچھ لوگوں کو قیام امن کا ذمہ دار کھڑاتے تھے۔ مدینہ میں سعد بن قیس رضی اللہ عنہ کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ آپ لوگوں کو اخلاق و عادات کی اصلاح کی برابر تلقین کرتے رہتے تھے۔ آپ اکثر بازار میں تشریف لے جاتے اور تجارتی لین دین کا محاسبہ کرتے تھے۔ اور یہ عنوانی کو روکتے تھے۔ صوبوں میں یہ ذمہ داری گورنروں کے سپرد تھی۔ قاضیوں کو ہدایت تھی کہ تبلیغ کا کام بھی کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے عدل و انصاف کا شاہکار ہوتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد کا واقعہ ہے کہ مکہ کی ایک قریش عورت چوری کے جرم میں پکڑی گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ لوگوں نے آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ کے بیٹے اسامہ کو سفارش کے لئے بھیجا۔ آپ سفارش سن کر ناراض ہوئے اور فرمایا:-

”تم سے پہلی قومیں اسی لئے ہلاک ہوئیں کہ جب بڑے لوگ جرم کرتے تو انہیں چھوڑ دیتے اور اگر چھوٹے لوگ جرم کے مرتکب ہوتے، تو انہیں سزا دیتے تھے۔ اللہ کی قسم! اگر میری بیسی خاطر رض بھی چوری کرتی تو یہی سزا دیتا۔“

مقدمات بہت کم ہوتے۔ عدالتی نظام بہت سادہ تھا۔ مسجد ہی عدالت گاہ ہوتی تھی۔ بیانات سن کر اس وقت بلا عزم فیصلہ سنا دیا جاتا تھا۔

آپ عہدہ داروں کا تقرر کرتے وقت ان کی ذاتی قابلیت، دین داری اور علم و فضل کا خاص خیال

### عہدہ داروں کا تقرر

رکھتے تھے۔ آپ ہمیشہ ایسے لوگوں کو مقرر کرتے جو عربوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں اور جو اپنے فرائض کو خوش اسلوبی اور دیانت و امانت کے ساتھ ادا کرنے کے خواہر ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے افسرانِ مال اور صوبائی حکام کے بارے میں حالات دریافت کرتے رہتے تھے۔ ناموزوں افسروں



کو معزول بھی کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ بحرین سے قبیلہ عبدالقیس کا وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وفد نے وہاں کے عامل علاء بن حضری کی شکایت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے اسے معزول کر دیا اور ابان بن سعید رض کو بحرین کا عامل نامزد کر دیا اور حکم دیا کہ قبیلہ مذکور سے اچھا سلوک کرے۔

**حساب کی جانچ پڑتال** افسران مال سے حساب کے بارے میں آمد و  
 خرچ کی پوری تفصیل دریافت فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ نے ایک شخص کو صدقات کی وصولی کے لئے مقرر فرمایا۔ جب وہ شخص واپس آیا تو آپ نے حساب کی پڑتال فرمائی وہ عرض کرنے لگا۔ یہ مال آپ کا ہے اور یہ مال مجھے بطور ہدیہ ملا ہے۔ یہ سن کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہم ایک شخص کو افسر مال بنا کر بھیجتے ہیں تاکہ صدقات کی فراہمی کرے اور وہ شخص آکر یہ کہتا ہے کہ یہ مال تمہارا ہے اور یہ مجھے بطور ہدیہ ملا ہے۔ مزا تو جب تھا کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھا رہتا اور پھر دیکھتا کہ کون اسے ہدیہ دیتا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا :-

"ہم جس شخص کو افسر اور عامل بنا کر بھیجتے ہیں اور اس کی تنخواہ مقرر کر دیتے ہیں تو اس کے بعد اگر وہ کوئی چیز کسی سے قبول کرتا ہے تو خیانت کرتا ہے۔"

**شوری** آپ ہم کام میں مشورہ کرتے تھے۔ اس مقصد کے لئے آپ نے چودہ ہماجرین اور چودہ انصار پر مشتمل ایک مجلس مشاورت قائم کر رکھی تھی۔ جس میں چیدہ صحابہ شامل تھے۔

مختصر یہ کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کے قبیل عرصہ میں نہ صرف جزیرہ عرب بلکہ کرہ ارضی کی حالت بدل ڈالی۔ جن بلند پایہ مقاصد کے لئے آپ کی بعثت عمل میں آئی تھی۔ آپ نے انہیں بڑی خوش اسلوبی سے پورا کیا۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ آپ نے پوری دنیا کو ایک نیا معاشرہ، نئی تہذیب، نئے عقائد و



افکار، ایک نئی حکومت اور نئے اصولِ حیات بخشنے۔

## سوالات

- ۱۔ عہد رسالت کے نئے نظام سلطنت پر جامع تبصرہ کیجئے۔
- ۲۔ عہد نبوی کے نظام حکومت کی خاص خاص باتیں تحریر کیجئے۔
- ۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی تدبیر اور عسکری قیادت پر سیر حاصل بحث کیجئے۔



وَالَّذِينَ مَعَهُمْ أَشَدَّ أَعْرَافًا عَلَى الْكُفَّارِ رَحِمَاءٌ بَيْنَهُمْ

(اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں، وہ کفار پر بڑے سخت اور باہم رحیم و مہربان ہیں)

# خلافتِ اشد

۱۱۱ تا ۱۲۰ مطابقت ۱۳۳۲ تا ۱۳۶۱

غلام احمد عربی

ایم اے (عربی) ایم اے (علوم اسلامیہ) ایم اوز ایل (عربی)

فاضل السنہ شرقیہ، فاضل درس نظامی

سینئر پبلیشر علوم اسلامیہ زرعی یونیورسٹی

(لاہل پور)



# حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

## خلافت راشدہ

سالارِ انبیاء و رسول اللہ علیہ وسلم کے اس وارِ فانی سے  
تشریف لے جانے کے بعد آپ کے چار جاں نثار ،  
ساتھیوں نے باری باری اسلامی حکومت کی باگ ڈور

اپنے ہاتھ میں لی۔ یہ چاروں صحابی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ یعنی نائب اور جانشین  
مشہور ہوئے۔ پہلے حضرت ابو بکرؓ، پھر حضرت عمرؓ، پھر حضرت عثمانؓ، اور ان کے بعد  
حضرت علیؓ نے مسندِ خلافت کو رونق بخشی۔ چاروں خلفاء کا عہد حکومت تقریباً ۳ برس  
تک رہا۔ ان خلفاء کو خلفائے راشدین اور خلفائے اربعہ بھی کہتے ہیں۔ یہ چاروں خلیفے نہایت  
پاکباز، متقی اور اطاعتِ رسول کے جذبہ سے سرشار تھے۔ ان کا ہر قدم اسلام اور مسلمانوں  
کی فلاح و بہبود کے لئے اٹھتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے انتہائی کوشش کی کہ رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی۔ اور احکامِ خداوندی کو عملی زندگی میں نافذ کیا جائے۔  
ان بزرگوں کے اس بابرک عہدِ خلافتِ راشدہ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

تاریخ اسلام میں یہ عہدِ اسلامی جمہوریت کی بہترین یادگار ہے۔ اگر اس  
تینس سالہ عہدِ حکومت کو تاریخ اسلام کا زرین دور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔  
اس عہد میں مسلمانوں کے تمام سیاسی اور ملکی امور باہم مشورہ سے طے پاتے تھے۔



خلافت راشدہ میں اسلام مشرق سے لے کر مغرب تک پھیل گیا مسلمان فوجوں نے ایران اور روم جیسی طاقت ور حکومتوں کو میدان جنگ میں بڑی طرح شکست دی۔ قیصر روم کے اقتدار کو ایسی ضرب لگائی، کہ وہ پھر اٹھ نہ سکا۔ سلطنت روم کے زرخیز اور شاداب علاقے یعنی مصر، شام اور فلسطین مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ ایرانیوں و سلطنت کو پاش پاش کر کے سارا ملک فتح کر دیا۔ مسلمانوں نے تیس سال کی مختصر مدت میں ہزاروں میل کا رقبہ فتح کر کے وہاں کے باشندوں کو اسلامی تہذیب و ثقافت اسلامی آئین و روایات اور اسلامی نظام حکومت سے نہ محض آشنا کیا بلکہ ان کو علم و ادب اور ہنر و فن کا علمبردار بنا دیا۔

آپ کا نام عبداللہ، کنیت ابو بکر اور صدیق و عتیق لقب ہے۔

## حضرت ابو بکرؓ کی ابتدائی زندگی

والد کا نام عثمان اور کنیت ابو قحافہ تھی۔ والدہ کا نام سلمیٰ اور کنیت ام الخیر تھی۔ آپ قریش کے ایک ممتاز خاندان بنو تیم سے تعلق رکھتے تھے۔ چھٹی لپیٹ پر آپ کا نسب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ آپ کا گھرانہ زمانہ جاہلیت سے ممتاز چلا آتا تھا۔ قریش کے بیانیسی نظام میں خوں بہا کے مال کی امانت اسی کا عہدہ آپ ہی کے گھر میں تھا۔ اسلام سے پہلے آپ تجارت کرتے تھے۔ آپ ابتدا ہی سے سلیم الفطرن تھے۔ چنانچہ زمانہ جاہلیت میں بھی آپ کا دامن اخلاقِ قبیحہ کے مفاسد سے پاک رہا ہی زمانہ سے لوگوں پر آپ کے حسنِ خلق، راست بازی اور متانت و سخپگی کا سکہ بچھا ہوا تھا۔ شرف سے مکہ میں آپ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

آپ تقریباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عمر تھے۔ طبیعت کی یکسانی کی وجہ سے بچپن ہی سے دونوں میں گہرے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ ان تعلقات کی بنا پر دونوں ایک دوسرے کے اخلاق و سیرت سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت سب سے پہلی مرتبہ اسلام کی دعوت دی۔ تو حضرت ابو بکرؓ نے



بلا تامل اس کی تصدیق کی قبول اسلام کے بعد وہ اسلام کی تبلیغ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ راست بن گئے کسی صحابی کی اسلامی خدمات آپ کے برابر نہیں ہیں۔ ان کی مختصر فہرست یہ ہے کہ قریش کے سن رسیدہ لوگوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ مکہ کی ترہ خطرات اور مظلومیت کی زندگی کے ہر مرحلہ میں حضور کے لپیٹ پناہ رہے تبلیغ اسلام میں ہمیشہ آنحضرت کا ساتھ دیتے۔ اکابر صحابہ آپ کی کوشش سے مشرت باسلام ہوئے۔ ہجرت کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کی تعمیر کا ارادہ فرمایا۔ تو اس کی زمین کی قیمت جو دو تینوں کی تھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انا کی۔ اس طرح مدینہ میں پہلی خانہ خدا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مدد سے تعمیر ہوا۔ (فتح الباری جلد ۷ ص ۱۹۲) رسول اللہ کی رحلت کے بعد مسلمانوں میں سربراہی کے آثار نمایاں تھے۔ اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دانشمندی سے معاملات کو درست کیا۔ اور ایک موثر تقریر سے لوگوں کے جذبات پر قابو پایا۔

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال کے وقت اپنا کون جانشین نامزد نہ

## حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب

فرمایا۔ اس بے آپ کی چہیز و تکفین سے پہلے ہی منافقین کی سازش سے آپ کی جانشینی کا مسئلہ چھڑ گیا۔ انصار نے سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر جانشینی کا دعویٰ کیا۔ یہ مسئلہ ایک ایسے نازک وقت میں چھڑا تھا کہ اگر نورا اس کا تدارک نہ کیا جاتا۔ تو بڑی نازک صورت حال پیدا ہو جاتی اور عجب نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی اسلام کا شیرازہ ڈھم بھم ہو جاتا۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بردت اس کی اطلاع ہو گئی۔ آپ فوراً حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح کو لے کر سقیفہ بنی ساعدہ پہنچے۔ بات بہت طویل پکڑ پکڑ گئی۔ انصار کہنے لگے کہ ہم اپنا امیر الگ بنانا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف قریش بھی یہی چاہتے تھے۔ اس نازک موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نہایت نرمی سے انصار کو سمجھایا۔



کہ۔۔۔ مجھے تم لوگوں کے فضائل اور تمہارے جذبات اسلامی سے انکار نہیں لیکن عرب قریش کے علاوہ اور کسی خاندان کی سیادت تسلیم نہیں کر سکتے۔ علاوہ ازیں مہاجرین سابقہ اسلام ہونے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاندانی تعلق کی بنا پر آپ کی جانشینی کے زیادہ مستحق ہیں۔ یہ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اور عمر بن الخطاب موجود ہیں۔ ان میں سے جس کے ہاتھ پر چاہو، بیعت کرو۔

یہ سنتے ہی حضرت عمر نے حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر فرمایا۔ کہ آپ ہم سب میں بزرگ، ہم سب میں بہتر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے مقرب ہیں۔ اس لئے ہم آپ کے ہاتھوں پر بیعت کرتے ہیں۔

رخنباری جلد اول

حضرت ابو بکرؓ کی شخصیت ہر طبقہ میں ایسی محترم تھی کہ اس انتخاب پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مسلمان بیعت کے لئے ٹوٹ پڑے۔ اس طرح حضرت ابو بکرؓ کی برسرِ عمل تقریر اور بیعت میں حضرت عمرؓ کی پیش قدمی سے ایک زبردست انقلاب ہوتے ہوئے پرج گیا۔ اس کے دو مہرے دن شنبہ کو مسجد نبویؐ میں عام اجتماع ہوا۔ حضرت عمرؓ نے اٹھ کر حضرت صدیقؓ کے فضائل بیان فرمائے اور ان کی بیعت کی تحریک کی۔ اسلام کے ایک ایک نیاز مند نے کمال جذب و اشتیاق اور فرط ارادت و عقیدت میں آپ کی بیعت کی۔

بیعت ہو چکی۔ تو صدیق اکبرؓ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد حاضرین سے یوں خطاب کیا:

### خطبہ خلافت

اے لوگو! میں تم پر حاکم بنایا گیا ہوں۔ حالانکہ میں تمہاری جماعت میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھا کام کروں۔ تو میری اطاعت کرو۔ اور اگر غلط راستہ چلوں، تو مجھے سیدھا کرو۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تمہارا ضعیف فرد بھی میرے نزدیک قوی ہے۔ یہاں تک کہ میں دوسروں سے اس کا حق نہ دلاؤں، اور تم میں سے قوی ترین شخص میرے نزدیک کمزور ہے۔ حتیٰ کہ اس سے دوسروں کا حق نہ لے لوں۔ یاد رکھو،



جو قوم جہاد فی سبیل اللہ چھوڑ دیتی ہے خدا اس کو ذلیل و خوار کر دیتا ہے۔ اور جس قوم میں بدکاری پھیل جاتی ہے۔ خدا اس کو عام مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اگر میں خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کروں تو میری اطاعت کرو اور اگر اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں ہے۔

طبقات ابن سعد جلد ۳ - تاریخ ابن خلدون جلد اول ص ۲۲۴

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ خطبہ اسلامی جمہوریت کی اساس ہے۔ اس خطبہ میں وہ اصول بیان کر دئے گئے ہیں جن پر نہ صرف حضرت ابو بکر نے ہمیشہ عمل کیا۔ بلکہ آنبیوالے خلفاء کے لئے بھی مشعل راہ کا کام دیتے ہیں۔ اس خطبہ سے واضح ہوا کہ :-

۱۔ اسلامی حکومت عوام کی فلاح و بہبود کے لئے ہوتی ہے، لہذا عوام کو اس کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔

۲۔ حکومت کا کام عوام کی حفاظت کرنا ہے تاکہ کوئی کمزوروں پر ظلم اور زیادتی نہ کر سکے۔

۳۔ اسلامی ریاست میں احکام خداوندی پر عمل ہونا چاہیے۔ اگر خلیفہ بھی ان کو نظر انداز کرے تو لوگوں پر اس کی اطاعت واجب نہیں رہتی۔

۴۔ دنیا میں وہی قوم عزت کی زندگی بسر کر سکتی ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے تیار رہے۔

حضرت ابو بکرؓ کو آغازِ خلافت سے

بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن

حضرت ابو بکرؓ کی مشکلات

ہر موقع پر آپ کی خدا داد فرست اور بصیرت نے ایک ایک کر کے پیش آندہ مصائب کا حل تلاش کر لیا۔

۱۔ فتنہ ارتداد :- سب سے پہلی مصیبت فتنہ ارتداد کی تھی جب حضورؐ

کی وفات کی خبر سارے عرب میں پھیلی تو بعض قبائل عرب جن کے دل میں اسلام



نے اچھی طرح گھر نہیں کیا تھا اسلام سے برگشتہ ہو گئے۔

۲۔ انکارِ زکوٰۃ :- بہت سے قبائل ایسے تھے جنہوں نے زکوٰۃ دینا بند کر دیا، اور اس سے صاف انکار کر دیا۔ اگرچہ وہ اسلام پر قائم رہے مگر وہ زکوٰۃ کی ادائیگی کو محکومی کی علامت تصور کرنے لگے۔

۳۔ جھوٹے نبیوں کا ظہور :- بہت سے جھوٹے نبی مثلاً طلیحہؑ، مسلمیہؑ، کذاب - اسود غنسی اور سباج بنت حارث نمودار ہو گئے اور لوگوں کو اپنی اپنی نبوت کی دعوت دینے لگے۔

۴۔ بیرونی خطرات :- جنگِ مؤتہ میں مسلمانوں کی ناکامی کے باعث سرحدیں غیر محفوظ ہو گئی تھیں اور کسی وقت بھی بیرونی حملہ ہو سکتا تھا۔ لہذا جنگِ مؤتہ کا انتقام لینا بھی بہت ضروری تھا۔

یہ تمام مشکلات تھیں جو حضرت ابو بکرؓ کو آغازِ خلافت ہی میں پیش آئیں۔ آپ نے بڑی استقامت، پامردی اور جرات و بہمت سے ان تمام مشکلات کا مردانہ مقابلہ کیا اور سیاسی تدبیر ایمانی بصیرت و دراندیشی اور اسلامی جذبہ سے ایک ایک کر کے سب مشکلات کو سر کر لیا۔

۱۔ آزاد پسندی :- عرب قبائل

طبعاً آزادی پسند واقع ہوئے تھے۔

فقہ ارتداد کے اسباب

وہ کسی حکومت کے ماتحت رہنا جانتے ہی نہ تھے۔ جب عرب میں اسلام آیا تو اس نے پرانا قبائلی نظام توڑ کر قبائل کو مدینہ کی مرکزی حکومت کے ماتحت کر دیا۔ عرب قبائل اس کو اپنی آزادی کے منافی سمجھتے اور زکوٰۃ کو ایک قسم کا ٹیکس تصور کرتے تھے۔

..... اس لئے بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار

کر دیا۔



۲۔ اسلام سے بے رغبتی :- جو عرب قبائل مدینہ سے زیادہ دُور تھے، وہی

زیادہ ارتداد کا شکار ہوئے۔ چونکہ یہ لوگ جدید الاسلام تھے۔ اس لئے اسلامی تعلیمات نے ان کے دلوں میں ابھی تک گھر نہیں کیا تھا۔ دوسری طرف ہادی اکبر صلی اللہ علیہ وسلم ابھی تک ان کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کی طرف پوری طرح توجہ نہ دے سکے تھے۔ اس لئے بعض قبائل کی تعلیم ناقص رہ گئی تھی۔ آپ کی وفات پر وہ سمجھے کہ اب اسلام کا راسخا نہیں رہا اور وہ آسانی سے کفر کی طرف لوٹ سکتے ہیں۔

۳۔ سیاسی اتحاد میں دشواری :- عرب ایک گنجان اور متحد ملک نہ تھا۔

عرب لوگ مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ آمد و رفت کی سہولتیں بہت کم تھیں۔ ان سب قبائل کو اتنے قلیل عرصہ میں ایک حکومت کے ماتحت لانا بہت مشکل تھا۔ لہذا وہ حکومت سے باغی ہو گئے۔

۴۔ خانہ ساز نبوت :- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کو دیکھ کر کئی

خود غرض لوگ یہ سمجھے کہ شاید نبوت کوئی اختیاری چیز ہے۔ اور نبوت کا ڈھونگ رچا کر وہ بھی عرب کی سرداری حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کے سر میں نبوت کا سودا سمایا اور وہ بہت سے لوگوں کو اپنے دام فریب میں پھنسانے میں کامیاب ہو گئے۔

۵۔ غیر مسلموں کی ریشہ دوانیاں :- عرب میں یہودیوں اور عیسائیوں کی

لقدار ابھی کافی تھی۔ یہ لوگ اسلام کے شدید مخالف تھے۔ چونکہ علانیہ طور پر مخالفت کی بہت نہ تھی۔ اس لئے حقیقہ سازشیں کر کے مسلمانوں سے بدلہ لینا چاہا۔ اور فتنہ پردازوں کو خوب اکھارا۔

۶۔ بیرونی امداد :- مدعیان نبوت اور باغی عناصر کو بیرونی ممالک سے کافی مدد ملی۔

جنس سے ان کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ بحرین کے باغیوں کو کسریٰ ایران نے مدد دی۔ مشہور مدعیہ نبوت شجاع بنت حارث کی شمالی عرب کے عیسائی حکمرانوں نے امداد کی۔



اس بیرونی امداد نے قبائل کو بغاوت پر آمادہ کیا اور ان کے حوصلے بڑھا دیے۔

حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے کچھ دن پہلے جنگ موٹہ کے شہداء کا انتقام

## جیشِ اسامہ کی روانگی

لینے کے لئے ایک لشکر کو تیاری کا حکم دیا۔ اور اس کی کمان پر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے جواں سال فرزند حضرت اسامہؓ کو مامور کیا تھا بن کی عمر منہج کل ستائزہ سال تھی۔ لشکر اسی روانہ نہیں ہوا تھا کہ آنحضرتؐ نے خلافت کے دوسرے ہی روز حکم صادر فرمایا کہ جیشِ اسامہ کی تکمیل کی جائے۔ صحابہ کرام نے اس حکم کو ناپسند کیا اور کہا کہ جزیرہ عرب میں بغاوت کے آثار نمایاں ہیں۔ مخالف قوتیں پھر زور آزمانے پر تلی ہوتی ہیں۔ ان حالات میں بہتر یہی ہے کہ فوج کو اندرونی ظفشار اور شورش کو دبانے کے لئے ملک ہی میں رکھا جائے۔ حضرت ابو بکرؓ نے ان کا مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت ابو بکرؓ کے نزدیک اندرونی شورش اتنی اہم نہ تھیں جتنی غیر ملکی شورش کی مضبوطی اور استحکام۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے صحابہ کی مخالفت کے باوجود حضرت اسامہؓ کی سرکردگی میں اسلامی لشکر کو شام کی طرف روانہ کر دیا۔ خورد و لذت تک پا پیادہ الوداع کہنے کے لئے گئے۔ اسامہ گھوڑے پر سوار تھے اور حنیفہؓ رسولی گھوڑے کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ حضرت اسامہؓ نے تعظیماً عرض کیا: "اے حنیفہؓ! دل! خدا کی قسم! آپ گھوڑے پر سوار ہو جائیں۔ ورنہ میں بھی اترتا ہوں!" حضرت ابو بکرؓ بولے: "اس میں کیا مضائقہ ہے؟ اگر میں تھوڑی دیر تک راہِ خدا میں اپنے پاؤں غبار آلود کر لوں۔ غازی کے ہر قدم کے عوض سات سو نیکیاں لکھی جاتی ہیں"۔

دستارِ طبری ص ۱۸

حضرت ابو بکرؓ نے لشکر سے یوں خطاب کرتے ہیں :-

"اے لوگو! سنو! میں تمہیں دس باتوں کی نصیحت کرتا ہوں، انہیں یاد رکھنا۔ (۱) نیانت سے بچنا۔ (۲) وعدہ شکنی نہ کرنا (۳) بزدلی نہ دکھانا (۴) کسی شخص کے اعضاء و

ممت کاٹنا رہی بچے بوڑھے اور عورت پر ہاتھ نہ اٹھانا (۵) آباویوں کو نہ اجاڑنا۔



ی کھجور کا درخت نہ کاٹنا اور نہ جلانا، کوئی پھلدار درخت نہ گرانے اور ہوشیوں کو کھانے کی غرض سے سوزنا نہ کرنا اور تم خانقاہ نشین راہیوں کے پاس سے بھی گزرو گے۔ ان میں اپنے حال پر رہنے دینا (ابا) لوگ قسم قسم کے کھانے برتنوں میں رکھ کر تمہارے پاس لائیں گے۔ انہیں کھاؤ، تو اللہ کا نام لے کر۔ اس کے بعد آپ نے دعا کر کے رخصت کیا۔  
(تاریخ طبری۔ مؤطا امام مالک و ترمذی)

چالیس دن کے بعد یہ مہم اپنا کام پورا کر کے فاتحانہ مدینہ واپس آئی۔ حضرت ابو بکرؓ نے شہر سے باہر نکل کر اس کا استقبال کیا۔ اس فتح سے مسلمانوں کی فوجی طاقت اور سیاسی تدبیر کی دھاک بیرونی دشمنوں کے دلوں پر بیٹھ گئی۔ ایک طرف تو غیر ملکی حکمرانوں نے خوف کھانے لگے اور دوسری طرف اندرون ملک میں شورش پسند عناصر کو لپٹا ہوا گیا کہ مسلمانوں کی عسکری قوت ان کو کچل کر رکھ دے گی۔

آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ اٹھتے ہی عرب کے طول و عرض میں اللہ کے دین کے

### مدعیان نبوت کی سرکوبی

خلاف بغاوت کے نشان ابھرنے لگے۔ صرف مکہ مدینہ اور طائف کے باشندے ثابت قدم رہے۔ بغاوت اور ارتداد کا یہ نکتہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلا، اور چند روز ہی میں عرب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گیا۔ مرتدوں اور باغیوں نے اسلامی عمال کو نکال دیا۔ سچے مسلمانوں کو بیدار دوز سے قتل کرنا شروع کر دیا۔ جو بچ سکے، بھاگ کر مدینہ میں پناہ گزین ہوئے۔ کچھ طالع آزاؤں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہمانی کو دیکھ کر خانہ ساز نبوت کا ڈھونگ رچایا۔ مختلف قبائل میں کئی جھوٹے نبی پیدا ہو گئے جن میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں :-

۱۔ طلحہ بن خویلد :- اس کا اصلی نام طلحہ تھا۔ مسلمان اس کو تحقیقاً طلحہ کہتے تھے۔ بنو اسد کے قبیلہ سے تھا جو قریش کا دیرینہ حریف تھا۔ طلحہ نے رسول اکرم



صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں نبوت کا روپ دھار لیا تھا۔ لیکن اس وقت اس کا ذہن پر -  
 حضور کی وفات کے بعد سارا قبیلہ اس کے دام میں آگیا۔ اس نے نماز سے سجدہ موقوف کر دیا کہ اس  
 سے تکلیف ہوتی ہے۔ زکوٰۃ بھی معاف کر دی۔ اس لئے منکرین زکوٰۃ اس کے حلقہ بگوش ہو گئے۔  
 طلحہ نے ایک بہت بڑا لشکر مرتب کر کے مدینہ بھیجا۔ حضرت صدیق نے لشکر لے کر مقابلہ کے  
 لئے آئے۔ حملہ آور بھاگ نکلے۔ تاہم اس سے طلحہ کی قوت کا استیصال نہ ہو سکا۔ اتنے میں  
 حضرت اسامہؓ کا لشکر مدینہ واپس آگیا۔ طلحہ نے مزاحمہ کے مقام پر خمیہ زن تھا۔ اس کی سرکوبی  
 پر حضرت صدیق نے جناب خالدؓ کو مامور کیا۔ مزاحمہ کے مقام پر کھمبان کارن پڑا۔ طلحہ  
 کی فوج نے کچھ دیر تو بہادری کے جوہر دکھائے۔ آخر شکست کھائی۔ طلحہ کا فریب کھل گیا اور  
 وہ شام کی طرف بھاگ نکلا۔ طلحہ کچھ دیر بعد مسلمان ہو گیا اور عراق و ایران کی مہموں میں شجاعت  
 کے کارنامے دکھائے۔

۶۔ مسیلمہ کذاب :- یہ شخص علاقہ یمامہ کے قبیلہ بنو حنیفہ کا سردار تھا۔ یہ بڑا اقدار  
 پرست تھا۔ اس نے یمامہ پر حکومت جانے کے لئے نبوت کا اعلان کر دیا۔ مسیلمہ مدینہ آیا  
 اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ آپ مجھے اپنا جانشین تسلیم کر لیں تو میں آپ پر ایمان  
 لے آؤں گا۔ آپ نے فرمایا، کہ میں احکام خداوندی سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ اس شرط پر اگر تم کھجور کی  
 یہ چھڑی بھی مانگو، تو نہ دوں گا۔  
 (صحیح مسلم)

مسیلمہ نے حرم نگہ کے مقابلہ پر یمامہ میں ایک حرم بنوایا۔ اس میں لٹیروں اور غارت گردوں کو پناہ  
 ملتی تھی۔  
 (تاریخ طبری)

حضرت ابو بکرؓ نے مسیلمہ کی سرکوبی کے لئے حضرت شمرؓ قبیلہ بنو حنیفہ اور عکرمہ بن ابی جہل کو  
 الگ الگ راستوں سے بھیجا اور ہدایت کی کردونوں کیجا ہو کر حملہ کریں، عکرمہ اس دھن میں کہ فتح تنہا  
 ان کے حصہ میں آئے اکیسے مسیلمہ سے جا لٹھے، مگر پیسا ہونا پڑا۔ اب شمر قبیلہ کی فوج مسیلمہ کے  
 مقابلہ میں آئی۔ انہیں بھی حضرت خالدؓ کے اندظار کا حکم تھا۔ لیکن عکرمہ کی طرح جلدی کی اور



ٹسکت کھا کر پیچھے ہٹ آئے اور خالدؓ کے ساتھ مل گئے۔۔۔۔۔ حضرت خالدؓ کے پہنچنے پر گھمسان کا رن پڑا اور خون کی ندیاں بہنے لگیں بشرطہ میں دشمن نے بہت زور مارا۔ خالدؓ کی فوج پیچھے مٹی اور پٹ کر زوردار حملہ کیا۔ تمام سپاہ نے جان کی بازی لگا دی اور بنو حنیفہ کے منہ بھیر گئے۔ پاس ایک باغ تھا۔ مسیہ لشکر کو لے کر اس میں گھس گیا اور دروازے بند کر کے محصور ہو گیا بعض مجاہد دیوار پر سے کود کر اندر جا پہنچے اور دروازہ کھول دیا۔ حضرت خالدؓ کی فوج حرکت میں آئی اور چھوٹے بنی کے ساتھی گاجر مولیٰ کی طرح کٹنے لگے سید الشہداء حضرت حمزہؓ کے قاتل نے جس حربہ سے ان کو شہید کیا تھا اسے صیقل کر کے رکھ چھوڑا تھا کہ جب بھی موقع ملا اس سے مسیہ کو ہلاک کروں گا۔ آج اس نے دیکھا کہ مسیہ دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہے۔ اس نے تانک کر حربہ پھینکا جو اس کی چھاتی سے پار ہو گیا۔ ایک انفاری نے بڑھ کر مسیہ کی کھوپڑی پر تلوار کا دار کیا اور اسے ڈھیر کر دیا۔ مسیہ کی فوج بھاگ نکلی۔ (بخاری، باب الغزوات)

اس جنگ میں مسیہ کے ایکس ہزار آدمی مارے گئے۔ بارہ سو مسلمانوں نے شہادت پائی۔ جن میں بہت سے حافظ قرآن بھی تھے۔

۳۔ اسود غنسی :- اس کا اصل نام عتقہ تھا۔ یہ یمن کے قبیلہ غنسی سے تعلق رکھتا تھا۔ سیاہ فام ہونے کی وجہ سے اسے اسود غنسی کہتے تھے۔ اس نے جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ یمن کے علاقہ سے مسلم عمال کو نکال کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ اتفاقاً اس کے چند پیرو مسلمان سرگردوں کے ساتھ مل گئے۔ اسود کو ابھی چار ماہ بھی حکومت کرنا نصیب نہ تھا کہ نشہ کی حالت میں اسے ذبح کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۰ غنیمتہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ایک قبل پیش آیا۔ خلافت صدیقی میں فتح کی جو پہلی نوید پہنچی وہ یہ تھی۔ (تاریخ طبری)

۴۔ سجاح بنت حارث :- خانہ ساز نبوت کی ابتدائی کامیابیاں اس قدر مسرت قیام کے عہدوں کے دماغ میں بھی نبوت کا سودا سمایا۔ چنانچہ قبیلہ ثقیف کی ایک شاخ بنو کی ایک جوہرہ منہ عورت سجاح بھی نبی بن بیٹھی۔ لوگ جو حق درجوں اس کے پیرو ہو گئے۔ بنو تمیم کے



نامور سردار مالک بن نویرہ نے انحصور کی وفات کے بعد مرتد ہو کر سبوح کی مریدی اختیار کی۔ سبوح نے اپنی قوت بڑھانے کے لئے مشہور مدعی نبوت مسیلمہ کذاب سے شادی کر لی۔ حضرت خالد بن جب سبوح کی بہر کوہی کے لئے بنو تمیم میں پہنچے تو اسے غائب پایا۔ بنو تمیم نے حضرت خالد کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور اسلام لے آئے۔ حضرت خالد نے انہیں معاف کر دیا۔

اسی طرح عرب کے دوسرے حصوں میں بھی قبائل کو مطیع کیا گیا۔ علاء بن الحضری نے بحرین کے قبائل کو زیر کیا۔ عکرمہ نے حذلیہ زب سے مل کر عمان کے باغیوں کو شکست دی۔ اس کے بعد حضرت موت اور عین کے باغیوں کا مقابلہ کیا۔

درعیان نبوت اور مرتدین کی کوشمالی کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منکرین زکوٰۃ کی طرف متوجہ ہوئے۔

## منکرین زکوٰۃ کی کوشمالی

منکرین زکوٰۃ کو جہاد کا الٹی ملیٹیم دے دیا۔ ان کے خلاف فوجیں بھیجیں اور سب قبائل سے زکوٰۃ کی رقم وصول کی۔ زکوٰۃ کے معاملہ میں آپ نے کسی قسم کی رعایت دینے سے انکار کر دیا۔ اس مستقل مزاجی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض قبائل خود آ کر زکوٰۃ کی رقم بیت المال میں جمع کرانے لگے۔

اس طرح اپنے حسن تدبیر اور عزم و استقلال کے باعث حضرت ابو بکر نے ایک سال کے عرصہ میں اس بڑے فتنہ کو دبا دیا۔ سرکش قبائل ایک مرتبہ بچہ دارہ اسلام میں آگئے۔ اس نرسوش کے درمیان حضرت ابو بکر نے لشکر کی تیاری، قائدین لشکر کا انتخاب اور لشکر کی نقل و حرکت کے متعلق ضروری ہدایات کے سلسلہ میں جس دشمنی اور تدبیر کا ثبوت دیا وہ تاریخ اسلام میں ایک عظیم کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

مسیلمہ کذاب کے فتنہ کو دبانے کے لئے جو جنگ بیاہ میں

ہوئی تھی اس میں بہت سے حفاظ قرآن شہید ہوئے۔ حضرت

## تدوین قرآن

عمر نے سوچا اگر جنگوں کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو بہت ممکن ہے قرآن کے اجزاد ضائع ہو جائیں۔ لہذا قرآن حکیم کو ایک جگہ لکھ لینا چاہیے تاکہ قرآن کا وہ تحریری سرمایہ جو انحصور



کے سامنے تحریر کیا گیا تھا۔ ضائع ہونے سے بچ جانے والے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اس میں تاہل ہوا کہ جو کام  
 مخصوص کرنے نہیں کیا میں اسے کیوں کر انجام دوں۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اصرار سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ  
 عنہ کے ذہن میں آخر یہ بات آگئی۔ چنانچہ انھوں نے حضرت زید بن ثابت کو جو عہد نبوت میں کاتب  
 وحی تھے، یہ خدمت تفویض کی۔ حضرت زید نے نہایت کوشش و احتیاط کے ساتھ تمام متفرق  
 اجزاء کو جمع کر کے ایک کتاب کی صورت میں مدون کیا۔ وہ صحیفہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس محفوظ  
 رہا۔ جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے یہ نسخہ اپنی بیٹی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے حوالے  
 فرمایا اور وصیت کر دی کہ کسی شخص کو نہ دیں۔ البتہ جو شخص نقل کرنا چاہے یا اپنا نسخہ صحیح کرنے  
 کا ارادہ رکھتا ہو وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں  
 حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے عاریتاً لے کر چند نسخے نقل کرائے۔ اور اطراف ملک میں بھجوا دیے۔ اصل  
 نسخہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے لینا چاہا۔ لیکن انہوں نے دینے سے انکار کر دیا اور تاحیات اپنے پاس  
 محفوظ رکھا۔ ان کے انتقال کے بعد مروان نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے لے کر ضائع کر دیا۔  
 (فتح الباری جلد ۹ ص ۱۰۱)

قرآن کریم کے متفرق اجزاء کو ایک کتاب کی صورت میں مدون کرنا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا  
 عظیم احسان ہے۔ جس سے امت مسلمہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یہ  
 کارنامہ انجام نہ دیتے، تو امت کا شیرازہ بکھرتا اور اس کی وحدت پارہ پارہ ہو جاتی۔

## فتوحات

جزیرہ نما کے عرب کی سرحد تباہی  
 دو عظیم الشان سلطنتوں سے ٹکراتی تھی۔

عرب و عجم کے تعلقات

ایک طرف شام پر رومی پھر ہیرا لہرا لہ تھا۔ دوسری طرف عراق پر کیانی خاندان کا تسلط تھا۔



ان دونوں ہمسایہ سلطنتوں نے ہمیشہ کوشش کی کہ عرب کے آزاد اور جنگجو باشندوں پر اپنی حکمرانی کا سکہ جمائیں۔ خصوصاً ایرانی سلطنت نے اس مقصد کے لئے بارہا عظیم الشان قربانیاں برداشت کیں۔ بڑی بڑی فوجیں اس مہم کو سر کرنے کے لئے بھیجیں۔ بعض اوقات اس نے عرب کے ایک وسیع خطہ پر تہملط بھی قائم کر لیا۔ چنانچہ شاپور بن اردشیر جو سلطنتِ ساسانیہ کا دوسرا فرمان روا تھا اس کے عہد میں حجاز و یمن دونوں باجگزار ہو گئے تھے۔ لیکن عرب کی آزاد اور غنیوں و فطرت دب کر رہنا نہ جانتی تھی۔ اس لئے جب کبھی موقع ملا بغاوت برپا ہو گئی۔ یہاں تک کہ چند بار خود عربوں نے عراق پر قابض ہو کر اپنی ریاستیں قائم کیں۔ چنانچہ سلاطینِ یمن کے علاوہ قبیلہ معد بن عدنان نے عراق میں آباد ہو کر ایک مستقل حکومت قائم کر لی اور اس کے ایک فرماں روا عمر بن عدی نے حیرہ کو دارالسلطنت قرار دیا۔

غرض عرب و ایران کے تعلقات نہایت قدیم تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک باہم چھیڑ چھاڑ چلی آتی تھی۔ سترھویں صدی میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں کو دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے تو پروردگار نے شاہِ ایران نے اسی قدیم عناد کی بنا پر نامہ مبارک کو پھاڑ کر پھینک دیا اور برہم ہو کر کہا ”میرا غلام ہو کر مجھے یوں لکھتا ہے“ (عبرانی) رومی سلطنت نے بھی عربوں کا تہایت ویرتیہ تعلق تھا۔ عرب کے بہت سے قبائل شام کے سرحدی اضلاع میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ اور رفتہ رفتہ عیسائی مذہب قبول کر کے ملک شام میں بڑی بڑی ریاستیں قائم کر لی تھیں۔ اسی مذہبی تعلق کے باعث ان گروہوں کے ساتھ ایک قسم کی یگانگت ہو گئی تھی۔ اسلام کا زمانہ آیا تو مشرکین عرب کی طرح حدودِ شام کے عرب عیسائیوں نے بھی سراٹھایا۔ ۱۱ھ میں حضرت وحیہ رضی اللہ عنہ قبصرِ روم کو دعوتِ اسلام کا پیغام دے کر واپس آ رہے تھے تو شامی عربوں نے ان کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد حارث بن عمیر نے یمن کے حاکم عمر بن شہر قبیلہ نے قتل کر دیا۔ ۱۱ھ میں عمر وہ مؤثرہ اسی قتل و غارتگری کا انتقام تھا جس میں بڑے بڑے صحابہ کامرے (الطقات ابن سعد)



۹۰ھ میں رومیوں نے خاص مدینہ پر فوج کشی کی تیاریاں کی تھیں۔ لیکن جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیش قدمی کر کے مقام تبوک تک پہنچ گئے تو ان کے حوصلے بہت ہو گئے اور عارضی طور پر لڑائی رک گئی۔ تاہم مسلمانوں کو ہمیشہ شامی عربوں اور رومیوں کا خطرہ دامنگیر تھا۔ چنانچہ سالہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حفظاً مقدم کے خیال سے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو شام کی بہیم پر مامور فرمایا تھا۔

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرب ہمیشہ سے اپنی دونوں ہمسایہ سلطنتوں کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ اسلام کی روز افزوں ترقی نے ان کی آتش حسد کو اور کھینٹ کا یا خلیفہ اول نے ان ہی اسباب کی بنا پر اندرونی جھگڑوں سے فراغت پاتے ہی بیرونی دشمنوں سے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

قبل ازیں واضح کیا جا چکا ہے کہ عربوں

اور ایرانیوں کے تعلقات شروع ہی

## عراق پر فوج کشی کے اسباب

سے کشیدہ تھے۔ اکثر عرب قبائل اور ایرانیوں کی نوجوں میں جھڑپوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ عرب جب بھی شاداب علاقوں کی تلاش میں شمال کی طرف بڑھتے ایرانی اور عیسائی حکومتوں سے ٹکر ہوتی تھی۔ ایرانی عربوں کو وحشی، پسماندہ اور سیاسی اعتبار سے ذلیل سمجھتے تھے اور ان کی لوٹ مار سے سخت پریشان رہتے تھے۔ اس غارتگری کی سزا دینے کے لئے وہ حملے بھی کیا کرتے تھے۔ ایرانیوں نے ایران اور عرب کی سرحد پر ایک چھوٹی سی عرب ریاست قائم کر لی تھی جس کا صدر مقام حیرہ تھا۔ تاکہ ایرانی سلطنت میں عربوں کی لوٹ مار کو روکا جا سکے لیکن تمام کوششوں کے باوجود ایرانی عرب قبائل کو مطیع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور عرب ہمیشہ ان کے تسلط سے آزاد رہے۔

ساتویں صدی میں جب اسلام کی بدولت تمام عرب قبائل متحدہ ہو کر ایک قوم بن گئے تو ایرانی ان سے کھلم کھلا دشمنی کا اظہار کرنے لگے۔ یہ معاندانہ رویہ عرب اور ایران کی



جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور اسی لئے مسلمانوں نے ایران کو فتح کیا۔ ایرانیوں کی نفرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایرانی بادشاہ خسرو پر دینے آنحضرتؐ کا نام مبارک یہ کہہ کر چاک کر دیا کہ زخاکش بدین (میرا غلام ہو کر مجھے اس طرح خطاب کرتا ہے) اور اپنے یمن کے گورنر کو حکم بھیجا کہ اس مدعی نبوت کو گرفتار کر کے اس کے پاس بھیج دے۔ اس طرح کی باتوں سے عرب اور بھڑک گئے۔ اور ایرانیوں کو ان کے غرور کا مزا چکھانے کے لئے مناسب وقت کا انتظار کرنے لگے۔

ایرانی عربوں کے اتحاد سے ناخوش تھے اور اس نوزائیدہ مملکت کو ختم کرنے کی سازشیں کر رہے تھے۔ عرب کے بعض عیسائی قبائل ایران کی سرحدیں جا کر آباد ہو گئے۔ اور ایرانیوں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارنے لگے۔ ایرانیوں کی دشمنی کے پیش نظر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے عرب سرحدوں کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔

اس عرصہ میں ایرانیوں نے عربوں سے چھٹ چھٹ شروع کر دی۔ جب بنو بکر کے قبیلہ نے مسلمانوں

## کشکس کا آغاز

کے خلاف بغاوت کی تو سلاطین حیرہ نے جو ایران کے ماتحت تھے بنو بکر کی امداد کی شاہ ایران نے بھی اپنی زوج کے کچھ دستے بنو بکر کی مدد کے لئے بھیج دیے۔ یہ کہ رانی سر اسر کسی ملک میں بے جا مداخلت تھی۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے سرحد کی حفاظت کے لئے مثنیٰ شیبانی کو بھیجا جو قبیلہ دائل کی شاخ بنو شیبان کے سردار تھے۔ مثنیٰ اسلام لاپکے تھے اور انہوں نے مزین کی سرکوبی میں بڑا نام پایا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ تنہا اس عظیم الشان حکومت کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لئے بارگاہِ خلافت میں حاضر ہو کر باقاعدہ فوج کشی کی اجازت حاصل کی اور اپنے تمام قبیلہ کو لے کر ایرانی سرحدیں گھس گئے۔ اس وقت تک حضرت خالدؓ مدعیانِ نبوت اور مزین کی بیخ کنی سے فارغ ہو چکے تھے۔ اس لئے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ان کو اٹھارہ ہزار فوج کے ساتھ مثنیٰ کی



کلمہ پر روانہ فرما دیا۔ حضرت خالد بن ولید نے ایرانی گورنر ہرمز کو لکھا۔

”اسلام اور جزیہ میں کسی ایک کو قبول کر لو۔ اگر تم نے دونوں باتوں سے انکار کیا تو نتائج کی ذمہ داری تم پر عائد ہوگی۔ تمہارا سابقہ ایسے لوگوں سے ہے۔ جو موت سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا تم زندگی سے کرتے ہو۔“

ہرمز اس خط کو دیکھ کر بہت گھبرا یا۔ اور وہ خط اس نے  
نشاہ ایران کو بھیج دیا اور خود فوج لے کر نکلا۔ جب دونوں

## جنگ کاظمہ

فوجیں میدان میں صفِ آرا ہوئیں تو ہرمز نے حضرت خالد بن ولید کو مقابلے کی دعوت دی۔ حضرت خالد بن ولید نے سپہ سالار کی دعوت قبول کرتے ہوئے گھوڑے سے نیچے اتر آئے۔ ایک ہی وار میں ہرمز کا سرتن سے جدا کر دیا۔ مقابلہ کی تاب نہ لا کر ایرانی سپاہی بھاگ بکھے۔ مسلمان فوج نے دریائے فرات کے پکن تک ان کا تعاقب کیا۔ اب اسی مقام پر بصرہ آباد ہے۔ سرزمین عراق میں مسلمانوں کی یہ پہلی فتح تھی۔

اس جنگ کو ذات السلاسل (زنجیروں والی جنگ) بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ ایرانی سپاہیوں نے زنجیریں باندھ رکھی تھیں۔ تاکہ میدان چھوڑ کر بھاگ نہ سکیں۔ حضرت خالد بن ولید نے جنگ کے بعد ان زنجیروں کو اکٹھا کیا تو ایک اونٹ کا بوجھ ٹھا۔ اس لڑائی کو جنگ کاظمہ بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ جنگ منقام کاظمہ کے پاس ہوئی تھی۔ اس جنگ سے مسلمانوں کو جو مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اس میں ایک لاکھ بھی مدینہ میں آیا۔ اسے شہر کی گلیوں میں پھیرا گیا تاکہ لوگ اسے دیکھیں۔ بڑھی عورتوں نے اسے مصدوعی سمجھا اور انہیں راہِ حیرت کہا گیا یہ اللہ ہی کی مخلوق ہے ہاں اسے واپس عراق بھیج دیا گیا۔

(تاریخ طبری)

مثنیٰ و مثنیٰ کی شکست خوردہ فوج کا تعاقب کرتے ہوئے  
مدائن تک پہنچنے کا ارادہ رکھتے تھے کہ راستہ میں جابوں

## ۲۔ جنگ بدر



نے بتایا کہ دشمن کا ایک بہت بڑا لشکر مقابلہ کے لئے مدائن سے آرہا ہے۔ دشمنی نے مناسب سمجھا کہ مقامِ نذار کے قریب پڑاؤ کر کے کمک کا انتظار کیا جائے۔ نذار اس ہنر کے کنارے پر واقع ہے جو دریائے دجلہ اور نورات کو ملائی ہے۔ جب حضرت خالد بن ولیدؓ کو دشمن کے اجتماع کی خبر پہنچی تو حضرت خالد اپنی فوجِ ظفر موح لے کر برق رفتاری سے نذار پہنچے۔ ہرمز کے نسل سے ایرانی فوج میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ جب دونوں فوجیں مقابلہ پر آئیں۔ تو مسلمان مجاہدوں نے اس بے جگری سے حملہ کیا کہ ایک ہی ریلے سے ایرانی سپاہیوں کے قدم اکھڑ گئے۔ ایرانیوں کے بڑے بڑے سردار مارے گئے اور ایرانی فوجیں میدانِ چھوڑ کر بھاگ نکلیں مسلمانوں نے تعاقب کیا۔ مگر دشمن نے کشتیوں میں سوار ہو کر راہِ فرار اختیار کی۔ جنگِ نذار میں بڑا مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔ حضرت خالدؓ نے کچھ عرصہ نذار میں قیام فرمایا۔

جب شاہِ ایران کو دوسری شکست کی خبر پہنچی تو اس نے مناسب خیالی کیا کہ عربوں کے مقابلہ کیلئے عرب قبائل کی مدد حاصل کی جائے۔ سرحدِ عراق پر کئی عرب قبائل آباد تھے جو عیسائی مذہب رکھتے تھے جیناچہ کسریٰ نے ان کی امداد حاصل کی اور ایک فوج تیار کر کے ان میں سے ایک سپہ سالار کے زیر قیادت مقامِ دجہ کی طرف روانہ کر دی۔ نیز اپنا ایک مایہ ناز سپہ سالار بہمن جادویہ ان کی امداد اور نگرانی کے لئے بھیج دیا۔ راستہ میں حیرہ اور دجہ کے کسان بھی اس لشکر میں شامل ہو گئے۔ حضرت خالدؓ کو جب اس لشکر کی آمد کا حال معلوم ہوا۔ تو خود شکر لے کر دجہ کی طرف چل دئے۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے کو شکست دینے اور مر مٹنے کا عزم لئے میدانِ جنگ میں آئیں۔ مگر کارزار گرم ہوا۔ دونوں فوجیں سرودھڑ کی بازی نکالے آگے بڑھنے کی کوشش میں راہِ شجاعت دینے لگیں۔ ٹھہرے عرصہ کے لئے رنٹھری مشکوک ہو گئی۔ حضرت خالدؓ نے دو سالاروں کو متعین کر رکھا تھا کہ وہ دشمن کے پیچھے گھات میں بیٹھے رہیں اور دورانِ جنگ میں پیچھے سے حملہ کر کے دشمن کو پریشان کریں۔

### ۳۔ جنگِ دجہ



چنانچہ حضرت خالد بن ولید نے سامنے سے بڑے زور کا حملہ کیا۔ پیچھے سے مسلمان سپہ سالاروں نے بھی کمین گاہوں سے نکل کر کسریٰ کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ دشمن کے طوطے اڑ گئے اور کسریٰ کی فوج میں ایک بھگدڑ مچ گئی اور وہ ایک دوسرے کو روندتے ہوئے بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے ہزیمت خور وہ فوج کو قتل کرنا شروع کیا۔ بہت سے سپاہی قیدی بنا لئے۔ مسلمانوں کو بہت سا مال غنیمت حاصل ہوا۔

جب مسلمان فتح و کامرانی کی خوشیاں منا رہے تھے۔

## ۴۔ جنگِ اَلِیْس

دوسری طرف شکست خور وہ عیسائی قبائل اور تہذیب

ایرانی شکست کا داغ دھونے کے لئے فوج جمع کر کے جنگ کی تیاری میں مصروف تھے۔ عیسائی عربوں اور ایرانیوں کا ایک بھاری لشکر حیرہ اور ابلہ کے درمیان مقامِ اَلِیْس پر جمع ہوا۔ ایرانی سپہ سالار بہمن جاؤویہ نے اپنی فوج جابان نامی سپہ سالار کے سپرد کر کے اَلِیْس کی طرف روانہ کر دی اور خود کسریٰ ایران سے مشورہ کرنے کے چلا گیا۔ ادھر حضرت خالد بن ولید جب دشمن کی تیاری کی خبر ملی۔ تو لشکر لے کر چل پڑے۔ اور اَلِیْس پہنچ کر لڑائی شروع کی۔ پہلے عیسائی مقابلہ پر آئے۔ حضرت خالد کے ایک ہی درہم ان کی صفوں میں بڑی پھیل گئی۔ یہ دیکھ کر جابان ایرانی سپاہیوں کے ساتھ آگے بڑھا۔ ایرانی فوج اس قدر بہادری اور استقلال سے لڑی کہ حضرت خالد دیکھ کر حیران رہ گئے۔ مسلمانوں نے بار بار حملہ کیا لیکن ایرانیوں نے ہر بار مسلمانوں کے حملہ کو ناکام بنا دیا۔ بالآخر حضرت خالد نے مادی اسباب و ذرائع کی ناکامی دیکھ کر بارگاہِ ایزدی میں فتح و نصرت کی دعا کی اور یہ عہد کیا کہ :-

”اے اللہ! اگر تو مجھے دشمنوں پر غلبہ عطا فرمائے تو پھر میں کسی دشمن کو زندہ نہ

چھوڑوں گا اور یہ دریا ان کے خون سے سرخ ہو جائے گا“

حضرت خالد نے کسی جنگی چالیں چلیں۔ آخر کار دشمن کی صفوں میں انتشار کے آثار رونما

ہونے لگے۔ یہ دیکھ کر حضرت خالد نے حکم دیا کہ دشمنوں کو پکڑ کر قیدی بنا لو اور مقابلہ کرنے والوں



کے سوا کسی قتل نہ کرو۔ چنانچہ ساری فوج کو قیدی بنایا گیا۔ وعدہ پورا کرنے کے لئے حضرت خالدؓ نے حکم دیا کہ ان قیدیوں کو دریا کے کنارے لے جا کر قتل کر دیا جائے نتیجہ یہ ہوا کہ مقتولوں کے خون سے دریا کا پانی سرخ ہو گیا۔ جنگ اسیں میں ستر ہزار کافر مارے گئے (تاریخ طبری)

ان فتوحات کے بعد حضرت خالدؓ نے سوچا کہ سرحد ایران کے عیسائی قبائل کی طاقت کو ختم کر دینا چاہیے۔ اس مقصد کے پیش نظر

### ۵۔ فتح حیرہ

حضرت خالدؓ نے حیرہ کا قصد کیا۔ حیرہ عیسائی عربوں کی ایک چھوٹی سی ریاست کا صدر مقام تھا۔ یہ عیسائی عرب سلطنت ایران کے باجگزار تھے۔ جب مسلمان فوجیں حیرہ کی طرف بڑھیں تو حاکم حیرہ نے دریائے فرات پر بند باندھ کر ان کی پیش قدمی کو روک دیا۔ بند کی وجہ سے مسلمانوں کی کشتیاں رک گئیں۔ مسلمانوں نے دریا کا بند توڑ کر حیرہ کی طرف بڑھتے ہوئے شاہی محل پر قبضہ کر لیا۔ حضرت خالدؓ کی آمد کی خبر سن کر حاکم حیرہ بھاگ نکلا۔ مگر ان کے فرار کے باوجود اہل شہر نے شہر کی گھاتی اور شہر کے دروازے بند کر دیے۔ حضرت خالدؓ نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ایک عرصے تک محاصرہ جاری رہا۔ بالآخر حضرت خالدؓ نے تین شرطیں پیش کرتے ہوئے اہل حیرہ کو اختیار دیا۔ کہ وہ کوئی ایک شرط قبول کر لیں۔

۱۔ اسلام قبول کر لو۔ ہمارے تمہارے حقوق و فرائض مساوی ہوں گے۔

۲۔ اسلام قبول نہیں کرتے تو جزیہ ادا کرو۔

۳۔ اگر دونوں شرطوں میں سے کوئی قبول نہیں کرتے، تو ہمیں ان جنگ میں اثر کر مقابلہ کرو

شہر والوں نے جزیہ دینا قبول کیا۔ اور ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ ادا کرنے

کرنے پر صلح ہو گئی۔ حضرت خالدؓ نے جو عہد نامہ اہل حیرہ کو لکھ دیا۔ اس میں تحریر تھا :-

”اہل حیرہ ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ ادا کریں گے۔ اس کے عوض ہم ان

کی حفاظت کریں گے۔ اور اگر ہم حفاظت نہ کر سکیں۔ تو جزیہ کی رقم ان سے وصول

نہیں کی جائے گی۔ اگر وہ عہد شکنی کریں تو ہم بری الذمہ ہیں۔“



حضرت خالد بن ولیدؓ نے حیرہ کو فوجی مرکز بنا کر وہاں پیام اختیار کیا۔ بلاد عرب سے باہر اسلامی مرکز بننے کا شرف سب سے پہلے شہر حیرہ کو ملا۔ مسلمانوں کی فتوحات اور حضرت خالد کا حسن سلوک اور عدل و انصاف دیکھ کر حیرہ کے اس پاس کے لوگوں نے بھی جزیہ ادا کر کے صلح کر لی۔ اس طرح جنوبی عراق پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

حیرہ کی فتح عراق کی فتح کی طرف پہلا قدم تھا۔ اب حضرت خالدؓ نے شمالی عراق کی طرف توجہ دی۔

## دیگر مقامات کی تسخیر

اس وقت ایرانی فوجیں انبار کے قلعے میں مقیم تھیں۔ مسلمانوں نے انبار پر حملہ کیا لیکن مسلمانوں نے مناسب سزا پر صلح کر لی۔ اس کے بعد حضرت خالدؓ عین التمر کی طرف بڑھے۔ اس شہر کی حفاظت کے لئے شاہ ایران نے مشہور سپہ سالار بہرام جوہی کو مقرر کیا۔ عیسائی عرب قبائل بھی اس کی فوج میں موجود تھے۔ بہرام نے مسلمانوں کا سخت مقابلہ کیا۔ حضرت خالدؓ نے ان کے سردار کو گرفتار کر لیا۔ اس پر انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے بعد حضرت خالدؓ دومتہ الجندل کی طرف بڑھے جس کا محاصرہ حضرت عیاض بن غنم کر رہے تھے۔ جن کو حضرت ابو بکرؓ نے شمالی عراق کی طرف بھیجا تھا۔ خالدؓ کے وہاں پہنچتے ہی وہ بھی فتح ہو گیا۔ یہاں زیادہ تر عیسائی مقیم تھے۔ ان کو ان کی عہد شکنی کی سزا دی گئی۔

اس اثنا میں حضرت ابو بکرؓ نے حضرت خالدؓ کو شمالی محاذ پر جانے کا حکم دیا اور وہ آدھی فوج لے کر شام کی طرف چل دیے۔ اور اپنے بعد مثنیٰ کو اپنا قائم مقام بنا گئے۔ جب ایرانیوں کو معلوم ہوا کہ عراق میں مسلمانوں کی فوج آدھی رہ گئی ہے تو انہوں نے عراق کو واپس لینے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے دس ہزار ایرانی فوج کو مقابلہ کے لئے بھیجا۔ مثنیٰ نے بابل کے مقام پر اس کو شکست دی اور مزید مدد کی درخواست کے لئے خود مدینہ پہنچے جس دن مثنیٰ مدینہ پہنچے اس دن حضرت ابو بکرؓ نہ صرف موت میں مبتلا تھے۔ مثنیٰ کو دیکھتے ہی آپ



نے حضرت عمرؓ کو ناکہ بندی کی کہ ان کی ہر ممکن مدد کی جائے۔

## فتح شام

**وجہ و اسباب** عربوں کی دوسری ہمسایہ سلطنت روم تھی۔ اس زمانہ میں شام بھی سلطنت روم کا حصہ تھا۔ رومی عربوں سے دشمنی رکھتے تھے۔ ان کی عداوت مذہبی تھی۔ ظہور اسلام سے یہ مخالفت اور بڑھ گئی کیونکہ وہ اسلام کو عیسائی مذہب کے لئے خطرہ سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے سفیر وحیہ کلثمیہ کو واپسی پر لوٹ لیا تھا۔ دوسرے سفیر حارث بن عمر بنہ کو غسانی حکمران شتر جنیل نے شہید کر دیا تھا۔ اس کا بدلہ لینے کے لئے آنحضرت ﷺ نے مسیحی اللہ علیہ وسلم نے وہاں پہنچنا ضروری سمجھا لیکن عیسائیوں نے مقابلہ نہ کیا۔ اس کے بعد بھی چونکہ رومی خطرہ برابر موجود تھا۔ اس لئے آپ ﷺ اسامہ بن زیدؓ کی سرکردگی میں ایک مہم بھیجنے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ آپ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے۔ حضرت ابو بکرؓ نے خلیفہ بنتے ہی اسامہ بن زیدؓ کو ایک لشکر کے ساتھ سرحد شام پر بھیج کر آنحضرت ﷺ کے ارادے کی تکمیل کی تھی۔ ایرانی مہمات کے موقع پر عیسائی قبائل نے بار بار ایرانیوں کی مدد کر کے اور خود حضرت خالدؓ کے لشکر سے فخر کیا اس بات کا ثبوت پیش کر دیا کہ وہ مسلمانوں کی دشمنی میں پیش پیش ہیں۔ چنانکہ رومی مسلمانوں کی سلطنت کو ہمیشہ کے لئے مٹانے کی فکریں تھے اور ان کے حملہ کا ہر وقت خطرہ تھا اس لئے حضرت ابو بکرؓ نے شمالی سرحدوں کو مضبوط کرنے کی طرف توجہ فرمائی۔ چنانچہ اپنے خلیفہ خالد بن سعیدؓ کو ایک فوجی دستہ دے کر سرحدوں کی حفاظت کے لئے مقرر کیا اور صرف مدافعتی کارروائی کا حکم دیا۔ مگر عیسائیوں نے اپنے جارحانہ اقدام سے حضرت خالدؓ کو رٹنے پر مجبور کر دیا۔ مسلمانوں نے کئی بار رومیوں کو مار کر اندرون شام تک



بھگا دیا۔ خالد بن سعید کی درخواست پر حضرت ابو بکر رضی عنہ نے عکرمہ بن ابو جہل کو تمام روانہ کیا۔ خالد بن سعید کو جب عکرمہ بن سعید کی آمد کی خبر ملی۔ تو وہ شام کے اندر گھس گئے۔ مگر رومی جنرل باہن کے ہاتھوں شکست کھائی۔ خوش قسمتی سے عکرمہ نے رقت پر پہنچ کر مسلمانوں کو تباہی سے بچا لیا۔ اس شکست کی اطلاع مانے پر حضرت ابو بکر رضی عنہ نے ۱۳ھ میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ لینے کے بعد شام پر کئی طرف سے لشکر کشی کا انتظام کیا اور ہر ایک علاقہ کے لئے علیحدہ علیحدہ فوج مقرر کر دی۔ چنانچہ حضرت ابو عبیدہؓ حمص پر، یزید بن ابی سفیان دمشق پر، شمر بن جہیل بن حنظلہ اردن پر، اور عمرو بن العاص فلسطین پر مامور ہوئے۔ مجاہدین کی مجموعی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ ان سرداروں کو سرحد سے نکلنے کے بعد قدم قدم پر رومی جتھے ملے جن کو قبضہ کرنے پہلے ہی الگ الگ ایک سردار کے مقابلہ میں متعین کر دیا تھا۔ یہ دیکھ کر انہیں اسلام نے اپنی کل فوجوں کو ایک جگہ جمع کر لیا اور بارگاہِ خلافت کو عنیم کی غیر معمولی کثرت کی اطلاع دے کر مزید کمک کے لئے لکھا۔ چونکہ اس وقت دارالخلافت میں کوفہ فوج موجود نہ تھی۔ اس لئے حضرت ابو بکرؓ نے حضرت خالد بن ولید کو لکھا کہ مہم عراق کی باگ منشی کے ہاتھ میں دے کر شام کی طرف روانہ ہو جائیں۔ یہ فرمان پہنچتے ہی خالدؓ نے ایک جمعیت کے ساتھ شامی میدان جنگ کی طرف روانہ ہو گئے۔

تاریخ طبری و فتوح الشام بلاذری ص ۱۱۶

جب شہنشاہ روم کو اسلامی فوج کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی تو اس وقت شہر حمص

## جنگِ اجنادین ۶۳۴ھ

میں مقیم تھا۔ اس نے اسلامی فوج کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے ایک لشکر جبار اپنے جنرل تمیم دؤر کے ماتحت روانہ کیا۔ یہ دیکھ کر تمام اسلامی فوجیں یکجا ہو گئیں۔ اور اس طرح مسلمان فوج کی تعداد چالیس ہزار تک ہو گئی اس مقابلہ میں رومیوں کی فوج دو لاکھ چالیس ہزار تھی۔ دونوں فوجیں اجنادین کے مقام پر صف آرا ہوئیں۔ یہ دونوں فوجیں دوران تک ایک دوسرے کے مقابل میں رہیں۔ اس دوران میں معمولی جھڑپیں بھی ہوتی رہیں۔ لیکن کچھ فیصلہ نہ ہو سکا۔ حضرت



خالد بن ولید بھی رگی نشان کو عبور کر کے لشکرِ اسلام سے آئے۔ حضرت خالد بن ولید نے اسلامی لشکر کی ازبیرت و تنظیم کی اور چالیس دستوں میں تقسیم کیا۔ پورے طور سے منظم ہونے کے بعد مسلمانوں نے رومیوں پر حملہ کیا۔ بڑی خونریزی لڑائی ہوئی۔ رومیوں کو شکست فاش ہوئی اور ڈیڑھ لاکھ رومی شہداء میں کام آئے۔ تین ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ اس فتح سے مسلمانوں کے لئے دمشق کا راستہ کھل گیا۔ دمشق مدت سے شام کا دارالسلطنت تھا۔ یہ دنیا کے قدیم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے اور ایک نہایت ہی سرسبز وادی میں ہے۔

اجنادین کی عظیم الشان فتح کے بعد مسلمان دمشق کی طرف بڑھے۔ اور اس کا محاصرہ کیا۔ مگر اسی دوران میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا۔ اور دمشق حضرت عمر کے عہدِ خلافت میں فتح ہوا۔

۳۱۰ء ماہ جمادی الثانی کے شروع میں حضرت ابو بکر صدیق بیمار پڑ گئے۔ سخت سردی تھی۔ آپ نے غسل کیا بخانہ حملہ کیا اور مرض بڑھتا گیا۔ حضرت عمرؓ کو غار پڑھانے کا حکم دیا۔ جب زندگی سے مایوس ہوئے تو اپنے جانشین کی فکر و انگیز ہوئی۔ آپ کے عہدِ خلافت میں اکثر معاملات حضرت عمرؓ کے مشورہ سے طے ہوتے تھے۔ اس لئے آپ کو حضرت عمرؓ سے بہتر کوئی جانشین نظر نہ آیا۔ صحابہ کرام کو بلا کر اس ضمن میں مشورہ کیا اور حضرت عمرؓ کا نام پیش کیا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف نے کہا۔ عمرؓ بلاشبہ اس منصب کے لائق ہیں لیکن وہ کسی قدر سخت گیر ہیں۔ حضرت عثمانؓ کو بلا کر عہد نامہ خلافت لکھوا دیا۔ عہد نامہ مرتب ہو چکا تو اپنے غلام کو دیا کہ لوگوں کو سنا دے۔ خود بالاخانہ پر تشریف لے جا کر تمام حاضرین سے فرمایا۔ "کہ میں نے اپنے کسی رشتہ دار کو خلیفہ مقرر نہیں کیا ہے بلکہ اس کو منتخب کیا ہے جو تم لوگوں میں سب سے بہتر ہے۔" تمام حاضرین نے حسن انتخاب کی داد دی۔ پھر حضرت عمرؓ کو بلا کر نہایت مفید نصیحتیں کیں جو ان کی کامیاب خلافت کے لئے نہایت عمدہ دستور العمل ثابت ہوئیں۔



(طبقات ابن سعد جلد ۳ صفحہ ۴۳)

**وصیت**  
 بیازی کے دوران فرمایا۔ "میں نے اپنے عہد خلافت میں بیت المال سے جو خرچ لیا ہے اس کا حساب کراؤ اور واپس کر دو۔" حساب کیا گیا تو آٹھ ہزار درہم ہوئے۔ فرمایا۔ "میں اس کے عوض اپنی فلاں جگہ کی زمین اہل اسلام کو دیتا ہوں۔" آپ کے پاس بیت المال سے ایک اونٹنی، ایک غلام اور پانچ درہم کا ایک کبیل تھا۔ یہ چیزیں آپ کی وصیت کے مطابق خلیفہ ثانی کو پہنچا دی گئیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ چیزیں دیکھ کر فرمایا۔

"ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جانشینوں کے لئے بڑی مشکل پیدا ہو گئی ہے!"

**وفات اور تجہیز و تکفین**  
 تجہیز و تکفین کے متعلق فرمایا۔ کہ۔  
 "اس وقت جو کچھ ابدن پر ہے۔"

اسی کہ دھونا اور دو اور کپڑے لگا کر مجھے کفن دینا۔" حضرت عائشہؓ نے عرض کی۔ کہ یہ تو پرانا ہے کفن کے لئے نیا ہونا چاہیے۔ فرمایا۔ "زندے مردوں کی بنسبت نئے کپڑوں کے زیادہ حقدار ہیں۔ میرے لئے یہی پھٹا پڑا ناپس ہے۔" اس کے بعد پوچھا۔ "آج کون سا دن ہے؟" لوگوں نے جواب دیا۔ دو شنبہ۔ پھر پوچھا۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال کس روز ہوا تھا؟" کہا گیا۔ دو شنبہ کے روز۔ فرمایا۔ "تو پھر میری آرزو ہے کہ آج ہی رات تک اس عالم فانی سے رحلت کر جاؤں۔" چنانچہ یہ آخری آرزو بھی پوری ہوئی۔ دو شنبہ کا دن ختم نہ کر کے منگل کی رات کو تریسٹھ برس کی عمر میں ۲۱ جمادی الاخریٰ ۱۱ سالہ کو رہ گزرنے کا عالم جاواں ہوئے۔ خلافت کی مدت دو سال تین ماہ اور دس روز ہے۔

(طبقات ابن سعد)

وصیت کے مطابق رات ہی کے وقت تجہیز و تکفین کا سامان کیا گیا۔ آپ کی زوجہ محترمہ حضرت اسماء بنت عمیس نے غسل دیا۔ حنتہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔



اپنے آقا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں وطن ہوئے۔ آپ کا سر مبارک سرورِ کائنات  
صلی اللہ علیہ وسلم کے دوش مبارک کے برابر رکھا گیا۔ (تاریخ طبری و مستوردی)

## حضرت صدیق اکبرؓ کی سیرت و سیاست

**سیرت**  
حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ دہلے پٹیلے آدمی تھے۔ چہرہ با رغبت اور پر دکھار  
تھا۔ سفید رنگ گھنگریلے بال۔ پیشانی کشادہ اور الجھری ہوئی۔ چہرہ لاغر، ہاتھوں کی انگلیاں باریکی  
اور کم گوشت تھیں، بہت چاک و چوبند رہتے تھے، آواز عرب جلال سے بھر پور تھی۔ کم گو تھے۔ لیکن  
بات کرتے وقت بڑی تانت اور گرجوہشی کا اظہار کرتے تھے۔

حضرت ابو بکرؓ کی زندگی اسلامی تعلیمات کا جیتا جاگتا مجسمہ تھی۔ آپ اخلاق حسنہ اور اوصافِ  
حمیدہ کے مالک، عقلمند اور بہادر تھے۔ آپ اپنی فراست ایمانی اور مہمانانہ بصیرت کی وجہ سے تمام صحابہ  
کرام میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ اجتہاد میں آپ کو سب پر فوقیت حاصل تھی۔ آپ کی سیرت کا نمایاں پہلو  
یہ تھا۔ کہ آپ نے سنتِ رسولؐ سے ذرا بھی ہٹنا گوارا نہ کیا۔ رسول اللہؐ کی زندگی میں ان سے بڑھ  
کر مزاج شناس رسولؐ کوئی نہ تھا۔ آپ از بس سادہ مزاج اور فقیر بنفش تھے۔ خلیفہ ہونے سے قبل  
محلہ کے لوگوں کی بکریاں دودھ دیا کرتے تھے۔ لباس بہت سادہ تھا۔ اکثر پیوند لگے ہوتے تھے کسی شخص  
نے ایک دفعہ شمار کیا تو لباس میں بارہ پیوند تھے جن میں سے بعض چمڑے کے تھے (تاریخ طبری)

آپ اپنے ذاتی مفاد اور آرام کا خیال نہیں رکھا کرتے تھے۔ ایک خلیفہ کے وسیع اختیارات کو  
ہمیشہ دین رتلت کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کیا۔ دولتیں مند ہونے کے باوجود فقیرانہ زندگی  
بسر کرتے تھے جو وطنیت اپنے عہدِ خلافت میں بیت المال سے حاصل کیا۔ وہ بھی اپنی زمین فروخت کر کے  
وفات پانے سے پہلے ادا کر دیا بڑے نرم دل اور پرہیزگار تھے۔ نرم مزاجی کے باوجود جب امور سلطنت میں سختی



کہ حضرت پڑتی تو بڑی مستقل مزاجی کا ثبوت دیتے۔

حضرت ابو بکرؓ بڑے زاہد، متقی اور رفیق القلب تھے۔ تواضع، انکسار اور پھیزگاری میں آپ بڑی شہرت رکھتے تھے۔ آپ ایمان کے پکے اور قول کے سچے تھے۔ جو بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنتے تو رومان لیتے تھے۔ اسی وجہ سے ”صدیق اکبر“ سے۔

مکی زندگی میں آپ نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا ساتھ دیا، ہجرت مدینہ کے وقت شرفِ رفاقت حاصل ہوا۔ غارِ ثور میں ساتھی بنے۔ مدینہ شریف پہنچ کر ہر جگہ میں آپ کے دوش بدوش دشمنانِ اسلام سے لڑے۔ جب حج فرض ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو امیر حج بنا کر مکہ مکرمہ بھیجا۔ حضورؐ کی علالت کے دوران آپ نے مسجدِ نبوی میں امامت کے ذرا قص انجام دئے۔ آپ بڑے صاحبِ عزیمت و استقامت تھے۔ آپ کی عزیمت و استقامت ہی کا نتیجہ تھا کہ سارا عرب باغی اور مرتد ہو جانے کے بعد پھر اترہ اسلام میں داخل کیا گیا۔ آپ کی نظر انتخاب بڑی درست اور صحیح تھی۔ انسروں اور سپہ سالاروں کے انتخاب کے بارے میں آپ بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ رضی اللہ عنہما شہرت اور زور دین کے محرم اور روحِ اسلامی کے وانائے راز تھے۔ قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ، علم الانساب اور دیگر علوم میں آپ کا یہ بہت بلند تھا۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ رضی اللہ عنہما کی زندگی کا عظیم الشان کارناموں سے لبریز

## سیاست

ہے۔ انہوں نے سوا دو برس کی قلیل مدتِ خلافت میں مساعیٰ جمیلہ کے کے بعد لازوال نقش و نگار چھوڑے وہ قیامت تک محو نہیں ہو سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سزیدین ہوا ایک دفعہ پھر کفر و ضلالت کا لہوارہ بن گئی تھی۔ مؤرخ طبری کا بیان ہے کہ قریش و ثقیف کے سوا تمام عرب اسلامی حکومت سے باغی ہو چکا تھا۔ مدعیانِ نبوت الگ الگ ملک میں شورش برپا کر رہے تھے۔ منکرینِ زکوٰۃ مدینہ منورہ کو لوٹنے کی دھمکی دے رہے تھے۔ غرض خود شدید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے غروب ہوتے ہی شمعِ اسلام کے چراغِ سحر بن جانے کا



خطرہ تھا لیکن خلیفہ رسول نے اپنی روشن ضمیری سیاست اور غیر معمولی تدبیر و استقلال کے باعث نہ صرف اس کو گنجل ہونے سے محفوظ رکھا بلکہ پھر اسی مشعل ہدایت سے تمام عرب کو منور کر دیا۔ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلام کو جس نے دوبارہ زندہ کیا اور دنیا کے اسلام پر سب سے زیادہ جس کا احسان ہے وہ حضرت ابو بکرؓ ہی کی ذات گرامی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد میں بڑے بڑے کارنامے انجام پائے۔ یہاں تک کہ روم و ایران کے دفتراٹ و سے گئے۔ تاہم اس کی دماغ بیل خلافتِ صدیقی ہی میں ڈالی گئی تھی اور خلافتِ اسلامیہ کی ترتیب و تنظیم کا سنگ بنیاد حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ ہی نے رکھا تھا۔

اسلام میں خلافت یا جمہوری حکومت کی بنیاد سب سے پہلے حضرت ابو بکرؓ نے ڈالی۔ چنانچہ خود ان کا انتخاب بھی جمہور نے کیا تھا۔ آپ کے عہدِ خلافت میں جس قدر بڑے بڑے کارنامے انجام پائے ان سب میں کیا بے صحابہؓ کا مشورہ شامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے صاحبِ رائے و تجربہ کار صحابہ کو بھی دارالخلافت سے جدا نہ ہونے دیا۔ حضرت اسامہؓ کی مہم میں حضرت عمرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نامزد کیا تھا۔ لیکن انہوں نے حضرت اسامہؓ کو راضی کیا کہ حضرت عمرؓ کو رائے و مشورہ میں مدد دینے کے لئے چھوڑ جائیں۔ شام پر لشکر کشی کا جہاں آیا تو پہلے اس کو صحابہ کی جماعت میں مشورہ کے لئے پیش کیا۔ اسی طرح منکرینِ زکوٰۃ سے جہاد حضرت عمرؓ کی نامزدگی اور تمام دوسرے اہم معاملات میں اہل الرائے صحابہ کی رائے دریافت کر لی گئی تھی۔

حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں بیرونی فتوحات کی ابھی ابتدا ہوئی تھی۔ اس لئے ان کی حکومت صرف عرب تک محدود تھی۔ انہوں نے عرب کو متعدد صوبوں اور ضلعوں پر تقسیم کر دیا تھا۔ چنانچہ مدینہ، مکہ، طائف، صنعاء، خراسان، حضرت یثرب، بحرین، روم، اجدال، علیحدہ، علیحدہ صوبے تھے۔ ہر صوبہ میں ایک عامل مقرر تھا۔



جو ہر شے کے فرائض انجام دیتا تھا۔ عہدہ داروں کے انتخاب میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ان لوگوں کو ترجیح دیتے تھے۔ جو عہد نبوت میں عہد دار رہ چکے تھے۔ جب کسی کو کسی عہدہ پر مامور فرماتے تو عموماً بلا کر اس کے فرائض کی تشریح کر دیتے۔ اور نہایت مؤثر الفاظ میں سلامت روحی و تقویٰ کی نصیحت فرماتے۔ چنانچہ عمر بن العاصؓ اور ولید بن عقبہؓ کو قبلیہ قضاعہ پر مقرر کر کے بنا کر بھیجا۔ تو ان الفاظ میں نصیحت فرمائی :-

در خلوت و جلوت میں خدا کا خوف رکھو۔ جو خدا سے ڈرتا ہے۔ وہ اس کے لئے رزق کا ایسا ذریعہ پیدا کر دیتا ہے۔ جو کسی کے گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔ جو خدا سے ڈرتا ہے۔ وہ اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ اس کا اجر دو بالاکر دیتا ہے۔ بندگانِ خدا کی خیر خواہی بہترین تقویٰ ہے۔ (تاریخ طبری)

یزید بن ابی سفیان کو مہم شام کی امارت سپرد کی تو فرمایا :-

”اے یزید! تمہاری رشتہ داریاں ہیں۔ شاید تم ان کو اپنی امارت سے فائدہ پہنچاؤ۔“

در اصل یہی سب سے بڑا خطرہ ہے جس سے میں ڈرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی مسلمانوں کا حاکم مقرر ہو، اور ان پر کسی کو بلا استحقاق رعایت کے طور پر افسر بنا لے تو اس پر خدا کی لعنت ہو۔ خدا اس کا کوئی عذر اور ذریعہ قبول نہ فرمائے گا۔ اور اس کو جہنم میں داخل کرے گا۔ (مسند احمد جلد ۱ ص ۳۱)

حضرت ابو بکرؓ کے عہدِ خلافت میں مالی حالت بڑی قابلِ اطمینان

تھی۔ زکوٰۃ۔ عشر۔ چریہ اور مالِ غنیمت کی آمدنی سے ملک مال مال

## مالی انتظام

ہو گیا تھا۔ جتنی دولت آتی سب خرچ کر دی جاتی تھی۔ سامانِ جنگ یعنی تلواریں، نیزے،

اونٹ اور گھوڑے خریدنے کے بعد باقی تمام مسلمانوں میں برابر تقسیم کر دی جاتی تھی۔ آپ کے

عہد میں مال کا باقاعدہ محکمہ نہ تھا۔ شروع میں بیت المال تک نہ تھا۔ بعد میں ایک بیت المال

تعمیر کرایا۔ مگر اس میں زیادہ مال جمع ہونے کی کبھی نوبت نہ آئی۔ ایک فضل پڑا رہتا تھا۔ سپرہ



کی ضرورت تھی۔ آپ کی وفات کے بعد اس میں صرف ایک درہم پایا گیا۔

عہد نبوت میں کوئی باقاعدہ فوجی نظام نہ تھا۔ جب ضرورت پیش آتی تو صحابہ کرام خود ہی شوق سے علم جہاد کے پچھے جمع ہو جاتے۔

## فوجی نظام

حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں بھی یہی صورت حال باقی رہی لیکن انہوں نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ جب کوئی فوج کسی مہم پر روانہ ہوتی تو اس کو مختلف دستوں میں تقسیم کر کے الگ الگ افسر مقرر فرما دیتے۔ امیر الامراء یعنی کمانڈر انچیف کا عہدہ بھی خلیفہ اول کی ایجاد ہے۔ سب سے پہلے حضرت خالد بن

ولید اس عہدہ پر مامور ہوئے تھے۔ (فتوح البلدان بلاذری ص ۱۱۱)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ غیر مسلم رعایا کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ اسلامی حکومت میں جو غیر مسلم

## غیر مسلم رعایا کی حفاظت

آباد ہوں ان کو ذمی یا اہل ذمہ کہا جاتا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت ان کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ ان سے جبراً فوجی خدمت نہیں لی جاتی اس رعایت کے عوض صاحب استطاعت اہل ذمہ پر حسب حیثیت معمولی ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ اس کو جزئیہ کہتے ہیں۔ ذمیوں کے مقابلہ میں اہل اسلام پر جہاد کے علاوہ زکوٰۃ بھی فرض ہے۔ زکوٰۃ نہ معاف ہو سکتی ہے اور نہ کم۔ اس کے برعکس جزئیہ کی مقدار بہت خفیف ہوتی ہے۔ غریب اور معذور لوگ جزئیہ سے مستثنیٰ تصور کئے جاتے ہیں۔ خلیفہ اول کے عہد میں جزئیہ کی شرح نہایت آسان تھی اور ان ہی لوگوں پر مقرر کرنے کا حکم تھا جو اس کی ادائیگی کی صلاحیت رکھتے ہوں چنانچہ چہرہ کے باشندوں میں سے ایک ہزار بائیس مستثنیٰ تھے۔ اور باقی پر صرف دس دس درہم سالانہ مقرر کئے گئے تھے۔

(کتاب الخراج امام ابو یوسف)

حضرت خالد بن ولید کا ذکر کئے بغیر خلافت صدیقی

کا تذکرہ نا تمام رہے گا۔ حضرت خالدؓ بڑے کہن

## حضرت خالد بن ولیدؓ

مشق، تجربہ کار اور ماہر فنون جنگ سپہ سالار تھے وہ قبیلہ بنی مخزوم سے تعلق رکھتے تھے۔



جو بڑا دولت مند اور بہادر تھا۔ حضرت خالد بن ولید کو عسکری قیادت ورثہ میں ملی تھی۔ ان کا والد ولید بن مغیرہ اکیلا غلامانہ کعبہ تیار کر کے کعبہ پر چڑھاتا تھا۔ حضرت خالد بن ولید کا چچا ہشام جنگ فجار میں بنو مخزوم کا سپہ سالار تھا۔ ان کے دو بچے چچا بھی بڑے نامور سردار تھے۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے بھی خالد کئی معرکوں میں غزیریک ہو چکے تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے تقریباً پچاس معرکوں میں نمایاں حصہ لیا۔ حضرت خالد بن ولید اپنی عسکری مہارت، جنگی قابلیت، بے مثال بہادری اور جرات و جلاوت کی وجہ سے دنیا کے بڑے بڑے سپہ سالاروں کے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔ وہ ہر معرکہ میں بڑی بہادری سے لڑے۔ ہر مقام پر ثابت قدم رہے۔ اسی بنا پر بارگاہ نبوت سے ”سیف اللہ“ (اللہ کی تلوار) کا لقب پایا۔ خلافت صدیقی میں حضرت خالد بن ولید کا دم بڑا غنیمت تھا اور اکثر فتوحات ان کی بے مثال شجاعت کی مرہون منت تھیں۔

## سوالات

- ۱۔ حضرت ابو بکرؓ کا انتخاب کس طرح ہوا؟ انتخاب کے بعد ان کے خطبہ خلافت کا خلاصہ لکھئے۔
- ۲۔ حضرت ابو بکرؓ نے فتنہ ارتداد کو دبانے کے لئے جو اقدامات کئے ان کا تذکرہ کیجئے۔
- ۳۔ حضرت ابو بکرؓ کو خلیفہ بننے کے بعد کن کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔
- ۴۔ خلیفہ اول کے عہد میں جن جھوٹے نبیوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ ان کا تعارف کرایئے۔ اور بتائیے کہ ان کی سرکوبی کے لئے حضرت ابو بکرؓ نے کیا اقدام کیا۔
- ۵۔ حضرت ابو بکرؓ کی اسلامی خدمات کی تفصیلات بیان کیجئے۔
- ۶۔ جنگ اجنادین کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے اسباب بیان کیجئے۔
- ۷۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی سیرت و سیاست قلمبند کیجئے۔
- ۸۔ مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھئے۔ (۱) عہد صدیقی میں حفاظت قرآن اور زمینوں کے حقوق کی گہرا س فوجی نظام۔
- ۹۔ عہد صدیقی کے طرز حکومت پر بحث کیجئے۔ نیز ملکی و مالی اور فوجی انتظامات پر تبصرہ کیجئے۔
- ۱۰۔ خلافت صدیقی میں فتوحات ہشام و عراق کے حالات و اسباب بیان کیجئے۔



# حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ

**نام و نسب اور ابتدائی حالات**  
 نام عمر۔ ابو حفص کنیت اور فاروق لقب تھا۔  
 والد کا نام خطاب تھا۔ آپ قبیلہ قریش کی مشہور  
 شاخ بنو عدی کے معززین میں سے تھے جن کا سلسلہ نسب آٹھویں پشت میں رسول اللہ  
 صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر مل جاتا ہے حضرت عمر کا خاندان ایام جاہلیت سے نہایت ممتاز تھا۔  
 آپ نہ خیال کی طرف سے بھی نہایت معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی والدہ ہاشم بن مغیرہ  
 کی بیٹی تھیں۔ مغیرہ اس درجہ کے آدمی تھے کہ جب قریش کسی قبیلہ سے لڑنے کے لئے جاتے تھے تو  
 فوج کا اہتمام ان ہی سے متعلق ہوتا تھا۔  
 عقد الغریب

حضرت عمرؓ ہجرت نبوی سے چالیس سال قبل ۵۸ھ میں مکہ میں پیدا ہوئے بچپن کے  
 حالات بہت کم معلوم ہیں۔ ذرا ہوش سنبھالا۔ تو لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ اسلام  
 سے قبل مکہ میں صرف گنتی کے آدمی تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ شباب کا آغاز ہوا۔  
 تو نسب دانی، سپہ گری، پہلوانی اور خطابت میں مہارت حاصل کی۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ  
 نے شہسواری میں بھی کمال حاصل کیا۔ جوان ہوئے تو معززین مکہ کی طرح تجارت کو ذریعہ معاش بنایا۔  
 تجارت کے سلسلہ میں آپ اکثر عراقی و شام میں آیا جایا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ جوان ہوتے ہی  
 اپنے تمام اہل عیال سے گئے سعادت لے گئے۔ آپ کی صحت قابل رشک تھی۔ آپ بڑے نوجوان  
 اور کھیل جوان تھے۔ اپنے قد و قامت، ڈپل ڈول اور سرخ و سفید رنگت کے باعث تمام لوگوں سے



مناظر آتے تھے۔

حضرت عمرؓ کا ستائیسواں سال تھا کہ ریگستانِ عرب میں آفتابِ اسلام پر تو فگن ہوا اور مکہ کی گھاٹیوں سے توحید کی صدا بلند ہوئی۔ حضرت عمرؓ کے لئے یہ صدا نا مانوس تھی اس لئے سخت برہم ہوئے جس کی نسبت معلوم ہو جاتا کہ یہ مسلمان ہو گیا ہے اس کے دشمن بن جاتے ان کے خاندان کی ایک کینز کنبیہ مسلمان ہو گئی تھی اس کو اٹا مارتے کہ مارتے تھے اور جس پر قابو چلتا زور و کوب سے دریغ نہ کرتے تھے لیکن اسلام کا نشہ ایسا نہ تھا کہ جو چرٹھ کر اتر جاتا۔ ان تمام سختیوں پر ایک شخص کو بھی وہ اسلام سے برگشتہ نہ کر سکے۔

(فتوح البلدان بلاذری ص ۷۷)

تقریباً کے سرکردہ اشخاص میں ابو جہل اور حضرت

حضرت عمرؓ کا اسلام لانا

سے زیادہ سرگرم تھے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے لئے بارگاہِ ایزدی میں التجا کی تھی۔ کہ

”اے اللہ! اسلام کو ابو جہل یا عمر بن الخطاب سے معزز کر۔“ (جامع ترمذی)

مگر یہ دولت قسم از ل نے حضرت عمرؓ کی قسمت میں لکھ دی تھی۔ ابو جہل کے حصے میں کینہ کر آتی۔ اس لڑکا کا اثر یہ ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد اسلام کا یہ سب سے بڑا دشمن اس کا سب سے بڑا دوست اور سب سے بڑا جان نثار بن گیا۔ آپ کے اسلام لانے کے بارے میں درودائیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ایک دن آپ ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادہ سے نکلے۔ راستہ میں نعیم بن عبد اللہ مل گئے، ان کے تیور دیکھ کر پوچھا خیر تو ہے؟ بولے۔ محمد (ص) کا فیصلہ کرنے جانا ہوں۔ انہوں نے کہا پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو۔ خود تمہاری بہن فاطمہؓ اور بہنوئی اسلام لچکے ہیں۔ نوزاً پلٹے اور بہن کے یہاں پہنچے۔ وہ قرآن پڑھ رہی تھیں۔ ان کی آہٹ پا کر چپ ہو گئیں اور قرآن کے اجزاء چھپا دئے۔ لیکن آذان کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ بہن نے



پوچھا۔ یہ کیسی آواز تھی؟ بولیں "کچھ نہیں"۔ انہوں نے کہا میں سن چکا ہوں تم دونوں مرتد ہو چکے ہو۔ یہ کہہ کر بہنوئی سے الجھ گئے اور جب ان کی بہن چکانے کو آئیں تو ان کی بھی خبر لی۔ یہاں تک کہ ان کا چشم لٹو لٹمان ہو گیا۔ لیکن اسلام کی محبت پر ان کا کچھ اثر نہ ہوا۔ بولیں "کہہ دو جو بنائے گمراہ لیکن اسلام اب دل سے نکل نہیں سکتا"

جب عمر نے بہن کا خون بہتے دیکھا تو دلی بھرا آیا۔ اور کہا۔ کہ مجھے وہ ادراق دکھاؤ جو تم پر ٹھہ رہے تھے۔ بہن نے قرآن کے اجزاء سامنے لا کر رکھ دیے۔ اٹھا کر دیکھا تو سورہ حدید تھی۔ ایک ایک لفظ پر ان کا دل مرعوب ہوتا جاتا تھا۔ جب اس آیت پر پہنچے۔ "امِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ"  
اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ (سورہ حدید)

تو بے اختیار سر کر کلمہ شہادت پڑھ دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب رسول اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم کے مکان پر جو کوہ صفا کے دامن میں واقع تھا تشریف فرما تھے۔ حضرت عمر نے اس تلافی مبارک پر پہنچ کر دستک دی۔ چونکہ ستم نشین کبھی اس لئے صحابہ کو تردد نہ ہوا حضرت حمزہ نے کہا آنے دو مخلصانہ آیا ہے۔ تو بہتر ہے۔ ورنہ اسی تلوار سے اس کا سر تسلیم کر دوں گا۔ حضرت عمر نے اندر قدم رکھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غم آگے بڑھے۔ اور ان کا دامن پکڑ کر فرمایا۔ کیوں عمر! کس ارادہ سے آئے ہو؟ ثبوت کی پھر جلال آواز نے ان کو مرعوب کر دیا۔ نہایت عجز و انداز میں کہا۔ بد ایمان لانے کے لئے۔ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ ہفتے بے ساختہ اللہ اکبر کا لفظ اس زور سے لگایا کہ مکہ کی تمام وادیاں گونج اٹھیں۔ (سیرت النبی بحوالہ ابن عساکر و کامل ابن اثیر) حضرت عمر نے اس کے اس واقع بقول مورخین نبوت کے ساتویں سال پیش آیا۔ آپ چالیسویں مسلمان تھے۔

یہ واقعہ اکثر اباب سیر نے بیان کیا ہے۔ مگر محدثین نے اس پر سخت تنقید کی اور اس کے سب طرق کو پایہ اعتبار سے ساقط قرار دیا ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ آنحضرت کو ایذا دینے کے لئے نکلا۔ آپ بڑھ کر خانہ کعبہ میں داخل ہو گئے اور نماز شروع کر دی۔ آپ



نے سورہ الحاقہ تلاوت فرمائی۔ میں کھڑا سنتا رہا اور قرآن کے نظم و اسلوب سے حیرت زدہ تھا۔  
دل میں کہا جیسا قریش کہا کرتے ہیں۔ خدا کی قسم، یہ نشانہ ہے! بھی یہ قبیل آیا ہی تھا کہ آپ نے  
یہ آیت پڑھی۔

ابنہ لَقَوْلِ رَسُولٍ كَرِيمٍ  
وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا  
مَّا تُؤْمِنُونَ (الحاقہ)

یہ ایک باعزت قاصد کا کلام ہے۔  
اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں۔ تم بہت  
کم ایمان رکھتے ہو۔

میں نے کہا یہ تو بخوبی ہے میرے دل کی بات جان گیا ہے اس کے بعد یہ آیت پڑھی:۔  
وَلَا يَقُولُ كَافِرٍ قَلِيلًا  
مَّا تَدَّكُرُونَ

یہ بخوبی کا کلام بھی نہیں۔ تم بہت کم نسیحت  
کپڑتے ہو۔

آپ نے یہ سورہ آخر تک تلاوت فرمائی۔ سکوتِ شب کے تاثر انگیز لمحوں میں اللہ تعالیٰ کا کلام  
زبان رسالت پناہ سے اٹھ کر میرے دل میں اتر گیا۔ آنحضرتؐ نماز سے فارغ ہو کر گھر کو چلے تو  
میں بھی پیچھے ہو گیا۔ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینہ پر ہاتھ بھیرا اور دعا دی (مسند احمد جلد ۱ ص ۱۸۱)  
اس عظیم شخصیت کے تابع اسلام ہونے کے ساتھ اسلام کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔  
اس نئے بل فرزندانِ تو حید مشرکین سے چھپ کر نماز پڑھتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا ہم بر سرِ حق ہو  
کہ کب تک پوشیدہ عبادت کریں گے۔ اہلِ شرک کیلئے بندوں بت پرستی کرتے ہیں ہم بھی بر سرِ عام  
حرم میں خدا کی عبادت کریں گے۔ چالیس مسلمانوں کو ساتھ لے کر گئے اور سب کے سامنے نماز پڑھی۔  
مشرکین نے مزاحمت کرنا چاہی لیکن عمرؓ کی تلوار کے سامنے ہمت نہ ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے حق و  
باطل کا فرق بر ملا طور پر دکھا دیا۔ اس خدمتِ جلید کے عوض بارگاہِ رسالت سے فارق کالقب ہلا۔

(البدایہ والنہایہ)

حضرت عمرؓ نبویؐ میں اسلام لائے تھے۔ سال ۶۲۲ء نبویؐ میں  
ہجرت مدینہ وقوع پذیر ہوئی۔ اس طرح انہوں نے اسلام لانے

ہجرت مدینہ



کے بعد تقریباً چھ سات برس تک قریش کے منظم برداشت کئے جب مسلمانوں کو مدینہ کی جانب ہجرت کی اجازت ملی تو حضرت عمر بھی اس سفر کے لئے آمادہ ہوئے۔ بارگاہ نبوت سے اجازت لے کر چند آدمیوں کے ساتھ مدینہ کی طرف اس شان سے روانہ ہوئے کہ پہلے مسلح ہو کر مشرکین کے مجمع میں سے گذرتے ہوئے خانہ کعبہ پہنچے۔ نہایت اطمینان سے طواف کیا اور نماز پڑھی پھر مشرکین سے مخاطب ہو کر کہا۔

”اگر کوئی یہ چاہتا ہو کہ اس کی ماں اس سے محروم ہو جائے اس کی بیوی بیوہ ہو جائے

اور بچے یتیم ہو جائیں تو وہ اس مادی کے پار میرے مقابلہ کو آئے“

لیکن کسی کو ہمت نہ ہوئی، اور وہ مدینہ روانہ ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کے بعد اکثر صحابہ نے ہجرت کی یہاں تک کہ ۶۳۲ء میں خود آفتاب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم بھی مکہ کی گھاٹیوں سے نکل کر مدینہ کے انق سے ضوا نکلے ہوئے۔

حضرت عمرؓ نے ہر موقع پر اسلام کی تہنیت و اعانت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آپ اکثر غزوات میں شریک ہوئے۔

### حضرت عمرؓ کی شخصیت

غزوہ بدر، احد، خندق، بیعت رضوان، غزوہ خیبر اور فتح مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوش بدوش رہے۔ جنگ تبوک میں آوصال راہ خدا میں دے دیا تھا۔ مدبر اور معاملہ فہمی کا یہ حال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر معاملات میں حضرت عمرؓ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے کبھی مرتبہ حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید میں وحی نازل ہوئی۔ حضرت عمرؓ خلافت صدیقی میں بھی حضرت ابو بکرؓ کے دست راست رہے۔

قبل ازیں تفصیلاً ذکر کیا گیا

### حضرت عمرؓ کا انتخاب اور خطبہ خلافت

ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے اپنی

وفات سے پہلے مسلمانوں کو انتخاب کی اجنبیوں سے بچانے کے لئے مہاجرین و انصار کے سرکردہ لوگوں کے مشورہ سے حضرت عمرؓ کو نامزد کر دیا تھا۔ نامزدگی کے بعد ان تمام مسلمانوں کی



رائے بھی لے لی۔ جو مسجد نبوی میں جمع ہو گئے تھے۔ حضرت عمر کے انتخاب پر سب مسلمانوں نے اتفاق کیا۔ حضرت ابو بکرؓ کی وفات کے بعد سب نے حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ خلیفہ منتخب ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے پہلا خطبہ دیتے ہوئے فرمایا :-

”و اے لوگو! میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ اگر مجھے حضرت ابو بکرؓ کی نافرمانی کا خیال نہ ہوتا تو میں تمہارا امیر بننا کبھی پسند نہ کرتا۔“

پھر بارگاہِ ربانی میں یوں دست بردا ہوئے :-

”اے اللہ! میں سخت ہوں مجھے نرم کر دے۔ اے اللہ! میں کمزور ہوں مجھے قوت دے اور انا مال عطا کر، اے اللہ! میں بخیل ہوں، مجھے سخی بنا دے۔“

”اے لوگو! اللہ نے مجھے تمہارے لئے آزمائش بنا دیا ہے اور تمہیں میرے لئے۔ جو کوئی

نیک کام کرے گا میں بھی اس سے بھلائی کر دوں گا۔ اور جو کوئی برائی کام کرے گا۔ تو میں اسے عبرت ناک سزا دوں گا۔“

جب لوگوں کے دلوں میں آپ کی سختی کے متعلق شکوک پیدا ہوئے۔ تو آپ نے فرمایا :-

”آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میری سختی بہت کم ہو گئی ہے۔ البتہ میں مسلمانوں

پر کسی ظالم و جاہل کے ظلم و جور کو برداشت نہیں کر سکتا۔ امن و سلامتی ،

دیانت داری اور میانہ روی اختیار کرنے والوں کے لئے میں بہت ہی نرم

ہوں۔ یاد رکھو۔ کہ ظالموں کو عرفِ غلط کی طرح مٹا کر دکھ دوں گا



# فتوحاتِ فاروقی

## فتحِ عراق

حضرت عمرؓ نے مسندِ نشینِ خلافت ہوئے تو سب سے پہلے اہم  
عراق کی جانب متوجہ ہوئے۔ آپ نے لوگوں کے سامنے

جہاد پر پُر جوش تقریریں کیں۔ کوئی آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ ایران کی شہری ہر بیتہ دلوں پر  
مسلط تھی۔ آپ نے متواتر تین دن لوگوں کو خطاب کیا۔ چوتھے روز پھر تقریر کی۔ تو منشی نے  
کھڑے ہو کر عربوں کو غیرت دلائی اور کہا کہ اس محاذ کو دشوار نہ سمجھو۔ ہم نے فارس سے عراق  
کا بہترین علاقہ لے لیا اور انہیں جانی نقصان پہنچایا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ”مہاجرین  
اولین کہاں ہیں؟ کیا انہیں قرآن حکیم کا وراثتِ ارضی کا وعدہ یاد نہیں؟ قبیلہ ثقیف کے  
سرور ابو عبیدہ ثقفی اٹھے اور کہا: ”میں یہ خدمت انجام دوں گا۔“ ہر طرف سے آوازیں اٹھیں  
کہ ہم بھی حاضر ہیں۔“ حضرت عمرؓ نے پانچ ہزار کا لشکر تیار کیا اور ابو عبیدہ کو سپہ سالار مقرر کر کے  
روانہ کیا۔

ادھر مسلمان عراق کی مہم پر روانہ ہوئے۔ ادھر ایرانیوں نے گذشتہ ہزیمتوں سے سبق حاصل  
کرتے ہوئے فوج کی از سر نو تنظیم کی۔ خراسان کا مشہور و معروف مدبر اور نامور بہادر رستم  
سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ رستم نے ایرانیوں کے مذہبی جذبات سے کھینٹنا شروع کیا۔ مذہب کے  
نام پر اس نے ایرانیوں کو مسلمانوں کے خلاف خوب بھڑکایا اور ملک میں ایک آگ سی لگا دی۔  
نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ایرانی مسلمانوں کے مقابلہ پر رٹنے مرنے کے لئے تیار ہو گئے۔

ایرانیوں کی نئی تربیت یافتہ فوج سے مسلمانوں کی کئی جھڑپیں ہوئیں۔ ایک دو معرکوں میں  
تو ایرانیوں کو بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ حیرہ اور تادسیہ کے درمیان مقامِ نمارق پر ابو عبیدہ  
کا ایرانی سپہ سالار جابان سے آمناسامنا ہوا۔ شدید جنگ کے بعد ایرانیوں کو شکست پہنچ



ہوئی۔ ان کا قائد فوج جابان گرفتار ہوا۔ مسلمان فوج نے پیش قدمی جاری رکھتے ہوئے شکست کے قریب  
مقام سفاطیہ پر پھر دستوں کی فوج کو شکست دی۔ ایرانی سپہ سالار رسی میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ  
گیا۔ بے شمار مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ تازہ دم ایرانی افواج نئے حملہ کے لئے میدان میں  
آپہنچیں۔ ابو عبیدہ ثقفی کی فوج دریائے فرات کو پار کرنے کے دشمن کے مقابلہ کے لئے نکلی۔ ایرانیوں  
کے ساتھ ہڈے بڑے ہاتھی تھے۔ مسلمانوں کے گھوڑوں نے پہلی دفعہ ہاتھی دیکھے تو بدگئے۔ مسلمان  
بڑی بہادری سے لڑے مگر ہاتھیوں کے سامنے کوئی پیش نہ گئی۔ جب ابو عبیدہ ہاتھی کا مقابلہ کرتے  
ہوئے شہید ہوئے تو ایرانیوں نے ہزاروں مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ جب حضرت عمرؓ کو اس  
شکست کی خبر ملی تو انہوں نے عبداللہ بن جلی کے زیر قیادت مزید کمک بھیجی۔ اب منشی نے ایرانی  
فوج کو بویب کے مقام پر پوری طرح شکست دی۔ سالار ایرانی سپہ سالار خمران کو قتل کر دیا۔  
اسلامی فوج کے سپہ سالار منشی دریائے فرات کا پل روک کر کھڑے ہو گئے اور ان تمام ایرانی  
سپاہیوں کو جنہوں نے اس پل کو عبور کرنے کی کوشش کی نہ تیغ کر دیا۔ معرکہ بویب کے بعد  
دریائے فرات کے مغرب میں مسلمانوں کا تسلط دوبارہ قائم ہو گیا۔ بویب کی فتح کے بعد مسلمانوں  
کو بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ اور مسلمانوں کا رعب ایرانیوں پر چھا گیا۔ معرکہ بویب میں  
بارہ ہزار ایرانی مارے گئے۔ مسلم شہداء کی تعداد صرف ایک سو تھی۔

معرکہ بویب میں فتح حاصل کرنے کے بعد مسلمان چین سے  
نہ بلیٹھ سکتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ایرانی بڑے جوش

## جنگ قاسیہ

دو طرفہ جوش سے دوسری جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس عرصے میں ایک پرجوش اور نوجوان  
شہزادہ یزدگرد و ایران کے تختِ شاہی پر بیٹھا۔ اس نے مسلمانوں کے مقابلے کے لئے ایک لشکر  
جراہ تیار کر کے رستم نامی سپہ سالار کے زیر قیادت روانہ کیا۔

ادھر حضرت عمرؓ بھی تیاری میں مصروف تھے۔ آپ نے تمام اطرافِ ملک سے آزمودہ کار  
سپاہی جمع کر کے بیس ہزار کی ایک فوج تیار کی اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جیسے حلیاۃ



صحابی کی زیرکمان ایران کی طرف روانہ کر دی۔ آپ نے حضرت سعد کو مناسب ہدایات دیں اور یہ بھی حکم دیا کہ اہل ایران کو جنگ سے پہلے دعوتِ اسلام دی جائے۔ حضرت سعد نے دو مرتبہ مبلغین کو ایرانی دربار میں بھیجا مگر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر کار انہوں نے کہا کہ اگر تو حیدر رسالت پر ایمان لانا گوارا نہیں تو پھر ہمارے ہمارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔ یہ سن کر ایرانی سپہ سالار رستم بڑا غضبناک ہوا۔ اوشہ کھا کر کہنے لگا کہ کل طلوعِ آفتاب سے پہلے تم اپنے آپ کو خاک و خون میں تہہ پستہ ہوئے پاؤ گے۔ مبلغین یہ سن کر واپس آ گئے۔

فوجیں مقابلہ کے لئے صرف بستہ ہوئیں۔ حضرت سعد بیمار پڑ گئے۔ قواد سیہ میں ایک پرانا محل تھا اس کے بالا خانے پر مقیم رہے اور جنگ کی ہدایات دیتے رہے۔ قواد سیہ کا میدان عجیب سپاہیوں سے آدھیوں کا جنگل نظر آنے لگا۔ اس کے پیچھے ہاتھیوں کے کالے کالے پہاڑ عجیب خوفناک سماں پیدا کر رہے تھے۔ دوسری طرف مجاہدینِ اسلام کا لشکر جبار صرف بستہ کھڑا تھا۔ اللہ اکبر کے نعروں سے جنگ شروع ہوئی۔ دن بھر سنگسار و کھنڈیوں کا پھانسیا ہوا۔ شام کو جب تاریکی پھا گئی تو دونوں حریف اپنے خیموں میں واپس آ گئے۔

قواد سیہ کی جنگ چار روزہ رہی۔ ایرانیوں کے آگے ہاتھیوں کے پہاڑ تھے۔ فیل بان ان پر سے تیر اندازی کرتے تھے۔ عربوں کے پاس ان کا کوئی فری حمل نہ تھا۔ جان پر کھیل کر ان پر ٹوٹ پڑے۔ مگر فیصلہ کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ دوسرے روز بازار جنگ گرم ہوتے ہی شام سے حضرت سعد بن قائل کے بھتیجے ہاشم بن عقبہ کے تحت چھ ہزار فوج آ گئی۔ یہ دستوں میں تقسیم تھی۔ جو شام تک تھوڑے تھوڑے وقفے سے تکبیر کے نعروں سے مارتے میدانِ جنگ میں آتے رہے۔ ہرنے دستے کی آمد سے مسلمانوں میں تازہ ولولہ پیدا ہوتا۔ اور مجوس کے دل بھیڑ جاتے۔

تاریخ طبری و مسعودی  
اسلامی فوج نے اس دن ہاتھیوں کو بندگانے کے لئے یہ تجویز کی کہ دس دس اونٹوں پر چھوٹے ڈال کر انہیں ایرانی رسالوں کی طرف بڑھاتے۔ دشمن کے گھوڑے ان فیلیں غائبکیوں سے جباگ نکلتے تھے۔

(تاریخ طبری، ماہ بن مملوک)



تیسرے روز بھی جنگ جاری رہی۔ ہاتھی اٹھی تک نقصان پہنچا رہے تھے۔ عمرو بن معدی  
 کرب جو عرب کے نامور بہادر تصور کئے جاتے تھے۔ تلوار سونت کر ایک ہاتھی پر حملہ آور ہوئے۔  
 مجاہدین نے نیزوں سے ہاتھیوں کی آنکھیں پھوڑ دیں۔ یہ بھاگے تو باقی ہجوم بھی پیچھے ہو گیا۔  
 اور اپنے ہی لشکر کو روندنا گیا۔ انھوں نے سیدھے مدائن میں جا کر دم لیا۔ جب اس طرح ہاتھیوں  
 کی آہنی دیوار ٹوٹ گئی۔ تو مسلمانوں نے بڑے زور کا حملہ کیا۔ فریقین میں بڑی خونریز جنگ ہوئی۔  
 نزاروں کی جھنڈکار اور نعروں کے شور سے میدان جنگ گونج رہا تھا۔ صبح سے شام تک میدان  
 کا رزار گرم رہا۔ رات کو بستی شدت کی جنگ ہوتی رہی۔ چوتھے روز دوپہر کو جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔  
 رستم بڑی بہادری سے بڑھا رہا۔ بالآخر زخموں سے چمڑے ہو کر میدان سے بھاگ نکلا۔ ایک مسلمان  
 مجاہد ہلال بن شلقمہ نامی نے تعاقب کر کے اسے قتل کر دیا۔

رستم کی زندگی کے ساتھ سلطنت ایران کی قسمت کا بلی فیصلہ ہو گیا۔ ایرانی سپاہیوں کے  
 پاؤں اکٹھے ہو گئے۔ مسلمانوں نے درتک تعاقب کیا اور ہزاروں لاشیں میدان میں بچھا دیں۔  
 اس جنگ میں مسلمان شہداء کی تعداد دس ہزار تھی۔ ایک لاکھ ایرانی کھیت رہے۔

اس جنگ میں مسلمان عورتوں نے بڑی جوانمردی کا ثبوت دیا۔ وہ زخمیوں کو پانی پلائیں  
 اور ان کی مرسم مٹی کرتی تھیں۔ غورنوں کے ساتھ چھوٹے بچے بھی سر دھڑ کی بازو لگائے پانی  
 پلاتے پھرتے تھے۔ جنگ قادیسیہ میں بے شمار مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ ہر شہسوار کو  
 چھ ہزار درہم پیادے کو دو ہزار درہم ملے۔

حضرت سعد نے نامہ فتح ایک نیز رواقہ کے ہاتھ مدینہ میں روانہ کیا۔ حضرت  
 عمرؓ نے نتیجہ جنگ کے ایشیا میں بے تاب تھے۔ ہر روز شہر سے نکل کر عراقی سمت سے  
 آنے والے سواروں سے حالات پوچھتے۔ ایک دن ادھر سے ایک سوار آیا۔ آپ نے بڑھ  
 کر تازہ سپہ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی۔ وہ خبریں  
 سننا تا گیا۔ اور آپ اس کی ناقہ کے ساتھ جاسکتے گئے۔ سوار کو آپ کی شناخت نہ تھی شہر



میں داخل ہوئے اور لوگوں نے آپ کو امیر المومنین کہہ کر پکارا تو اس سوار نے آپ کو پہچانا اور معافی چاہی۔ آپ نے فرمایا برا اور! کوئی مضائقہ نہیں۔ (البدایہ والنہایہ)

فاروق اعظم نے لوگوں کو جمع کر کے فتح کا مژدہ سنایا اور ان الفاظ سے ان سے خطاب فرمایا:-

مسلمانو! میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تم کو غلام بنا لوں میں تو خود خدا کا غلام ہوں۔  
البتہ خلافت کا بار گراں میرے کندھوں پر ڈالی دیا گیا ہے۔ اگر میں اس طرح تمہاری خدمت کر سکتا کہ تم اطمینان سے گھروں میں سوئے رہو۔ تو میرے لئے یہ عین سعادت اور خوش نصیبی ہے اور اگر میری یہ خواہش ہو کہ تم لوگ میرے دروازے پر حاضری دو تو یہ میری بدبختی ہے۔"

"تاریخ عالم میں جنگ قادسیہ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ دنیا کی بڑی فیصلہ کن جنگوں میں شمار ہوتی ہے۔ فتح قادسیہ نے سلطنت کسریٰ کی کمر توڑ دی۔ اور اگرچہ اس کے بعد بھی ایرانیوں سے کئی زبردست جنگیں ہوئیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جنگ قادسیہ کے بعد ایرانی فوج میں وہ سکت باقی نہ رہی قادسیہ کی شکست نے ایرانی فوج کے حوصلے پست کر دیئے تھے۔ فتح قادسیہ دراصل ملک ایران اور ایشیا کے کوچک کی فتح کا پیش خمیہ ثابت ہوئی۔"

امیر المومنین حضرت فاروق اعظم کے حکم سے قادسیہ میں دو ماہ قیام کرنے کے بعد حضرت سعد نے ایران کے پائی تخت مدائن کی طرف پیش قدمی کی۔ یہ بڑی کارپنضا جگہ پر واقع ہے۔ دریائے دجلہ اس کے نیچوں نہج گذرتا تھا۔ اسلامی سپاہ دجلہ کے کنارے پہنچی تو دیکھا کہ دریا ترہا پر ہے۔ مجوس پل کو توڑ گئے تھے۔ اور کشتیاں بھی ساتھ سے لگے تھیں۔ مسلمان حیران تھے کہ کیا کیا جائے۔ اس موقع پر مسلمانوں نے بڑی بہادری اور بانبازی کا ثبوت دیا۔ سپاہ



حضرت سعدؓ نے خدا کا نام لے کر دریا میں گھوڑا ڈال دیا۔ سپہ سالار کے پیچھے چھ سو  
 بہادر اور بڑے سپہ سالاروں نے بھی دریا میں گھوڑے دوڑا دیے اور تھوڑی دیر میں دیکھنے  
 پارہ جا آئے۔ مسلمانوں کی شجاعت دیکھ کر ایرانی میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ وہ کہنے لگے مسلمان  
 انسان نہیں جن ہیں۔ معمولی سی مزاحمت کے بعد اسلامی فوج مدائن میں داخل ہو گئی۔ شاہ ایران  
 یزدگرد پہلے ہی سے بھاگنے کی تیاری کر چکا تھا۔ مسلمانوں کو شہر میں داخل ہوتا دیکھ کر اپنا  
 پایہ تخت چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ مسلمانوں نے پہلی نماز جمعہ ایران کسریٰ میں ادا کی۔ حضرت سعدؓ  
 نے مدائن کو صدر مقام بنایا۔ اور مشرقی علاقوں کا نظم و نسق سنبھالا۔ قصر شاہی میں بے شمار  
 مال و دولت اور زرد جواہرات کے ذخیرے موجود تھے۔ نہایت قیمتی ساز و سامان اور قیم و زر  
 کے انبار مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ حضرت عمرؓ مدائن غنیمت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ حضرت سعدؓ  
 بن ابی وقاصؓ کی فوج میں ساٹھ ہزار سپہ سالار تھے۔ ہر سپہ سالار کو دس ہزار درہم ملے۔

ایرانی فوج نے پایہ تخت خالی کرنے کے بعد جلولا کے قلعہ میں پناہ  
 لی۔ یہ شہر مدائن سے جانب شمال چالیس میل کے فاصلہ پر

تسخیر جلولا

واقع تھا۔ یہاں کسریٰ نے قریباً ایک لاکھ فوج جمع کر رکھی تھی۔ اسلامی لشکر نے شہر کو گھیر لیا۔  
 تین ماہ تک یہ محاصرہ جاری رہا۔ آخر جنگ آ کر ایرانیوں نے اچانک مسلمانوں پر تہ بول دیا۔  
 بڑی خونریزی لڑائی ہوئی۔ فریقین کے تیر اور نیزے ختم ہو گئے۔ سپاہی تلواروں اور کلہاڑیوں سے  
 لڑنے لگے۔ مسلمانوں نے بڑے زور کا کیا اور خندق کے دروازے پر جا پہنچے۔ اتنے میں شام  
 ہو گئی۔ اندھیرا چھانے لگا۔ رات کی تاریکی دیکھ کر مسلمان مجاہد جنگ ملتوی کرنا چاہتے تھے  
 کہ سالار شکر قبایع بن عمرو نے شکر سے ان الفاظ میں خطاب کیا۔

”مجاہدو! کہہ جا رہے ہو۔ تمہارا سالار تو خندق کے دروازے پر پہنچ چکا ہے۔ اپنے  
 امیر کی طرف بھاگو۔ ہم ایک پتے میں شکر کے اندر داخل ہوا چاہتے ہیں۔“

قابہ شکر کے یہ الفاظ سن کر مجاہد دشمن پر پل پڑے اور ایسا حلقہ کیا۔ کہ سب خندق



کے دروازے پر پہنچ گئے۔ مسلمانوں کا سالار دروازے پر قابض ہو چکا تھا۔ ایرانیوں کو دبا کر بھاگ  
 نکلے۔ مسلمان سپاہیوں نے دشمنوں کے کشتوں کے پتے لگا دیے۔ جو جان بچا کر بھاگیں وہ  
 حلوآن میں پناہ گزین ہوئے۔ مسلمان شہر میں فاتحانہ داخل ہوئے۔ یہاں بھی بڑا مال غنیمت  
 ہاتھ آیا۔ سیم وزر کے انبار ملے۔ سامان جنگ بھی مکتوت دستیاب ہوا۔ ہر شہسوار  
 درہم اور نو نو سواری کے جانور ملے۔ تسخیر کے بعد حلوآن اور اس کے ارد گرد کے علاقوں پر  
 جزیہ لگا دیا گیا۔

شہزادہ ایران یزدگرد اس وقت حلوآن میں تھا۔ جب اس نے  
 حلوآن فتح ہونے کی خبر سنی۔ تو حلوآن چھوڑ کر کھیاگ نکلا۔  
 فقہاء بن عمر و پیش قدمی کرتے ہوئے حلوآن پہنچے۔ تو معمولی مزاحمت کے بعد شہر پر  
 قبضہ کر لیا۔ اور ساتھ ہی اعلان کر دیا۔ کہ جو شہری اسلام قبول کرے گا یا جزیہ ادا کرے گا  
 اس کی جان اور مال محفوظ رہے گا۔ یہ اعلان سن کر بہت سے سردار مسلمان ہو گئے۔ حلوآن  
 عراق کا آخری شہر تھا۔ اس کی تسخیر کے ساتھ عراق کی فتح مکمل ہو گئی۔

عراق سے زرد سیم کے مال و متاع کے انبار مدینہ آنے لگے۔ ایک دن غنیمت  
 کے ایک ڈھیر پر حضرت عمرؓ کی نظر پڑ گئی۔ تو انکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آپ سے  
 پوچھا گیا۔ کہ یہ خوشی کا مقام ہے آپ روتے کیوں ہیں؟ فرمایا۔ "جہاں مال و دولت کی  
 فراوانی آتی ہے۔ وہاں بغض و حسد بھی آسوتا ہوتا ہے۔ اور قوم کی قوت خانہ جنگی کی نذر  
 ہونے لگتی ہے۔" (تاریخ طبری)

عراق کو مسخر کرنے کے بعد حضرت سعد بن ابی  
 وقاصؓ نے ایرانیوں کے دار السلطنت مدائن  
 میں سکونت اختیار کی۔ ملکی انتظامات اور سرحدوں کی حفاظت کے لئے اسلامی فوجوں کا  
 قیام وہاں ضروری تھا، لیکن ملک کی اب دو عربوں کو اس نہ آئی۔ اس لئے امیر المومنین حضرت



عمر کے حکم سے دو شہر آباد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ وہ دو شہر کوفہ اور بصرہ تھے۔

کوفہ شہر حیرہ کے قریب دریائے فرات کے مغربی کنارے پر واقع تھا۔ بڑا شاداب اور سرسبز ہونے کے علاوہ صحرا سے بھی دور نہ تھا۔ حضرت سعد نے وہاں ایک شاندار مسجد بنانے کا حکم دیا۔ مسجد کے پاس ہی قصبہ سعد کے نام سے حضرت سعد کے لئے مکان تعمیر ہوا۔ مسجد کے ارد گرد فوج کے لئے چھاؤنی بنا کر پالیس ہزار سپاہیوں کو ٹھہرایا گیا۔ بصرہ دریائے فرات کے دہانہ پر شہر ابلہ کے قریب نیلج فارس سے متصل آباد ہوا۔ سب سے پہلے مسجد تعمیر ہوئی۔ پھر دارالامارت بنا۔ پھر فوجی اور شہری محلے آباد ہوئے۔ کوفہ اور بصرہ دونوں شہر اسلامی افواج کے لئے چھاؤنیاں قرار پائے۔ بعد میں یہ شہر اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی علوم و فنون کے مرکز بن گئے۔ بڑے عرصہ تک ان شہروں کو علمی و سیاسی اور شکستہ اہمیت حاصل رہی۔

خوزستان کا علاقہ بصرہ کے قریب شمال مشرق میں واقع تھا۔ یہاں ہرمزان فوجیں لئے بلیٹھا تھا۔ بصرہ کے مسلمانوں کو

## خوزستان

خوزستان کی طرف سے دن رات حد نشہ رہتا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے امیر بصرہ عتبہ بن غزوہ ان کو فوجی کمک بھیجی کہ خوزستان کو زیر کیا جائے۔ ہرمزان اپنی فوجیں لے کر شہر اہوازہ کے قریب فرودکش ہوا۔ اسلامی فوجیں سامنے آئیں۔ تو ہرمزان نے ہتھیار ڈال دیے۔ اور اس شرط پر صلح کر لی کہ اسے حضرت عمرؓ کے پاس بھیجا جائے۔ چنانچہ تھوڑے سے عرصہ میں اہوازہ، سوس، رام ہرمزان، شوش اور سجندی ساہور کے اہم مقامات اسلامی سلطنت میں شامل کر لئے گئے۔ جب مسلمانوں نے خوزستان پر قبضہ کیا تو یزدگرد کو سن کر بڑا افسوس ہوا۔ اسے یہ بات سن کر بڑا صدمہ ہوا کہ اس کا دست راست ہرمزان بھی زیر ہو گیا ہے۔ اس نے سمجھا کہ اب سارا ایران ہاتھ سے گیا۔ چنانچہ ایران کو مسلمانوں سے بچانے کے لئے یزدگرد نے پھر کوشش کی اور تمام چھوٹی بڑی ریاستوں کو ایران کی مدافعت و حفاظت پر اکسایا۔



نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ڈیڑھ لاکھ فوج اسلامی لشکر سے ٹکر لینے کے لئے تیار ہو گئی۔

یہ دگر نے ایران کے مشہور و معروف سپہ سالار  
مردان شاہ کو قائد لشکر بنا کر نہادند بھیجا۔

## فتح نہادند

حضرت عمر کو ایران کی اس تیاری کی خبر ملی۔ تو آپ نے سرحد کی طرف کمک روانہ کی۔  
اور نعمان بن مقرن کو تیس ہزار فوج کا سپہ سالار مقرر کر کے نہادند کی طرف روانہ کیا۔  
جب مسلمان وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایرانی فوج پہلے سے وہاں موجود ہے۔ ایرانیوں نے قلعوں  
میں ٹھکانا کیا قلعوں کے ارد گرد خندقیں کھودی ہیں۔ مسلمان مجبوراً محاصرہ کر کے بٹھکے۔  
ایرانی جب چاہتے طاقت آزمائی کر کے واپس قلعوں میں جاگتے۔ اسلامی فوج ان کی چالوں  
سے تنگ آگئی۔ آخر یہ ترکیب کی کہ ایک دن جب معرکہ چھڑا تو مسلمان سپاہی کا دکھاوا  
کر کے پیچھے ہٹتے گئے۔ ایرانی سمجھے کہ مسلمان ہار کھائے جاتے ہیں۔ وہ آگے بڑھے اور ستم  
یہ کیا کہ اپنے پیچھے لوہے کے بڑے بڑے گھوڑے بچھاتے گئے تاکہ عربوں کو شکست دے بغیر اپنی  
چھاؤنی میں لوٹتے کا نام نہ لیں۔

فرزندانِ توحید نے دیکھا کہ ایرانیوں کا اب سلامت پلٹنا نامکن ہے تو قدم روک  
لئے۔ پھر تلواریں تول کر دشمن پر ٹوٹے اور لاشوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ اس قدر خون بہا  
کر کچھ ہو گیا۔ گھوڑے پھسل پھسل جاتے تھے حضرت نعمان کا گھوڑا پھسلا اور آپ  
زمین پر آ رہے۔ اسی اثنا میں آپ کے ایک تیر لگا۔ اور زخمی ہو گئے۔ آپ کو اُلٹ  
نازک تھی۔ فوج کو خبر نہ گئے دی تاکہ ہد دل نہ پھیلے۔ (تاریخ مسعودی)

ایرانی فوج مسلمانوں سے چار گنا زیادہ تھی لیکن جہ نہ سکی۔ ان کے پاؤں اکھڑ گئے  
مسلمانوں نے پھان تک ان کا تعاقب کیا اور ہزاروں ایرانی ہلاک ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا  
کہ پھر اس مرد مسلمان کے ساتھ کبھی مسلمانوں کے مقابلے میں نہ آسکے۔ اسی لئے عرب مورخین  
اس فتح کو "فتح الفتح" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ (فتح البلدان بلاذری)



حضرت نعمان بن مقرن کا آخری وقت قریب تھا کہ معقل بن یسار آپ کے پاس آئے اور آپ کا منہ دھونے لگے۔ اس حالت میں بھی زبان سے نکلا۔ ”مسلما نوں کا کیا انجام ہوا؟“ جو اب ملا ”خدا نے فتح دی۔“ فرمایا۔ ”الحمد للہ! عمر کو اطلاع دو۔“ یہ مرثوہ سن کر اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

حضرت عمرؓ کو ہمینوں سے بیقراری کے ساتھ جنگ کے نتیجہ کا انتظار تھا۔ نوید ظفر پہنچی تو مسرور ہوئے لیکن جب نعمان کی شہادت کی خبر سنی تو بے اختیار سر پر ہاتھ دھر کر رہنے لگے۔

واقعہ ہمدانہ کے بعد حضرت عمرؓ کو خیالی پیدا ہوا، کہ جب

**ایران پر عام شکر کشی** تک شاہ ایران ملک میں موجود ہے، بغاوت کا فتنہ فرو نہ ہوگا۔ اس بنا پر عام شکر کشی کا ارادہ کیا اور اپنے ہاتھ سے معتقد و علم تیار کر کے مشہور افسروں کو دے اور انہیں خاص خاص علاقوں کی طرف روانہ کیا۔ چنانچہ اس میں یہ سب غازیانِ اسلام مختلف اطراف کی طرف چلے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دو سال ہی میں تمام ایران پر عربوں نے قبضہ کر لیا۔ اصفہان، آذربائیجان، طبرستان کے علاوہ آرمینیا کا ایک حصہ ۲۲ میں فتح ہوا۔ اگلے برس کرمان، سیستان، مکران اور خراسان کو زیر نگین کیا گیا۔

ایران کا آخری تاجدار یزدگرد مزدک کے شہر سے بھاگ کر خاقان دیہ ترکستانی بادشاہوں کا لقب ہے، کے پاس پہنچا خاقان نے اس کی بڑی عزت و تکریم کی اور بھاری فوج لے کر یزدگرد کے ہمراہ خراسان کی طرف بڑھا۔ اس کے مقابلہ پر احنف بن قیس مقرر ہوئے۔ خاقان مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ احنف نے اولین مبارزت میں خاقان کے تین چوٹی کے بہادروں کو ٹھکانے لگا دیا۔ خاقان کی ہمت چھوٹ گئی اور یہ کہہ واپس چلا گیا کہ اس قوم سے لڑنے میں کوئی بھلائی نہیں۔

(تاریخ طبری)

یزدگرد کو خاقان کے واپس جانے کی خبر ملی۔ تو یاس ہو کر خواہ اور خواہرات



ساتھ لے کر ترکستان کا عزم کیا۔ درباریوں نے دیکھا کہ ملک کی دولت ہاتھ سے نکلی جاتی ہے۔ انہوں نے یزدگرد کو روکا وہ نہ مانا۔ چنانچہ درباریوں نے مقابلہ کر کے تمام مال و اسباب چھین لیا۔ یزدگرد بے سر و سامان خاقان کے پاس پہنچا، اور چند سال ترکستان کی خاک چمانے کے بعد عثمانی خلافت میں قتل ہوا۔ تاجدار ایران کے نابود ہوتے ہی ایران کی شورشیں ہمیشہ کے لئے دب گئیں اور وہاں مسلمانوں کی حکومت مستحکم ہو گئی۔

احنف نے بارگاہِ خلافت میں نامہ نوح روانہ کیا۔ حضرت فاروق نے ایک بڑے

اجتماع سے خطاب کیا اور مشورہ جانفزا سنایا۔ آپ نے فرمایا:۔  
 آج مجوسیوں کی سلطنت برباد ہوئی، اور اب وہ اسلام کو کسی طرح نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ لیکن اگر تم بھی صراطِ مستقیم پر قائم نہ رہے تو خدا تم سے بھی حکومت چھین کر دوسروں کو دے دیگا۔ (تاریخ طبری دابن خلدون)

## فتوحاتِ شام

**فتح دمشق** | ببادِ شام میں سے اجنادین بصری اور حمصیے چھوٹے شہر خلافتِ صدیقی میں فتح ہو چکے تھے حضرت عمرؓ نے آرائے خلافت ہوئے تو دمشق محاصرہ کی حالت میں تھا۔ قبصرِ روم نے دمشق کی حفاظت کے لئے بہت بڑی فوج روانہ کی مگر مسلمانوں نے اس لشکر کو بھگا دیا۔ مجاہدین نے شہر کے سب ناکے بند کر دیئے اور کسی طرف سے کمک نہیں آ سکتی تھی۔ محاصرہ پر مشرکوں کو گزر کئے شہر کی تفصیل نہایت مضبوط تھی۔ ایک رات شہر کے اندر بہت شور مچا دیا۔ حضرت خالدؓ کو جاسوسوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ شہر کے کوئی جشن منا رہے ہیں اور شراب پی کر مست ہیں۔ انہوں نے چند جان بازوں کو ساتھ لیا۔ وہ کندھ لگا کر شہر تباہ کی دیوار پر چڑھ کر



شہر کے اندر آتر گئے۔ پھانٹک کے محافظوں کو نشتل کر کے پھاٹک کھول دئے مسلمان باہر  
 منتظر تھے، فوراً اندر داخل ہو گئے۔ اہل شہر اس ناگہانی مصیبت سے گھبرا گئے۔ وہ سیدھے  
 ابو عبیدہ کے پاس پہنچے اور ان سے صلح کی درخواست کی۔ انہیں صورتِ حال کا علم نہ تھا۔ اس لئے  
 صلح قبول کر لی۔ شہر کی ایک سمت سے خالد بن ولید فاتحانہ داخل ہوئے اور دوسری طرف سے  
 ابو عبیدہ مصالحنہ لیکن ابو عبیدہ چونکہ مصالحت کر چکے تھے۔ اس لئے دمشق کی فتح مصالحنہ  
 قرار دی گئی۔ نہ مالِ غنیمت لوٹا گیا۔ نہ کسی کو لوندی غلام بنایا گیا۔ (تاریخ طبری)

فتح دمشق سے فارغ ہو کر مسلمانوں نے شہر حبیش بن حسنہ کی قیادت میں فحل کے مقام  
 پر حملہ کر دیا۔ دو روز کی جنگ کے بعد مسلمان شہر پر قابض ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت ابو عبیدہ  
 اور خالد بن ولید نے حمص کی طرف پیش قدمی کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ پھر لاذقیہ، حلب،  
 انطاکیہ وغیرہ شہروں کو زیرِ نگیں کر کے اردن کے تمام علاقے قبضہ میں کر لئے۔

مشق کی فتح کے بعد قیصر روم نے شام کو بچانے کی پوری  
 کوشش شروع کر دی۔ اور سلطنت کے دورِ دراز

## جنگِ زموکِ شاہ

مقامات سے فوجیں طلب کیں، اس نے دو لاکھ فوج انطاکیہ کے مقام پر اکٹھی کر لی۔ اور خود بھی  
 مقیم ہو گیا حضرت ابو عبیدہ نے اپنے چھوٹے چھوٹے دستے جو حضرت خالد بن ولید اور عمرو بن  
 العاص کی سرکردگی میں شام کے مختلف علاقوں کو فتح کرنے کے لئے گئے تھے واپس بلا لئے۔ اور  
 دمشق، فحل، حمص اور دیگر شہروں کو خالی کر دیا گیا۔ آپ نے حکم دیا کہ جن شہروں سے چیزیں  
 لیا گیا ہے۔ انہیں واپس کیا جائے۔ اب ہم ان کی حفاظت سے قاصر ہیں، اس لئے چیزیں  
 کے حقدار نہیں۔ شام کے عیسائیوں نے یہ انصاف آج تک اپنے ہم مذہب رومی حاکموں  
 میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ فرزندِ انِ توحید کے اخلاقی تقدس پر شکر رہ گئے۔ حمص کے لوگوں  
 نے کہا۔ کہ تمہاری عادلانہ حکومت ہمیں رومیوں کی ظالمانہ حکومت سے عزیز تر ہے۔ ہم رومی  
 فوجوں کا مقابلہ کریں گے۔ یہود نے کہا۔ کہ جب تک ہم میں سکت ہے۔ رومی حمص میں قدم



(فتوح البلدان بلاذری)

نہیں رکھ سکتے۔

حضرت عمرؓ کو مفتوحہ مقامات سے مسلمانوں کے بہت آنے کی خبر ملی، تو پہلے وہ بہت رنجیدہ ہوئے لیکن جب معلوم ہوا کہ تمام انسروں کی رائے یہی تھی، تو تسلی ہو گئی اور فرمایا: "خدا کی اسی میں مصالحت ہوگی۔" سعید بن عامر کو ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ مدد کے لئے روانہ کیا اور قاصد کو ہدایت کی کہ خود ایک ایک صف میں جا کر زبانی یہ پیغام پہنچانا۔

"اے برادران اسلام! عمر نے سلام کے بعد تم کو یہ پیغام دیا ہے کہ پوری سرگرمی کے ساتھ جنگ کرو۔ اور دشمنوں پر پیشروں کی طرح اس طرح حملہ کرو کہ وہ تمہیں چوڑائیوں کی طرح حقیر معلوم ہوں۔ ہم کہ یقین کامل ہے کہ خدا کی نصرت تمہارے ساتھ ہے، اور آخر فتح تمہارے ہاتھ ہے۔"

شام کے جنوبی صوبہ اردن میں یرموک نامی ایک ندی ہے۔ حضرت ابو عبیدہؓ دمشق سے ہوتے ہوئے یہاں پہنچے۔ باقی اسلامی عساکر بھی یہیں آکر فروکش ہوئے۔ رومیوں کی تعداد دو لاکھ تھی۔ اس کے مقابلہ میں مسلمان صرف تیس تیس ہزار تھے لیکن سب کے سب یگانہ روزگار تھے۔ اس فوج کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں قریباً ایک ہزار صحابہ تھے۔ سترہ تھے جو غزہ بدر میں آنحضرتؐ کے ہمراہ تھے۔ لشکر کی قلت دیکھ کر حضرت ابو عبیدہؓ نے مزید مدد مانگی مگر وقت تنگ تھا حضرت عمرؓ رعانت نہ کر سکے حضرت ابو عبیدہؓ کو خط لکھا کہ خدا کی مدد طلب کرو۔ بدر کے غازی اس سے بھی قلیل تھے۔ (مسند احمد جلد اول حدیث نمبر ۳۴۴)

یرموک کا پہلا معرکہ بنی قریظہ ہوا۔ پانچویں رجب ۵ھ کو دوسرا معرکہ پیش آیا۔ رومیوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ تیس ہزار آدمیوں نے پاؤں میں بیڑیاں پہن لی تھیں کہ بھاگنے کا خیال نہ آئے۔ ہزاروں پادری ہتھیروں میں صلیب لئے آگے آگے تھے اور حضرت علیؓ کا نام لے کر جوش دلاتے تھے۔ رومیوں کا لشکر آگے بڑھا تو ایک مسلم سپاہی کہہ اٹھا: "کتنا بڑا لشکر ہے۔" حضرت خالدؓ نے سن لیا۔ فرمایا: "رومی کتنے تھوڑے اور مسلمان کس قدر زیادہ ہیں۔ فوجوں کی کثرت،



فصرتِ ربانی سے ہوتی ہے، "اسلامی فوج کے پیچھے ایک بہت بڑا ٹیلہ تھا۔ حضرت خالد نے عورتوں کو اس پر کھڑا کر دیا۔ اور کہا کہ خیموں کی چوبیس تھام لو اور پتھر سامنے ڈھیر کر لو۔ جو میدان سے منہ موڑے اس کی خبر چوبیسوں اور پتھروں سے لو۔ (فتوح الشام واقعہ)

گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی۔ کچھ ذریعہ برابر رہا۔ پھر رومیوں نے زور کیا۔ عربوں کو دھکیل کر ان کی خیمہ گاہ تک لے گئے۔ مسلمان عورتیں ڈنڈے لے کر ان پر پھینکیں۔ سپاہیوں کو غیرت آئی اور پلٹ کر دشمن پر ایسے گرے کہ صفیں الٹ دیں۔ دخترانِ اسلام نے اس روز جس حسرت اور دینی جوش کا مظاہرہ کیا وہ ملت کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ مردوں کو پکار پکار کر جہاد پر ابھارتی تھیں۔ حضرت ابوسفیانؓ کی بیوی ہندکن سالی کے باوجود میدانِ جہاد میں موجود تھی اور رجز پر لڑ رہی تھی۔ بعض عورتیں تلواریں سونت کر دشمن پر ٹوٹ پڑیں۔ ہندکن بیٹی جو یہی نے اپنے شوہر کے شانہ بشانہ شمشیر زنی کی (فتوح البلدان بلاذری و تاریخ طبری)

حضرت ابوسفیانؓ اس معرکہ میں شامل تھے۔ جنگ میں بھی حصہ لیا۔ بہادرانِ اسلام کو جوش دلاتے پھرتے تھے۔ ان کی ایک آنکھ طائف کے معرکہ میں کھوئی تھی دوسری اس معرکہ کی نذر ہو گئی۔ ابو ہریرہؓ بھی شامل شکر تھے۔ ان کی لہکار رہ رہ کہ دونوں کو گر ماتی تھی۔ (فتوح البلدان و عارف بن قیس) حضرت عکرمہؓ بن ابی جہل نے چار سو آدمیوں سے بیعت لی تھی کہ مرتے مر جائیں گے لیکن دشمن کو پشت نہیں دکھائیں گے۔ اس کے بعد دشمن کے قلب میں ایسے گھسے کہ فقط ایک آدمی زندہ بچا۔ حباش بن تیسبہ نے کئی رومیوں کو فنا کیا۔ جنگ کے دوران ان کا ایک پاؤں کٹ کر کہیں گہ گیا۔ انہیں جبر نہ ہونے کی وجہ سے جلا۔ بڑی لڑائی ہوئی۔ لیکن انجام کار مسلمانوں کی ثابت قدمی اور پامردی کے آگے رومیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ان کی ایک لاکھ سے زیادہ لاشیں میدانِ جنگ قریبی جنگلوں اور میدانوں میں بکھری پڑی تھیں۔ ان کا سپہ سالار و یا مان مارا گیا۔ چالیس ہزار عیسائی گرفتار ہوئے۔ کل تین ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ تبصر کہ اس ہزیمت کی خبر ملی تو حضرت وائسوس کے ساتھ ملک شام کو الوداع کہہ کر قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ نتیجہ جنگ کے



انتظار میں حضرت عمرؓ کی نیند اڑ گئی تھی۔ مشرودہ فتح سنا تو اسی وقت سجدہ میں گر کر خدا کا شکر ادا کیا۔  
 (فتوح البلدان بلاذری)

فتح یرموک کے بعد اسلامی فوجیں اطراف ملک میں پھیل گئیں اور سارے شام کو زیر نگین کر لیا۔ انطاکیہ تک کا علاقہ لے لیا۔ یہ شام کا سب سے بڑا شہر تھا اور لب ساحل واقع تھا۔

اسے یرشلیم بھی کہتے ہیں۔ اس کا قدیم نام ایلیاد بھی ہے۔ یہ شہر فلسطین کا صدر مقام تھا۔ اس کو قبضہ میں

### بیت المقدس ۱۶

لے بغیر شام کی تسخیر مکمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے فاروق اعظمؓ کے حکم سے ابو عبیدہؓ نے اس پر فوج کشی کر دی۔ عیسائی شہر میں محصور ہو کر بیٹھ گئے۔ کچھ عرصہ بعد محصورین نے یہ خواہش ظاہر کی کہ امیر المؤمنین خود یہاں آکر اپنے ہاتھ سے معاہدہ لکھیں تو ہم شہر حملے کرنے کو تیار ہیں۔ انہیں حضرت عمرؓ سے انتہائی شفقت کی توقع تھی۔ حضرت عمرؓ نے اکابر صحابہ سے مشورہ کر کے حضرت علیؓ کو نائب مقرر کیا۔ اور ماہِ رجب ۱۶ء میں مدینہ سے روانہ ہوئے۔ (تاریخ طبری)

حضرت عمرؓ کا یہ سفر نہایت سادگی سے طے ہوا۔ ایک عنقر سا گروہ ساتھ لیا۔ جانبیہ کے مقام پر فوجوں

### بیت المقدس کا سفر

نے استقبال کیا۔ جانبیہ ہی میں بیت المقدس کا وفد آیا۔ ان سے مہم کوئی جزویہ پر صلح نامہ طے ہوا۔ شرائط یہ تھیں کہ شہر والوں کو جان و مال کی امان دی جاتی ہے۔ ان کے گرجے اور صلیبیں محفوظ رہیں گی۔ انہیں تبدیل مذہب پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ جو لوگ بیت المقدس سے باہر جانا چاہیں۔ ان کو ہر طرح کا امن و امان حاصل ہوگا۔ (صحیح مسلم و ترمذی)

حضرت عمرؓ کا لباس کم قیمت اور پرانا تھا۔ آپ کو عمدہ پوشاک پیش کی گئی۔ تاکہ انھیادے پیسے رعیبی نہ ہو۔ آپ نے حجاب و یا ہمارے لئے اسلام کا رعب کافی ہے۔ حضرت عمرؓ بیت المقدس کی طرف روانہ ہوئے تو دیکھا کہ گھوڑا سمٹوں کے گھس جانے کے باعث مشکل سے چلتا ہے۔ آپ نے اونٹ کی سواری لے لی۔ بیت المقدس کے قریب پہنچے، تو آپ کو ایک نر کی گھوڑا



پیش کیا گیا۔ اور اونٹ کی سواری کو آپ کے شایان شان نہ سمجھا گیا۔ آپ گھوڑے پر سوار ہوئے۔  
وہ شوخی کی چال چلا۔ آپ اتر پڑے اور فرمایا۔ "میں ڈرتا ہوں۔ کہ اس کی چال مجھ میں غرور پیدا  
کر دے۔" (تاریخ طبری)

پادریوں نے آپ کو شہر کی سیر کرائی۔ ایک گرجا میں تھے کہ نماز کا وقت آ گیا۔ عیسائیوں نے  
گرجا میں نماز پڑھنے کی اجازت دی۔ آپ نے فرمایا "میں گرجا میں نماز پڑھوں تو مسلمانوں کو  
نظیر مل جائے گی۔ یہاں وہ غیر مسلم رعایا کے عبادت گاہوں کو مسجدیں بنانے لگیں۔ چنانچہ گرجا  
سے باہر نکل کر نماز پڑھی۔" (فتوح البلدان بلاذری ص ۱۴۷)

ایک دن سوزن رسول حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ اذان دیجئے۔ انہوں نے  
اذان دی۔ "تر حیات نبوی کا سماں آنکھوں میں پھر گیا۔ حاضرین رقت سے لبریز ہو گئے۔ اور  
دیر تک اشکبار رہے۔" (فتوح الشام از وی)

فتوحاتِ شام کے واقعات میں حضرت خالد  
کی سبکدوشی ایک اہم واقعہ ہے۔ حضرت

## حضرت خالد بن ولیدؓ

خالد بن ولیدؓ میں معزول کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ ایک بہترین فوجی سپہ سالار  
ہونے کے ساتھ کسی حد تک خود راستے بھی تھے۔ جنگی سرگرمیوں کے سلسلہ میں جو اخراجات ہوتے  
تھے وہ ان کا باقاعدہ حساب دربارہ خلافت کو نہیں بھیجتے تھے۔ کئی بار حضرت عمرؓ نے انہیں  
تاکید کی لیکن انہوں نے یہ جواب دیا کہ میں حضرت ابو بکرؓ کے زمانے سے ایسا ہی کرتا آ رہا ہوں۔  
یہ امر واقعہ بھی ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ جنگی معاملات میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے لیکن یہ ضروری نہیں  
کہ وہ مالی معاملات کے بھی ماہر ہوں۔ دوسری طرف حضرت عمرؓ نے یہ برداشت نہ کر سکتے تھے کہ بیت المال  
کی رقم بلا حساب کتاب خرچ ہوتی رہے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو لکھ دیا کہ تم  
اسی شرط پر سپہ سالار رہ سکتے ہو کہ فوج کے مصارف کا حساب ہمیشہ بھیجتے رہو۔ حضرت خالدؓ  
نے یہ شرط نامنظور کر دی۔ تاہم حضرت عمرؓ نے انہیں معزول نہیں کیا بلکہ حضرت ابو بکرؓ کے



ما تحت کر دیا۔

(اصابہ جلد دوم ص ۹۹)

کاتبہ میں حضرت خالد بن ولید نے ایک شاعر کو دس ہزار دہم انعام میں دیکھے حضرت عمرؓ نے ان سے باز پرس کی۔ اور حضرت ابو عبیدہؓ کو لکھا کہ اگر خالدؓ نے یہ انعام اپنے پاس سے دیا تھا، تو اسراف ہے۔ اور اگر بیت المال سے دیا تو خیانت۔ دونوں حالتوں میں وہ معزولی کے قابل ہیں۔ آپ نے ابو عبیدہؓ کو لکھا کہ خالدؓ کو بلا کر اس کا جواب طلب کریں۔ ابو عبیدہؓ نے حکم کی تعمیل کی۔ سب لوگوں کے سامنے قاصد نے حضرت خالدؓ سے جواب طلب کیا وہ خاموش رہے۔ حضرت بلالؓ اٹھے، اور کہا کہ ہمیں حضرت عمرؓ کے حکم پر پورا اکل کرنا ہے۔ خالدؓ کی ٹوپی اتاری اور ان کی پگڑی گلے میں ڈال کر گنتا کر لیا۔ پھر پوچھا ماں کہاں سے دی ہے؟ بڑے "جیب سے" اب چھوڑ دیا۔ اور اپنے ہاتھ سے پگڑی بندھالی کس قدر عبرت انگیز اور صبر آریا سزا تھی۔ مگر کیا مجال کہ تاریخ اسلام کے غازی اعظمؓ کی اطاعت میں فرق آیا ہو۔ آج وہ مجاہد اعظم اور فاتح ایران و شام، جس کی لہزہ فگن شخصیت نے قبصر و کسریٰ کے غرور کو خاک میں ملا دیا تھا۔

نظم و ضبط اسلام کے آگے بے بس اور دبدبہ فاروقی کے آگے ٹہر گیا تھا۔

حضرت خالدؓ حضرت عمرؓ کے حکم سے ان کے پاس مدینہ پہنچے اور عرض کیا کہ آپ نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے آپ کو کسی ناراضگی یا خیانت کی وجہ سے معزول نہیں کیا ہے۔ آپ کے کارناموں کی وجہ سے لوگ فتنے میں مبتلا ہو رہے تھے اس لئے میں نے معزول کر دیا تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے (تاریخ طبرستان) حضرت خالدؓ نے خلافت فاروقی کے آٹھویں برس تمص میں بیمار رہ کر وفات پائی۔ آپ نے اتنی جہلیں بڑی تھیں کہ جسم کا کوئی حصہ زخموں کے نشانات سے خالی نہ تھا مگر شہادت کی آرزو بہ نہ آئی۔

حضرت فاروقؓ کی خلافت کے پانچویں سال ۳۱ھ میں مدینہ اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ محوط کی لپیٹ میں آ گیا۔ بادشہ نہ ہوئی

مختصر ۱۸



زمین خشک ہو گئی۔ چشمتے سوکھ گئے۔ انسان و حیوان بھوک پیاس کی شدت سے مرنے لگے۔ اکثر لوگ دیہات سے مدینہ آ گئے۔ بئشہر کے چاروں طرف خیموں کا جنگل لگ گیا۔ آپ نے سرکاری گودام کھول دیے۔ باہر سے غلہ منگوانے کے فوری انتظامات کئے۔ آپ اپنے ہاتھ سے غلہ تقسیم کرتے تھے قحط کے ایام میں اس قدر فکر مند رہتے تھے کہ لوگ خیال کرنے لگے، اگر قحط جلدی نہ ہوتا تو آپ اس کے غم میں جان دے دیں گے۔ خود بھوکے رہتے تھے فرمایا کرتے تھے: "اگر میرا پیٹ بھر جائے تو اردوں کی تکلیف کا احساس کیونکر ہو گا۔ قسم کھالی کہ جب تک لوگوں کو سیر ہو کر کھانا نہ ملے گا گھسی اور دوند نہ چکھوں گا۔ باہر سے غلہ آیا تو قحط سال کے آثار دور ہوئے۔" (ابن جوزی)

۱۸۔ میں شام میں نہایت سخت طاعون پھیلایا جو پچاس ہزار مسلمانوں کے لئے جان لیوا ثابت

## طاعون عمواس ۱۸ھ

ہوا۔ (ظہری) بڑے بڑے نامور صحابہ نے وفات پائی، حضرت عمرؓ نے انتظامات کے لئے بذات خود شام پہنچے۔ مگر سرخ کے مقام سے بمشورہ صحابہ لوٹ آئے۔ حضرت ابو عبیدہؓ کو بھی واپس بلا لیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ جو قسمت میں لکھا ہے ہو کر رہے گا میں مسلمانوں کو چھوڑ کر نہیں آسکتا۔ حضرت عمرؓ نے یہ خط پڑھ کر رونے لگے اور ابو عبیدہؓ کو دوبارہ لکھا کہ اگر تم نہیں آتے تو فوجوں کو مرطوب مقامات سے ہٹا دو۔ اس حکم پر وہ جاہلیہ چلے آئے۔ جہاں کی آب و ہوا بہت عمدہ تھی۔ مگر ان پر وبا کا اثر ہو چکا تھا۔ اس لئے جاہلیہ آنے کے بعد طاعون میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئے۔ انتقال سے پہلے حضرت معاذ بن جبلؓ کو اپنا جانشین بنا گئے۔ انہوں نے بھی وفات پائی۔ حضرت معاذؓ نے عمرؓ بن العاصؓ کو اپنا قائم مقام بنایا تھا۔ حضرت عمرؓ بن العاصؓ نے فوجوں کو پہاڑی مقامات پر بھیج دیا۔

اس وبا میں ہزاروں عورتیں بیوہ اور ہزاروں بچے یتیم ہو گئے۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے انتظامات کے لئے دوبارہ شام کا سفر کیا اور اکثر اضلاع کا دورہ کر کے مناسب انتظامات کئے۔ فوجوں میں روپیہ تقسیم کیا۔ مہرم مسلمانوں کے وارثوں کو ان کا ترکہ دلایا۔ فوج میں جو بچے



خالی ہو گئی تھیں۔ ان پر نئے عہدہ دار مقرر کئے ان انتظامات سے فارغ ہو کر مدینہ واپس آئے۔ رطلہ کے گرد زجاج میں عمود اس نامی ایک گاؤں تھا۔ وہاں سے دبا پھوٹی اور سارے شام پر محیط ہو گئی۔ اس لئے تاریخ میں اس کو طاعونِ عمود اس کہا جاتا ہے۔ (تاریخ یعقوبی جلد ۲ ص ۱۷۷)

ساتویں صدی عیسوی میں جب مسلمانوں نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ تو بیت المقدس اور شام کی طرح مصر بھی رومیوں کے قبضہ میں تھا۔ وہاں کے باشندے قبطی کہلاتے تھے یہ مذہباً عیسائی تھے۔ ان پر قیصر روم کی طرف سے ایک مصری نائب مقرر ہوتا تھا۔ جسے مقوقس کہتے تھے قبطیوں کے ساتھ رومیوں کا سلوک اچھا نہ تھا۔

## فتح مصر ۶۴۰ھ

۱۔ شام کے زیر نگیں ہونے کے بعد اس کے قریب تک مصر پر فوج کشی ہوئی۔ اس کی فتح کا سہرا تمام تر حضرت عمرؓ بن العاص کے سر ہے۔ ظہورِ اسلام سے قبل وہ تجارت کے سلسلہ میں اکثر بصرہ آیا جاتا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں مصر کی شادابی اور زرخیزی ان کی نگاہ میں تھی۔

## حملہ کے اسباب

۲۔ دوسرا محرک یہ تھا۔ کہ مصر کی قبطی حکومت قیصر روم کے ماتحت تھی اور رومیوں کا اس پر پورا اثر تھا۔ وہ نہایت آسانی کے ساتھ قبطیوں کے ذریعہ شام میں شورش پا کر آسکتے تھے۔ اس لئے شام کی حفاظت کے لئے مصر پر قبضہ کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ شام کی فتح کے بعد عمرؓ بن العاص نے حضرت عمرؓ سے مصر پر فوج کشی کی اجازت مانگی۔ آپ نے احتیاط کے نکتہ خیال سے انکار کر دیا۔ لیکن حضرت عمرؓ بن العاص کے پیہم اصرار پر یہ فرمانہ ہو گئے اور چار ہزار سپاہ ان کے ساتھ روانہ کر دی۔

۳۔ تیسری وجہ یہ تھی۔ کہ رومی سردار اطروبن فلسطین سے بہانہ کہہ کر حملہ کیا تھا اور وہاں اپنی طاقت بڑھا رہا تھا۔

۴۔ قیصر روم مصر کی راہ سے شام پر حملہ کی تیاریاں کر رہا تھا۔



۵۔ مصر پر رومیوں کا غاصبانہ قبضہ تھا۔ انہوں نے اہل مصر کو غلامی کے نسلکچہ میں جکڑ رکھا تھا۔ مصر کو رومیوں سے چھین لینے کا خرد وہاں کے باشندوں کو یہ فائدہ پہنچتا کہ ظالم حکمرانوں سے نجات پا جاتے۔

۶۔ یہ بات پرشیدہ نہ تھی کہ مصر والے رومیوں کو ناپسند کرتے تھے۔ اسلامی حملہ کی صورت میں ان سے یہ توقع تھی کہ مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ بعد کے حالات نے فارخ مصر عمرو بن العاص کے اس اندازہ کو صحیح ثابت کر دیا۔ کہ اہل مصر نہایت آسانی سے مغلوب ہو جائیں گے۔

## فسطاط کی فتح

عمرو بن العاص نے چار ہزار کالٹ کرے کر لیا۔ یہ مصر پر فوج کشی کی لہر عیش کے راستہ سے فرمایا۔ یہاں کی رومی فوجوں نے روکا۔ عمرو بن العاص نے انہیں شکست دی اور آگے بڑھ کر بلقیس اور دیگر مقامات فتح کرنے ہوئے فسطاط پہنچے۔ فسطاط اس زمانے میں غیر آباد تھا۔ لیکن یہاں حکومت مصر کا ایک مضبوط قلعہ تھا جس میں مصری فوجیں رہا کرتی تھیں۔ عمرو بن العاص نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ نہایت مضبوط تھا۔ مصریوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اس لئے عمرو بن العاص نے دار الخلافہ سے مزید امدادی فوجیں طلب کیں۔ حضرت زبیر بن عوام اور حذیفہ صحابہ کو دس ہزار فوج دے کر بھیجا۔ کابل سات ماہ تک قلعہ کا محاصرہ جاری رہا مگر کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ حضرت زبیر بن عوام نے بہت کر کے قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئے۔ بعض صحابہ نے ان کا ساتھ دیا۔ فصیل پر پہنچ کر ان دنوں نے اس زور سے تکبیر کا نعرہ لگایا کہ عیسائی یہ سمجھ کر کہ مسلمان قلعہ میں گھس گئے بدحواس ہو کر قلعہ سے باہر نکلے۔ حضرت زبیر بن عوام نے قلعہ میں اتر کر پچانک کھول دیا اور اسلامی فوج اندر داخل ہو گئی۔ یہ صورت دیکھ کر مشفقہ قس نے صلح کر لی۔ قیصر کو اس مصالحت کی خبر ہوئی۔ تو اس نے مقوقس کو لکھ بھیجا کہ اگر تم مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے تو رومیوں کی تعداد کیا کم تھی۔ قیصر روم نے اسی وقت قسطنطنیہ سے ایک لشکر لے کر اسکو یہ روانہ کیا۔

## فتح اسکندریہ

اس شہر کو سکندر اعظم نے بسایا تھا۔ یہ عیسائیوں کا مرکز تھا۔



یہاں عظیم ترین گریبے اور مذہبی یاوگاریں تھیں۔ قیصر روم خود آنا چاہتا تھا۔ مگر اچانک مر گیا۔  
 حضرت عمرؓ بن العاص کے ساتھ کچھ قبلی رئیس بھی شامل ہو گئے۔ مصر کے لوگ رومی مظالم سے بہت  
 نالاں تھے۔ اسکندریہ تک مسلمان آسانی سے بڑھے مگر اس کے مضافات میں پہنچ کر سخت مقابلہ  
 کرنا پڑا۔ آگے بڑھ کر مسلمانوں نے اسکندریہ کا محاصرہ کر لیا۔ ایک طویل مدت اسی حالت میں  
 گذر گئی۔ دشمن کی فوج کبھی کبھی نکل کر حملہ آور ہوتی رہتی تھی۔ محاصرہ کی طوالت سے حضرت عمرؓ  
 کو بڑی تسمت لیش ہوئی۔ انہوں نے عمرو بن العاص کو خط لکھا۔ ”معلوم ہوتا ہے مصر نیکی کے قیام  
 سے تم لوگ عیسائیوں کی طرح عیش و عشرت میں پڑ گئے ہو۔ ورنہ فتح میں اتنی دیر نہ ہوتی۔ میرا یہ  
 خط پہنچتے ہی متفقہ حملہ کرو۔“ اس خط کے آنے پر عمرو بن العاص نے فوج کے سامنے جہاد کے  
 فضائل بیان کئے۔ عبادہ بن صامت نے کہ سپہ سالار بنا کر جمعہ کے روز قلعہ پر اس زور سے  
 حملہ کیا کہ اسکندریہ فتح ہو گیا۔ حضرت عمرو بن العاص نے حضرت عمرؓ کو فتح کی اطلاع بھجوا  
 دی۔ اسکندریہ مصر کی کنجی تھا۔ باقی مصر پر آسانی سے قبضہ ہو گیا۔ مدعی سامراج کا جنازہ  
 وادی نیل سے نکل گیا۔  
 (خط مقررہ جلد اول و فتوح البلدان بلاذری)

## فتح طرابلس

تسخیر مصر کے بعد حضرت عمرو بن العاص نے مغرب کی طرف  
 پیش قدمی کرتے ہوئے طرابلس کے مشہور مقام برقہ پر

قبضہ کر لیا۔ پھر وہاں سے طرابلس کے مشہور قلعے کو فتح کیا۔

## مسلمانوں کی فتوحات کے اسباب

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مسلمانوں کو ایران و روم کی سلطنت کے  
 خلاف بڑی شاندار فتوحات حاصل ہوئیں۔ ان فتوحات کی وسعت اور تیز رفتاری واقعی حیرت  
 میں ڈال دیتی ہے۔ عرب کے بے سرد سامان لوگوں کا اس قدر قلیل مدت میں روم و ایران کی



سلطنتوں کو تہ و باہا کر دینا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یورپین موزخین نے مسلمانوں کی فتح کا صرف یہ سبب بیان کیا ہے کہ یہ دونوں سلطنتیں اندرونی جھگڑوں کے باعث بہت کمزور ہو گئی تھیں اس لئے مسلمانوں نے ان کو فتح کر لیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں سلطنتیں مسلمانوں کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ طاقتور تھیں۔ ایران اور رومی جس طرح میدان جنگ میں اپنی مسلح اور تربیت یافتہ ہڈیوں کو فرجوں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں لائے اس سے ان کی طاقت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ جب ان سلطنتوں کے لئے صرف ایک معرکہ میں دو یا تھائی لاکھ فرج لانا کچھ مشکل نہ تھا۔ وہاں مسلمان کسی معرکہ میں تیس یا چالیس ہزار سے زیادہ فرج مقابلہ میں نہ لاسکتے۔ اور ان کے لئے بھی سامان جنگ اور رسد کا معقول بندوبست ان کے پاس نہ تھا۔ دراصل مسلمان ان پر پادوی اسباب سے نہیں، بلکہ روحانی اور اخلاقی قوت کی بنا پر بلا دہستی حاصل کر سکے۔ مسلمانوں کی فتح کے مندرجہ ذیل اسباب قرار دئے جاسکتے ہیں:-

۱۔ مسلمانوں کی فتح کا سب سے بڑا سبب ان کا جذبہ ایمان تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا ان کا سب سے بڑا فریضہ ہے اور اسلام کے نام پر جان قربان کرنا سب سے کامیاب زندگی ہے۔ فتح کی صورت میں نمازی اور موت کی صورت میں شہید ہونا ہر مسلمان کی سب سے بڑی آرزو تھی۔

۲۔ اسلام نے مسلمانوں میں بلند اخلاق پیدا کر دیا تھا۔ ان میں عزم و استقامت، راستبازی اور انصاف پسندی کا جذبہ موجود تھا۔ وہ اپنے اشراق سے مفترحہ علاقے کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔

۳۔ مسلمانوں کے اندر بلا کا اتحاد اور تنظیم موجود تھی۔ اس کے باعث ان کی قوت میں بڑا اضافہ ہو گیا تھا۔ عرب قبائل متحد ہو کر بڑی قوت بن گئے تھے جن کا مقابلہ کرنا ایرانیوں اور رومیوں کے بس کی بات نہ تھی۔



۴- ابتدا میں جن علاقوں پر مسلمانوں نے حملے کیے وہاں عرب آباد تھے۔ اگرچہ وہ روم یا ایران کے باجگزار تھے۔ مگر عرب قومیت کے بیدار ہوتے ہی وہ مسلمانوں سے مل گئے۔ مصر کے قبطی اگرچہ عرب نہ تھے۔ تاہم وہ یونانیوں کی بدسلوکی سے پریشان تھے۔ اس لئے مسلمانوں کے مہنوا بن گئے۔

۵- مسلمانوں کے سپہ سالار بڑے بلند پایہ اور بلند کردار کے لوگ تھے۔ خالد بن ولید، ابو عبیدہ بن الجراحؓ، سعد بن ابی وقاصؓ اور عمرؓ بن العاص بڑے قابل جرنیل تھے۔ جن کا مقابلہ کوئی رومی یا ایرانی نہیں کر سکتا تھا۔ ہمیشہ فتح و کامرانی ان کے قدم چومتی رہی۔

۶- اس دور کی فتوحات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی نمایاں حصہ تھا۔ انھوں نے نہ صرف مسلمانوں میں جہاد کا جوش پیدا کر دیا تھا۔ بلکہ تمام فوج کا نظم و نسق اور نقل و حرکت بھی اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ اور مدینہ میں بیٹھ کر اپنے احکام سے فوجی مہمات کی راہنمائی کرتے تھے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک جمعہ کے خطبہ میں فرمایا۔ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک مرنے والے میرے

## شہادتِ سلام

بدن پر تین چوٹیں ماری ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرا وقت قریب آ گیا ہے اس خطبہ کے چند روز پہلے ایک نازی غلام فیروز نامی کے ہاتھوں آپ کے خواب کی تعبیر ظہور میں آئی۔ فیروز، حضرت سعید بن مسعود کا غلام تھا۔ اس کی کنیت ابو کؤر کؤر تھی۔ مذہباً مجوسی یا عیسائی تھا۔ نہادند کا رہنے والا تھا۔ رومیوں کے پاس اسیر ہو کر گیا تھا۔ وہاں سے مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ حضرت عمرؓ کسی عجمی کو مدینہ میں رہنے نہیں دیتے تھے۔ لیکن اس شخص کو اس کی کارگیری کی وجہ سے رہنے دیا۔ فیروز کا دل حضرت عمرؓ کے خلاف کینہ سے بھر رہا تھا۔ نہادند کی جنگ سے جب قیدی مدینہ میں آئے، تو ایک ایک لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرتا اور رو کر کہتا تھا کہ عمرؓ نے میرا کلیجہ کھا لیا ہے۔

(تاریخ طبری۔ البدایہ والنہایہ)



مذکورہ جمعہ کے دوسرے روز اس کی حضرت عمرؓ کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ اس نے شکایت کی کہ میرا آقا مجھ سے محصول زیادہ لیتا ہے۔ آپ نے مقدار پوچھی، تو اس نے دو درہم بتائے۔ پوچھا: کیا کام کرتے ہو؟ کہا: ”بڑھئی لگا اور نقاشی ہوں۔“ فرمایا: ”تمہارے پیشہ کے لحاظ سے یہ رقم زیادہ نہیں۔“ فیروز جانے لگا، تو آپ نے فرمایا: ”سنا ہے۔ تم ہو اسے چلنے والی چکی بہت اچھی بنا سکتے ہو۔ ایسی ایک چکی میرے لئے تیار کر دو۔“ اس نے کہا: ”بہتر ایک ایسی چکی بناؤں گا جس کا ذکر شرق سے سزپ ہوگا۔“ آپ سمجھ گئے۔ کہ یہ قتل کی دھمکی ہے۔ لیکن اتنا دھیان نہ دیا۔ چار روز بعد بڑھ کے دن حضرت عمرؓ نماز فجر کی امامت کے لئے کھڑے ہوئے۔ تو اچانک فیروز نے پیچھے سے نکل کر آپ پر خنجر سے پے درپے وار کئے۔ ایک زیر ناف لگا۔ آپ نے کہا: ”عبدالرحمن بن عوف نہ نماز پڑھا ہیں۔ خود خون میں لٹنے لگے۔“ اسی عالم میں نماز ہوئی۔ فیروز بھاگ نکلا۔ نماز کے بعد اس کا تعاقب ہوا۔ اس نے تیرہ آدمی زخمی کر ڈئے جن میں سے چھ شہید ہو گئے۔ آخر ایک شخص نے کبل ڈال کر بکڑا۔ اس نے خنجر اپنے پیٹ میں گاڑ لیا اور مر گیا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا: کہ میرا قاتل کون تھا؟ بیٹے نے بتایا۔ کہ فیروز تھا۔ فرمایا: ”الحمد للہ! میرا قاتل ایسا شخص نہیں جس نے خدا کو ایک بھی سجدہ کیا ہو۔“

(تاریخ طبری۔ ابن اثیر۔ ابن جوزی)

زخم نہایت کاری تھا پھنے کی کوئی امید نہ تھی۔ آپ کو اتنے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دفن ہونے کی بڑی تمنا تھی۔ اس لئے اپنے بیٹے حضرت عبداللہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس حجرہ نبوی میں دفن ہونے کی اجازت حاصل کرنے کے لئے بھیجا۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا یہ جگہ میں نے اپنے لئے محفوظ رکھی تھی۔ میں عمرؓ کو ترجیح دوں گی۔“

عبداللہؓ واپس آئے۔ آپ نے پوچھا: ”یہ جواب دے: عرض کیا۔“ جو آپ چاہتے تھے۔“ فرمایا: ”نہ سے بڑی آرزو یہی تھی:“ (مسند رب حاکم جلد ۲ ص ۹۱)

وفات | ضروری وصیتوں کے بعد زخمی ہونے کے تیسرے روز یکم محرم ۲۳ھ



ہفتہ کے دن اس دنیا کو خیر باد کہا۔ اقوار کو دفن ہوئے۔ عمر تریسٹھ سال سے کچھ زائد تھی۔  
مدتِ خلافت دس برس اور قریباً چھ ماہ ہے۔ وصیت کے مطابق حضرت صہیب رضی اللہ عنہ  
نے نماز جنازہ پڑھائی۔

اپنے مختلف اوقات میں چھ شادیاں کیں۔ اولیٰ کے عبداللہ  
عبداللہ - عائشہ - عبدالرحمن - زید - اور مجیر ہیں۔

**ازواج و اولاد**

لڑکیاں ام المؤمنین حضرت حفصہ اور رقیہ تھیں۔ آخر عمر میں خاندان نبوت سے شرفاً  
انتساب حاصل کرنے کے لئے حضرت علیؑ کی صاحبزادی ام کلثوم سے چالیس ہزار مہر  
پر عقد کیا تھا۔ (تاریخ اسلام شاہ معین الدین ص ۱۹۹)

## خلافتِ فاروقی میں نظامِ حکومت

حضرت عمرؓ کا عہد حکومت صرف فتوحات ہی کے لئے مشہور نہیں۔ بلکہ آپ کا  
بے نظیر نظمِ حکومت بھی آپ کے حیرت انگیز تدبیر اور حکمتِ عملی کو ظاہر کرتا ہے۔ آپ کے عہد  
حکومت میں اسلامی سلطنت بہت وسیع ہو گئی تھی۔ آپ نے اس وسیع سلطنت کے نظم و نسق کے  
لئے ایسے اصول و قواعد مرتب کئے۔ کہ تمام لوگ آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے لگے۔ آپ  
نے اپنی سلطنت کے مختلف عناصر کو ایک سانچے میں ڈھالا۔ مسلمان خلافتِ فاروقی میں  
رشتہ وحدت میں منسلک تھے۔ وحدت عقیدہ، وحدت جنس و قوم، اللہ وحدتِ زبان و  
بیان نے انہیں مضبوط و متحد بنا دیا تھا۔ آپ نے حکومت کے وہ آئین وضع کئے۔ جو بعد  
میں ایک مثالی اسلامی حکومت کی اساس قرار پائے۔ اس اعتبار سے حضرت فاروقیؓ  
رضی اللہ عنہ کو اسلام کے سیاسی نظام کا بانی قرار دیا جاسکتا ہے۔



## مجلس شوریٰ

اسلام کا سیاسی نظام شوریٰ پر مبنی ہے حضرت عمرؓ نے اسی بنیاد پر خلافتِ اسلامیہ کو قائم کیا۔ اس نظام میں کوئی اہم کام اہل الرائے صحابہؓ کے مشورے کے بغیر انجام نہ پاتا تھا۔ خاص خاص حالات میں عام مسلمانوں کا مشورہ بھی لیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ رضی اللہ عنہ نے اپنی حیثیت صرف ایک متولی کی رکھی تھی۔ اس کا اظہار آپ نے کئی مرتبہ کیا۔ ایک موقع پر فرمایا :-

دو تمہارے مال میں مجھ کو صرف اسی قدر حق ہے جس قدر ایک یتیم کے مال میں اس کے متولی کا ہوتا ہے۔ اگر میں دولت مند ہوں گا تو کچھ نہ لوں گا۔ اور اگر حاجت مند ہوں گا تو صرف ضرورت کے مطابق لوں گا۔ مجھ پر تمہارے متعدد حقوق ہیں۔ جن کا محاسبہ تم مجھ سے کر سکتے ہو۔ ایک یہ کہ ملک کا خراج نہ بے جا طور سے جمع کیا جائے اور نہ بے جا طور سے صرف ہونے پائے۔ دوسرے یہ — کہ میں تمہاری تلخ راہ بڑھائوں۔ سرحدوں کی حفاظت کروں اور تم کو خطروں میں نہ ڈالوں۔“  
(کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۶۷)

روزانہ پیش آنے والے مسائل کے فیصلہ کے لئے اہل الرائے صحابہؓ کی مجلس شوریٰ تھی۔ اس کے ممتاز ارکان یہ تھے۔

حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ۔ حضرت معاذ بن جبلؓ حضرت ابی بن کعبؓ حضرت زید بن ثابتؓ رضی اللہ عنہم۔  
(کنز العمال جلد ۳ ص ۱۲۲)

اس کے علاوہ اہم امور کے لئے ممتاز مہاجرین و انصار کی خاص مجلس ہوتی تھی۔ مسلمان برسرِ عام حضرت عمرؓ کو لوگ دیتے تھے۔ شوریٰ کے بارے میں آپ فرمایا کرتے تھے :-  
” ایک آدمی کی رائے کچھ دھاگے کے مانند ہوتی ہے۔ دو کی بٹے ہوئے دھاگوں کی مانند۔ اور تین کی پختہ رستی کی طرح جو ٹوٹ نہیں سکتی۔“  
(عیون الاخبار)

عہدِ فاروقی میں مسجدِ نبویؐ اسمبلی ہال اور سیکرٹریٹ کا کام دینی تھی۔ عمال، صوبائی واپسوں



اور سپہ سالاروں کے تمام تمام ہدایات مسجد نبوی سے جاری ہوتی تھیں۔

حضرت عمرؓ نے مفتوحہ علاقوں کے اکثر انتظامی اداروں کو بحال رکھا۔ مگر وہاں کے غیر منصفانہ طریقوں کو بدل دیا۔ آپ نے

## صوبائی نظام

تمام اسلامی سلطنت کو گیارہ صوبوں میں تقسیم کیا تھا۔ صوبے یہ تھے :-  
مکہ - مدینہ - شام - جزیرہ - کوفہ - بصرہ - فلسطین - فارس - خراسان - ہرمز  
اور آذربائیجان -

ہر صوبے میں کمی عہدیدار ہوتے تھے۔ مثلاً - حاکم صوبہ - چیف سیکرٹری افسر مال - پولیس افسر  
قاضی اور خزانچی۔ یوں تو صوبہ کا والی ہی فوج کا افسر علیٰ ہوتا تھا۔ مگر کبھی کبھی علیحدہ  
سپہ سالار بھی مقرر کیا جاتا تھا۔ صوبے اضلاع میں تقسیم تھے۔ ہر ضلع میں افسر خزانہ - عامل  
اور قاضی مقرر تھے جو وہاں کے نظم و نسق کو چلاتے تھے۔

آپ افسروں کے تقرر کے معاملہ میں بڑے  
محتاج تھے۔ قابل اعتماد اور لائق ترین

## افسروں کا تقرر و محاسبہ

لوگوں کو عہدے تفویض کرتے تھے۔ اس معاملہ میں آپ کی نگاہ ایسی صحیح اور دقیقہ رس تھی  
کہ جس کام کے لئے جس کو چن لیتے۔ اس سے بہتر آدمی نہ مل سکتا تھا۔ عہد فاروقی کی فتوحات  
اور انتظامی ترقی کی بڑی وجہ آپ کا حسن انتخاب ہے۔ تقرر سے پہلے اس کی جائیداد کی فہرست  
لے کر چار گواہوں کے دستخط ثبت کرا لیتے تھے۔ اور عام ہدایات کے علاوہ یہ شرائط اسے  
بتا دیتے تھے :-

۱ - وہ ترقی گھوڑے پر سوار نہ ہوگا۔

۲ - باریک کپڑا نہ پہنے گا۔

۳ - پھنا ہوا آٹا نہ کھائے گا۔

(تاریخ طبری و سیرت عمر ابن جوزی)

۴ - دروازہ پر دربان مقرر نہ کرے گا۔



آپ اپنے ماتحت افسروں کو ہمیشہ رشوت سے بچنے اور سادہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ہر سال حج کے موقع پر بڑے افسروں کو مکہ میں حاضر ہونے کا حکم تھا۔ وہاں ان کے خلاف شکایات سن جاتی تھیں۔ اگر کسی کے خلاف کسی قسم کی شکایت ہوتی تو اسے سخت سے سخت سزا دی جاتی۔ حضرت عمرؓ نے شکایات کی تحقیق کے لئے ایک کمیشن بھی بنا رکھا تھا۔ جس افسر کے بارے میں سنتے کہ عوام اس کے پاس نہیں جاسکتے۔ اسے فوراً الگ کر دیتے تھے۔ عیاض بن غنمؓ عامل بصرہ کہ بیٹن قیمت لباس پہننے کے جرم میں کابل کا گرتہ پہنوا کر بکریاں چرانے پر مجبور کیا۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ عامل کوفہ نے محل بنوایا جس میں دیوڑھی تھی۔ حضرت عمرؓ کو خبر پہنی تو دیوڑھی میں آگ لگوا دی۔

**محکمہ عدالت**  
حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں محکمہ عدالت لگا لگا کر دیا تھا۔ نہایت عادل اور متقی لوگوں کو جج اور قاضی مقرر کرتے تھے۔ ہر ضلع اور ہر صوبہ میں حکم دے رکھا تھا کہ ہر شخص کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کیا جائے۔ حضرت عمرؓ کا دستہ تھا کہ صرف معزز اور دولت مند لوگوں کو قاضی بناتے، تاکہ وہ رشوت کی طرف مائل نہ ہوں۔ رشوت سے بچانے کے لئے قاضیوں کی بڑی بڑی تنخواہیں مقرر کیں۔ آپ نے قاضیوں کو ہدایت کی تھی کہ مقدمات کا فیصلہ کتاب و سنت کے مطابق کریں۔ اگر کتاب و سنت میں اس مسئلہ کا حل نہ ملے تو اجتہاد سے کام لیں۔ ابتدا میں قاضی اپنے گھر میں عدالت قائم کرتا تھا۔ لیکن بعد میں مسجد میں بیٹھ کر مقدمات کے فیصلے کرنے لگے۔

**محکمہ پولیس**  
حضرت فاروقِ اعظمؓ نے شہری لوگوں کی حفاظت اور قیام امن کی خاطر محکمہ پولیس قائم کیا۔ اس عہد میں اس کا نام احداث تھا بعد میں شرط کہلانے لگا۔ عہد فاروقی سے پہلے عرب میں جیلخانوں کا رواج نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے جیلخانے قائم کئے۔

**محکمہ ڈاک**  
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سرکاری خطوط، فوجی مراسلات اور مال



غنیمت کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے کے لئے محکمہ ڈاک قائم کیا۔ نیز فارس اور انڈوں اور گھوڑوں کے ذریعے سرکاری مراسلات اور خطوط بھیجنے کا انتظام کیا گیا۔ اس محکمے کی بدولت حضرت عمرؓ مدینہ میں بیٹھ کر عراق، شام، فلسطین اور مصر میں اپنی فوجوں کو ہدایات بھیجا کرتے اور ان کے حالات سے باخبر رہتے تھے۔

**طکسال** عہدِ فاروقی سے پہلے عرب میں سونے چاندی کے غیر ملکی سکے رائج تھے، حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں چاندی کے سکے بنائے اور ان پر عربی حروف میں عبارت کندہ کرائی۔ اکتبہ سونے کے سکے بنوائے اور ان میں عبد الملک بن ولید نے بنائے تھے۔ چاندی کے سکے درہم کہلاتے تھے اور سونے کے سکے دینار۔

**مالی نظم** حضرت عمرؓ پہلے خلیفہ تھے جنہوں نے اسلامی سلطنت میں مالیات کا معقول بند و بست کیا۔ آپ نے باقاعدہ مالیات کا محکمہ قائم کیا۔ حضرت عمرؓ نے مدینہ میں ایک مرکزی بیت المال اور ہر صوبے کے دہم ترین مقام پر صوبہ کا بیت المال قائم کیا۔ آپ نے بیت المال کے لئے کشادہ اور مضبوط عمارتیں تعمیر کرائیں۔ اگرچہ مرکزی بیت المال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں بھی موجود تھا۔ مگر اس میں کچھ جمع نہ رہتا تھا۔ آپ نے بیت المال کا باقاعدہ محکمہ قائم کیا۔ آمدنی اور اخراجات کے اصول وضع کئے۔ بیت المال کا حساب کتاب رکھنے کے لئے ایماندار اور لائق افسر مقرر کئے۔ ہر صوبے کی آمدنی وہاں کے بیت المال میں جمع ہوتی تھی۔ اور وہاں کے اخراجات نکالنے کے بعد جو کچھ بچ رہتا، وہ مدینہ کے خزانہ میں داخل کر دیا جاتا۔ بیت المال کی آمدنی عموماً ان امور پر صرف ہوتی تھی۔

- ۱۔ سرکاری ملازمین کی تنخواہیں۔
- ۲۔ فوج کے مصارف۔
- ۳۔ عوامی وظیفے۔ ہر شخص کو اس کی حیثیت کے مطابق وظیفہ ملتا تھا۔



- ۴۔ زناہ عامہ -  
 ۵۔ سرکاری عمارتوں کی تعمیر -  
 ۶۔ قیدیوں کی کفالت -  
 ۷۔ سامان جنگ کی خرید -

## ذرائع آمدنی

۱۔ زکوٰۃ :- صرف مسلمانوں سے لی جاتی تھی۔ ان کو اپنے مال کا پالیسواں حصہ بیت المال میں داخل کرنا پڑتا تھا۔ حضرت عمرؓ سے پہلے گھوڑوں پر زکوٰۃ نہ تھی۔ کیونکہ گھوڑوں کی تجارت نہ تھی۔ آپ کے عہد میں جب ان کی تجارت ہونے لگی تو ان پر زکوٰۃ لگا دی۔ زرعی زمین پر جو لوگان اہل اسلام سے لیا جاتا ہے، اس کو عشرت کہتے ہیں۔ بارانی زمین پر دسواں حصہ اور نہروں سے سلنچی ہوئی زمین پر بیسواں حصہ حکومت کو دینا ہوتا ہے۔

۲۔ مال غنیمت :- دشمنوں کی ہر وہ چیز جو مسلمان مجاہدوں کے ہاتھ آتی۔ مال غنیمت کہلاتی تھی۔ اس کا پانچواں حصہ بیت المال میں جمع ہوتا تھا۔ باقی مجاہدوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

۳۔ عشرت :- مسلم تاجروں کی ہر وہ چیز جو کسی ممالک میں تجارت کے لئے جلتے تو وہاں کی حکومتیں ان سے سرمایہ کار دسواں حصہ بطور ٹیکس کے لیتی تھیں۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے بھی حکم دیا کہ غیر ممالک کے تاجروں سے دس فیصد ٹیکس لیا جائے اس کا نام عشرت تھا۔ بعد میں وطن کے تاجروں سے بھی عشرت وصول کیا جانے لگا۔ اس کا نصاب دس درہم تھا۔ ذمیوں سے پانچ فی صد اور اہل اسلام سے اڑھائی فی صد لیا جاتا تھا۔

۴۔ خراج :- وہ رقم یا غلہ جو غیر مسلم رعایا سے زمین کی پیداوار میں سے وصول کیا جاتا



تھا۔ اسے خراج کہتے ہیں۔ خراج کی مقدار معین تھی۔ زمین کی نوعیت و حیثیت کے مطابق خراج کی شرح مقرر کی جاتی تھی۔ خراج اس زمین سے وصول کیا جاتا تھا جو فتح کے بعد غیر مسلم کا کاروں کے پاس رہتی تھی۔

**جزیہ** :- اسلامی حکومت میں اہل ذمہ فوجی خدمت پر مجبور نہیں ہوتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود حکومت ان کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس حفاظت کے عوض فی کس کچھ سالانہ رقم ادا کرنا ہوتی ہے۔ اس کو جزیہ کہتے ہیں۔ صرف انہی لوگوں پر جزیہ عائد ہوتا ہے جو تلوار اٹھانے کے قابل اور خوش سائے ہوں۔ معذرا رہا ہے ابڑھے، عورتیں، بچے اور نادار لوگ جزیہ سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ جزیہ کی شرح مقرر نہیں۔ اس میں حیثیت کے مطابق کمی بیشی ہو سکتی ہے اور معاف بھی ہو سکتا ہے۔ جو ذمی نوج میں شامل ہو جائے اس سے جزیہ وصول نہیں کیا جاتا۔

## سن ہجری کا آغاز

زمانہ جاہلیت میں عربوں کے اس تاریخ شمار کرنے کے لئے کوئی باقاعدہ نظام نہ تھا۔ عام طور پر کسی بڑے واقعہ یا حادثہ مثلاً اصحابِ انبیل کا حملہ جنگِ فجار سال اور تاریخ کا شمار ہوتا تھا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت تک یہی دستور رہا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے عہد میں حکومت کا کاروبار بہت وسیع ہو گیا اور سرکاری خطوط اور مراسلات کے لئے باقاعدہ اور معین تاریخ کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے سن ہجری کا آغاز ہوا۔ اسلامی کی ابتدا سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے اسے سال سے پہلی اور اس نسبت سے یہ سن ہجری کہلاتا ہے۔



## فوجی نظام

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت سے پہلے فوج کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا۔ حضرت عمر فاروق نے ۳۵ھ میں ولید بن ہشام کے مشورہ سے محکمہ فوج قائم کر کے اسے منظم اور وسیع کیا۔ سب مجاہدوں کے نام رجسٹر میں درج کر کے ان کی تنخواہیں مقرر کیں۔ تنخواہ کی کمی بیشی حسبِ مراتب تھی۔ تنخواہ داروں کی بیوی اور ان کے بچوں کو بھی وظائف ملتے تھے۔ غلاموں کو ان کے آٹن کے برابر وظیفہ ملتا تھا۔ فوج دو حصوں میں تقسیم تھی۔

۱۔ باقاعدہ فوج

۲۔ رضا کار

پہلی قسم کی فوج ہر وقت تیار رہتی تھی اور دوسری ضرورت کے وقت طلب کی جاسکتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام علاقوں میں چھاؤنیاں قائم کیں۔ یہ ”جند“ کہلاتی تھیں۔ یہ فوجی مراکز مدینہ، بصرہ، کوفہ، دمشق، موصل، فسطاط اور حمص وغیرہ میں تھے۔ جہاں فوجیوں کے رہنے کے لئے مکانات، کھوڑوں کے لئے اصطبل اور چراگاہوں کا انتظام تھا۔ ان مقامات پر فوجیوں کا حساب کتاب رکھنے کے لئے علیحدہ دفتر تھے۔ نمد اور سامان جنگ مہیا کرنے کا معقول انتظام تھا۔ سپاہیوں کی تربیت اور جسمانی صحت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ شروع شروع میں صرف انصار اور قریش ہی فوج میں بھرتی کئے جاتے تھے مگر بعد میں مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کو بھی بھرتی کیا جانے لگا۔

فوج پیادہ اور شہسواروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ شہسوار فوج کے بازوؤں پر متعین کئے جاتے تھے۔ فوجی زرہ بکتر پہن کر تلواروں، نیزوں اور تیروں سے لڑتے تھے، محاصرہ کے وقت قلعہ شکن آلات استعمال کئے جاتے تھے۔ ہر فوج کا ایک سپہ سالار ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے افسر مثلاً خزانچی، محاسب، قاضی، مترجم اور طبیب بھی شامل تھے۔ جمعہ کو عام



تعطیل ہوتی تھی۔ اور اس کے علاوہ اتفاقی چھٹی بھی ہوتی تھی۔ چار ماہ کے بعد گھر جانے کی اجازت تھی۔  
 خبر رسائی اور جاسوسی کا عمدہ (منظم) تھا۔ فوجوں کی نقل و حرکت کی خبر خلیفہ کو برابر ملتی رہتی تھی۔  
 سڑکوں اور پلوں کی مرمت اور تعمیر کا کام ذمی انجام دیتے تھے۔ فوجیوں کو مفتوحہ علاقوں میں  
 کاشت کاری کی اجازت نہ تھی۔ عورتیں اور بچے بھی جنگ میں شریک ہو سکتے تھے۔ عورتیں زخمیوں  
 کی مرہم پٹی اور تیمار داری کرتی تھیں۔ بچے پانی پلاتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فوجیوں کا  
 بڑا خیال رکھتے تھے۔ ان کو برابر ہدایات بھیجتے رہتے تھے۔ سپاہی کی صحت کی آپ کو ہر وقت  
 فکر رہتی تھی۔ اسی لئے آپ عمدہ آب و ہوا کے علاقوں میں چھاؤنیاں قائم کرتے تھے،  
 موسم بہار میں فوجوں کو سرسبز و شاداب اور صحت افزا مقامات پر بھیجتے تھے۔ آپ فوجیوں  
 کے حالات سے باخبر رہتے تھے۔ اور سپہ سالاروں کی کردی نگرانی کرتے تھے۔ ان کی سستی  
 یا غفلت کو بھی نظر انداز نہ کرتے تھے۔ اور سخت تنبیہ کرتے تھے۔

**ذمیوں کے ساتھ سلوک** | کسی حکومت کے عدل و انصاف کے جانچنے کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ غیر قوموں کے ساتھ ان کا طرز عمل کیا ہے۔ اور ان کو اس حکومت میں کیا حقوق حاصل ہیں۔ اس اعتبار سے فارسی عہد عدل و مساوات کا نمونہ تھا۔

ذمی سے مراد وہ غیر مسلم رعایا ہے جن کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ تھی۔ یہ لوگ مفتوحہ علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ چونکہ یہ لوگ فوج میں شامل نہیں ہوتے تھے اس لئے ان کی حفاظت کے غرض ان سے ایک رقم وصول کی جاتی تھی۔ جسے جزیہ کہتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ مفتوحہ علاقوں کے ذمیوں سے جو عمدہ سلوک حضرت عمرؓ نے کیا اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں عرب کی ہمسایہ سلطنتوں کے بیشتر علاقے فتح ہوئے۔ عربی تسلط



سے پہلے غیر اترام نذر کنار خود ان کی ہم قوم رعایا سے ان سلطنتوں کا سلوک اچھا نہ تھا۔ گو اہل شام رومیوں کے ہم مذہب تھے مگر ان کی حالت بہت خراب تھی۔ انہیں اپنی ملکیتوں پر کوئی حقوق حاصل نہ تھے۔ وہ غلامانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ جس طرح ملکیت ایک شخص سے دوسرے شخص کے قبضہ میں چلی جاتی ہے۔ اسی طرح یہ لوگ بھی بحیثیت غلام ایک مالک سے دوسرے مالک کے ہاتھوں میں چلے جاتے تھے۔ یہودیوں کی حالت تو اور بھی خراب تھی۔ کیونکہ وہ ان کے ہم مذہب نہیں تھے۔ اسی طرح ایران میں مقیم عیسائیوں کی حالت بہت اتر تھی۔ لیکن جب یہ ممالک حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مسلمانوں کے قبضہ میں آئے تو ان سے ایسا سلوک کیا کہ ان کی حالت ایک دم بدل گئی۔

ان کے ساتھ اس طرح معاہدے کئے گئے۔ جیسے کسی ہم پارہ قوم سے کئے جاتے ہیں۔ ان کے لئے قانون ہی وضع نہیں کئے گئے بلکہ ان پر عمل بھی کیا گیا۔ زمینوں کو برابر کے حقوق دئے گئے۔ مسلمانوں اور زمینوں کے حقوق کو مساوی قرار دیا گیا اور ان کے ہر قسم کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ بیت المقدس کے عیسائیوں کو از روئے قانون جو حقوق دئے گئے وہ یہ تھے۔

وہ یہ وہ امان ہے۔ کہ خدا کے غلام امیر المومنین عمرؓ نے بیت المقدس والوں کو دی۔ یہ امان جان، مال، گرجا، صلیب، آئینہ، بیمار، اور ان کے تمام اہل مذہب کے لئے ہے۔ نہ ان کے گرجا میں سکونت اختیار کی جائے گی۔ نہ وہ منہدم کئے جائیں گے۔ نہ ان کے احاطہ کو نقصان پہنچایا جائے گا۔ نہ ان کی صنیعوں اور ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی۔ مذہب کے معاملہ میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا، نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا۔ (تاریخ طبری)

یہ حقوق بیت المقدس والوں کے ساتھ مخصوص نہ تھے۔ بلکہ تمام مفتوحہ اترام کو دئے گئے تھے۔ اہل جرجان کے ساتھ جب معاہدہ ہوا تو اس میں لکھا۔

ان کی جان و مال اور مذہب و شریعت سب محفوظ ہے۔ ان میں سے کسی چیز میں کوئی



(تاریخ طبری)

تبدیلی نہیں کی جائے گی۔

حضرت عمرؓ نے ان معاہدوں کی پابندی کی تاکید کرتے رہتے تھے۔ حضرت ابو عبیدہؓ

فاتح شام کو لکھا :-

دو مسلمانوں کو ذمیوں پر ظلم کرنے اور ان کو نقصان پہنچانے اور ان کا مال کھانے سے روکو۔ اور ان سے جو شرطیں کی گئی ہیں۔ ان کو پوری کرو۔ (کتاب الحزاج ام ابیہ) اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دیتا تھا تو حضرت عمرؓ اس سے قصاص لیتے تھے۔ ایک مرتبہ قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے عیسائی کو قتل کر دیا تو حضرت عمرؓ نے قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالہ کر دیا۔ انہوں نے اسے قتل کر دیا۔

(الدراية فی تخریج احادیث الہدایت)

ذمیوں کی جائداد کو کوئی نقصان پہنچاتا تھا تو اس کا معاوضہ دلاتے تھے ایک مرتبہ نوح نے شام کے ایک ذمی کی کھیتی پامال کر دی۔ حضرت عمرؓ نے بیت المال سے اس کو زکوٰۃ معاوضہ دلا یا۔ (کتاب الحزاج)

حضرت ابو بکرؓ نے بیت المال سے غریب، ایتام اور نادار مسلمانوں کو دیکھ کر دینے شروع کر دیے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ذمیوں کو بھی ایسے وظیفے دیے۔ ایسے لوگوں کو مساکین کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

**جزیرہ** | چونکہ ذمیوں سے فوجی خدمت نہیں لی جاتی تھی اس لئے ان کی حفاظت و نگہداشت کے عوض ان سے جزیرہ وصول کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں سے اس کے وصول کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ فوجی خدمت ادا کرتے تھے اکثر معاہدوں میں اس کی تصریح ہے۔ کہ یہ جزیرہ حفاظت کا ٹیکس تھا۔ چنانچہ اہل بحر جان سے جو معاہدہ ہوا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں :-

”ہمارے ذمہ اس شرط پر تمہاری حفاظت ہے کہ تم کو بقدر استطاعت سالانہ



جزیہ دینا ہوگا۔ اور اگر ہم تم سے فوجی مدد لیں گے تو اس کے بدلہ میں جزیہ  
معاف کر دیا جائے گا۔ (تاریخ طبری جلد ۵)

آذربائیجان کی فتح میں یہ معاہدہ لکھا گیا :-  
اگر جو لوگ کسی سال فوج میں کام کریں گے۔ تو اس سال کا جزیہ ان سے نہیں لیا  
جائے گا۔ (طبری)

چنانچہ جب بھی ذمیوں سے فوجی خدمت لی جاتی تھی۔ تو ان کا جزیہ چھوڑ دیا جاتا  
تھا۔ ایران کی فتوحات کے سلسلہ میں جب اس قسم کے مواقع پیش آئے تو حضرت عمرؓ نے  
اسے ان فوج کو لکھ بھیجا۔ "جن ذمی سواروں سے مدد لینے کی ضرورت ہو ان سے مدد لو۔  
اور ان کا جزیہ چھوڑ دو۔" (طبری)

جب جنگ یرموک کے سلسلہ میں مسلمان، ذمیوں کی حفاظت سے معذور ہو گئے۔ تو  
جزیہ کی کل وصول شدہ رقم واپس کر دی گئی۔ حضرت ابو عبیدہؓ سپہ سالار تھے۔ انہیں اور تمام  
مذہب اصلاح کے حکام کو لکھ بھیجا کہ جتنا جزیہ وصول ہو چکا ہے۔ سب واپس کر دیا جائے۔  
(فتوح البلدان ص ۱۴۳ کتاب الخراج ص ۸۱)

جزیہ کی وصولی میں سختی نہیں کی جاتی تھی، حضرت عمرؓ کو جب بھی اس کا علم ہو جاتا تھا، آپ سختی  
سے رد کرتے تھے۔ شام کے سفر میں کسی مقام پر دیکھا۔ کہ ذمیوں پر سختی کی جا رہی ہے۔ سبب پوچھا تو  
معلوم ہوا کہ جزیہ نہیں ادا کیا گیا ہے۔ پوچھا کیوں؟ معلوم ہوا۔ ناداری کی وجہ سے۔ فرمایا  
"چھوڑ دو۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مناسبت ہے کہ لوگوں کو تکلیف نہ دو۔ جو لوگ دنیا  
یا ربوں کو عذاب دیتے ہیں۔ انہیں قیامت کے دن عذاب دے گا۔ (کتاب الخراج)  
نادار اے کس اور معذور قریب جزیہ سے مستثنیٰ تھے۔ اور بیت الماں سے ان کی کفالت کی جاتی  
تھی۔ جزیہ کی فتح کے موقع پر جو معاہدہ لکھا گیا۔ اس میں تحریر تھا :-  
"اگر کوئی بڑھادی کام کرنے سے معذور ہو جائے۔ یا آنت زدہ ہو جائے۔ یا دولت مندی



کے بعد غریب ہو جائے اور اس کے اہل ذہب اسے خیرات دینے لگیں۔ تو اس کا جزیرہ  
موقوف کر دیا جائے گا۔ اور اس کی اولاد کو مسلمانوں کے بیت المال سے خرچ دیا جائے گا۔  
(کتاب الخراج)

یہ معاہدہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی  
اس پر عمل رہا۔ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ آیت قرآنی ﴿لَسْنَا الصَّدَقَاتِ لِلْفُقَرَاءِ  
وَالْمَسْكِينِ﴾ (صدقات فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں) میں فقراء سے مسلمان اور  
مساکین سے اہل کتاب مراد ہیں۔ فرماتے تھے کہ بخدا یہ انصاف نہیں ہے کہ ان لوگوں کو جو ان کی  
توانائی سے توہم فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں نکال دیں۔ (کتاب الخراج ص ۷۷)  
آپ کو زمینوں کا اتنا خیال تھا کہ زندگی کے آخری دور میں اپنے بعد ہونے والے خلیفہ  
کے لئے جو ہدایت نامہ لکھا تھا اس میں زمینوں کے متعلق خاص طور پر یہ وصیت تھی۔  
”میں زمینوں کے حق میں یہ وصیت کرتا ہوں۔ کہ ان سے جو عہد کیا گیا ہے اسے پورا کیا  
جائے۔ ان کی حمایت پر اٹھا جائے اور ان کی طاقت سے زیادہ ان کو تکلیف  
نہ دی جائے۔“ (کتب حدیث)

خلاصہ یہ کہ حضرت عمرؓ کا زمینوں کے ساتھ حسن سلوک اپنی مثال آپ ہے۔ سلطنت میں قلعیتوں  
کے لئے تو انہیں تو مرتب کر شے جلاتے ہیں مگر ان پر عمل کرنے کی نوبت بہت کم آتی ہے۔ مگر نوبت  
عمرؓ نے نہ صرف قانون وضع کئے۔ بلکہ ان پر عمل کر کے دنیا کے لئے رواداری اور کشادہ دلی  
کی ایک مثال قائم کر دی۔ زمینوں کے حقوق کا تحفظ اور ان کے ساتھ عدل و انصاف حضرت عمرؓ  
رضی اللہ عنہ ہی کا کام تھا۔ آخری وقت میں بھی اپنے جانشینوں کو یہی ہدایت کرتے رہے۔ کہ  
زمینوں سے حسن سلوک سے مہین آنا۔ یہی وہ سلوک تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمیں آپ کے عہد میں جو حق و حقوق  
اسلام کے حلقہ گدوش ہوئے جو مسلمان نہ ہوئے وہ شہری بن کر اسلامی سلطنت کی خدمت بہ انجام  
دیتے رہے۔



# اَوَّلِيَّاتِ فَارُوقِ

مؤرخین نے فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی ایجاد کی ہوئی باتوں کو یکجا کر کے لکھا اور ان کو ردِ اولیاتِ عمر بن خطاب سے تعبیر کیا ہے۔ حضرت عمرؓ کی اولیات پر ایک علیحدہ مبسوط کتاب لکھنے کی گنجائش ہے۔ چند اولیات درج ذیل ہیں۔ (تاریخ ابن خلدون جلد اول ص ۱۴۴)

- ۱۔ بیت المال قائم کیا۔
- ۲۔ عدالتیں قائم کیں اور قاضی مقرر کیے۔
- ۳۔ تاریخ و سن ایجاد کیا۔
- ۴۔ امیر المؤمنین کا لقب اختیار کیا۔
- ۵۔ زمین کو اپیمائش کرائی۔
- ۶۔ نہریں کھدوائیں۔
- ۷۔ شہر آباد کئے۔
- ۸۔ ممالکِ مشرق کو صوبوں میں تقسیم کیا۔
- ۹۔ عیشور یعنی مالِ تجارت پر پورا محصول مقرر کیا۔
- ۱۰۔ عربی تاجروں کو ممالکِ اسلامیہ میں آنے اور تجارت کرنے کی اجازت دی۔
- ۱۱۔ راقوں کو گشت کر کے رعایا کے احوال دریافت کرنے کو اپنا معمول بنایا۔
- ۱۲۔ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک مسافروں کے لئے مکانات اور کنوئیں بنائے۔
- ۱۳۔ شہروں میں مسلمان خانے تعمیر کرائے۔
- ۱۴۔ نماز تراویح باجماعت کا حکم دیا۔
- ۱۵۔ شراب کی حد استی در سے مقرر کی۔



- ۱۶۔ تجارتی گھوڑوں پر زکوٰۃ مقرر کی۔  
 ۱۷۔ نماز جنازہ میں چار تکبیروں پر سب مسلمانوں کو اکٹھا کیا۔  
 ۱۸۔ مساجد میں وعظ کا طریقہ جاری کیا۔  
 ۱۹۔ اماموں، مؤذنون اور دیگر ملازموں کی تنخواہیں مقرر کیں۔  
 ۲۰۔ بچو کہنے والے شاعروں کو سزا دی۔  
 ۲۱۔ اشعار میں عورتوں کے ذکر سے منع کیا۔  
 ۲۲۔ جو بوزرعی صاحب اولاد ہو جائے۔ اس کو فروخت کرنے سے منع کیا۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ، جاہلیت اور اسلام میں خلافت سے پہلے تجارت کرتے تھے جب خلیفہ ہوئے اور امور خلافت سے فرصت کم ملنے لگی۔ تو صحابہؓ کو جمع کر کے ان کی خدمت میں وظیفہ مقرر کے جانے کی درخواست کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رائے دی کہ بیت المال سے اس قدر تنخواہ لے لیا کریں جو معمولی خوراک و لباس کے لئے کافی ہو۔ ۵۰۰۰ روپے میں جب تمام عربوں کے وظائف مقرر کئے گئے۔ تو ان کا برصحبہؓ کے ساتھ ان کی تنخواہ پانچ ہزار درہم سالانہ مقرر ہوئی۔  
 (تاریخ ابن خلدون جلد اول ص ۱۴۲)

ان کے دسترخوان پر معمولی روٹی اور درغن زیتون کے سوا دوسری کوئی چیز نشاؤ و نادر ہی ہوتی تھی۔ آٹا کبھی گنیہوں کا ہوتا اور کبھی جو کا۔ لیسکن چھتا ہوا نہ ہوتا۔ گاہے گاہے ترکاری۔ سرکہ دودھ اور گوشت بھی کھاتے تھے۔ لباس میں کسی قسم کا تکلف نہ تھا۔ ہمیشہ موٹے کپڑے پہنتے تھے۔ اور اکثر کپڑوں میں پیوند ہوتے تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایک روز خلیفہ پر ٹھہرے تھے۔ ان کے تہ بند میں بارہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک پیوند چمڑے کا تھا۔ فتح بیت المقدس کے موقع پر جب آپ تشریف لے گئے تو آپ کی قمیض میں ستر پیوند تھے۔ مزاج میں سادگی اور بے تکلفی



بے حد تھی۔ ایک مرتبہ اپنے عمدہ مذاوت میں نماز عید پڑھانے جا رہے تھے اور پاؤں میں جوتا نہ تھا۔ ایک دفعہ گد میں دیر تک رہے۔ باہر تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ پہننے کو کپڑے نہ تھے انھیں کپڑوں کو دسو کر خشک کر رہے تھے۔ (تاریخ ابن خلدون جلد اول)

**عشر** | رنگ سرخ و سفید تھا۔ سُرخ اس پر غالب تھی۔ قد اتنا لمبا تھا کہ پاسبانہ بھی سوار معلوم ہوتے تھے۔ رخسار سے کم گوشت۔ دائرہ گھنی۔ سر کے بال سامنے سے اُٹ گئے تھے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ آپ کی عمر کے بارے میں صحیح قول یہ ہے کہ تریسٹھ برس اور چھ مہینے کی ہوئی۔ (تاریخ ابن خلدون جلد اول ص ۷۷)

## حضرت عمرؓ کی سیرت اور کارنامے

تاریخ عالم کا ہر طالب علم اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے بڑا فاتح اور کثرت کشاکش کوئی نہیں گذرا۔ سکندر و چنگیز کی فتوحات کا دائرہ شاید اس سے بھی وسیع تر ہو۔ لیکن انہیں فاتح نہیں کہا جاسکتا وہ قہر و ظلم کا ایک طوفان تھے جو یونان و رومستان سے اٹھا اور تباہی و غارتگری پھیلانا ہوا گذر گیا۔ چنگیز کی ہلاکت خیز جنگوں سے کون واقف نہیں۔ اس نے شہر سی نہیں ملک کے ملک ویران کر دیئے جس علاقے سے گذر گیا وہاں کی زراعت و تجارت اور صنعت برباد ہو گئی۔ سکندر بڑا عالمی بہت شہنشاہ شمار ہوتا ہے۔ لیکن ملک شام میں صُور کا قتل عام اور ایران میں اِصطخر کی غارت گری اس کے وہ کارنامے ہیں جنہیں تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔

اس کے برعکس حضرت عمرؓ نے جن ممالک کو فتح کیا وہاں کے باشندے ان کے گردیدہ ہو گئے۔ ملک کی زراعت و تجارت اور صنعت اتنی بڑھی کہ ہر شخص خوشحال ہو گیا۔ جن جن ممالک میں فاروقی فوجیں داخل ہوئیں، وہ آج تک اسلام کا گہوارہ ہیں۔ نہ وہاں قتل عام ہوا۔



نہ رعایا لوٹی گئی بلکہ پسماندہ اور غریب طبقے کو سہرا ٹھانے اور پرسکون زندگی بسر کرنے کا موقع ملا۔ شام و مصر میں رومی برسر اقتدار تھے تو وہاں کی تمام زمینوں اور تجارت پر ان کا قبضہ تھا۔ شامی و مصری غلاموں کی سہی زندگی بسر کرتے تھے۔ جب یہ علاقے فتح ہوئے تو وہاں کی زمینوں اور تجارت پر ان کا قبضہ تھا۔ شامی و مصری غلاموں کی سہی زندگی بسر کرتے تھے۔ جب یہ علاقے فتح ہوئے تو حضرت عمرؓ نے تمام زمینیں اور باغات ان ہی شامیوں اور مصریوں کے حوالے کر دیئے۔ ایسا نیا صن تاریخ عالم میں دوسرا کون تھا؟

عہد فاروقی کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ حدود مملکت میں اتنی توسیع کے باوجود اس سرے سے اس سرے تک ہر طرف امن و سکون تھا۔ دنیا میں اور بھی ایسے صاحب جاہ و اقتدار گذرے ہیں جن کی حکومت میں کوئی سہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ مگر یہ سکون انہوں نے جو رستم کے بلی بوتے پر حاصل کیا تھا۔ ذرا سی مخالفت کرنے والوں کو وحشت پانہ سزا میں دی جاتی تھیں اور آبادیوں کو جلا کر خاک کا ڈھیر بنا دیا جاتا تھا۔ لیکن خلافت فاروقی میں انصاف کے دامن کو کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا گیا۔ اگر کوئی جرم کرتا تھا تو اس کی سزا بھی سخت نہ دی جاتی تھی۔ جن لوگوں کو ان کی باغیانہ سرگرمیوں کے پیش نظر جلاوطن کیا گیا تھا انھیں جا سیدادوں کا دگنا معاوضہ دیا گیا تھا۔ راستے میں ہر قسم کی سہولتیں کیں اور جب دوسری جگہ آباد ہو گئے تو دو سال کے بے جزیرہ معاف کر دیا گیا۔ حضرت نے ملک میں جو امن قائم کیا وہ محبت و نرمی اور بردباری کے اصولوں کے پیش نظر تھا اس لئے لوگ نہ بغاوت کرتے تھے نہ سرکشی۔

حضرت عمرؓ کو فاروق اعظم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ تاریخ اسلام میں آپ کو بلند مقام حاصل ہے۔ آپ کا دورِ خلافت تاریخ اسلام کا زریں باب ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ آپ کے عہدِ خلافت میں فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ ایران و روم کی سلطنتیں صفحہ ہستی سے ہمیشہ کے لئے ہٹ گئیں۔ فاروق اعظمؓ کا دوسرا بڑا



کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے مملکتِ اسلامیہ کو مستحکم بنیادوں پر کھڑا کیا۔ تمام سلطنت میں ایک ایسا نظم و نسق رائج کیا جو آئندہ خلفاء کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتا رہا۔ آپ نے ایک ایسا عادلانہ نظامِ حکومت قائم کیا جس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔ آپ کی حکومت جمہوریت اور آمریت کا لطیف امتزاج تھی۔ مذہبی رواداری کی جو مثال آپ نے قائم کی وہ سلطنتِ اسلامیہ کا امتیازی نشان تھی غرض ان وجوہ و اسباب کے پیش نظر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ صرف اسلامی تاریخ کے عظیم النظیر خلیفہ، بلکہ تاریخِ عالم کے زبردست ہیرو اور عدل و انصاف زہد و تقویٰ، جرات و جلاوت، حق گرائی اور بے باکی کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔

## سوالات

۱۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ابتدائی زندگی کے حالات قلمبند کرو۔ نیز بتاؤ کہ آپ کیسے اسلام لائے

اور اس کا کیا اثر ہوا؟

۲۔ ایرانیوں اور رومیوں کے خلاف مسلمانوں کی فتح کے اسباب بیان کیجئے۔

۳۔ عرب اور ایرانیوں کی لڑائی کے کیا اسباب تھے؟ عربوں نے کس طرح بدرجہ ایران کو فتح کیا۔

۴۔ فتحِ شام کے حالات و واقعات بیان کیجئے۔

۵۔ جنگِ قادسیہ کی تفصیلات بیان کیجئے۔



۶۔ مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھو :-

(۱) کوفہ (۲) بصرہ (۳) خوزستان (۴) فتح الفتوح

۷۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کے کردار اور حالات زندگی۔ نیز ان کی معزولی کے اسباب سے بحث کیجئے۔

۸۔ حضرت عمرؓ کے عہد کی خاص خاص فتوحات کا حال لکھئے۔

۹۔ حضرت عمرؓ کی سیرت و سیاست پر تبصرہ کیجئے۔

۱۰۔ حضرت عمرؓ کے کردار اور ذمیوں کے ساتھ سلوک کے بارے میں آپ کیا جانتے

ہیں؟

۱۱۔ حضرت عمرؓ پر بحیثیت ایک انسان اور حکمران کے تبصرہ کریں۔

۱۲۔ حضرت عمرؓ نے جو مالی اور فوجی ادارے قائم کئے ان کا حال لکھئے۔

۱۳۔ حضرت عمرؓ کی اسلامی خدمات کا جائزہ لیجئے۔

۱۴۔ حضرت عمرؓ کے نظام حکومت پر تبصرہ کیجئے۔



# حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

آپ کا اسم مبارک عثمان۔ کنیت ابو عبد اللہ اور لقب ذو النورین  
تھا۔ والد کا نام عفان اور والدہ کا ازویٰ تھا۔ چونکہ سردیہ کا شاہ

## ابتدائی حالات

صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں آپ کے ساتھ یکے بعد دیگرے منسوب ہوئی تھیں اس لئے یہ لقب  
پایا۔ آپ قریش کی مشہور شاخ بنو امیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ پانچویں پشت پر آپ کا نسب رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ بنو امیہ کا خاندان زمانہ جاہلیت سے نہایت معزز چلا آتا تھا۔  
پورے قریش میں بنی ہاشم کے سوا کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہجرت نبوی کے سینتالیس سال قبل پیدا ہوئے۔ بچپن کے حالات پردہ خفایں

ہیں۔ ذریعہ معاش تجارت تھا۔ اس میں اپنی امانت دوپاٹتے اور راستبازی سے اتنی ترقی  
حاصل کر لی تھی کہ قریش کے دولت مند ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ دولت و ثروت کی وجہ  
سے "عثنی" کے لقب سے پکارنے جلتے تھے۔ آپ کا چونتیسواں سال تھا کہ اسلام کا ظہور ہوا۔  
حضرت ابو بکر صدیقؓ ان سے حضرت عثمانؓ کے گھرے مراسم تھے۔ صدیق اکبرؓ کی تبلیغ نے انھیں اسلام  
کی طرف مائل کر لیا۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ حق پرست پر مشرتاب اسلام ہو گئے۔  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی منجھلی صاحبزادی رضیہؓ کا عقد ان کے ساتھ کھنپوایا۔

(اصحابہ جلد ۵، واسطہ لغابہ)

حضرت عثمانؓ نے اولین مسلمانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کا خاندان ان دنوں اسلام کا



سخت دشمن تھا۔ آپ دین حق کے حلقہ گروش ہوئے تو اعزہ نے آپ کو کڑی سزائیں دیں۔ لیکن آپ کی ثابت قدمی میں فرق نہ آیا۔ کچھ عرصہ تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مظالم برداشت کرتے رہے جب ہجرت کی اجازت ملی۔ تو اپنی اہلیہ حضرت رقیہ کو لے کر حبشہ چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد وہاں یہ افواہ آئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مشرکین کے ساتھ صلح ہو گئی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دیگر مہاجرین مکہ لوٹ آئے۔ وہاں آپ کو معلوم ہوا کہ خبر غلط تھی۔ بہت سے مسلمان پھر حبشہ چلے گئے۔ لیکن آپ مکہ ہی میں منقیم رہے پھر چند دنوں کے بعد ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے (طبقات ابن سعد جلد ۱) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بڑے کشادہ دل اور فیاض تھے۔ مالی جہاد میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ آپ کی دولت سے مسلمانوں کو بڑا فائدہ پہنچا۔ مدینہ شریف میں بیٹھے پانی کا صرف ایک ہی کنواں تھا۔ جو بیڑ ڈوب کر کھلتا تھا۔ یہ کنواں ایک یہودی کی ملکیت تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی تکلیف دیکھی تو بیس ہزار درہم دے کر یہ شیریں کنواں خرید کر مسلمانوں کے سودف کر دیا۔ جنگ تبوک میں دس ہزار دینار نقد کے علاوہ ایک ہزار اونٹ اور ستر گھوڑے ساز و سامان سمیت

۶ تھے۔

استیعاب جلد دوم ص ۴۸۸

مسجد نبوی میں ترویج کی ضرورت ہوئی تو آپ نے ۲۵ ہزار درہم کے لگ بگ رقم سے جگہ خرید کر دی۔ خانہ کعبہ کی ترویج کے لئے تقریباً دس ہزار میں زمین خریدی۔ (ترمذی)

مدینہ آنے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تمام غزوات میں شریک ہوئے تھے۔ بدر میں حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی علالت کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روک دیا تھا اور فرمایا تھا کہ تم کو جنگ میں شرکت کا ثواب اور مال عنایت دونوں ملیں گے۔ (صحیح بخاری)

غزوہ احد میں بھی شریک ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی جھوٹا افواہ سن کر بہت سے صحابہ کئے پاؤں میدان جنگ سے اکرتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی انہی میں سے تھے۔ ان کو اس حالت میں لایا گیا۔ جب وحی الہی نے ان صحابہ کو بری قرار دیا۔ اس وقت آپ کو اطمینان ہوا۔ حدیث کی صلح سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو سفیر بنا کر مکہ



بھیجا۔ قریش نے آپ کو روک لیا۔ افزاء پھیل گئی کہ آپ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ حضور نے آپ کے خون کا انتقام لینے کے لئے سب صحابہ سے بیعت لی۔ جسے بیعت رضوان کہتے ہیں۔ حضرت عثمان کے لئے یہ ایک عظیم شرف ہے۔

حضرت عثمان ان دس صحابہ کے ساتھ تھے جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نام بنام جنت کی بشارت دی تھی۔ یہ حضرات عشرہ مبشرہ کہلاتے ہیں۔

زخمی ہونے کے بعد جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے جانشین ہونے کی کوئی امید نہ رہی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حاضر ہو کر عرض

## حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب

کیا کہ اپنا کوئی جانشین مقرر کر دیں۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ اگر آج ابو عبیدہ بن جراح زندہ ہوتے تو میں انہیں اپنا جانشین بنا دیتا۔ جب آپ کی حالت زیادہ بگڑتی نظر آئی۔ تو آپ نے بڑے غور و خوض کے بعد چھ صحابہ پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کر دی۔ اس کمیٹی میں حضرت طلحہ، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم شامل تھے۔

حضرت عمر کی تجویز و تکفین سے نزاع کے بعد آپ کی وصیت کے مطابق حضرت مقداد نے ایک مکان میں ان چھ حضرات کو جمع کیا۔ مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ تیسرے دن حضرت عبدالرحمن بن عوف نے فرمایا کہ انتخاب کی صورت یہ ہے کہ چھ کی تعداد کو اور کم کر دیا جائے، جو شخص جس کو زیادہ موزوں سمجھتا ہو اس کا نام پیش کرے۔ اس تجویز پر حضرت سعد نے حضرت عبدالرحمن کا نام پیش کیا، لیکن آپ نے اپنا نام واپس لے لیا۔ حضرت طلحہ نے حضرت عثمان اور حضرت زبیر نے حضرت علی کا نام پیش کیا۔ اس تحریر پر حضرت عبدالرحمن نے فرمایا کہ صرف وہ نام رکھنے ہیں ان دونوں میں سے جو شخص کتابت سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور طریقہ نبوی کو بے غور و غمزہ پر چلنے کا عہد کرے گا، اس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی۔ دوسری طرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر آپ دونوں حضرات اس کا فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیں تو زیادہ مناسب ہے۔ دونوں رضی ہو گئے۔ ان سے اجازت لینے کے بعد انہوں نے مسجد نبوی میں مسلمانوں کو جمع کر کے ایک مؤثر تقریر کی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ



نے بیعت کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ آپ کے بیعت کرتے ہی سب نے واہماہ شوق کے ساتھ بیعت کر لی۔  
 بیعت عام کے بعد حکم محرم مکہ میں حضرت عثمان مسندِ خلافت پر فائز ہوئے۔ حضرت عثمان کی عمر  
 اس وقت ستر برس کی تھی۔ شہادتِ علم اور بیعتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے عین درمیانہ ایام میں صہبہ کبریٰ (رضی اللہ عنہا)  
 فاروقِ اعظمؓ کی وصیت کے مطابق امامتِ نزار کے فرائض انجام دیتے رہے۔  
 (طبقات ابن سعد جلد ۳ - نیز طبری)

## عثمانی فتوحات

فاروقِ اعظمؓ نے اپنے عہد میں شام اور مصر اور ایران کو فتح کر کے مالکِ محروسہ میں شامل کر لیا  
 تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ نظم و نسق کو بحال رکھنے کے لئے قوانین وضع کئے تھے۔ حضرت عثمان کے لئے  
 میدان صاف تھا۔ انہوں نے صدیقِ اکبرؓ کی زمی اور فاروقِ اعظمؓ کی سیاست کو اپنا شعار بنایا  
 اور ایک سال تک قدیم طریقِ نظم و نسق میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ البتہ خلیفہ سابق کی وصیت کے مطابق  
 حضرت سعد بن ابی وقاص کو مغیرہ بن شعبہ کی جگہ کوثر کا دالی بنا کر بھیجا۔ یہ پہلی تقرری تھی جو  
 حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے عمل میں آئی۔  
 (ابن اثیر جلد ۳ ص ۶۱)

خلافتِ عثمانی کے ابتدائی چند سالوں میں مملکتِ اسلامیہ میں امن و امان قائم رہا ملک کا انتظام  
 بہت خوش اسلوبی سے چلتا رہا۔ فتوحات کا سلسلہ جاری رہا اور اسلامی سلطنت کی حدیں مشرق اور  
 مغرب دونوں طرف سے وسیع ہوتی چلی گئیں۔

حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ایران کا بیشتر حصہ فتح ہو چکا تھا  
 فتح ایران کی تکمیل

مگر بعض علاقے پوری طرح مطیع نہیں ہوئے تھے۔ حضرت عثمانؓ  
 کے خلیفہ ہونے کے کچھ دن بعد فارس میں بغاوت ہوئی۔ عبداللہ بن عامر جو ابو موسیٰ اشعریؓ کی  
 جگہ بصرہ کے گورنر مقرر کئے گئے تھے، نوزاً فارس پہنچے اور اس علاقہ کو پوری طرت زیر کر لیا۔  
 اس عرصہ میں سعید بن عاص حاکم کوثر نے طبرستان کو دوبارہ فتح کیا۔ اس کے بعد عبداللہ بن



عامر اور سعید بن عاص نے ملی کر خراسان پر حملہ کیا۔ اور اس کو فتح کرنے کے لئے نیشاپور کا محاصرہ کیا۔ ایک ماہ کے بعد وہاں کے حاکم کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ ایران کا بد قسمت بادشاہ یہ رداجس کے دل میں ایران کو واپس لینے کی تڑپ آخروم تک زندہ رہی سلسلہ میں ایک چکی والے کے ہاتھوں قتل ہوا۔ کا نشانہ خسرو کی اس آخری چرانے کے گل ہونے سے ایران کا باغی عنصروب کیا اور ایران کی فتح مکمل ہو گئی۔

**مشرق میں فتوحات** فتح ایران کی تکمیل کے بعد عبداللہ بن عامر نے مشرق کی طرف فوجیں روانہ کیں۔ تقوڑ سے ہی عرصہ میں کرمان، سیستان،

طخارستان، ہرات، غزنی اور کابل کے علاقے فتح ہو گئے۔ اور اس طرح اسلامی سلطنت کی سرحدیں مغربی پاکستان کی سرحد تک پہنچیں۔ اس عرصہ میں آرمینیہ اور آذربائیجان میں بغاوت ہوئی جس کو ولید بن عقبہ نے دبا دیا۔ حبیب بن مسلمہ، عبدالرحمن بن ربیعہ اور سلیمان بن ربیعہ کی کوششوں سے اس سارے علاقے پر تسلط ہوا۔

**ایشیائے کوچک کی فتح** خلافت فاروقی میں ایشیائے کوچک فتح نہیں ہوا تھا۔

رومیوں نے وہاں پھر قبضہ جس جمع کرنی شروع کی اور خطرہ پیدا ہو گیا کہ یہ لوگ شام پر حملہ کریں گے۔ ان کے مقابلہ کے لئے حبیب بن مسلمہ کو بھیجا گیا انہوں نے علیسائیوں کو شکست دے کر بت سے شہروں پر قبضہ کر لیا۔ اسی دوران میں حضرت امیر معاویہ نے جو ان دنوں شام کے حاکم تھے ایشیائے کوچک پر حملہ کر کے انطاکیہ اور طرس کے ویرانی علاقے میں بہت سے قلعوں کو فتح کیا اور وہاں اسلامی نوآبادیاں قائم کیں۔

**فتح طرابلس** مہتمم طرابلس کا اہتمام تو ۳۵ھ ہی میں ہوا تھا۔ لیکن باقاعدہ فوج کشی ۳۶ھ میں ہوئی۔ عبداللہ بن ابی سرح سپہ سالار تھے۔ حضرت عثمان

نے دارالخلافہ سے بھی ایک لشکر جبار کمک کے لئے روانہ کیا۔ جس میں عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمرو بن العاص اور عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ شامل تھے، اسلامی فوجیں ہت



ملک طرابلس کے سیدانوں میں معرکہ آرا رہیں۔ آخر کار مسلمانوں کی شجاعت، جانبازی اور پامردی کے آگے اہل طرابلس کے پاؤں اکھڑ گئے۔ عبداللہ بن ابی سرح نے فوج کے چھوٹے چھوٹے دستے بنا کر تمام ملک میں پھیلا دیے۔ طرابلس کے امراء نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کا مقابلہ ممکن نہیں ہے تو عبداللہ بن ابی سرح کے پاس آ کر پچھیں لاکھ دینار پر مصالحت کر لی۔ (فتوح البلدان ص ۲۳۵)

مصر سے متصل شمالی افریقہ کا آباد علاقہ افریقہ (عربی تلفظ افریقیہ) کہلاتا تھا۔ یہاں بڑے بڑے قوم آباد تھیں۔

## افریقہ کی فتح ۲۳ھ

افریقہ کا بادشاہ قبیر روم کا باجگزار تھا۔ قبیر کے اشارہ سے اس کے قبائل آئے دن مصری سرحدوں پر لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ اس کے سبب باب کے لئے حضرت عمرو بن العاص حاکم مصر نے عبداللہ بن ابی سرح کے قتل ایک مہم بھیجی جس نے ملحقہ علاقوں کی سرکوبی کی اور کچھ خراج پر وہاں کے باشندوں سے صلح کر لی۔ مگر افریقہ کے حملے پھر بھی جاری رہے۔ ۲۳ھ میں حضرت عثمان نے عبداللہ بن ابی سرح کو جو اس وقت حاکم مصر تھے۔ افریقہ پر فوج کشی کی اجازت دی۔ حضرت عثمان نے ان سے وعدہ کیا کہ فتح کی صورت میں خمس غنیمت کا پانچواں حصہ ان کو بطور انعام دیا جائے گا۔ ایک لشکر آپ نے مدینہ سے بھیج دیا اور بعد میں ایک ملک مزید روانہ کی۔ افریقہ کے اجنبی اور دشوار گزار علاقہ میں بڑے جنگ آزمادوں سے الجھنا آسان کام نہ تھا۔ پندرہ ماہ کے صبر آزما اور خوزیرہ معرکوں کے بعد دشمن کا زور ٹوٹا۔ افریقہ کا بادشاہ مارا گیا۔ اور ملک عربوں کے زیر نگیں آ گیا۔

(تاریخ طبری وابن اثیر)

## قبرص کی جنگ

قبرص جس کو اب سائپرس کہتے ہیں، بحر روم میں شام کے شریب ایک نہایت زرخیز جزیرہ ہے۔ یہ یورپ اور روم کی طرف سے مصر

و شام کی فتح کا دروازہ ہے۔ مصر و شام کی حفاظت اس وقت تک نہیں ہو سکتی تھی۔ جب تک یہ بحرینا کہ مسلمانوں کے قبضہ میں نہ ہو۔ اس لئے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلافت فاروقی ہی میں اس پر فوج کشی کی جانب اجازت طلب کی تھی۔ مگر حضرت عمر نے بحرین جنگ کے خلاف تھے۔ اس لئے انکار



کر دیا۔ اس کے بعد ۱۸ھ میں امیر معاویہؓ نے پھر حضرت عثمانؓ سے باہر اتر قبرص پر لشکر کشی کی اجازت طلب کی۔ اور اطمینان دلایا کہ بحری جنگ کو جس قدر خوفناک سمجھا جاتا ہے اس قدر خوفناک نہیں ہے حضرت عثمانؓ نے لکھا کہ اگر تمہارا بیان صحیح ہے تو حملہ میں مضائقہ نہیں۔ لیکن اس مہم میں اسی کو شریک کیا جائے جو اپنی خوشی سے شرکت کرے۔

حضرت امیر معاویہؓ نے بحری بیڑا تیار کرایا اور عبداللہ بن قیس کی زیر قیادت قبرص پر پہلا بحری حملہ کیا گیا۔ قبرص کے باشندے جنگجو نہ تھے۔ اس لئے سات ہزار دینار سالانہ ادا کرنے اور بحری جنگوں میں رومی بیڑوں کی نقل و حرکت کی اطلاعات بہم پہنچانے کی شرط پر صلح کی۔ امیر معاویہؓ نے قبرص کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ کئی سال تک یہ صلح قائم رہی لیکن ۲۳ھ میں اہل قبرص نے رومیوں کو امداد دی اور معاہدہ صلح توڑ دیا۔ حضرت امیر معاویہؓ نے قبرص پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور ان باقاعدہ مسلمان نوجوان اور بحری بیڑہ متعین کر دیا۔ اسی زمانہ میں قیصر روم نے پھر مصر پر حملہ کیا۔ لیکن مسلمانوں کے بحری بیڑے نے بروقت امداد کر کے رومیوں کو پسپا کر دیا۔ اور اسکندریہ کے علاقہ میں کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

(تاریخ طبری و کامل ابن اثیر)

۲۱ھ میں قیصر روم نے ایک عظیم الشان جنگی بیڑا جس میں تقریباً پانچ سو جہاز تھے۔ سو اہل شام پر حملہ کئے

## عظیم الشان بحری جنگ

بھیجا۔ مورخین کا بیان ہے کہ رومیوں نے مسلمانوں کے مقابلہ میں ایسی عظیم الشان قوت کا مظاہرہ کبھی نہیں کیا تھا۔ امیر البحر عبداللہ بن ابی سرح نے مدانت کے لئے اسلامی بیڑے کو آگے بڑھایا اور صلح سمندر پر دونوں آپس میں مل گئے۔ دوسری صبح کو مسلمانوں نے اپنے تمام جہاز ایک دوسرے سے باندھ رکھے۔ فریقین میں نہایت خونریز جنگ ہوئی۔ بے شمار رومی مارے گئے۔ مسلمان بھی بہت سے شہید ہوئے۔ لیکن مسلمانوں کے استقلال و شجاعت نے رومیوں کے پاؤں اکھاڑ دیئے اور ان کی بہت تھوڑی تعداد زندہ بچی۔ قیصر روم خود اس جنگ میں زخمی ہوا۔ اور اسلامی بیڑہ فاتحانہ شان سے اپنی بندرگاہ پر واپس آیا۔

(ابن اثیر جلد ۱ ص ۹۱)



متفرق فتوحات | قبرص، اطرابلس اور طبرستان کے علاوہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں اور بھی فتوحات ہوئیں۔ ۳۱ھ میں حبیب بن مسلمہ فہری نے

آرمینیا کو فتح کر کے اسلامی ممالک محروسہ میں شامل کر لیا۔ ۳۲ھ میں حضرت امیر معاویہؓ نے قسطنطنیہ تک بڑھتے چلے گئے۔ ۳۲ھ میں عبداللہ بن عامر نے مرو، طالقان، فریاب اور جوزجان کو فتح کیا۔ ۳۳ھ میں امیر معاویہؓ نے ارض روم میں حصن الرومہ پر حملہ کیا۔ اسی سالی اہل خراسان نے بغاوت کی۔ عبداللہ بن عامر والی بصرہ نے احنف بن قیس کو بچھ کر اسے فرود کرایا۔ اسی طرح ۳۴ھ میں اہل طرابلس نے نقض امن کیا۔ عبداللہ بن ابی سرح نے ایک لشکرِ جرار کے ساتھ چڑھائی کر کے انہیں زیر کیا۔  
(کامل ابن اثیر)

مذکورہ صدر عثمانی فتوحات اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں کہ اسپ کے دورِ خلافت میں مسلمان اسی جرات و جلاوت، ایمان و ایقان، اخلاص

خلاصہ |

ووقار، شوقِ شہادت اور ان اوصاف و اخلاق کے حامل رہے جن سے وہ فاروقی خلافت میں مرتصف تھے اور جو آغازِ اسلام سے ان کا طرہ امتیاز رہے ہیں اگرچہ خلافتِ عثمانی کے اواخر میں امت مسلمہ اندرونی انتشار و خلفشار کی شکار ہو گئی تھی۔ تاہم ان کی قوتِ ایمان اور مومنانہ جرات میں کوئی فرق نہ آیا۔ اور وہ فاروقی عہدِ خلافت کی طرح ملکوں پر ہلاک فتح کرتے چلے گئے۔



# عہد عثمان کی فتنہ سامانی

عثمانی خلافت میں شورش کے اسباب | عثمانی عہد خلافت کے ابتدائی دو سال بڑے

امن و امان اور سکون کے ساتھ گزرے۔ اس عرصہ میں فتوحات کا سلسلہ بہت وسیع ہو گیا۔ خراج کی آمدنی بڑھ گئی اور مالِ غنیمت بھی بہت ہاتھ آیا۔ ملکی تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ لوگوں کی معاشرتی حالت بہت بہتر ہو گئی۔ لیکن اس کے بعد کے سالوں میں ایسے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے جن کے باعث حضرت عثمان کو اپنی جان تک سے ہاتھ دھونے پڑے۔

اس دور میں دولت کی فراوانی کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں ایک عجیب تبدیلی آگئی تھی۔ لوگوں کے دلوں میں خوفِ خدا کی جگہ دنیا کی محبت اور مال و دولت کی ہوس جگہ لینے لگی تھی۔ قناعت کی بجائے ختب و دنیا اور تن آسانی نے لوگوں کے ذہنوں میں گھر کر لیا۔ حضرت عمر کے زمانہ جیسی فطرتِ نالی کو اب لوگ خیر باد کہہ چکے تھے چونکہ فتوحات کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اس لئے لوگوں کی توجہ بیرونی معاملات سے ہٹ کر اندرونی مسائل کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ خاندانی اور قبائلی نشیب اور خود غرضیاں نمودار ہو رہی تھیں۔ ذاتی اغراض کو لوگ قومی مفادات پر ترجیح دینے لگے تھے۔ ملک میں ایسی جماعتیں پیدا ہو چکی تھیں جو خلیفہ کے کاموں پر بھی معترض ہونے لگیں۔

آخر کار یہ حالات اس قدر تشویشناک ہوئے کہ اختیارات کو اپنے ہی رعایا کے ہاتھوں شہید ہونا پڑا۔ حضرت عثمان کے آخری زمانہ میں جو فتنہ فساد برپا ہوا اس کی دیر در حقیقت یہی ہے کہ دولت مندی اور قبولِ کثرت نے مسلمانوں میں جی اس کے دو لوازم پیدا کر دیئے جو ہر



قوم میں ایسی حالت میں پیدا ہو جاتے ہیں اور بالآخر اس کے ضعف اور انحطاط کا سبب بن جاتے ہیں۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں سے فرمایا کرتے تھے۔ لَا آخَاذَ بِعَلَيْكُمْ وَالْفَقْرُ كُلُّ آخَاذٍ عَلَيْكُمْ وَالِدُنِيَاءُ مجھے تمہارے فقر و فاقہ سے کوئی خوف نہیں ہے بلکہ تمہاری ونیوی دولت سے ڈرنا ہوں (مومن اور دولت کی اکثریت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ توہی فرائد کے مقابلہ میں ہر فرد اپنے شخصی فزائد کو ترجیح دیتے لگتا ہے جس سے نقص و غنا پیدا ہو جاتا ہے۔ قومی وعدت کا شیرازہ بکھرتا ہے اور انحطاط کا دور شروع ہو جاتا ہے لیکن اس کے علاوہ اس نکتہ و نسا کی پیدائش کے کچھ اور بھی اسباب تھے۔

۱۔ صحابہ کرام کی ونیاس سے پر وہ پوشی | سب سے پہلی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام کی وہ نسل جو فیض نبوت سے براہ راست مستفیض ہوئی تھی ختم ہو چکی تھی۔ جو لوگ موجود تھے وہ پیرانہ سالی کی وجہ سے گزشتہ نسلن ہو گئے تھے اور ان کی اولاد ان کی جگہ لے رہی تھی۔ یہ نوجوانین زہد و تقویٰ، عدل و انصاف۔ حق پسندی و راست بازی میں اپنے بزرگوں سے کمتر تھے اس بنا پر رعایا کے لئے ویسے فرشتہ رحمت ثابت نہ ہوئے جسے ان کے اسلاف تھے۔

۲۔ غیر قریش عرب سرداروں کا حسد | اب تک سلطنت کے اہم معاملات پر قریش چھکے ہوئے تھے۔ مگر فتوحات میں کاروائے نمایاں دکھلانے کے باعث قریش کے علاوہ دوسرے عرب قبائل کے سردار قریش سے ہمسری کا دعویٰ کرنے لگے اور ان سے حسد کرنے لگے۔ اسی سے ملک میں رقابتیں شروع ہو گئیں۔

۳۔ سرداران قریش کا انتشار | حضرت عمر بڑے دورانہ قریش ان تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے میں قریش کے بڑے بڑے سرداروں کو باہر نہ جانے دیا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ لوگ ان کے حکمران خاندان سے



تعلق کی بنا پر ان کی خوشامد کریں گے۔ اور ان کے دل میں حکومت کی ہوس پیدا ہو جائے گی۔  
 حرمان کے درمیان باہمی جنگ و جدل کا باعث بن جائے گی۔ حضرت عثمان نے ان پر سے  
 یہ پابندی اٹھائی۔ قریش سردار تمام مقبوضہ علاقوں میں پھیل گئے۔ مفسد لوگ ان کی  
 آڑے کھینچنے پیدا کرنے لگے۔ مدینہ کی مرکزیت ختم ہو گئی۔ لہجہ۔ کوفہ۔ دمشق قسطنطین  
 وغیرہ اہمیت حاصل کرنے لگے۔

۲۔ مفتوحہ اقوام کے انتقامی جذبات | اگرچہ مقبوضہ علاقوں میں مفتوحہ  
 اقوام کے ساتھ مسلمانوں کا سلوک

نہایت اچھا تھا مگر ان کے دلوں میں انتقامی جذبات موجود تھے۔ چنانچہ انہوں نے  
 وقت کی نزاکت سے فائدہ اٹھا کر سازشوں کا جال پھیلا دیا اور مملکت اسلامیہ میں بدظمی  
 پیدا کر دی۔

۳۔ مروان کے غلط مشورے | حضرت عثمان نے مروان کو اپنا سیکرٹری

مقرر کیا۔ اور اسی کے مشورہ پر عمل کرنے

لگے۔ مروان کسی حد تک قابل اعتماد شخص نہ تھا۔ اس نے اپنے اختیارات کا  
 غلط استعمال شروع کر دیا۔ لوگ یہ سمجھنے لگے یہ بدعنوانیاں حضرت عثمان کر رہے ہیں۔  
 اس لئے لوگ ان سے بدظن ہو گیا۔ شروع ہو گئے۔

بنو ہاشم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

سے منسوب تعلق کی وجہ سے خلافت کو اپنا

۴۔ بنو ہاشم کی رقابت

موردنی حق خیال کرتے تھے۔ اس لئے حضرت عثمان کی خلافت سے خوش نہ تھے۔ بنو ہاشم اور  
 بنو امیہ میں پرانی عداوت چلی آرہی تھی۔ عہد بنوی میں تو یہ مخالفت دب گئی مگر اب پھر ابھرنے  
 لگی اور بنو ہاشم نے حضرت عثمان کی مخالفت شروع کر دی۔

۵۔ حضرت عثمان کا اپنے عزیز و اقارب سے سلوک | حضرت عثمان نہایت ہی شریف



انسان تھے وہ اپنے رشتہ واردوں کا بڑا خیال رکھتے تھے اور ان کی مدد کرتے رہتے تھے۔  
شرارت پسند لوگ خیال کرنے لگے کہ وہ بیت المال کو اپنے خاندان پر صرف کر رہے ہیں۔ اس  
طرح انہوں نے لوگوں کو حضرت عثمان کے خلاف ابھارنا شروع کر دیا۔

خلافت کو کامیاب بنانے کے لئے یہ نہایت  
۸۔ عادل حکام کا فقدان  
فردوری ہے کہ حکومت کے افسر نہایت قابل۔

فرض شناس اور وفادار ہوں۔ بد قسمتی سے حضرت عثمان کو ایسے اہل کار نہ مل سکے۔  
گورنر اپنے کام کو بہتر طریقہ پر انجام نہ دیتے تھے۔ بیشتر افسر خاندان بنو امیہ سے  
تعلق رکھنے کی وجہ سے غفلت اور سستی سے کام لیتے تھے جس سے نظام حکومت بگڑ گیا اور  
حالات بے قابو ہو گئے۔

۹۔ معزول شدہ گورنروں کی مخالفت  
حضرت عثمان نے کچھ گورنروں کو  
بعض وجوہات کی بنا پر ان کے عہدوں

سے معطل کر دیا تھا۔ یہ گورنر حضرت عثمان سے ناراض تھے اور ان کے خلاف کاروائیوں  
کی یا تو بہت افزائی کرتے تھے یا چشم پوشی سے کام لیتے تھے۔

۱۰۔ منافقین کی فتنہ پر داری  
اس زمانے میں عبداللہ بن سبا جیسے منافق  
لوگ موجود تھے جنہوں نے محض اس سے

اسلام قبول کیا تھا کہ اندر ہی اندر مسلمانوں کی وحدت ملی کو منتشر کر دیں۔ ان منافقوں  
نے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا اور مسلمانوں میں فرقہ بندی پیدا کر کے عجیب انتشار  
پیدا کر دیا۔

۱۱۔ حضرت عثمان کی کنبہ پروری  
حضرت عثمان نے غیر اموی گورنروں اور علی  
حکام کو معقول وجوہات کی بنا پر برطرف

کر کے ان کی جگہ اموی گورنروں کو مقرر کیا تھا کیونکہ اموی لوگوں کی صلاحیت پر ان کو



زیادہ اعتماد تھا۔ مخالف لوگ کہنے لگے کہ حضرت عثمان اپنے خاندان کا خیال رکھتے ہیں اور دیگر فائدہ مندوں کی پرزور نہیں کرتے۔ ان لوگوں کو مکتہ چینی کا موقع مل گیا۔

۱۲۔ شرعی قوانین کے الفاظ پر نو مسلموں کی برابری | پہلے خلفاء کی طرح اس عہد میں بھی احکام

شرعیہ کا خیال رکھا جاتا تھا۔ عدل و انصاف میں کسی کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ نو مسلم لوگوں کو یہ باتیں مانگاؤ گزرتی تھیں۔ ان کی نظر میں شرعی احکام کی زیادہ وقعت نہ تھی۔ حضرت عثمان کتاب اللہ اور سنت رسول پر سختی سے عمل کرتے تھے۔ اس وجہ سے یہ نو مسلم ان کے خلاف ہو گئے۔ ایران کے نو مسلم فطرتاً شاہ پرست تھے۔ جب مفسدوں نے اہل بیت کے حقوق کے نام پر تحریک شروع کی تو وہ فوراً اس سے متاثر ہو گئے اور خلافت کو موروثی حق قرار دینے کی جدوجہد کرنے لگے۔

۱۳۔ حضرت عثمان کی نرم مزاجی | بعض مورخین کا خیال ہے کہ ان تمام فتنوں کا اصلی سبب حضرت عثمان

کی نرم مزاجی تھی۔ آپ حد سے زیادہ حلیم تھے۔ وہ اتنی مخالفت کے باوجود نہ چاہتے تھے کہ کسی کلمہ گو کا خون بہایا جائے۔ وہ ہمیشہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے سابقین کے اسوہ حسنہ کو مد نظر رکھتے تھے۔ کئی دفعہ گورنروں نے مشورے دیئے کہ ان فتنوں کو طاقت کے ذریعے دبایا جائے مگر حضرت عثمان کہا کرتے تھے کہ میں مسلمانوں کا خون بہانا نہیں چاہتا۔ اس طرح حضرت عثمان کی شرافت اور فروتنی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے سازشیں شروع کر دیں۔



## عبداللہ بن سبا کی فتنہ انگیزی

تینتیس ۵۳۳ ہجری سے حضرت عثمان کے خلاف ایک سو چھیٹھویں تحریک کا آغاز ہوا۔ اس تحریک کا اصلی بانی عبداللہ بن سبا نامی ایک یہودی تھا۔ یہ بظاہر مسلمان ہو گیا تھا۔ اصلی وطن صنعاء دین تھا۔ اسے ابن سواد بھی کہتے ہیں۔ اس نے چند دن مدینہ میں رہ کر اہل اسلام کے حالات کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد صوبوں میں جا کر عجیب و غریب عقائد ایجاد کر کے پھیلائے۔ اس نے لوگوں کو اپنی چرب زبانی کے ذریعے اپنی طرف مائل کرنا شروع کر دیا۔ اموی عمال کو بدنام کر کے اور خلیفہ کی کشتہ پردی کی داستانیں سننا کہ حضرت عثمان کے خلاف ایک جماعت کھڑی کر دی۔ عبداللہ بن سبا کی یہ تحریک عجم میں زیادہ کامیاب ہوئی۔ عجمی لوگ اپنی شکستوں کا بدلہ لینے کے لئے بے تاب تھے۔ سبائیوں نے اپنی تحریک کو اس طرح پھیلا دیا کہ ملکی فضا کو بدل کر رکھ دیا۔ پہلے عبداللہ بن سبا نے یہ تحریک بصرہ سے شروع کی۔ وہاں سے نکلا گیا تو کوفہ پہنچا اور اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ اس کے بعد وہ شام گیا۔ مگر وہاں حضرت امیر معاویہ نے اسے کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کرنے دی۔ پھر وہ مصر گیا۔ وہاں اس نے سب لوگوں کو گرویدہ بنا لیا۔ اس طرح عبداللہ بن سبا نے تمام سلطنت اسلامیہ میں مسلمانوں کو حضرت عثمان کے خلاف ایسا بھڑکا دیا اور حالات ایسے خراب ہو گئے کہ حضرت عثمان کے لئے ان پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

عبداللہ بن سبا نہایت ہی مکار اور سازش منگھن تھا۔ اس نے اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے مسلمانوں کو بہت سے گمراہ کن عقائد سکھائے۔ اس نے اعلان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے۔ نیز ہر معجزہ کا ایک دوسری



ہوتا ہے اور حضرت علیؑ آنحضرت کے وصی ہیں۔ وہی ان کی جانشینی کے حقدار ہیں حضرت عثمان غاصب ہیں ان کو معزول کر دینا چاہیے اس طرح اس نے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ بہت سے پختہ یقین لوگ بھی اس کے فریب میں آکر حضرت عثمان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ حضرت عثمان کے عمال کے مظالم جھوٹی داستانیں لوگوں کو سننا کہ بہت پر آواز کرنے لگے۔ اس نے حضرت عثمان کے خلاف ایسے ایسے الزام تراشی اور ان پر ایسی تہمتیں لگائیں جو قیاس میں نہیں آسکتی تھیں شروع میں تو لوگوں کو ان پر یقین نہ آتا تھا مگر بعد میں اس نے ایسا پراپیگنڈا کیا کہ بڑے بڑے نیک لوگ بھی اس سے متاثر ہو گئے۔

عبداللہ بن سبآن نے اپنی سرگرمیاں عراق سے شروع کیں۔  
چونکہ ایرانی ہمیشہ سے بادشاہت کے عادی تھے۔ اور وصی

## شورش کا آغاز

کا مسئلہ ان کی فطرت کے عین مطابق تھا اس لئے وہ بہت جلد اس کے حامی بن گئے۔ عراق کے کچھ لوگ جو اپنے عمال سے ناراض تھے وہ بھی شورش میں شریک ہو گئے۔ کوفہ میں سبائی پارٹی نے پہلے دہاں کے والی ولید بن عتبہ کے خلاف شکایت کر کے اسے معزول کرادیا۔ پھر اس کے جانشین سعید بن العاص کو بد نام کر کے حضرت عثمان کو مجبور کیا کہ اس کی جگہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کو کوفہ کا گورنر مقرر کر دیں۔

بصرہ میں اس پارٹی نے ابو موسیٰ اشعری پر قول و فعل کے تضاد کا الزام لگا کر گورنری سے معزول کرادیا۔ جب عبداللہ بن عامر گورنر بنے تو ان کے خلاف شکایتیں کرنے لگے۔ شام میں اگرچہ وہ حضرت معاویہ کے حسن انتظام کے باعث کوئی عملی قدم نہ اٹھاسکے تباہی انہوں نے ایک مقتدر صحابی ابوذر غفاریؓ کو امیر معاویہ کے خلاف بھڑکایا جس کی وجہ سے ابوذر کو شام سے ہٹانا پڑا۔ بصرہ میں تو عبداللہ بن سبائی کی تحریک نے خوب ترقی کی کیونکہ یہاں دو بااثر صحابی محمد بن حذیفہ فسادیوں سے مل گئے اور وہاں کے گورنر عبداللہ بن ابی سرح کے خلاف

کو درغلایا۔



اگرچہ حضرت عثمان لوگوں کے مطالبہ پر گورنروں کو برابر تبدیل کرتے رہے تاہم عراق اور مصر سے بے اطمینانی کی اطلاعات برابر موصول ہوتی ہیں۔ کیونکہ مفسدین نے اس طرح کی شکایات مسلسل بھیجنے کی اسکیم بنائی تھی۔ اس پر مدینہ میں جو صحابہ کرام تھے ان کو تشویش ہوئی اور انہوں نے حضرت عثمان کو مشورہ دیا کہ مختلف صوبوں میں تحقیقاتی وفد بھیجے جائیں۔ چنانچہ محمد بن مسلمہؓ کو کوفہ، اسامہ بن زید کو بصرہ، عبد اللہ بن عمرؓ کو شام اور عمار بن یاسر کو مصر بھیجا گیا۔ تاکہ حقیقت حال کا جائزہ لیں اور رپورٹ بھیجیں۔ پہلے تین صحابہ نے ترقی رپورٹ دی کہ عمال کے خلاف شکایات بالکل بے بنیاد ہیں۔ عمار بن یاسر البتہ مفسدوں کے بہکانے میں آگئے اور انہوں نے شکایات کو درست بتایا۔

حضرت عثمان نے اس تحقیقاتی کمیشن کے علاوہ تمام صوبوں میں احکام بھیجے کہ آئندہ حج کے موقع پر تمام عمال جمع ہوں۔

## عمال کی کانفرنس

تاکہ لوگ ان کے خلاف شکایات پیش کر سکیں۔ جب حج کا موقع آیا اور احکام جمع ہوئے، تو شکایات پیش کرنے والا کوئی بھی موجود نہ تھا۔ حضرت عثمان نے ان عمال سے اس فتنہ کے بارے میں صلاح مشورہ کیا۔ سب نے یہی کہا کہ یہ فساد چند شرارت پسند لوگوں نے پھیلا رکھا ہے۔ اس سازش کا علاج یہ ہے کہ مفسدوں کو سختی سے دبا دیا جائے، اور اس فتنہ کے بانی عبد اللہ بن سبا کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن حضرت عثمان نے اپنی نرم دلی کے باعث یہ مشورہ قبول نہ کیا۔ امیر معاویہؓ نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ ان کے ساتھ شام چلیں جہاں وہ بالکل محفوظ ہوں گے۔ مگر حضرت عثمان نے کہا کہ وہ کسی صورت میں بھی رسول اللہؐ کا قرب نہ چھوڑیں گے۔ اور جب امیر معاویہؓ نے ان کی حفاظت کے لئے ایک شاہی فوج بھیجنے کی پیشکش کی تو آپ نے فرمایا کہ میں اپنی اکیلی جان کے لئے بیتہ المال پر یہ بوجھ نہ ڈالوں گا۔ اس طرح یہ کانفرنس ناکام رہی۔

سبائی پارٹی کا منصوبہ یہ تھا کہ جب عمال حج سے واپس جانے لگیں تو فساد شروع کر



دیا جائے۔ مگر کسی وجہ سے وہ اپنی سکیم میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر سوچ سمجھ کر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کوئٹہ بصرہ اور مصر سے کچھ لوگ دفنوں کی صورت میں مدینہ جائیں۔ بہانہ یہ بنا لیا کہ وہ حکام کی شکایات کرنے جا رہے ہیں تاکہ ان کو کوئی راستہ میں نہ روکے۔ چنانچہ تینوں مقامات سے دفنوں کو مدینہ پہنچا کر شہر سے واپس لے کر آئے۔ حضرت عثمان کو جب ان کی آمد کا اطلاع ملی تو آپ نے کچھ صحابہ کو ان کے پاس بھیجا تاکہ حقیقت حال سے آگاہ کریں۔ یہ صحابہ علیحدہ علیحدہ ہر وفد سے ملے اور حضرت عثمان کو آکر اطلاع دی کہ وہ آپ کی غلطیاں جتلا کر آپ کو خلافت سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ اور اگر آپ نے خلافت سے علیحدگی اختیار نہ کی تو آپ کو قتل کر دیں گے۔ آپ یہ سن کر مسکرائے اور معززین مدینہ کو بلا کر مشورہ کیا۔ انہوں نے یہ رائے دی کہ مفسدوں کو پکڑ کر قتل کر دینا چاہیے تاکہ فتنہ نہیں ختم ہو جائے مگر آپ نے فرمایا کہ ایسا کرنے کے لئے میرے پاس کوئی شرعی جواز نہیں ہے۔ پھر میں یہ کام کیسے کروں بہ اس پر تمام لوگ خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے ان دفنوں کو بلا بھیجا اور صحابہ کبار کے سامنے ان کی شکایات سنیں اور سب کا تسلی بخش جواب دیا۔ مگر فتنہ پردازوں نے ان جوابات کو بڑی بے پروائی سے سنا اور اپنے ارادہ سے باز نہ آئے۔

ان لوگوں نے حضرت عثمان پر جو الزامات تراشے وہ مندرجہ ذیل ہیں :-

## حضرت عثمان کے خلاف الزامات

۱۔ صحابہ کی برطرفی : حضرت عثمان کے خلاف پہلا الزام یہ تھا کہ انہوں نے نامور صحابہ کو برطرف کر کے ان کی جگہ اپنے خاندان کے نوجوان ناخبرہ کار اور نا اہل افراد کو مقرر کیا۔ مثلاً مغیرہ بن شعبہ - ابو موسیٰ اشعری - سعد بن ابی رقاص - عبداللہ بن مسعود - عبداللہ بن ارقم اور عمرو بن العاص کمان کے عہدوں سے علیحدہ کر دیا۔ دراصل اس الزام کی کوئی حقیقت نہ تھی ان لوگوں کی برطرفی کے معقول اسباب تھے۔ اگر معقول وجوہ کا بنا پر حکام کو معزول کرنا گناہ ہے تو بڑے بڑے عادل خلفاء بھی اس گناہ سے مبرا نہیں ہیں۔ حضرت عثمان پر یہ الزام لگایا



گیا کہ انہوں نے نامور صحابہ کو برطرف کیا تو ان کے اسباب یہ تھے۔  
 حضرت مغیرہ بن شعبہ کو حضرت عمر کی وصیت کی بنا پر معزول کیا گیا۔  
 ۲۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری کو معزول کرنے کا سبب اہل بصرہ کی یہ شکایت تھی کہ ان کے قول و فعل میں تضاد پایا جاتا ہے۔

۳۔ سعد بن ابی وقاص کو برطرف کرنے کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے ایک رستم بیت المال سے قرعہ لیا تھا اور منڈاڑ تقاضوں کے باوجود واپس نہیں کی تھی۔

۴۔ عمرو بن العاص کی برطرفی کی وجہ یہ تھی کہ ان کے تحت مصر جیسے زر خیز صوبے کی آمدنی دن بدن گھٹ رہی تھی۔ جب خلیفہ نے اس کا سبب دریافت کیا اور اصلاح کے لئے لکھا تو انہوں نے جواب دیا کہ "اونٹنی اس سے زیادہ دودھ نہیں دے سکتی" لیکن ان کے جانشین عبداللہ بن ابی سرح نے تھوڑے ہی عرصے میں آمدنی گنی کر دی۔ اس کے علاوہ ان پر اسکندریہ کے لوگوں پر سختی کی بھی شکایت تھی۔ اس لئے ان کو معزول کرنا پڑا۔

۵۔ حضرت عبداللہ بن ارقم ناظم بیت المال کی برطرفی ضعف پیری اور کمزوری کی وجہ سے تھی۔ یہ الزام کہ ان اصحاب کی جگہ نا تجربہ کار نوجوان مقرر کئے گئے تو واقعات نشاہد ہیں کہ حضرت عثمان نے جن اصحاب کو عہدوں پر مقرر کیا تھا وہ سب تیریں اشخاص تھے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ رگ نوجوان تھے لیکن عہدہ کے لئے انتخاب اپنی اہلیت کی بنا پر ہوتا ہے نہ کہ عمر کے لحاظ سے۔ حتیٰ تو یہ ہے کہ آپ کے مقرر کردہ نوجوان والی مثلاً ولید بن عقبہ سعید بن العاص عبداللہ بن عامر اگرچہ صحابہ کرام کی طرح زہد و تقویٰ کا جوہر نہ رکھتے تھے مگر لائق جانشین تھے۔ ان لوگوں کی کوشش سے شرق و مغرب میں ہر طرف اسلامی سلطنت وسیع ہو گئی اس کے علاوہ اس زمانہ تک بیشتر صحابہ پیرانہ سالی کے باعث اہم وزارتیں سنبھالنے کے قابل نہ رہے تھے۔ ان کی جگہ بہر حال نوجوان لوگ ہی لے سکتے تھے۔

۲۔ کتبہ پوری | مفیدین کا یہ الزام کہ آپ اپنے خاندان کے افراد کا بہت



خیال رکھتے ہیں اور ان کو بڑے عہدوں پر فائز کرتے ہیں بالکل بے کار تھا۔ اگر حضرت عثمان کے خاندان کے کچھ افراد قابل تھے اور انہیں دوسروں کے حقوق کو نظر انداز کے بغیر حکومت کے اہم عہدوں کے لئے منتخب کر لیا گیا تو اس میں کیا برائی تھی۔ حضرت عثمان نے ہمیشہ اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ اپنے کنبہ والوں کی سرپرستی کرتے ہیں اور اپنی گروہ سے ان کی امداد کرتے ہیں۔ اس کی دلیل میں وہ یہ فرماتے کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام قبائل عرب کے مقابلہ میں قریش کا خیال نہیں رکھتے تھے؟ اور بنو ہاشم کی خاص طور سے اعانت نہیں کرتے تھے؟

۳۔ معزز صحابہ سے بدسلوکی | مفسدین کا تیسرا الزام یہ تھا کہ حضرت عثمان نے معزز صحابہ مثلاً ابوذر غفاری، عمار بن یاسر

اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کے ساتھ نا انصافی کی۔ مگر یہ الزام بھی بے بنیاد ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کو جلاوطن نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ خود ہی ایک دیوانہ میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ عمار بن یاسر کے ساتھ سختی کی وجہ یہ تھی کہ وہ سبائی جماعت کے ہم خیال ہو گئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کا وظیفہ اس لئے بند کر دیا گیا کہ حضرت عثمان تمام مسلمانوں کو ایک قرآن پر متحد کرنا چاہتے تھے۔ مگر انہوں نے اس کام میں رکاوٹ ڈالی تھی اور اپنا نسخہ قرآن جو اصل قرآن سے کچھ مختلف تھا۔ تلف کرنے پر رضامند نہ ہوئے۔

۴۔ بیت المال کا غلط استعمال | چوتھا الزام یہ تھا کہ آپ بیت المال کا مال بیجا طور پر صرف کرتے اور اپنے خاندان

والوں کو بھاری وظیفے دیتے ہیں لیکن یہ الزام بھی درست نہیں کیونکہ جتنے واقعات بھی اس کے ثبوت میں پیش کئے گئے وہ سب جھوٹے تھے۔ پھر حضرت عثمان جیسے تو نگہ اور دولت مند شخص ایسا کام بھلا کب روا رکھ سکتے ہیں۔ انہوں نے رشتہ داروں کو جو کچھ دیا وہ اپنی گروہ سے دیا۔ بیت المال سے ایک کوڑی تک نہ لی۔ اور اگر کسی دولت کوئی غلط تقسیم ہو بھی جاتی تو اس کا فوراً ازالہ کر دیا کرتے تھے۔ حکم بن عاص اور عبداللہ بن خالد کو جو رقم دی گئی وہ آپ نے



خود اپنے پاس سے دی تھیں۔ مروان کو خمس دینے کا واقعہ بھی بہتان تھا۔ مروان نے یہ حصہ خریدا تھا۔ عبداللہ بن ابی سرح کو آپ نے خمس کا جو حصہ دیا تھا اس کا مقصد ان کی حوصلہ افزائی کرنا تھا۔ مگر جب اس پر اعتراض ہوا تو رقم واپس لے لی گئی۔

۵۔ بیع کی چراگاہ مفسدین نے پھر یہ الزام لگایا کہ بیع کی چراگاہ کو آپ نے اپنے لئے مخصوص کر لیا اور عام لوگوں کو اس سے فائدہ

انھانے سے روک دیا۔ لیکن اس الزام کی بھی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ یہ چراگاہ عہد فاروقی ہی سے ہریت المال کے مویشیوں کے لئے استعمال ہوتی تھی۔

۶۔ اموی عمال کا محاسبہ نہ کرنا شورش پسندوں کا یہ الزام کہ آپ نے مجرموں پر شرعی حدود جاری کرنے میں

غفلت برتی۔ بالکل بے معنی تھا۔ عبداللہ بن سبا کے ساتھیوں نے دو واقعات اس کی دلیل میں پیش کئے۔ اول یہ کہ عبید اللہ بن عمر بنہ سے ہرمزان کے قتل کا بدلہ نہیں لیا گیا تھا۔ دوسرے ولید بن عقبہ والی کوفہ پر شراب خوری کی حد جاری کرنے میں تاخیر برتی گئی۔ پہلے واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ عبید اللہ بن عمر نے ایک نو مسلم ایرانی ہرمزان کو اس شبہ میں قتل کر دیا تھا کہ حضرت عمر بنہ کے قتل کرنے میں اس کا ہاتھ تھا۔ سوائے حضرت علی ان کے تمام صحابہ نے حضرت عبید اللہ کو اس کے بدلے میں موت کے گھاٹے اتارنا خلاف مصلحت سمجھا اور حضرت عثمان نے اپنی گردہ سے خون بہا کی رسم ادا کر دی تھی۔ دوسرا واقعہ ولید بن عقبہ کے شراب پینے کے متعلق مصدقہ شہادتیں بہت دیر بعد ملی تھیں اس وجہ سے تفتیش میں دیر ہو گئی اور جلد کوئی شرعی حد جاری نہ ہو سکی۔

۷۔ اقارب و ابعزہ میں تقسیم اراضی مفسدوں نے آپ پر یہ الزام بھی

تراشا کہ آپ اپنے عزیزوں اور

دوستوں کو اطراف ملک میں زمینیں عطا کرتے ہیں اس الزام کی حقیقت یہ تھی کہ آپ کے



عہد میں بہت سے اہل مین گھر بار چھوڑ کر مدینہ چلے آئے تھے۔ آپ نے ان لوگوں کی آباد کاری کے لئے زمین کے قطعے دے دئے تھے اور اس کے بدلے میں ان کی زمینیں لے لی تھیں۔ عراق میں کچھ زمین غیر آباد تھی بعض لوگوں نے اس کو قابل کاشت بنایا۔ حضرت عثمان نے ان لوگوں کو اس کا مالک بنا دیا۔

۸۔ بدعات کی ترویج

مذہب میں بدعات کو رواج دینے کا الزام نہایت لغو اور بے بنیاد ہے۔ اتیانِ شہادت حضرت عثمان

کا مقصد حیات تھا۔ مفسدین نے الزام لگایا تھا کہ حضرت عثمان مرتیٰ ہیں دو گانہ کے بجائے چار رکعت پڑھتے ہیں۔ حالانکہ حضرت عثمان شریعی دلائل کی بنا پر مرتیٰ ہیں پوری نماز پڑھتے تھے اور نقر کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ جب صحابہ نے اس کو بدعت پر محمول کر کے اس پر اعتراض کیا تو حضرت عثمان نے بھرے مجمعے میں چار رکعت نماز پڑھنے کی حسب ذیل وجہ بیان کی۔

”صاحبو! جب میں مکہ پہنچا تو یہاں اقامت کی نیت کر لی۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ جو شخص کسی بھٹ میں اقامت کی نیت کرے اس کو مقیم کی طرح نماز پڑھنا چاہیے۔“

ومنہ احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۶۲

۹۔ نسخہ ہائے قرآن کو جلانا

حضرت عثمان کے خلاف یہ الزام بھی لگایا گیا تھا کہ انہوں نے ایک قرآن کے علاوہ سب قرآنوں کو جلا ڈالا لیکن

یہ ایک عظیم اسلامی خدمت تھی کہ آپ نے لوگوں کو ایک بہت بڑے فتنہ سے بچالیا۔ اگر آپ ایسا نہ کرتے تو آج ایک قرآن کی بجائے مسلمان کئی قرآنوں کے پیرو ہوتے اور آپس میں طرح طرح کے اختلافات پیدا ہو جاتے۔

۱۰۔ حکم کو مدینہ جلاتا

حضرت عثمان پر ایک الزام یہ بھی تھا کہ آپ نے حکم بن عاص کو جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف جلاوطن

کیا ہوا تھا واپس بلا لیا۔ اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم بن عاص کو



طاہر جلا وطن کیا تھا لیکن آپ نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں حضرت عثمان کی سفارش سے مدینہ  
آئے، اجازت دیدی تھی۔ چونکہ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کو آنحضرتؐ کی اجازت کا علم نہ تھا اس لیے  
انہوں نے حکم کو مدینہ آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ جب حضرت عثمان نے عنانِ خلافت ہاتھ  
لی تو اپنے ذاتی عام کی بنا پر ان کو مدینہ بلا لیا۔ ان کے رط کے مروان سے اپنی ایک صاحبزادی  
فاز کاج کو دیا اور صلہ رحم کے طور پر حبیب خاص سے حکم کو ایک لاکھ درہم عطا فرمائے۔  
نیز مروان کو جہیز میں ایک لاکھ درہم کا عطیہ مرحمت فرمایا۔ اصل واقعہ کو مفسدین نے  
تور مردہ کر پیش کیا۔

جب ان دنوں نے اعتراضات کے معقول جواب سنے تو خاموش ہو گئے مگر قائل نہ  
ہوئے اس وقت تو بظاہر وہ مطمئن ہو کر چلے گئے مگر اپنی شہر پسندی پر قائم رہے۔ اور  
حضرت عثمان اس بے اطمینانی کو دور کرنے کی تدابیر سوچنے میں مشغول ہو گئے۔ اور  
شورش پسندوں نے فیصلہ کن قدم اٹھانے کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں شروع  
کر دیں۔

انقلاب کی کوشش

اور دربار خلافت میں اصلاحات کی تجویزیں پیش  
ہو رہی تھیں۔ دوسری طرف ملک میں ایک عظیم الشان  
انقلاب کی سازش مکمل ہو چکی تھی۔ چنانچہ بصرہ۔ کوفہ اور مہر کے فتنہ پردازوں نے آپس  
میں ملے کر کے اپنے اپنے شہر سے حاجیوں کی وضع میں مدینہ کا رخ کیا تاکہ جبراً حضرت  
عثمان سے اپنے مطالبات تسلیم کرائیں۔ (کامل ابن اثیر صفحہ ۱۲۵)

مدینہ کے قریب پہنچ کر شہر سے دو تین میل کے فاصلہ پر قیام کیا۔ چند آدمی جو اس  
جماعت کے سرکردہ تھے، باری باری حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت سعد بن ابی وقاص  
اور حضرت علیؓ کے پاس گئے کہ وہ اپنی رسالت سے معاملہ کا تصفیہ کرا دیں۔ لیکن سب  
نے اس جھگڑے میں پڑنے سے انکار کیا۔ حضرت عثمانؓ نے چونکہ فتنہ زدنا د کو دہانا چاہتے



تھے اس لئے حضرت علیؑ کو بلا کر کہا کہ آپ اس جماعت کو راضی کر کے واپس کر دیجئے۔ میں  
جائز مطالبات تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں چنانچہ حضرت علیؑ کی وساطت سے مفسدین واپس  
چلے گئے۔  
(ابن اثیر)

اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے جمعہ کے روز مسجد میں خطبہ دیا اور تینا زعمہ امور پر روشنی ڈالی۔  
لوگ بڑے خوش ہوئے کہ اب مدینہ میں امن قائم ہو جائے گا۔ لگ رہے امید بڑھ آئی۔ ایک دن اچانک  
مدینہ کی گلیوں میں تکبیر کے نعروں اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے نثر قیامت برپا ہو گیا۔ کبار صحابہ  
گھبرا کر گھروں سے نکل آئے۔ دیکھا کہ مفسدین کی جماعت پھر واپس آگئی ہے اور انتقام  
انتقام کی صدا میں بلند ہو رہی ہیں۔ حضرت علیؑ نے آگے بڑھ کر واپس آنے کا سبب دریافت  
کیا۔ مصریوں نے کہا کہ راہ میں دربار خلافت کا ایک قاصد ملا جو نہایت تیزی سے بھڑ جا رہا تھا  
اس کی مشتبہ حالت سے بدگمانی پیدا ہوئی اور خیالی ہوا کہ ضرور ہم لوگوں کے متعلق داعی مصر  
کے پاس احکام بھیجے جا رہے ہیں۔ تلاشی لی گئی تو ایک ایسا فرمان برآمد ہوا جس میں ہدایت  
کی گئی تھی کہ ہم لوگوں کو قتل کر دیا جائے۔ اس لئے ہم اس بد عہدی اور فریب کاری کا  
انتقام لینے آئے ہیں۔

حضرت عثمانؓ کو اس واقعہ سے آگاہ  
کیا گیا۔ تو آپ نے حیرت کے ساتھ اپنی

### خلافت سے علیؑ کی کا مطالبہ

لا علمی ظاہر کی اور قسم کھا کر کہا مجھے مطلقاً اس خط کی اطلاع نہیں ہے۔ حضرت عثمانؓ کے اہلیہ  
انکار پر لوگوں نے قیاس کیا کہ یقیناً یہ مردان کی شرارت ہے مصریوں نے کہا کچھ جی ہو  
خلیفہ اس قدر غافل ہو کہ اس کی لاعلمی میں ایسے امور پیش آجائیں اور ایسے خبر نہ ہو وہ کس  
طرح خلافت کا اہل ہو سکتا ہے؟ اور حضرت عثمانؓ سے مسند خلافت سے الگ ہو جانے کا  
مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا جب تک مجھ میں جان باقی ہے میں اس خلافت کو جو خدا نے  
مجھے پہنچایا ہے خود اپنے ہاتھوں سے نہیں اتاروں گا اور حضور ﷺ کی وصیت



کے مطابق اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک صبروں کا۔ (طبقات ابن سعد)

حضرت عثمان کے انکار پر مفسدین نے جن کی تعداد تقریباً پانچ سو تھی کاشا نہ خلافت کا نہایت سخت محاصرہ کر لیا یہ محاصرہ چالیس دن تک مسلسل قائم رہا۔ اس عرصہ میں اندر پانی تک پہنچانا جرم تھا۔ حضرت علی اور دیگر صحابہ نے اذن جنگ مانگا۔ لیکن آپ نے برابر انکار فرمایا اور کہا میں وہ خلیفہ نہیں بننا چاہتا جو مسلمانوں کا خون بہا سکے۔ ایک دفعہ ام المومنین حضرت ام حبیبہ نے اپنے ساتھ کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے کر حضرت عثمان تک پہنچنے کی کوشش کی مگر مفسدین کے قلوب ندر ایمانی سے خالی ہو چکے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم محترم کا بھی پاس و محاذ نہ کیا اور گستاخی کے ساتھ مزاحمت کر کے واپس کر دیا۔ (تاریخ طبری)

## حضرت عثمان کا محاصرہ

ہمسایہ گھروں سے کبھی کبھی رسد اور پانی کی آمد و پہنچ جاتی تھی۔ مفسدین کی جرات اس قدر بڑھ گئی تھی کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن سلام - ابو ہریرہ - سعد بن ابی وقاص اور زید بن ابی اسحاق رضی اللہ عنہم جیسے اکابر صحابہ کی بھی تدوین کی اور ان کی ایک نہ سنی۔ حضرت علی نے حضرت عثمان کے بلانے پر ان کے گھر کے اندر جانا چاہا تو لوگوں نے ان کو روک دیا۔ آپ نے مجبور ہو کر اپنا سیاہ عمامہ اتار کر قاصد کو دے دیا اور کہا جو حالت ہے اس کو دیکھ لو اور بیان کرو۔ (طبقات ابن سعد جلد ۱)

کاشا نہ خلافت کا محاصرہ کرنے والے باغیوں کو مقتد و دفعہ حضرت عثمان نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ان کے سامنے موثر تقریریں کیں۔ حضرت ابی بن کعب نے بھی تقریر کی مگر ان لوگوں پر کچھ اثر نہ ہوا۔ حضرت عثمان نے چھتے کے آدھے سے مجموع کر یوں مخاطب فرمایا۔

و کیا تمہیں معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو مسجد تنگ تھی۔ آپ نے فرمایا کہ ان زمین کو خرید کر وقف کرے گا، اس کے صلہ میں اس کو سزا سے بچا جائے گا۔ تمہیں دیکھ کر تمہیں اس کے حکم کی تعمیل کی۔ یہ کیا ایسی مسجد میں تم۔ تمہیں نہ انداز پڑھے نہیں دیتے۔ تم کو خدا کی قسم دیتا ہوں تاؤ کیا تم جانتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو



اس میں رومہ کے سوا بیٹھے پانی کا کوئی کنواں نہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ کون اس کو خرید کر عام مسلمانوں پر وقف کرتا ہے؟ اور اس سے بہتر اس کو حنت میں لے گا۔ تو میں نے ہی اس کی تحصیل کی۔ تو کیا اسی کے پانی پینے سے مجھے محروم کر رہے ہو۔ کیا تم جانتے ہو کہ تبرک کے لشکر کو میں نے ہی ساز و سامان سے آراستہ کیا تھا؟۔ سب نے جواب دیا خدا کی قسم یہ سب باتیں سچ ہیں۔ مگر سنگدلوں پر اس کا بھی اثر نہ ہوا۔ پھر فرمایا میں تم کو خدا کی قسم دیتا ہوں تم میں کسی کو یاد ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑ پر چڑھے تو پہاڑ ملنے لگا۔ آپ نے پہاڑ کو پاؤں سے ٹھوکر مار کر فرمایا اے حرا! ٹھٹھریا تیری پشت پر اس وقت ایک نبی۔ ایک صدیق۔ اور ایک شہید ہے اور میں آپ کے ساتھ تھا۔ لوگوں نے کہا یاد ہے۔ پھر فرمایا تمہیں خدا کا واسطہ دیتا ہوں بتاؤ کہ حدیبیہ میں مجھے آپ نے مکہ کا سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ تو کیا خود آپ نے دست مبارک کو میرا ہاتھ قرار نہیں دیا تھا؟ اور میری طرف سے خود ہی بیعت نہیں کی؟ سب نے کہا سچ ہے۔

(مسند امام احمد بن حنبل جلد اول ص ۷۷۷ نیز بخاری و ترمذی)

## شہادت

حضرت عثمان کا گھر بہت وسیع تھا۔ گھر میں صحابہ اور عام مسلمانوں کی خاصی جمعیت موجود تھی۔ جس کی تعداد سات سو تھی۔ اس جمعیت کے

سردار حضرت زبیرؓ، بہادر صاحبزادے حضرت عبداللہؓ بن زبیر تھے۔ وہ حضرت عثمان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اے امیر المؤمنین! اس وقت گھر کے اندر ہماری خاصی تعداد ہے۔ اجازت ہو تو بنان باغیوں سے لڑوں۔ فرمایا اگر ایک شخص کا بھی ارادہ ہو تو میں اس کو ذرا کا واسطہ دیتا ہوں کہ وہ میرے لئے اپنا خون نہ بہائے۔

(طبقات ابن سعد جلد ۳)

گھر میں اس وقت بیس غلام تھے ان کو بھی بلا کر آزاد کر دیا۔ حضرت زبیر بن ثابت نے آ کر عرض کیا امیر المؤمنین! انصار دروازہ پر کھڑے اجازت کے منتظر ہیں کہ وہ دوبارہ اپنے کارخانے



دکھائیں۔ فرمایا اگر لڑائی مقصود ہے تو اجازت نہ دوں گا۔ طبقات ابن سعد جلد ۱ ص ۲۸  
 اس وقت میرا سب سے بڑا مددگار وہ ہے جو میری مدافعت میں تلوار نہ اٹھائے۔ حضرت ابو بکرؓ  
 نے اجازت مانگی تو فرمایا اے ابو بکرؓ! کیا تمہیں پسند آئے گا کہ تم تمام دنیا کو اور ساتھ ہی مجھے  
 بھی قتل کر دو۔ عرض کی نہیں۔ فرمایا اگر تم نے ایک شخص کو بھی قتل کیا تو گریبا سب قتل ہو گئے۔  
 ابو بکرؓ یہ سن کر لوٹ آئے۔ (طبقات ابن سعد)

ذرا بچہ کا ہمینہ تھا اور جمعہ کا روز۔ حج پر ابھی تین چار روز ہی گزرے تھے۔ حضرت عثمان  
 روزہ سے تھے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکرؓ وہاں  
 رہے ہیں کہ عثمانؓ صبر کیجئے۔ آج آپ ہمارے پاس افطار کریں گے۔ آپ سمجھ گئے کہ آج سفرِ آخرت  
 کا دن ہے۔ آپ ویسے تہمذ بانڈھتے تھے پانچ ماہ لنگا کر پہنا کہ شہادت کے وقت ستر نہ کھل  
 جائے۔ غلاموں کو آزاد کیا اور قرآن کھول کر تلاوت میں مصروف ہو گئے۔ باغیوں کے لئے  
 روزانہ سے داخل ہونا ممکن نہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ چاہتے بھی نہ تھے کہ قاتلوں کا سراغ ملے۔

کچھ آدمی عصر کے وقت چوری سے پیچھے کی طرف سے چھت سے گزر کر آپ کے پاس پہنچے۔  
 ان میں حضرت ابو بکرؓ کے چھوٹے صاحبزادے محمد بن ابی بکرؓ بھی تھے۔ یہ حضرت علیؓ کی اغوش  
 تربیت میں پلے تھے۔ یہ کسی بڑے عہدے کے طلبگار تھے جس کے نہ ملنے سے حضرت عثمانؓ کے  
 دشمن بن گئے تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر حضرت عثمانؓ کی ریش مبارک پکڑ لی اور زور سے کھینچی۔

حضرت عثمانؓ نے فرمایا بھتیجے! اگر تمہارے والد زندہ ہوتے تو انکو یہ فعل پسند نہ آتا۔ یہ سن کر محمد بن  
 ابی بکرؓ شرمناک رہنے لگے۔ ایک دوسرے شخص کینا نہ بن لپٹنے آگے بڑھ کر پیشانی مبارک پر  
 لوہے کی سلاح اس زور سے ماری کہ پہلو کے بل گر پڑے۔ اس وقت بھی زبان سے بسم اللہ  
 تو کلت علی اللہ، نکلا۔ سودان بن حمران مراری نے کاری ضرب رکائی جس سے خون کا  
 نوارہ جاری ہو گیا۔ ایک اور سنگدل عمرو بن احنس سینہ پر چڑھ بیٹھا اور حسمہ کے مختلف حصوں پر پے  
 درپے نیزوں کے نو زخم لگائے۔ کسی بد بخت نے بڑھ کر تلوار کا دار کیا۔ وفادار بیوی حضرت نائکہؓ



نے جو پاس ہی بیٹھی تھیں ہاتھ پر روکائیں انگلیاں کٹ کر لگ کر گئیں۔ اس دار نے ڈوانورین کی شمع حیات بجھا دی۔ اس بکسی کی موت پر سب دنیا نے ماتم کیا۔ کائنات ارضی و سماوی نے خون ناحق پر آنسو بہائے۔ کارکنانِ نضا و قدر نے کہا جو خون آشام تلوار آج بے نیام ہوئی ہے۔ وہ قیامت تک بے نیام رہے گی۔ اور نقشہ و نساو کا جو دروازہ کھلا ہے وہ حشر تک کھلا رہے گا۔  
(صحیح بخاری کتاب الفتن)

شہادت کے وقت حضرت عثمان نے قرآن کریم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جمعہ کے دن عصر کے وقت شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ دو دن تک لاش بے گور و کفن پڑی رہی۔ حرم رسول میں قیامت برپا تھی۔ باغیوں کی حکومت تھی۔ ان کے خوف سے کسی کو علانیہ دفن کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ہفتہ کا دن گزر گیا تو رات کو چند آدمیوں نے پتھیلی پر جان رکھ کر تھیز تھکفین کی بہت کی اور غسل دیئے بغیر اسی طرح خون آلود پیراہن میں شہیدِ منظم کا جنازہ اٹھایا اور کل کھترہ آدمیوں نے کابل سے مراکش تک کے مزاروں کے جنازہ کی نماز پڑھی۔ مسند ابن صنبل کی روایت کے مطابق حضرت زبیر نے اور بروایت طبقات ابن سعد حضرت جعفیہ بن مسلم نے نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ کا مزار مبارک جنت البقیع کے قبرستان کے آخری حصہ میں آج بھی موجود ہے۔

(مسند ابن صنبل جلد ۱ ص ۷۷)

حضرت عثمان کی شہادت تاریخ اسلام کا بہت بڑا المیہ ہے۔ آپ کی شہادت نے وحدت

## شہادتِ عثمانی کا ردِ عمل

تلی کو پارہ پارہ کر دیا۔ اتحاد اور شیرازہ بندی کا خاتمہ ہو گیا۔ شہادت سے ایک دو دن پہلے آپ نے باغیوں سے کہا تھا ”یاد رکھو بخدا اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو قیامت تک ایک ساتھ نماز نہ پڑھ سکو گے۔ آپ کا یہ فرقہ حروفِ بے حروف دست بکلا مسلمان گرد ہوں اور فرقوں میں بڑے مسلمانوں کی تلواریں اپنے ہی بھائیوں کے خلاف بے نیام ہو گئیں۔ شیعہ مسنی خارجی اور فاضی فرقے بن گئے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ اسلامی فتوحات کے لئے یہ تفریق بہت نقصان دہ ثابت ہوئی۔“



فتوحات کا قدم رک گیا۔ خانہ جنگی اسلامی قوت کے زوال کا باعث بنی۔ وہی قومیں جو مسلمانوں کے نام سے کانپ اٹھتی تھیں۔ باہمی خانہ جنگی کے باعث دلیر ہو گئیں اور انھیں جب کبھی موقع ملا مسلمانوں سے اپنا بدلہ دل کھول کر لیا۔ اسلام میں ایک ایسا رخنہ پیدا ہوا جو پھر کبھی بند نہ کیا جاسکا۔ اگر یہ شہادت واقع نہ ہوتی تو اسلامی سلطنت کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور مسلمانوں کی قوت کبھی نہ کھلتی۔ اس شہادت نے خلیفہ کا وقار ختم کر دیا۔ اس کے باعث حضرت علی کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ نبو امیہ نے حضرت عثمان کے قصاص کا مسئلہ کھڑا کر دیا اور اس لغزہ کو استعمال کر کے وہ برسرِ اقتدار آگئے۔

## حضرت عثمان کی سیرت و سیاست

حضرت عثمان فطرتاً بڑے پاکباز، نیک دل، دیانت دار اور راست باز تھے۔ حیا اور حمد لی ان کی خاص نشان تھی۔ حضرت عثمان طیباً فیض

### سیرت عثمان

اور سخی تھے۔ آپ اپنی فیاضی اور سخاوت کے باعث بڑے ہر دل عزیز اور مقبول خاص و عام تھے۔ دورِ جاہلیت میں جب کہ عرب کا ہر بچہ مست شراب رہتا تھا اس وقت بھی عثمان ذرا نوریں کی زبان بادۂ گلگوں کی ذوق آشنا نہ تھی۔ جب کذب، افتراء اور فسق و فجور عالمگیر تھا، آپ کا دامن ان وقتوں سے آلود نہیں ہوا۔

خوف نہ اتمامِ محاسن کا سرِ پشم ہے حضرت عثمان اکثر خوفِ خداوندی سے آبدیدہ رہتے تھے۔ موت۔ تیز اور عاقبت کا خیال ہمیشہ دماغ پر رہتا۔ سامنے سے جنازہ گزرتا تو کھڑے ہو جاتے اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔ قبروں سے گزرتے تو اس قدر روتے کہ واڑھی تر ہو جاتی۔ آپ کی حیا واری ضرب المثل کی حد تک مشہور ہے۔ نہ بند غسلیاں ہیں بھی ہتھکڑیاں باندھ کر نہاتے تھے۔ محاکم کے دوران آپ کی زبان سے کوئی ایسی بات نہیں



نکلی جو قابل الزام ہو ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ عثمان کی حیات سے زلفتیں بھی شرماتے ہیں۔

(مسند احمد صحیح مسلم)

حضرت عثمان بدر کے سوا تمام غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہے۔ حضرت کا ادب و احترام اس قدر ملحوظ تھا کہ جس ہاتھ سے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی تھی پھر اس کو نجاست یا محل نجاست سے مس نہ ہونے دیا۔ (کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۳۷۶)

اہل بیت نبوی اور ازواج مطہرات کا خاص خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ اپنے عہد خلافت میں جب لوگوں کے وظائف مقرر کئے تو ازواج مطہرات کا روزیہ سب سے زیادہ مقرر کیا۔ (تاریخ طبری)

سنت نبوی کے نشیدائی تھے۔ اپنے ہر قول و فعل یہاں تک کہ حرکات و سکنات اور اتفاق باتوں میں بھی محبوب آقا کی اتباع کو پیش نظر رکھتے تھے۔ ایک دفعہ وضو کر کے مسکرائے رگوں نے اس بے موقع تبسم کی وجہ پوچھی۔ فرمایا میں نے ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی عرج وضو کے بعد مسکراتے دیکھا تھا۔ (مسند ابن حنبل جلد ۱ صفحہ ۵۶)

آپ صبر و تحمل کا پیکر تھے۔ مصائبِ آلام کو نہایت صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرتے تھے۔ شہادت کے موقع پر چالیس دن تک جس بڑے باری ضبط اور تحمل کا اظہار آپ کی ذات سے ہوا وہ اپنی آپ نظیر ہے۔

ذاتی حالات | آپ خوبصورت اور بارعب تھے رنگ گدھی قد معتدل ناک بلند رخسارے پر گوشت اور ان پر چھپک کے ہلکے ہلکے فرغ تھے۔

ڈاڑھی گھنی اور طویل۔ سر کے بال گھنے اور بڑے بڑے۔ بعض روایات کے مطابق بالوں میں خصا ب فرماتے تھے۔ دانت پیوستہ اور چمکدار تھے۔

لباس | آپ خوش لباس تھے لیکن اس میں تکلف کو دخل نہیں ہوتا تھا۔ ایسے لباس سے پرہیز کرتے تھے جس سے مزاج میں غرور تکبر اور



خود بینی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ تمام عمر اچھا نہ نہیں پہنا۔ صرف شہادت کے وقت  
ستر کے خیال سے پہن لیا تھا۔ عمدتاً تہمت باندھا کرتے تھے۔

مختلف اوقات میں مقتدر و شادیاں کیں۔ پہلی بیوی آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ تھیں۔ عیسیٰ کی ہجرت میں وہ

## ازواج و اولاد

آپ کے ساتھ تھیں۔ داپس آ کر مدینہ منورہ کی ہجرت میں شریک ہوئیں مدینہ میں ایک سال زندہ رہیں۔

۳۰ء میں غزوہ بدر کے مرتب پر وفات پائی۔ ان سے عبداللہ نام ایک فرزند تولد ہوا تھا جس

نے بچپن ہی میں وفات پائی۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چھوٹی صاحبزادی حضرت ام

کلثوم سے ۳۰ء میں نکاح ہوا۔ انھوں نے بھی نکاح کے چھ سات برس بعد ۳۹ء میں وفات

پائی۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے آٹھ نکاح کئے۔ کئی صاحبزاد

ہوئے جن میں سے حضرت ابان نے کافی شہرت حاصل کی۔ انہوں نے اموی عہد خلافت میں خاصہ

اعزاز حاصل کیا۔

خلافت عثمانی میں ممالک عروسہ کا دائرہ بہت

وسیع ہوا۔ افریقہ میں طرابلس برتہ اور مراکش

## سیاست اور کارنامے

فتح ہوئے۔ ایران کی فتح تکمیل کو پہنچی۔ افغانستان۔ خراسان اور ترکستان کا ایک حصہ زیر نگین

ہوا۔ دوسری طرف آرمینیا اور آذربائیجان فتح ہو کر اسلامی سرحد کوہ قاف تک پھیل گئی۔ اسی

طرح ایشیا کے کوچک کا ایک وسیع خطہ ملک شام میں شامل کر لیا گیا۔ بحری فتوحات کا آغاز

حضرت عثمان کے عہد خلافت سے ہوا۔ ذوالنورین کی اولوالعزمی نے خطرات سے بے پردا ہو کر

ایک عظیم الشان بڑا تیاری کر کے جزیرہ قبرص پر اسلامی چھریا بلند کیا آپ کے ارادے سے

اتنے بلند تھے کہ آپ نے بندھ میں ایک تحقیقاتی وفد بھیجا تاکہ اس سرزمین کی آبرو ہوا

پیداوار اور لوگوں کے حالات کا جائزہ لے سکیں۔ اس وفد کی رپورٹ چنداں بہت اذرا

نہ تھی اس لیے فتح سندھ کا منصوبہ عارضی طور پر ملتوی کر دیا گیا۔



## حفاظتِ قرآن

قرآن کریم کی حفاظت کے سلسلہ میں آپ نے جو خدمت سرانجام دی وہ تاریخ اسلام کا زرین باب ہے۔ حضرت عثمان کے عہد میں ایک صحابی حضرت حذیفہ بن یمان نے جنگی جہات کے دوران میں یہ دیکھا کہ قبائل میں قراءت کا اختلاف بہت بڑھ گیا ہے۔ انہوں نے خیال کیا کہ اگر اس کا تدارک نہ کیا گیا تو تفرقہ انگیز نتائج رونما ہونگے۔ واپس آ کر حضرت عثمان سے تذکرہ کیا۔ آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا سب نے اتفاق ہو کر کہا کہ آیت کو ایک قراءت پر جمع کرنا چاہیے۔ حضرت عثمان نے ام المومنین حضرت حفصہ کے گھر سے قرآن کریم کا وہ نسخہ منگوایا جو حضرت ابوبکر کے عہد میں لکھا گیا تھا۔ چند اشخاص کا ایک بڑا مقرر کیا کہ اس سے نقل کر کے قرآن حکیم کے نسخے تخریر کریں۔ انہیں حکم دیا کہ ان میں جہاں اختلاف پیدا ہو تو قریش کی بولی کے مطابق لکھیں۔ آپ نے متعدد نسخے تیار کروائے اور مملکت کے سب حصوں میں بھجوادئے۔ پھر سابقہ نسخے تھے ان کے بارہ میں حکم دیا کہ جہاں کہیں ہوں انہیں جلا دیا جائے تاکہ اختلاف کا احتمال نہ رہے۔

(ابن اثیر - ترمذی - القہرست لابن السدی)

آپ کا نظام حکومت تقریباً وہی تھا جو فاروق اعظم نے قائم کیا تھا۔ اقتصادی لحاظ سے ملک میں بڑی ترقی ہوئی اور آمدنی بہت بڑھ گئی۔ سرکاری اور فوجی ملازموں کی تنخواہ میں اضافہ ہوا اور لوگ خوشحال ہو گئے۔ آپ نے رفاہ عامہ کے بہت سے کام انجام دئے۔ بہت سی سڑکیں، پل، مسافر خانے اور تالاب تعمیر کئے۔ کئی نئی فوجی چھاؤنیاں قائم کیں آپ کے زمانہ میں تبلیغ کا سلسلہ جاری رہا۔ مفتوحہ علاقوں میں دعوتِ اسلام کا کام پوری سرگرمی سے جاری رہا۔

حکومت کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا گیا اسی قدر تعمیرات کا کام بھی بڑھتا گیا۔ تمام صوبہ جات میں سرکاری دفاتر کے لئے عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ مسافروں کے لئے مہمان خانے بنائے گئے۔ پہلے کوہ میں کوئی مہمان خانہ نہ تھا۔ حضرت عثمان کو معلوم ہوا تو انہوں نے ایک نہایت عظیم الشان مہمان خانہ بنوایا۔

(تاریخ طبری)

خیبر کی جانب سے کبھی کبھی مدینہ میں نہایت ہی خطرناک سیلاب آتا تھا جس سے شہر کی



آبادی کو سخت نقصان پہنچا تھا۔ مسجد نبوی کو بھی اس سے نقصان پہنچنے کا احتمال تھا اس لئے حضرت عثمان نے مدینہ سے تھوڑے فاصلے پر ایک بند بندھوایا اور نہر کھود کر سیلاب کا رخ دوسری طرف پھیر دیا۔ اس بند کا نام بند ہمزور ہے۔ رفاہ عامہ کے کاموں میں یہ حضرت عثمان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔  
(وفاء الوفاء جلد ۲ ص ۲۱۴)

مسجد نبوی کی تعمیر و توسیع حضرت عثمان کا ذریعہ کارنامہ ہے۔ سترہ لاکھ میں حضرت عثمان نے خطبہ دیتے ہوئے صحابہ کرام کو مسجد نبوی کی توسیع کی جانب توجہ دلائی۔ اس تقریر کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے خوشی سے اپنے وہ مکانات دے دئے جو مسجد سے ملحق تھے۔ آپ نے نہایت اہتمام کے ساتھ تعمیر کا کام اپنی نگرانی میں شروع کرایا اور شب و روز اسی میں مصروف رہنے لگے۔ دس مہینوں کی مسلسل جدوجہد کے بعد اینٹ چوڑھ اور پتھر کی ایک نہایت خوشنما اور مستحکم مسجد تیار ہو گئی۔  
طول میں پچاس گز کا اضافہ ہوا۔ البتہ معرض میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی۔  
(خلاصۃ الوفا، ص ۱۲۴)

غرض یہ کہ آپ نے لاتعداد اسلامی خدمات انجام دیں جن کے مختصر تذکرہ کے لئے دہلی

دفتر درکار ہیں۔

## سوالات

- ۱: حضرت عثمان کی ابتدائی زندگی اور انتخابِ خلافت کے حالات قلمبند کیجئے۔
- ۲: حضرت عثمان کی سیرت و سیاست قلمبند کیجئے۔
- ۳: خلافتِ عثمانی کی فتوحات اور نظامِ حکومت پر تبصرہ کیجئے۔
- ۴: حضرت عثمان کی انتظامی پالیسی بیان کیجئے اور بتائیے کہ کیا انہوں نے کوئی اختراعات کیں؟
- ۵: حضرت عثمان کے عہدِ خلافت کا تجزیہ کیجئے اور ان کی شہادت کے نتائج بیان کیجئے۔
- ۶: حضرت عثمان کے کردار اور کاموں کا تذکرہ کیجئے نیز واقعات مختصر طور پر لکھئے جو ان کی شہادت کا باعث بنے۔



## امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

**نام و نسب** نام نامی علی۔ کنیت ابو الحسن اور ابو تراب تھی۔ والدہ نے حیدر (شیر) لقب رکھا تھا۔ آپ کے والد کا نام ابو طالب اور والدہ کا نام فاطمہ

تھا۔ آپ والد اور والدہ دونوں طرف سے ہاشمی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا زاد بھائی تھے۔ آپ بعثت نبوی سے تقریباً دس برس پہلے پیدا ہوئے خوش قسمتی کی حد یہ ہے کہ آنحضرت نبوت میں تشریف پائی۔ یہی برحق نے اعلان نبوت کیا تو آپ نے فوراً اسلام قبول کیا۔

حضرت علی کے والد ابو طالب مکہ کے نہایت ذی اثر بزرگ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کی شفقت میں پرورش پائی اور بعثت کے بعد انہیں کے زیر حمایت مکہ کے کفرستان میں دعوتِ حق کا اعلان کیا تھا۔ ابو طالب ہر موقع پر آپ کے لئے سینہ سپر رہے۔ ابو طالب نے گواہی قبول نہیں کیا تاہم انہوں نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی جس طرح پرورش و پرداخت کی اور کفار کے مقابلہ میں جس ثبات و استقلال کے ساتھ آپ کی نصرت و حمایت کا فرض انجام دیا۔ اس لحاظ سے اسلام کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ شکر گزاری اور احسان مندی کے ساتھ لیا جائے گا۔

حضرت علی کی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہ بنت اسد نے بھی حضرت آمنہ کے اس یتیم معصوم کی ماں کی طرح شفقت و محبت سے پرورش کی۔ مستند روایات کے مطابق وہ مسلمان ہوئیں اور ہجرت کر کے مدینہ گئیں۔ ان کا انتقال ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفن میں اپنی قمیص مبارک پہنائی اور قبر میں لیٹ کر اس کو منبر کیا۔ لوگوں نے اس عنایت کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ ابو طالب کے بعد سب سے زیادہ اسی نیک سیرت خاتون کا ممنون احسان ہوں۔ (انسب النبی جلد ۵ صفحہ ۵۱)



**اسلام** | حضرت علی کی عمر ابھی صرف دس سال کی تھی کہ ان کے شفیق مرنے کو بارگاہِ خداوندی سے نبوت کا خلعت عطا ہوا۔ صحبتِ نبوی میں وہ کہ اصلاحِ باطن پہلے ہی ہو چکی تھی فوراً آپ کی دعوت پر لبیک کہا۔ آپ بچوں میں سب سے پہلے اسلام لائے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت علی کی زندگی کے تیرہ سال مکہ معظمہ میں بسر ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں پھپھپ کر عبادتِ خداوندی کا فریضہ بجالاتے تو حضرت علی بھی انہی میں شرکت کرتے تھے۔ حج کے موقع پر جب آنحضرت حضرت ابوبکر کی رفاقت میں مختلف قبائل کو دعوتِ اسلام دیتے تو حضرت علی بھی آپ کے ہمراہ ہوتے تھے۔ کبھی کبھی آنحضرت کے ساتھ خانہ کعبہ تشریف لے جاتے اور بتوں کو توڑ پھوڑ کر غیب ڈار کر دیتے تھے۔ (کنز العمال جلد ۲ ص ۳۱۱ و مستد احمد)

**ہجرت مدینہ** | ہجرت مدینہ کا حکم ہوا تو سرکارِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال سے کہ مشرکین کی شبہ نہ ہو حضرت علی کو اپنے بستر پر بیٹھنے کا حکم دیا اور خود حضرت ابوبکر کو ساتھ لے کر مدینہ روانہ ہو گئے۔ اس وقت حضور کے بستر پر سونا گویا موت کی سیخ قبول کرنا تھا لیکن شیر خدا کے پاس موت کا خوف کب آسکتا تھے۔ ارشادِ نبوی کی تعمیل کی۔ تین دن مکہ میں رہے۔ امانتیں مالکوں کی پہنچائیں اور اپنا پردہ عازم مدینہ ہوئے۔ جوان کا مہینہ تھا اور غرب کی جان سوز گری۔ تاہم آپ نے تین سو میل کا سفر صرف تین روز میں طے کیا۔ پاؤں زخموں سے چوڑ ہو گئے۔ آنحضرت نے لعابِ دہن لگایا تو ٹھیک ہو گئے اور پھر کبھی کوئی شکایت نہ ہوئی۔

**مخزومات** | بدر کی جنگ میں آپ نے شجاعت کی دت کھڑا دی۔ کفار کے ستر منتشر لوں کی تقریباً نصف تعداد آپ نے ہلاک کی۔ اسی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؑ کا نکاح آپ سے فرمایا۔ مہر کے لئے حضرت علی کے پاس کچھ نہ تھا۔ آپ کے پاس ایک گھوڑا تھا اور ایک زرہ۔ حضور نے فرمایا زرہ فروخت کر دو۔ آپ نے اسے ۸۰ درہم میں فروخت کر دیا۔ حضور نے ضروری



اشیاء منگوائیں۔ نکاح پڑھا اور علیؑ و فاطمہؑ کو خیر و برکت کی دعویٰ حضرت فاطمہؑ کا کل  
 جہیز ایک چادر ایک مشکیزہ ایک کپڑا دو گھڑے اور چڑے کا ایک گدا تھا جو کھجور  
 کی چھال سے بھرا تھا۔ عمر کھبر سیدۃ النساء کا یہی متاعِ خانہ رہا۔ دیگر عرواۃ نبوی  
 میں بھی حضرت علیؑ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیمار پڑے تو آپ نے تیمارداری کے فرائض نہایت  
 بانفشانی سے ادا کئے۔ حضور کے حسیب و سیب غسل دینے والوں میں ایک آپ بھی تھے۔  
 حضرت ابو بکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عمرِ خلافت میں آپ اسلام کی خدمت میں  
 ہمیشہ کوشاں رہے۔ آپ مجلس شوریٰ کے رکن رکین تھے۔ اور آپ کو ہر مشورہ میں  
 شریک کیا جاتا تھا۔

**بیعتِ خلافت** حضرت عثمان کی شہادت کے بعد تین دن تک مسندِ خلافت  
 خالی رہی۔ اس عرصہ میں لوگوں نے حضرت علیؑ سے اس منصب

کے قبول کرنے کے لئے سخت اصرار کیا۔ آپ نے پہلے اس بارگراں کے اٹھانے سے انکار  
 کر دیا۔ لیکن آخر میں مہاجرین و انصار کے اصرار سے مجبور ہو کر اٹھنا پڑا۔ واقعہ شہادت کے  
 تیسرے دن ۱۲ رذوالحجہ و شبہہ کے دن مسجد نبویؐ میں آپ کے دستِ اقدس پر بیعت ہوئی۔  
 تمام باغیوں اور شہر کے بہت سے لوگوں نے آپ کی بیعت کر لی۔ کچھ لوگوں کو ذرا بیعت  
 کرنے میں تامل تھا اور وہ حالات کا رخ دیکھ کر بیعت کرنا چاہتے تھے۔ سنتِ ظلمہ اور  
 حضرت زبیرؓ نے بھی حضرت علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کر لی مگر شرط یہ رکائی کہ سنتِ علیؑ  
 قرآن و سنت کے مطابق شرعی حدود جاری کریں گے۔

اس طرح حضرت علیؑ کا انتخاب بھی جمہوری طریقہ پر ہوا۔ حضرت عثمان کے بعد وہی اس منصب  
 کے لئے موزوں ترین شخص تھے مگر اس زمانہ میں ایک گروہ اہل بیت کے حامیوں کا ایسا پیدا ہو گیا  
 تھا جنہوں نے حضرت علیؑ کی خلافت کو ان کی صلاحیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم



سے دشتہ داری کی بنا پر قبول کیا تھا۔ اس طرح جمہوریت کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور آئندہ جمہوریت کی بجائے موروثی خلافت قائم ہوئی۔

بیعت خلافت کے کچھ دنوں بعد حضرت علی کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے حضرت

## حضرت عثمان کا قصہ

عثمان کے قصص کا مسئلہ تھا۔ ہر مسلمان چاہتا تھا کہ حضرت عثمان کے قاتلوں کو فوراً پکڑا جائے اور سخت سے سخت سزا دی جائے۔ حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور چند دیگر صحابہ بھی آپ کے پاس آئے اور اس کے لئے زور دیا مگر اس معاملہ کا حل اس قدر آسان نہ تھا۔ تلاش بسیار کے باوجود حضرت عثمان کے قاتلوں کا پتہ نہ چل سکا۔ ان کی شہادت کے وقت ان کی بیوی حضرت ناکہؓ موجود تھیں اور وہ ضعف پیری کے باعث کسی کو پہچان نہ سکتی تھیں۔ اس لئے حضرت علیؓ نے سب کو یقین دلایا کہ وہ اس سے غافل نہیں ہیں۔ اس وقت ان کے پاس اتنی طاقت نہیں ہے کہ قاتلوں پر قابو پاسکیں۔ قاتلوں سے قصص لینے میں ابھی کچھ وقت بچے گا۔

حضرت علیؓ کے لئے ایک مشکل یہ تھی کہ قاتلوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ اس لئے لوگوں کو شک تھا کہ وہ قاتلوں کی طرف داری کر رہے ہیں۔ بہر حال حضرت علیؓ کوئی کام جلد بازی سے نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ اس طرح ایک دوسرے بے گناہ کا اندیشہ تھا جو شہادت عثمان سے بھی زیادہ اہمناک ہو سکتا تھا۔

حضرت علیؓ نے ایک دیندار اور بے باک انسان

## عثمانی عمال کی معزولی

تھے۔ حضرت عثمان کے عمال عامہ کو وہ الزامات آپ کے ذہن میں تھے اور وہ امور سلطنت میں کسی حاکم کی ذرا بھر غیر ذمہ داری برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ اس لئے آپ نے حضرت عثمان کے زمانہ کے تمام عمال جن پر لوگوں کو اعتماد تھا برطرف کر دئے اور ان کی جگہ دوسرے عمال مقرر کر دئے مگر شام کے والی امیر



معاویہ نے اس معزولی کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ امیر معاویہ کے دل میں حکومت کرنے کا خیال پیدا ہو گیا تھا اور وہ اپنے آپ کو خلافت کا مستحق سمجھتے تھے۔ انھوں نے قصاص عثمان کا بہانہ بنا کر حضرت علی کی اطاعت سے انکار کر دیا اور حضرت عثمان کے خون آلود کپڑے اور حضرت نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیوں کی دمشق میں نمائش کر کے لوگوں کو حضرت علی کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا اور قاتلین عثمان سے بدلہ لینے کا عہد کر لیا۔

جب کئی مرتبہ خط لکھنے کے بعد حضرت امیر معاویہ نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت نہ کی تو وہ شام پر چڑھائی کرنے لگے تاکہ ان سے زبردستی بیعت لیں۔ مگر اسی وقت آپ کو اطلاع ملی کہ ایک فوج حضرت عائشہؓ کی سرکردگی میں مکہ سے بصرہ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ چنانچہ آپ شام پر چڑھائی کا ارادہ ملتوی کر کے بصرہ کو روانہ ہوئے جہاں جنگِ جمل کا المناک واقعہ پیش آیا۔

حضرت عائشہؓ شہادتِ عثمان کے وقت مکہ معظمہ میں تھیں۔ جب آپ مدینہ کو روانہ ہوئیں تو ایک آدمی نے خبر دی کہ حضرت عثمان کو

## جنگِ جمل

شہید کر دیا گیا ہے۔ فتنہ و فساد زوروں پر ہے اور لوگوں نے حضرت علیؓ کی بیعت کر لی ہے۔ اس وقت حضرت طلحہ اور حضرت زبیرؓ بھی مکہ پہنچ گئے اور حضرت عائشہؓ صدیقہ کو مطلع کیا کہ حضرت علیؓ قصاصِ عثمان میں سستی کر رہے ہیں۔ ان تینوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خود بصرہ میں جا کر قاتلوں سے بدلہ لیں گے۔ یہ لوگ اپنے معاہدین کو لے کر بصرہ پہنچ گئے وہاں حضرت علیؓ کا عامل عثمان بن حنیف مامور تھا۔ اس نے مقابلہ کیا مگر ناکام رہا اور بصرہ پر حضرت عائشہؓ کی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ بصرہ کے ان سب لوگوں کو نذرِ شمشیر کیا گیا جو حضرت عثمان کے خلاف مظاہر ہیں شریک ہوئے تھے۔

(کامل ابن اثیر)

حضرت علیؓ کو جس وقت علم ہوا کہ حضرت عائشہؓ کا لشکر عازمِ بصرہ ہو چکا ہے تو کچھ فوج لے کر ادھر کوچ کیا۔ راستہ میں چند قبائل شریک ہونے کو آئے لیکن آپ نے ان کو واپس کر دیا۔ آپ نہیں چاہتے تھے کہ زیادہ مسلمانوں کو جنگ کی آزمائش میں ڈالیں۔ کوفہ کے قریب پہنچے تو



باہر فری و تارح کے مقام پر پڑاؤ کیا۔ حضرت حسن کو کوفہ بھیجا وہاں کے حاکم ابو موسیٰ اشعری تھے۔ وہ لوگوں کو یقین کرتے تھے کہ اس جھگڑے سے الگ رہیں اور کسی فریق کا ساتھ نہ دیں۔ حضرت حسن پہنچے تو انھوں نے حضرت موسیٰ اشعری کو معزول کیا اور تقریباً بارہ ہزار فوج بھرتی کر لی۔ اب حضرت علی کے پاس تقریباً بیس ہزار سپاہ تھی۔ (ابن اثیر)

مصالحت کی سلسلہ جنبانی ہوئی تھی مگر وہ ناکام رہی۔ جمادی الاخریٰ ۳۵ھ میں فریقین کی ٹوہیں بصرہ سے باہر حدیبیہ کے میدان میں آمنے سامنے خیمہ زن ہوئیں۔ حضرت عائشہ کی فوج کا شمار تقریباً تیس ہزار تھا اور اصحاب علی کا بیس ہزار۔ دونوں طرف اکابر صیہ موجود تھے کشت و خون کسی کو گوارا نہ تھا۔ خیر خواہان ملت کی مساعی سے تین دن کی تک و دو سے صلح ہو گئی۔ (ابن اثیر)

مسلمان اس رات خوشی سے بھولے بڑھاتے تھے۔ لیکن فساد یوں کے گرد وہ نے ان سب امیدوں کا خون کر دیا۔ ابھی پر نہیں پھٹی تھی کہ بد اندیش نہایت رازداری سے نکلے اور حضرت عائشہ کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ مقابلہ پر تلواریں بے نیام ہو گئیں۔ وہ سمجھے حیدری فوج نے شب خون مار دیا۔ لشکر پاس پاس تھے۔ ایک دوسرے کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ حضرت علی اور حضرت عائشہ نے کہ اس کی قطعاً خبر نہ تھی۔ ہر فریق نے دوسرے کو محرک جنگ سمجھا۔ حضرت عائشہ شہر میں تھیں۔ ان کو معلوم ہوا تو اونٹ پر بیٹھ کر آبادی سے باہر کھڑی ہو گئیں کہ شاید انہیں دیکھ کر لوگ ہتھ روک لیں۔ اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا دن تھا کہ فرزند ان اسلام ایک دوسرے کے نفاق بردار ما ہو رہے تھے۔ قیامت کا دن پڑا اور معاملہ قابو سے باہر ہو گیا۔ حضرت عائشہ کی فوج کے قدم اکھڑ گئے اور میدان سے ہٹنا شروع کیا۔ حضرت عائشہ سستی سے باہر کھڑی تھیں۔ آپ کو معلوم ہوا کہ فوج کو شکست ہوئی ہے تو آپ نے خیال کیا کہ اب شاید صلح ہو جائے۔ مگر سپاہ نے آپ کی سواری کے پاس پہنچ کر قدم جمائے۔ جنگ نے نئے سرے سے زور باندھا۔ اصل معرکہ اب یہیں حضرت عائشہ کے اونٹ کے گرد چھڑا۔ اس لئے اس جنگ کو حمل یعنی اونٹ کی جنگ کہتے ہیں۔ جنگ کا پہلا



حضرت دوپہر تک رہا تھا۔ اب یہ دوسرا معرکہ دوپہر سے شروع ہوا اور عصر کے قریب ختم ہوا۔ اب کے موت کی جس قدر گرم بازاری ہوئی اور فریقین کی سب پانے جس سرفروشی کے مظاہرے کئے اس کا جواب جنگِ صفین کے علاوہ شاید ہی اور کہیں ملے۔ اندھا دھند شمشیر بازی ہوئی اور ہاتھ پیر کٹ کٹ کر خشک پتوں کی طرح بھرنے لگے۔ حضرت عائشہ کے اونٹ کی نیکیں تمام کر صرت ایک قبیلہ بنو ضبہ ہی کے شتر آدمیوں نے حق شجاعت ادا کر کے جان دیدی۔ چالیس کے قریب قریشیوں نے بھی ان کی مثال قائم رکھی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر اونٹ کی نیکیں کپڑے تھے وہ زخمی ہو کر گرے تو فوراً دوسرے نے بڑھ کر پکڑ لی وہ مارا گیا تو تیسرے نے اس کی جگہ لی (تاریخ طبری و مستدرک حاکم) حضرت علی نے دیکھا کہ جب تک حضرت عائشہ کا اونٹ ان کی فوج کا مرکز نگاہ ہے اس وقت تک وہ ہمت نہیں ہاریں گے۔ اس لئے آپ کے اشارے سے ایک شخص نے پیچھے سے جا کر اونٹ کے پاؤں پر تلوار ماری۔ اونٹ ہلکا کر بیٹھ گیا۔ اونٹ کے بیٹھتے ہی حضرت عائشہ کی فوج کی ہمت چھوٹ گئی۔ اور حضرت علی کے حق میں جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ آپ نے حضرت عائشہ کے بھائی محمد بن ابی بکر کو جو حضرت علی کے ساتھ تھے حکم دیا کہ اپنی ہمیشہ محترمہ کی خبر گیری کریں اور عام منادی کرادی کہ بھاگنے والوں کا تعاقب نہ کیا جائے۔ زخمیوں پر گھوڑے نہ دوڑائے جائیں۔ بال غنیمت نہ لوٹا ہلکے جو ہتھیار ڈال دیں وہ مامون ہیں۔ پھر خود حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس حاضر ہو کر مزاج نرمی کی۔ بصرہ میں چند دنوں تک آرام و آسائش سے ٹھہرانے کے بعد محمد بن ابی بکر کے ہمراہ عزت و احترام کے ساتھ بھیج دیا۔ بصرہ کی چالیس شریف و معزز خواتین کو پہنچانے کے لئے ساتھ لہانہ کیا اور رخصت کرنے کے لئے جو چند میل تک ساتھ گئے اور ایک منزل تک اپنے صاحبزادوں کو الوداع کہنے کے لئے بھیجا۔

حضرت عائشہ نے رخصت ہوتے وقت لوگوں سے فرمایا: "میرے بچو! ہماری ماہی کشی محض غلط فہمی کا نتیجہ تھی۔ ورنہ مجھ میں اور علی میں پہلے کوئی جھگڑانا نہ تھا۔" حضرت علی نے بھی مناسب الفاظ میں تصدیق کی اور فرمایا: "انحضرت کی تحریم محترم اور ہماری ماں ہیں ان کی تعظیم و توقیر ضروری



ہے۔ "عرض یکم رجب ۱۳۰۰ ہفتہ کے دن حضرت عائشہ مدینہ کی طرف روانہ ہو گئیں۔  
 اس جنگ میں دس ہزار مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ نقصان کے پڑے برابر تھے۔  
 حضرت علی نے فریقین کے مقتولوں پر نماز جنازہ پڑھائی اور انہیں دفن کر دیا۔ (ابن اثیر)  
 حضرت علی نے بعد کا انتظام درست کیا۔ ابن عباس کو یہاں کا والی بنایا اور خود شکر لے کر  
 رجب ۱۳۰۰ میں عازم کوفہ ہوئے۔ آپ نے مدینہ کی بجائے کوفہ کو دار الخلافہ قرار دیا۔ بظاہر اس  
 کی یقین وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت علی نے دیکھ لیا تھا کہ فتنہ و فساد کے زمانے میں حرم نبوی  
 کی توہین ہوتی ہے۔ مدینہ میں فتنہ پردازوں کی خیر انگریزی اس کی تعظیم و تکریم کے منافی ہے۔  
 دوسری وجہ یہ تھی کہ عراق میں حضرت علی کے حامیوں کی بڑی اکثریت تھی۔ تیسری وجہ یہ تھی  
 کہ مفتوحہ علاقوں کا دیکھ بھال کے لئے کوفہ زیادہ موزوں نظر آیا۔

حضرت معاویہ شام کے تمام صوبہ کے حاکم تھے۔ حضرت عثمان  
 کے خاندان سے تھے۔ آپ کو یہ امر ادا تھا کہ جب حضرت علی کا تین  
 عثمان سے انتقام نہیں لیتے اس وقت تک بیعت نہیں کروں گا۔ حضرت علی نے عثمان خلافت  
 سنبھالتے ہی جناب معاویہ کی سبکدوشی کا حکم صادر کر کے ان کے بجائے اپنا حاکم بھیجا لیکن  
 اسے شامیوں نے واپس کر دیا تھا۔ حضرت معاویہ کے ساتھ فارح بن عمر و بن العاص نے اپنے آپ  
 کو حضرت عثمان کی مدد سے عاجز پایا تو یہ کہہ کر مدینہ سے رخصت سفر باندھا کہ جو شخص عثمان کی مدد  
 نہیں کر سکتا وہ کم از کم اس شہر میں نہ رہے۔ (تاریخ طبری)

حضرت عثمان کی شہادت کی خبر عمر بن العاص کو نسلطین میں پہنچی۔ وہاں سے حکومت معاویہ  
 کے پاس آئے اور خون عثمان کا انتقام طلب کرنے میں ان کے ہم خیال بن گئے۔ حضرت معاویہ اور  
 عمرو بن العاص شام کے مشہور مدبرین میں شمار کئے جاتے تھے ان کی حزمہ و تدبیر اور منصوبہ نگیری نے  
 مل کر وہ کام کیا جو بڑے بڑے لشکر کشی نہیں کر سکتے تھے۔

حضرت علی نے حضرت معاویہ کو مدینہ سے ایک خط لکھا تھا۔ اس کے جواب میں حضرت معاویہ:



نے اپنا سفیر بھیجا۔ جس نے آکر بتایا تھا کہ شام کے ہزاروں شیوخ شہادتِ عثمان پر خون کے آئینہ  
 رو رہے ہیں اور قاتلوں سے بدلہ لینے کی قسمیں کھا رہے ہیں۔ جنگِ جمل سے فارغ ہو کر حضرت علیؑ  
 نے حضرت معاویہؓ کے پاس پھر ایک قاصد بھیجا۔ اسے حضرت معاویہ نے کئی ہفتے ٹھہرایا کہ تمہاریوں  
 کے لاؤشکر اور ساز و سامان کا مشاہدہ کر کے حضرت علیؑ کو آگاہ کرے۔ اس نے حضرت علیؑ کی خدمت  
 میں تمام حالات بیان کئے اور بتایا کہ شام میں یہ پروپاگنڈہ ہے کہ حضرت علیؑ حضرت عثمان کے قاتلوں  
 کے پناہ دہندہ ہیں۔ (کامل ابن اثیر)

حضرت علیؑ نے مجبوراً شام پر فوج کشی کی تیاریاں شروع کیں۔ اور حضرت معاویہ نے بھی  
 ایک گراں اور آراستہ پیراستہ لشکر لے کر عراق کی طرف پیش قدمی کی۔ راستہ میں کئی قبائل ان  
 کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ شامی فوج سلسلہ کے آخری دنوں میں وادیائے فرات کے کنارے  
 صفین کے میدان میں ڈیرے ڈال دئے۔ شامی لشکر کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ (ابن اثیر)  
 حضرت علیؑ بھی تقریباً اسی توڑے ہزار کی فوج لے کر چلے۔ آپ کے ہرادل دستے پہلے پہنچ  
 گئے۔ آپ نے انہیں جنگ کی ابتداء کرنے سے منع کیا تھا۔ لیکن آپ کے سپینے سے پہلے شامی  
 دستوں سے ان کی کچھ جھڑپیں ہو گئیں مگر پشیمانیتجہ خیر نہ تھیں۔ (ابن اثیر)

حضرت معاویہ نے گھاٹ پر قبضہ کر لیا اور علوی فوج پر پانی بند کر دیا۔ جناب عمر بن العاصؓ  
 نے اس اقدام کے خلاف مشورہ دیا لیکن انہوں نے قبول نہ کیا۔ حضرت علیؑ نے کہلا بھیجا کہ پانی نہ  
 روکا جائے۔ مگر حضرت معاویہؓ نے مانے۔ مجبوراً آپ نے ایک دستہ بھیجا ایک غوثی معرکہ ہوا۔  
 شامی بھاگ اٹھے اور حضرت علیؑ کے ہاتھوں نے گھاٹ پر قبضہ کر لیا۔ آپ نے فراخ دلی سے کام  
 لیتے ہوئے شامی فوج کو دریا سے پانی لینے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ دونوں فوجیں ایک  
 ساتھ دریا سے سیراب ہونے لگیں اور باہم اس قدر اخللاط پیدا ہو گیا کہ دونوں کیمپ کے  
 سپاہیوں میں دوستانہ آمدورفت شروع ہو گئی۔ تین ماہ تک جنگ رکی رہی اور مصالحت  
 کی کوششیں ہوتی رہیں مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ یکم صفر ۴۰ھ سے قبضہ کن معرکوں کا دروازہ کھلا۔



ایک ہی دین کے پیرو دو بد وصف اور اہوسے اور ایک ہی خاندان اور ایک ہی قبیلہ کے لوگ ایک دوسرے کے خلاف تلواریں سونت کر نکلے۔ دونوں فریق اپنے کو حق پر سمجھتے تھے۔ جناب معاویہ کی فوج کو یہ دعویٰ تھا کہ حضرت علی نے قاتلین کو پناہ دے رکھی ہے اور ان سے قصاص لینا عین خدمتِ اسلام ہے۔ اور حضرت علی کے فدکاروں کا یہ خیال تھا کہ حضرت معاویہ اور ان کا گروہ باغی ہے ان کو مطیع کرنا فرض ہے۔ یہ معرکہ تقریباً دو ہفتہ تک مسلسل جاری رہے۔ کوئی دن نہ جاتا تھا کہ سینکڑوں آدمی خاک و خون میں ڈھیر نہ ہوتے ہوں۔ رات سایہ ڈالتی تو زخمیوں کی چیخ و پکار ایک لشکر سے دوسرے لشکر تک فضائیں ڈر دو گرب کی لہریں پیدا کر دیتی تھی۔ حضرت علیؑ نے امیر معاویہ کو کئی دفعہ مقابلہ کی دعوت دی کہ خلقِ خدا کا خون بہانے سے کیا فائدہ۔ اوہم دونوں آپس میں رو کر فیصلہ کر لیں۔ جو بیخ گیا وہ جیت جائے گا۔ حضرت معاویہ ہمیشہ ٹال دیتے (ابن اثیر) ایک دفعہ حضرت عمرو بن العاصؓ حضرت علیؑ کے مقابلہ میں آئے اور بڑی مشکل سے زندہ بچے۔ (تاریخ مسعودی)

جنگ نے جب طویل کھینچا تو ایک دن حضرت علیؑ نے پوری قوت کو میدان میں جمبوںک لینے کی ٹھان لی۔ جناب معاویہ کی فوج بھی زندگی سے ہاتھ دھو کر میدان میں اترتی۔ تیر و شمشیر اور نیزہ و سنان نے قیامت برپا کر دی۔ زمین خونِ مسلم سے لالہ زار بن گئی۔ دن گذر گیا مگر جنگ کا زور نہ ٹوٹا۔ رات کی سیاہی بھی جنگ کو نہ دک سکی۔ شب بھر ہتھیار بجاتے اور خون کے فوارے آبتے رہے۔ فریاد و شیون اور سنور و غل سے زمین دہل دہل جاتی تھی۔ اس لیے اس رات کا لقب لیا گیا کہ راتِ تھر تھراہٹ کی رات (نام پڑا)۔

کال ابن اثیر

اگلے روز آفتاب جواں تاب نے چہرہ بے نقاب کیا تو بازار دنیا کی گونیا اور بڑھیں۔ یوں نظر آتا تھا کہ آج کوئی نہ کوئی فیصلہ

## مثالوں کا فیصلہ

ہو کر رہے گا۔ خیال تھا کہ حضرت علیؑ کی فوج جیت جائے گی۔ اتنے میں شامی فوج نے نیزوں پر قرآن حکیم کے نسخے بلند کئے اور حضرت علیؑ کی سپاہ کی طرف یہ پکارتے ہوئے بڑھے کہ خون ریزی ختم کر کے قرآن پاک کی رُس سے فیصلہ کیا جائے۔ فوج کے سردار حضرت علیؑ کے پاس آئے اور کہا کہ ہمارے



بھائی آپس قرآن کی طرف بلا رہے ہیں۔ ہمیں جنگ بند کرنے کا حکم دیجئے۔ کچھ تامل کے بعد آپ نے جنگ بندی کا حکم دے دیا۔ طرفین کے درمیان فیصلہ ہوا کہ دونوں طرف سے ایک ایک حکم (مثلاً) مقرر کیا جائے اور وہ عمل کر کتاب الہی کے مطابق فیصلہ کریں۔

شامی فوج نے حضرت عمرو بن العاص کو ثالث مقرر کیا اور عراقی فوج نے جناب ابو موسیٰ اشعریؓ کو۔ حضرت ابو موسیٰ صفین میں موجود نہ تھے ایک قافلہ گیا اور انھیں لے کر آیا۔ اب ایک معاہدہ لکھا گیا کہ عمرو بن العاص اور ابو موسیٰ اشعریؓ کو حکم مقرر کیا جاتا ہے۔ وہ جو فیصلہ کریں گے فریقین کو منظور ہوگا۔ ان کی جان و مال محفوظ ہوگی۔ ثالث چھ ماہ تک فیصلہ کریں گے۔ اس دوران جنگ نہیں ہوگی اور فوجیں اپنے اپنے علاقوں کی طرف کوچ کر جائیں گی۔

(ابن اثیر - ابوالفداء)

حضرت علیؓ کا ایک سردار یہ عہد نامہ اپنی فوج کو سنانے لگا۔ ایک شخص نے تلوار مار کر اس کے گھوڑے کو زخمی کر دیا اور بولا "لَا حَکْمَ إِلَّا لِلَّهِ" خدا کے سوا کہیں کو فیصلہ کرنے کا حق نہیں) ممکن تھا کہ فساد ہو جائے مگر بیچ بچا ہو گیا۔ یہ شخص پہلا خارجی تھا۔ شامی فوجوں نے شام کی اور عراقی لشکروں نے عراق کی راہ لی۔ صفین کی لالہ زار سرزمین ستر ہزار شہداء کی نعشوں کو اپنے سینہ سے چمٹائے تنہائی کی وحشت میں کھو گئی۔

دونوں ثالثوں نے باہمی مشورہ سے یہ طے کیا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کو معزول کر دیا جائے اور مسلمانوں کو حق دیا جائے کہ جس کو چاہیں اپنا خلیفہ مقرر کر لیں۔ جب یہ لوگ دُوسْتِ الْجَنْدَلِ کے مقام پر فیصلہ سنانے کے لئے جمع ہوئے تو اکابر صحابہ کے علاوہ جو حجاز سے آئے تھے اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ فیصلہ سناتے وقت عمرو بن العاص نے مضرب پر چڑھ کر کہا کہ جو اعلان ابو موسیٰ نے حضرت علیؓ کے متعلق کیا ہے میں بھی اس کی تائید کرتا ہوں اور ساتھ ہی امیر معاویہ کو ان کی جگہ خلیفہ مقرر کرتا ہوں۔ جو کہ حضرت عثمان کے بائیں ہاتھ کے سب سے زیادہ اہل ہیں۔



اس فیصلہ نے حضرت علی کے ساتھیوں کو ششدر کر دیا اور بہت برہم ہوئے انہوں نے اس فیصلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ایک بہت بڑا فساد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس فیصلہ کے بعد اہل شام نے امیر معاویہؓ کو اپنا خلیفہ تسلیم کر لیا۔ جب حضرت علی کو اس ماموریت سے فہم نہ ہوئی تو آپ کو سخت افسوس ہوا۔ مگر آپ نے خلافت سے دست برداری اختیار نہ کی اور امیر معاویہؓ سے فیصلہ کن جنگ لڑنے کی تیاری شروع کر دی لیکن اسی عرصہ میں ان کو عدم ہوا کہ خارجیوں نے عراق میں شورش برپا کر رکھی ہے اس لئے آپ نے شام پر حملہ ملتوی کر دیا اور خارجیوں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہو گئے۔

**جنگ صفین کے نتائج** جنگ صفین اور ثالثی سے مسلمانوں کو بہت نقصان ہوا۔ جنگ میں تقریباً ستر ہزار مسلمان مارے گئے اور مالی

نقصان کا تو اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا۔ ان واقعات نے مسلمانوں کے شیرازہ کو منتشر کر دیا۔ اور ان میں قومی اتحاد کا عنصر تک نقصان رہا۔ سب سے زیادہ نقصان حضرت علی کو پہنچا۔ ان کی مشکلات بڑھ گئیں اور خلافت کا وتار گر گیا۔ مملکت اسلامیہ میں دو خلیفہ ہو گئے۔ دونوں میں حصول اقتدار کے لئے کشمکش شروع ہو گئی۔ امیر معاویہؓ نے عمر بن العاص کو بھیج کر حضرت علی کے گورنر محمد بن ابی بکر سے مصر کا علاقہ چھین لیا اور پھر فوج دے کر بصرہ اور حجاز بھیجا۔ جس نے حجاز و یمن کا علاقہ دوبارہ فتح کر کے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ آخر کار حضرت علی کو اس جنگ و جدال سے گھبرا کر امیر معاویہ سے صلح کرنا پڑی۔ اس ثالثی کے فیصلہ سے حضرت علی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان کے اپنے ساتھیوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ ان کے حامیوں کا ایک گروہ جس نے پہلے تو انھیں ثالثی قبول کرنے پر مجبور کیا۔ اب ان کے خلاف ہو گیا اور یہ کہنا شروع کیا کہ حضرت علی نے قرآن کے فیصلہ کے بجائے اہل کفر و کفر کا از تکاب کیا ہے۔ انہوں نے یہ نعرہ لگانا شروع کیا کہ "ہم خدا کے سوا کسی کا فیصلہ نہیں مانیں گے" جب یہ لوگ علیؓ پر عراق میں فتنہ پیدا کرنے



لیگے تو حضرت علیؑ کو مجبوراً ان کے خلاف نہرمان کے مقام پر جنگ کرنا پڑی جس میں ہزاروں مسلمان مارے گئے۔ خارجی اس جنگ کے بعد ختم نہ ہوئے بلکہ مملکت اسلامیہ میں ہمیشہ فتنہ فساد برپا کرتے رہے۔ خارجیوں سے جنگ کے باعث حضرت علیؑ امیر معاویہ سے فیصلہ کن جنگ نہ لڑ سکے اور آخر ایک خارجی کے ہاتھوں ہی حضرت علیؑ کی شہادت واقع ہوئی۔

## خوارج

جنگ سفین کے دوران جب ثالثی کا مسئلہ پیش آیا تو حضرت علیؑ نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر اپنے ساتھیوں کے اصرار پر اسے ماننا پڑا۔ جب طغین کے درمیان معاہدہ ہو گیا تو اس کو نباہنا لازمی ہو گیا مگر اس وقت حضرت علیؑ کی فوج میں سے ایک جماعت اس تحکیم (ثالث مقرر کرنے) کے خلاف ہو گئی۔ اس جماعت نے تحکیم کو کفر قرار دیا۔ اس جماعت نے حضرت کے پاس آکر کہا آپ نے ثالث مقرر کر کے کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ آپ توبہ کیجئے۔ آپ خلیفہ برحق تھے آپ نے اپنا معاملہ انسانوں کے سپرد کیوں کیا؟

حضرت علیؑ نے جب اس کا یہ جواب دیا ”عجیب بات ہے کہ میں اس کے خلاف تھا تو آپ لوگوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں یہ بات مان لوں اور اب جبکہ میں راضی ہو گیا ہوں تو آپ لوگ مجھ کو اعتراض کرتے ہیں۔ اب میں معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا“



رسول کریم حضرت علی کی فوج سے یہ جماعت علیحدہ ہو گئی اور خوارج و شیعہ اشدہ کہلاتی تھیں۔  
 حضرت علی نے ان کو بہت سمجھایا کہ اب معاہدہ ہو چکا ہے اس کو توڑنا بہت برا ہے اور اس میں  
 برائی بھی کوئی نہیں کیونکہ نادمہ جس تو قرآن و حدیث کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ مگر خارجی کہتے  
 تھے کہ سوائے اللہ کے کوئی انسان حکم نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم نے آپ کو ایسا کرنے کے لیے کہا ہے  
 تو ہم بھی گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ہم اس کا اقرار کرتے ہیں اور اپنے گناہ سے توبہ کرتے ہیں۔  
 اگر آپ بھی اپنے گناہ سے توبہ کر لیں تو ہم آپ کے ساتھ ہیں ورنہ ہم آپ کا ساتھ نہیں دیں گے۔  
 بلکہ مخالفت کریں گے۔ اس کے بعد جب ثمالثوں نے اپنا فیصلہ سنایا تو ان لوگوں نے حروراد  
 کے مقام پر عبداللہ بن وہب راہسی کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور علانیہ طور پر حضرت علیؑ کی  
 مخالفت شروع کر دی۔

غرض رفتہ رفتہ اس جماعت نے ایک مستقل فرقہ کی صورت اختیار کر لی اور کوفہ  
 بصرہ اور مدائن کے شہروں میں قتل و غارتگری کا بازار گرم کر دیا۔ خارجیوں کا عقیدہ  
 تھا کہ نہ بنی معاملات میں کسی کو حکم مقرر کرنا کفر ہے لہذا ان کے نزدیک یہ دونوں حکام اور  
 ان کو تختہ بزرگی والے کافر تھے۔ اس عقیدہ سے جس کو اتفاق نہ ہو اس کا خون ان کے  
 نزدیک مباح ہے چنانچہ انہوں نے عبداللہ بن خیاب اور ان کی اہلیہ کو نہایت بے دردی  
 کے ساتھ قتل کر دیا۔ حضرت علیؑ اس وقت اڑسیر نزد شام پر فوج کشی کی تیاری کر رہے تھے۔  
 لیکن جب خارجیوں کی سرکشی اور قتل و غارت اس حد تک پہنچ گئی تو اس ارادہ کو ملتوی کر کے  
 ان خارجیوں کی شبیہ کے لیے نہروان کا قصد کرنا پڑا۔

حضرت علیؑ شکر جزار نے کمر نہروان کے  
 میدان میں جا اڑے خارجیوں کو دعوت

**جنگ نہروان ۳۸ھ**

اتحاد دیتے ہوئے حضرت علیؑ نے ہر چند سمجھانے کی کوشش کی۔ کچھ خارجی تو بات سمجھ



کر علیحدہ ہو گئے لیکن ان کی اکثریت اپنی ضد پر قائم رہی۔ جب اصلاح کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تو سوائے لڑائی کے اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔ بڑی خونریز جنگ ہوئی جس میں تقریباً پین ہزار خارجی مائے گئے۔ صرف چند لوگ زندہ بچ سکے۔

خارجیوں کی سرکوبی سے فارغ ہونے کے بعد علی کو نہ داپس آئے اور اہل شام کے خلاف لڑنے کے لئے لوگوں کو تیار کرنے لگے لیکن ساتھیوں نے ہمت ہار کر عرض کیا: اے امیر المؤمنین! ہماری تلواریں کند ہو گئی ہیں۔ ہمارے نیزے ٹوٹ گئے ہیں۔ ہم جنگ سے تنگ آ گئے ہیں۔ کچھ عرصہ سستانی کے بعد تیاری شروع کریں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لشکر کو حکم دیا کہ کوہ سے باہر ڈیرے ڈال کر آرام کر لیں اور آئندہ جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔ ساتھ ہی انہیں حکم دیا کہ کوئی شخص اپنے گھر کا ارادہ نہ کرے۔ جب تک کہ شام کی مہم کو سر کر کے داپس نہ آ جائیں۔ لاکھوں خارجی جنگ سے اکتا چکے تھے۔ وہ چپکے چپکے گھروں کو کھسکنے لگے یہاں تک کہ چھاؤنی خالی ہو گئی۔ حضرت علی نے انہیں بارہا جویشن ملایا اور جہاد کی ترغیب دی۔ لیکن کسی نے کان نہ دھرا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت علی نے شام کی جنگاً مجبوراً ملتوی کر دی۔

**مصر پر حضرت امیر معاویہ کا قبضہ** | ملک مصر حضرت علی کے قبضہ میں تھا اور حضرت قیس بن سعد انصاری

حضرت علی کی طرف سے ابلی مقرر تھے۔ حضرت قیس بڑے بہادر اور جوش مند والی تھے۔ امیر معاویہ اور حضرت عمرو بن عاص مصر کو اپنے قبضہ میں لینے کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ لیکن حضرت قیس انصاری نے ان کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ آخر کار امیر معاویہ نے یہ تدبیر سوچی کہ قیس بن سعد کو کسی نہ کسی طرح مصر سے نکال باہر کرنا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے یہ انواہ پھیلا دی کہ قیس بن سعد تو حضرت عثمان کے حامیوں میں سے ہے اور امیر معاویہ سے اس کی خط و کتابت بھی ہے۔

جب حضرت علی نے یہ انواہ سنی تو فوراً قیس بن سعد انصاری کو معزول کر کے اشتر بن



مالک کو والی مقرر کر دیا۔ انشتر بن مالک ابھی عبیرہ قانزم میں پہنچتے نہ پایا تھا کہ کسی نے شہدیں زہر دے کر مار دیا۔ بعد ازاں حضرت علی نے محمد بن ابی بکر کو مصر کا والی مقرر کیا۔ وہ ماہ رمضان ۳۰ھ میں مصر پہنچ گئے۔ محمد بن ابی بکر بڑے بے ہوشیے مگر نا تجربہ کار نوجوان تھے۔ انہوں نے جوش کے عالم میں غرور و نخوت کا اظہار کرتے ہوئے حامیان انتقام عثمان سے سخت بدسلوکی کی۔ جب عثمانیوں کے سردار نے بیعت علی سے انکار کیا تو محمد بن ابی بکر نے ان کے گھروں کو نہدم کر دیا۔ ان کا مال و دولت لوٹ لیا۔ ان کی اولاد کو اذیت پہنچائی اور قید و بند کی لپیٹوں میں ڈالا۔ اس طرح اپنے طرز عمل سے ملک کے بہت سے لوگوں کو اپنا مخالف اور دشمن بنا لیا تھا۔

امیر معاویہ نے مصر پر قبضہ کرنے کی فکر میں تھے۔ انہوں نے عمرو بن عاص کو چھ ہزار شامی سپاہیوں کے ساتھ مصر روانہ کیا۔ مصری اور شامی لشکروں میں معرکہ کارزار خوب گرم ہوا۔ عمرو بن عاص فتح پاکر قسطنطین داخل ہو گئے۔ محمد بن ابی بکر شکست کے بعد روپوش ہو گئے۔ امیر معاویہ نے حسب وعدہ مصر کی حکومت حضرت عمرو بن العاص کے سپرد کر دی۔ ماہ صفر ۳۸ھ کا واقعہ ہے۔

حضرت عمرو ابن عاص نے دوسری مرتبہ مصر پر پانچ برس کے قریب (۳۸ھ تا ۴۵ھ) حکومت کی۔ امیر معاویہ نے مصر کو خود مختار صوبہ قرار دے دیا تھا۔ مصر کی تمام آمدنی مصریوں پر خرچ ہوتی تھی۔ فرجول اور رباہ عامہ کے کاموں پر خرچ ہونے کے بعد جو کچھ بچ رہتا وہ مصر کے بیت المال میں جمع رہتا تھا۔ حضرت عمرو بن عاص نے بڑی ذامالی، ہوشمندی اور عدل و انصاف سے مصر پر حکومت کی۔ ان کی ذات میں بڑی خوبیاں اور اوصاف جمع ہو گئے تھے۔ وہ بیک وقت تاجر، شاعر، سیاست دان، مدبر، قاری اور فصیح و بلیغ مقرر تھے عدل و انصاف و بردباری منجاعت بہادری اور حکمت و دانش میں نظیر نہ رکھتے تھے مصر پر قابض ہوجانے کے بعد امیر معاویہ ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور انہوں نے دوسرے علاقوں پر بھی پیش قدمی کر کے



قبضہ کرنا چاہا۔ امیر معاویہ کی جرات قابل تحسین ہے کہ ایک آدمی بھیج کر اہل مکہ اور اہل بدینہ کو تابع کرنا چاہا۔ اسی اثنا عشر میں حضرت علی کی شہادت کا واقعہ پیش آگیا۔

اس جانگداز واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ جنگ نہردان کے بعد خارجیوں نے حج کے موقع پر جمع ہو کر مسائل حاضرہ پر

## حضرت علی کی شہادت

گفتگو شروع کی۔ بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ جب تک تین آدمی علیؑ معاویہؓ اور عمرو بن عاصؓ زندہ ہیں دنیا کے اسلام کو خانہ بلیوں سے نجات نہیں مل سکتی۔ چنانچہ تین آدمی ان تینوں کے قتل کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ عبدالرحمن بن ملجم نے کہا کہ میں علیؑ کے قتل کا ذمہ لیتا ہوں۔ دوسرے دونوں نے حضرت معاویہ اور عمرو بن عاص سے بیٹھنے کا عہد کیا۔

عبدالرحمن بن ملجم پہلے حضرت علیؑ کی فوج میں تھا۔ صفین کی جنگ میں آپ کے زیر کمان شریک ہوا تھا اور غالباً نہروان کے موقع پر بھی آپ کے ساتھ تھا۔ لیکن بعد میں خارجی ہو گیا۔ حضرت علیؑ کو شہید کرنے کے ارادہ سے جب کو نہ آیا تو اس کی ملاقات ایک حسین عورت قطام نامی سے ہوئی۔ اس سے شادی کی درخواست کی۔ قطام کا باپ اور بھائی خارجی تھے اور نہروان میں کام آئے تھے اس نے نہیں حضرت علیؑ کا خون بھی شہر ٹھہرایا۔ اس واقعہ نے ابن ملجم کے ارادوں کو پختہ کر دیا۔ اس نے ناکامی سے بچنے کے لئے دو تین اور آدمیوں کو بھی ساتھ ملا لیا۔

(تاریخ ابن خلدون، البدایہ والنہایہ)

رمضان کا وسط تھا اور ہجرت کا چالیسواں برس۔ حضرت علیؑ ایک دن حسب معمول نماز فجر کے لئے گھر سے نکلے۔ ابن ملجم قریب ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھات لگا کر بیٹھا تھا۔ آپ پاس سے گزرے تو ابن ملجم کے ایک ساتھی نے وار کیا جو خطا گیا۔ اب ابن ملجم نے تلوار چلائی جو آپ کی پیشانی پر پڑی۔ ابن ملجم پکڑا گیا۔ اس کے ساتھی روپوش ہو گئے۔ حضرت علیؑ اتنے سخت زخمی ہوئے تھے کہ زندگی کی امید نہ تھی۔ جناب امیر المومنین کو اٹھا کر لے گئے۔ تلوار زہر آلود تھی۔ اس لئے آپ کی حالت تشویش ناک ہو گئی۔



اسی دن ابن ملجم کو آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے اُسے بلٹھنے کا حکم دیا اور نرمی سے پوچھا کہ تم نے میری جان کا قصد کیوں کیا؟ اس کے پاس کوئی معقول جواب نہ تھا۔ اس کا جرم ثابت تھا۔ آپ نے حضرت حسن سے کہا کہ اگر میں جانبر نہ ہو سکا تو ابن ملجم کو اسی طرح ایک داز سے قتل کرنا جس طرح اس نے ایک دار سے مجھے زخمی کیا ہے اسے اذیت نہ دینا اور نہ ہی اس کے اعضاء کا ٹٹنا۔ کیونکہ ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے۔ اپنے خاندان والوں کو مخاطب کر کے میرے قتل کے نام سے مسلمانوں میں خونریزی نہ کرنا۔ سوائے میرے قاتل کے اور کسی پر ہاتھ نہ اٹھانا (تاریخ طبری) قبائل کو قید میں ڈال دیا گیا۔ آپ دھیان رکھتے تھے کہ اس پر سختی نہ ہونے پائے۔ کھانے کے وقت پوچھتے کہ میرے قیدیاں کو کھانا دیا گیا ہے؟ زخمی ہونے کے تقریباً دو روز بعد داخل حلی ہو گئے۔

وفات سے قبل آپ نے اہل بیت کے نام ایک وصیت تحریر فرمائی جو اسلامی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ آپ کے اہل بیت نے آپ کو رات کی تاریکی میں پوشیدہ بن کیا۔ دشمنوں کی کینہ دہی کے خوف سے آپ کا مزار مبارک خفیہ رکھا گیا۔ دوسرے روز ابن ملجم کو حضرت حسن کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے حضرت علی کی وصیت کے مطابق ایک ہی دار میں اس کا سر اڑا دیا۔ حضرت علی نے تقریباً آٹھ برس کی عمر پائی۔ خلافت کی مدت چار سال فرما رہے

## حضرت علیؑ کی پیر و پیاسرت

حضرت علیؑ رضی اللہ عنہ نے آیام طفولیت ہی سے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

کے دامن عاطفت میں تربیت پائی تھی۔ اس لئے وہ محاسن اخلاق

**پیرت علیؑ**

اور حسن تربیت کے نمونہ تھے۔ آپ کی زبان نہ کبھی کلمہ شکر و کفر سے آلود ہوئی اور نہ آپ کی پیشانی غیر خدا کے آگے جھکی۔ تدرجاً جاہلیت میں ہر قسم کے گناہ سے پاک رہے۔ شراب



کے ذائقہ سے اسلام سے پہلے بھی آپ کی زبان آشنانہ ہوئی۔ صحابہ کرام میں حضرت علی اپنے علم و فضل اور جرات و شجاعت کے باعث ممتاز تھے۔ آپ بڑے بلند حوصلہ اور غیر معمولی اہمیت و استقلال کے مالک تھے۔ آپ کی ذات ستودہ صفات اخلاقیہ حسنہ کا پیکر اور اصابتِ حمیدہ کا مجسمہ تھی۔

آپ کی ذاتِ گرامی نمونہ زہد تھی۔ بلکہ حق یہ ہے کہ آپ کی ذات پر زہد کا خاتمہ ہو گیا۔ آپ کے کاشانہ فقر میں دنیاوی نشان و شکوہ کا گزرنہ تھا۔ کوفہ تشریف لائے تو دارالامارہ کے بجائے ایک میدان میں فروش ہوئے۔ اور فرمایا کہ عمر بن خطاب نے ہمیشہ ان عالیشان محلات کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا۔ اپنے عہدِ خلافت میں آپ نے مسلمانوں کی امانت بیت المال کو جس طرح حفاظت کی اس کا اندازہ حضرت ام کلثوم کے اس بیان سے ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ ازبکیاں آئیں۔ امام حسنؑ فرماواں امام حسینؑ نے ایک نازکی اٹھالی۔ حضرت علیؑ نے دیکھا تو چھین کر روگوں میں تقسیم کر دی۔ (ازالۃ الجف: جوالہ ابن ابی شیبہ)

ایامِ خلافت میں بھی زہد کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور آپ کی زندگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ بوٹا جھوٹا لباس اور ردکھا پھیکا کھانا ان کے لئے دنیا کی بڑی نعمت تھی۔ معاش کی یہ حالت تھی کہ سنتوں گھر سے دھواں نہیں اُٹتا تھا۔ بھوک کی شدت ہوتی تو پیٹ پو پھیر باندھ لیتے۔ ایک دفعہ بھوک کی شدت میں کاشانہ اتریں سے مزدوری کے لئے نکلے۔ دیکھا کہ ایک ضعیفہ اپنا باغ سیراب کرنا چاہتی ہے اس کے پاس پہنچ کر اجرت ملے گی۔ اور پانی سینچنے لگے۔ یہاں تک ہاتھوں میں آبلے پڑئے۔ اس محنت و مشقت کے بعد ایک مٹھی بھر اجرت میں ملی۔ لیکن تنہا خوری کی عادت نہ تھی۔ کھجوریں لے کر بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرتؐ نے تمام کیفیت سن کر نہایت متشوق کے ساتھ کھانے میں ساتھ دیا۔ (مسند ابن جنبل ص ۱۳۵)

وہ دولت پر کوئی دربان نہ تھا۔ عین اس وقت جب قیصر و کسریٰ کی شہنشاہی مسلمانوں کے لئے زور و جواہر اگل رہی تھی۔ اسلام کا خلیفہ ایک معمولی غریب کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔



تمام غزوات میں آپ نے نمایاں حصہ لیا۔ اور بے مثالی دلیری کا ثبوت دیا۔ آنحضرتؐ نے عرزہ بدر میں بہادری کے جوہر دکھانے پر آپ کو ایک تلوار ”ذوالفقار“ عطا فرمائی تھی۔ آپ نے بڑے بڑے بہادروں کو شکست دی کسی معرکہ میں آپ کے قدم پیچھے نہ ہٹے۔ لوگ آج بھی آپ کو ”شیر خدا“ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

علم و فضل میں بھی آپ اپنے معصروں سے ممتاز تھے۔ قرآن و حدیث پر آپ کو جو عبور حاصل تھا وہ بہت کم صحابہ کو نصیب ہوا۔ ایک مفتی اور فقیہ کی حیثیت سے آپ کا کوئی ہم عصر نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں“ جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ایک جادو بیان خلیب بھی تھے۔ آپ شاعری کا بھی بہت عمدہ ذائقہ رکھتے تھے۔ عربی نحو کے قواعد آپ نے مرتب کئے تھے۔ قرآن کے حائز تھے اور اس کے نکتوں کو خوب سمجھتے تھے۔ حضرت علیؑ بڑے حق گو حق پسند اور بے باک انسان تھے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ازالتہ الخفا میں لکھتے ہیں :-

بڑے بڑے لوگوں میں جو عظیم الشان اخلاق ہوتے ہیں بشکلا شجاعت و سخاوت و حمیت۔

اور وفادہ مکمل طور پر ان میں موجود تھے۔ (ازالتہ الخفا)

**ذاتی حالات** | حضرت علیؑ میانہ قد اور فریبہ اندام تھے۔ سینہ چوڑا اور کلاسیاں نہایت مضبوط تھیں۔ زنگ گندمی، آنکھیں بڑی بڑی، چہرہ پر رونق اور خوبصورت تھا۔ سینہ پر بال تھے۔ بازو اور تمام بدن گھٹا ہوا۔ پیٹ بڑا اور باہر کونکا ہوا۔ سر پر بال نہ تھے۔ ریش مبارک بڑی ادا تھی چوڑی تھی کہ ایک کندھے سے دوسرے کندھے تک پھیلی ہوئی تھی۔ جب چلتے تو ادا ہر جھکتے ہوئے چلتے تھے اور جب کسی کا ہاتھ پکڑ لیتے تھے۔ تو وہ سانس تک نہیں لے سکتا تھا۔ جب میدان جنگ میں جاتے تھے تو بے باکانہ دڑتے ہوئے جاتے تھے۔ طاقتور اور دل کے مضبوط تھے جس شخص سے کسی رشتے تھے اس کو بچھا دیتے تھے۔ بہادر تھے اور جس جنگ میں مقابلہ کرتے تھے اس پر غالب آتے تھے۔ (ابن خلدون مبداء اول)



## ازواج و اولاد

سیدہ حبت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بعد حضرت علی نے مختلف اوقات میں شادیاں کیں۔ ان کے جیتے جی دوسرا نکاح نہ کیا۔ ان کے لطن سے حضرت حسنؑ، حضرت حسینؑ اور لڑکیوں میں زینب الکبریٰ اور ام کلثوم کبریٰ پیدا ہوئیں۔ محسنؑ نے بچپن ہی میں وفات پائی۔ حضرت فاطمہؑ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے چودہ نکاح کئے۔ ان کے یہاں چودہ لڑکے اور سترہ لڑکیاں پیدا ہوئیں ان میں پانچ سے سلسلہ نسل جاری رہا۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:- (۱) امام حسنؑ (۲) امام حسینؑ۔ (۳) محمد بن حنفیہؑ (۴) عباس علم دارؑ (۵) عمر بن تغلبہؑ۔

حضرت عثمانؑ کی شہادت کے بعد حضرت علی نے مسندِ خلافت پر قدم رکھا۔ اس وقت نہ صرف دار الخلافہ بلکہ تمام دنیا سے اسلام

## سیاست

چراغِ آشوب تھی۔ حضرت عثمانؑ کی شہادت کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ اس نے مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کر دیا۔ یہاں تک کہ حضرت عثمانؑ کے مخالفین نے بھی مفسدین کے اس فعل کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا۔ چنانچہ حضرت زبیرؑ طلحہؑ اور خویم المومنین حضرت عائشہؑ نے حضرت عثمانؑ کی حکومت سے شاکہ ہونے کے باوجود قصاص کا علم بلند کیا۔ دوسری طرف شام میں بنو امیہ حضرت معاویہؑ کے زیرِ قیادت برسرِ اقتدار آنا چاہتے تھے۔ ان کے لئے اس سے بہتر موقع کیا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ امیر معاویہؑ نے حضرت عثمانؑ کے قصاص کا دعوے کر کے بڑی آسانی سے عظیم قوت پیدا کر لی۔

ان وجوہ و اسباب کی بناء پر حضرت علیؑ کو پچیس سالہ عہدِ خلافت میں ایک روز بھی چین کا نصیب نہ ہوا۔ نظم و نسق کی ترقی اور امن و امان کی بحالی کے لئے آپ کو فرصت ہی کب تھی؟ تاہم نظامِ خلافت کی استواری عمال کی نگرانی اور رعیت کی بہبود سے آپ کبھی بھی غافل نہیں ہوئے؟ حضرت علیؑ نے انتظامِ مملکت میں حضرت عمرؑ کے نقش قدم پر چلنا چاہتے تھے اور اس زمانہ کے انتظامات میں کسی قسم کا تغیر کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ بخران کے یہودیوں نے جن کو فاروقِ اعظمؑ



نے حجاز سے بلا وطن کے بحران میں آباد کیا تھا۔ نہایت لجا بحت کے ساتھ درخوست کی کہہ بان کو پھر اپنے قدیم وطن میں واپس آنے کی اجازت دی جائے۔ حضرت علی نے صاف انکار کر دیا اور فرمایا کہ عمر نہ سے زیادہ کون صاحب رائے ہو سکتا ہے؟ (کتاب الخراج فیما ضی ابو یوسف وابن ابی شیبہ)

ملکی نظم و نسق میں سب سے اہم کام عمال کی نگرانی ہے۔

## انتظامی معاملات

حضرت علیؑ نے اس کا خاص اہتمام مد نظر رکھا۔ وہ جب

کسی عامل کو مقرر کرتے تھے تو اس کو نہایت مفید اور گراں بہا نصیحتیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی عمال کے طرز عمل کی تحقیق کرتے تھے۔ جہاں سخت گیری کی ضرورت ہوتی تھی آپ کی طبیعت لچک سے ناکشا تھی۔

حضرت علیؑ کی سیاسی ناکامی کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ جس زہد و تقویٰ امانت اور عدل انصاف کے ساتھ حکومت کرنا چاہتے تھے۔ اور لوگوں کو جس راستہ پر لے جانا چاہتے تھے زمانہ کے

تغییر اور حالات کے انقلاب سے لوگوں کے دلوں میں اس کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی۔ ایک طرف امیر معاویہ اپنے طرفداروں کے لئے بیت المال کا خزانہ لٹا رہے تھے۔ دوسری طرف حضرت

علیؑ ایک کوڑی کا حساب لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت علیؑ کے حامی اور ان کے بعض اعزہ تک دل برداشتہ ہو کر ان سے جدا ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کی طرح کوٹا ہاتھ میں لے کر اکثر رات کو

گشت کرتے تھے۔ حضرت علیؑ نے محاصل کے صدیقہ میں خاص اصلاحات جاری کیں۔ حضرت عمرؓ نے جنگل سے کسی

قسم کا مالی فائدہ نہیں ماہل کیا تھا۔ آپ کے عہد میں جنگل کو بھی محاصل ملنے کے ضمن میں داخل کیا گیا۔ اور اس پر باگزار کی عائد کی گئی۔ عہد نبویؐ میں گھوڑے زکوٰۃ سے مستثنیٰ تھے۔ عہد فاروقی

میں جب عام طور پر سے ان کی تجارت ہونے لگی تو اس پر بھی زکوٰۃ مقرر کر دی۔ حضرت علیؑ کے نزدیک تمدنی اور جنگی فوائد کے لحاظ سے گھوڑوں کی افزائش نسل میں سہولت بہم پہنچانا ضروری

تھا اس لئے اپنے زمانہ میں زکوٰۃ موقوف کر دی۔ (کتاب الخراج ابو یوسف) حضرت علیؑ کا وجود باوجود رعایا کے لئے آیت رحمت تھا۔ بیت المال کے دروازے خراب اور



مساکین کے لئے کھلے رہتے تھے۔ اس میں جو رقم جمع ہوتی تھی۔ نہایت فیاضی کے ساتھ مستحقین میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ ذمیوں کے ساتھ بھی نہایت شفقت آمیز برتاؤ کرتے تھے۔ ایران میں کئی بار بغاوتیں ہوئیں لیکن حضرت علی نے ہمیشہ لطف و کرم سے کام لیا۔ یہاں تک کہ ایرانی اس لطف و شفقت سے متاثر ہو کر کہتے تھے۔ خراکی قسم اس عربی نے نوشیروان کی یاد تازہ کر دی۔

حضرت علی جو ایک بڑے تجربہ کار جنگ آزما تھے اور جنگی امور میں آپ کو پوری بصیرت حاصل تھی۔ اس لئے اس سلسلہ میں

## فوجی انتظامات

آپ نے بہت سے انتظامات کئے۔ چنانچہ شام کی سرحد پر نہایت کثرت کے ساتھ فوجی چوکیاں قائم کیں۔ شام میں جب امیر معاویہ نے عراق پر یورش کی تو پہلے ان ہی سرحدی فوجوں نے ان کو آگے بڑھنے سے روکا۔ اسی طرح ایران میں مسلسل ستورش اور بغاوت کے باعث بیت المال اور عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لئے نہایت مضبوط قلعے بنوائے۔ جنگی تمہیرات کے سلسلہ میں دریائے فرات کا پل بھی جو مکہ اصفین میں فوجی ضروریات کے خیال سے تعمیر کیا تھا قابل ذکر ہے۔

مسند خلافت پر قدم رکھنے کے بعد سے آفرودیت تک گو

## غزایں و خدایات

خانہ جنگیوں نے فرصت نہ دی تاہم اس فرض سے بالکل

غافل نہ تھے۔ ایران اور آرمینیا میں بعض نوسلم عیسائی مرتد ہو گئے تھے۔ حضرت علی نے نہایت سختی سے ان کی سرکوبی کی اور ان میں سے اکثر تائب ہو کر پھر زائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ حضرت علی نے مسلمانوں کی اخلاقی نگرانی کا بھی نہایت سختی کے ساتھ خیال رکھا۔ بھرموں کو عبرت انگیز سزائیں دیں۔ جرم کی نوعیت کے لحاظ سے نئی سزائیں تجویز کیں۔ جو ان سے پہلے اسلام میں رائج نہ تھیں مثلاً زندہ جلانا مکان مسمار کر دینا۔ چور کے علاوہ دوسرے جرم میں بھی ہاتھ کاٹنا لیکن اس سے یہ قیوں نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت علی شرعی حدود کے اجراء میں کسی اصول کے پابند نہ تھے۔ زندہ جلانے کی سزا صرف چند زندہ لقیوں کو دی تھی مگر جب حضرت ابن عباس نے آپ کو بتایا



کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سزا کی ممانعت فرمائی ہے تو آپ نے اس فعل پر ندامت ظاہر فرمائی۔  
شراب نوشی کی سزائیں کوڑوں کی تعداد متقلین نہ تھی۔ حضرت علی نے اس کے لئے ٹہنی کوڑے تجویز کیے۔

(ترمذی۔ کتاب الخراج نیز بسنن ابو داؤد)

خلاصہ یہ کہ حضرت علی کا عہد خلافت اپنے مخصوص حالات کے پیش نظر کامیاب تھا۔ آپ  
نے شورشی کو برقرار رکھا۔ جس کی وجہ سے نظام حکومت میں جمہوریت اور مساوات کی روح کار فرما رہی۔  
مقدمات کے فیصلے کتاب سنت کی روشنی میں طے کرتے اور علم کی اشاعت میں بھرپور عمل رہتے تھے۔  
عدل و انصاف کے لئے آپ کا دور ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ذمیوں کے حقوق کی آپ کے عہد میں  
پوری نگہداشت ہوتی تھی اور وہ نہایت پرسکون زندگی بسر کرتے تھے۔ البتہ اندرونی خانہ جنگی کی  
وجہ سے آپ فتوحات کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ اس لئے آپ کے عہد خلافت میں ملکی سرکرد  
میں ترویج نہ ہو سکی۔

## حضرت حسنؑ کا عہدِ خلافت

۳۰-۳۱ھ مطابق ۶۶۱-۶۶۲ء

حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد آپ کے بڑے صاحبزادے امام حسنؑ  
ابن ابی طالب کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔

آپ کا نام حسن گنیت ابو محمد اور لقب ریحانہ زانیہ تھا۔ آپ ۱۰ ارب و ۳۰۰ لاکھ میں پیدا  
ہوئے۔ آپ کی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہ الزہراءؑ جو گورنہ رسول تھیں۔ امام حسنؑ شکل و صورت  
میں اپنے نانا حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت ملتے جلتے تھے۔ آٹھ برس تک نانا کی



آغوشِ محبت اور دامنِ نبوت میں پرورش پائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امام حسن کو بڑے لاڈ اور پیار سے رکھتے اور ہر طرح ان کی ناز برداری کرتے تھے۔ بدعت کو پہنچنے کے بعد ہی میدان میں آپ کا قدم بھیچے نہ رہا حضرت عثمان کی حفاظت کرتے ہوئے زخمی ہوئے۔ جنگِ جمل و صفین میں اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ تھے۔

**خلافت** | حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سب سے پہلے قلیس بن سعد انصاری نے حضرت حسن کی بیعت کے لئے ہاتھ بڑھایا اور کہا میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر آپ سے بیعت کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کتاب اللہ اور سنت رسول کافی اور تمام شرائط کی جامع ہے۔ قلیس بن سعد کی بیعت کے بعد تمام اہل عراق نے بیعت کی اور ماہِ رمضان ۴۰ھ میں حضرت حسن مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے۔ (تاریخ طبری جلد ۷ ص ۲۷)

حضرت عثمان کی شہادت کے بعد سے امیر معاویہؓ والی شام کے دل میں عالم اسلام پر حکومت کرنے کی ترقی تھی۔ اس کے بے انہوں نے جنگِ جمل کی لیکن حضرت علی کی زندگی میں ان کی یہ کارروائی پوری نہ ہوئی۔ حضرت حسن بڑے نرم مزاج بزرگوار اور امن پسند تھے۔ جنگِ جمل سے آپ کو طبعی نفرت تھی۔ امیر معاویہؓ کو اس کا اندازہ تھا اس لئے حضرت علی کی شہادت کے بعد ان کو دیرینہ تمنا پوری کرنے کا موقع ملا۔ چنانچہ انہوں نے فوراً عراق پر فوج کشی کر دی۔ اور عین البصر سے ہوتے ہوئے دامن کا رخ کیا۔ حضرت امام حسن کو شامی فوج کی پیش قدمی کی خبر ہوئی تو قلیس بن سعد انصاری کو بار ہزار فوج کے ساتھ مقابلہ کے لئے بھیجا اور خود بھی روانہ ہو گئے۔ اس عرصے میں یہ افواہ لٹھی کہ قلیس بن سعد قتل کر دیئے گئے۔ افواہ کا پھیلنا تھا کہ عراقی فوج بھاگ نکلی۔ کچھ لوگوں نے حضرت حسن کے خیمہ پر حملہ کر کے اسے لوٹ لیا۔ فوج کا یہ رنگ دیکھ کر آپ مرساحت کے لئے آمادہ ہو گئے۔

(تاریخ طبری جلد ۷ ص ۲۷)

آپ نے لوگوں کے سامنے تقریر کر کے مصالحت کی تجویز پیش کی۔ خارجی یمن کو کہنے لگے۔



حسن بھی اپنے باپ کی طرح کافر ہو گئے۔ انہوں نے آپ پر حملہ کیا مگر چند جاں نثاروں نے بچا لیا۔ آپ سا باط سے مدائن روانہ ہو گئے۔ راستہ میں ایک خارجی نے آپ پر حملہ کر دیا۔ آپ کی ران میں زخم آیا۔ خارجی کو پکڑ کر قتل کر دیا گیا۔ حضرت حسن مدائن میں داخل ہو گئے اور زخم پھرنے تک یہاں مقیم رہے۔ اسی اثنا میں امیر معاویہ فوجیں لے کر انبار کے مقام پر پہنچ گئے یہاں حضرت حسن کے سپہ سالار قیس بن سعد انصاری پہلے سے موجود تھے۔ امیر معاویہ کی فوج کے سپہ سالار عبید اللہ بن عامر نے حضرت حسن کو پیغام بھیجا کہ مدین جنگ نہیں کرنا چاہتا۔ میں صرف امیر معاویہ کے حکم کی تعمیل کے لئے حاضر ہوا تھا۔ اب وہ خود یہاں پہنچ چکے ہیں لہذا اپنی جماعت کے حال پر رحم کریں۔

یہ پیغام سن کر عراقیوں نے جنگ سے ہاتھ روک لیا۔ حضرت حسن نے یہ رنگ دیکھا تو جنگ کا خیال ترک کر کے مدائن چلے گئے۔ آپ کے جانے کے بعد عبید اللہ بن عامر نے محاصرہ کر لیا۔ تاہم حضرت حسن کے ساتھ ایسی فوج کی کمی نہ تھی جو آپ کے حکم پر جان نثار کرنے کو تیار تھے۔ مگر آپ مسلمانوں کے خون کی قیمت پر خلافت خریدنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے چند شرائط پر امیر معاویہ کے حق میں دست بردار ہونے پر تیار ہو گئے۔ صلح کی شرائط یہ تھیں۔

۱۔ کسی عراقی کو محض پرانی عداوت کی بنا پر نہ پکڑا جائے۔

۲۔ سب کو امان دی جائے۔

۳۔ اہل عراق کی گستاخی کو گوارا کیا جائے۔

۴۔ امام حسین کو دو لاکھ درہم سالانہ دیئے جائیں۔

۵۔ حضرت حسن کو ایک مخصوص علاقہ کا خراج بطور وظیفہ دیا جائے۔

۶۔ تنخواہوں میں بنو ہاشم کو بنو امیہ پر ترجیح دی جائے۔

امیر معاویہ نے بلا ترمیم یہ تمام شرطیں منظور کر لیں اور اپنے قلم سے اقرار نامہ لکھ کر اس پر مہر لگا کر امام حسن کے پاس بھجوا دیا۔ مصالحت کے تمام مراحل طے ہو جانے کے بعد حضرت امیر معاویہ ان کے دست راست حضرت عمرو بن عاص بننے ان کو مشورہ دیا کہ حضرت حسن سے مجمع



عام میں دست برداری کا اعلان کرادیں تاکہ لوگ خود ان کی زبان سے بھی سن لیں حضرت حسن سے جب درخواست کی گئی تو انہوں نے یہ اعلان کر دیا۔

دست برداری کے بعد امام حسن اپنے جملہ متعلقین سمیت مدینہ منورہ روانہ ہوئے اہل کوفہ دوتک روتے ہوئے الوداع کہنے آئے۔ مدینہ پہنچ کر آپ نے باقی زندگی وہیں گزاری۔ آپ کی مدتِ خلافت چھ مہینہ سے لے کر سات مہینہ تک ہے۔ آپ کی تخت نشینی کا زمانہ رمضان شبیہ متعین ہے لیکن دست برداری کے زمانہ میں اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ آپ ربیع الاول ۴۰ھ میں دست بردار ہوئے اس لحاظ سے آپ کی مدتِ خلافت چھ ماہ ہوتی ہے۔

## مصالحات کے اثرات و نتائج

امیر معاویہ اور حضرت حسن کی مصالحت کے نتائج ملک و ملت کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے۔ مسلمانوں کی خون ریزی کا سلسلہ جو مدتوں سے چلا آرہا تھا۔ بند ہو گیا۔ ملک میں امن و سکون پیدا ہو گیا اور جو طاقت خانہ جنگی میں پارہ پارہ ہو رہی تھی وہ پھر دشمنوں کے مقابلہ میں صرف ہونے لگی۔ بیرونی فتوحات اور اندرونی اصلاح و ترقی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس لئے اس سال کو ”عام الجماعة“ کا اتحاد اتفاق کا سال کہتے ہیں۔

## وفات

دست برداری کے نو سال بعد ۴۰ھ میں مدینہ میں انتقال فرمایا۔ آپ کی موت کے متعلق مشہور ہے کہ آپ کی بیوی جعدہ بنت اشعث نے امیر معاویہ کے اشارہ سے زہر دیا تھا۔ یہ بے بنیاد روایت ہے جس کی کوئی سند نہیں۔ امیر معاویہ کا وصال اس افتراء سے پاک ہے۔

(تاریخ ابن خلدون ج ۱ ص ۱۰۰)



آپ کو اپنے نانا کے پہلو میں دفن ہونے کی بڑی تمنا تھی۔ حضرت عائشہ سے اس کی اجازت طلب کی۔ آپ نے بخوشی اس کی اجازت دے دی۔ حضرت حسنؓ نے پھر وصیت کر لی کہ میری وفات کے بعد دوبارہ اجازت لینا۔ ممکن ہے زندگی میں میری مررت سے اجازت دی ہو۔ اگر بعد از وفات بھی وہ اجازت دے دیں تو روضہ نبوی میں دفن کرنا۔ مجھ کو خطرہ ہے کہ اس میں بنی امیہ مزاحم ہوں گے۔ اگر یہ صورت پیش آجائے تو روضہ نبوی میں دفن کرنے پر اصرار نہ کرنا اور بقیع کے گورخریباں میں دفن کر دینا۔

(استیعاب جلد ۱ صفحہ ۱۴۱ نیز مروج الذهب جلد ۲ صفحہ ۱۸)

وفات کے بعد حضرت حسنؓ کا خیال درست نکلا۔ حضرت عائشہؓ نے تو حسب سابق اجازت دیدی مگر بنو امیہ نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ جب حضرت عثمانؓ کو یہاں دفن نہیں کیا گیا تو حسنؓ کو یہ اعتراض کیوں کر مل سکتا ہے؟ حضرت حسینؓ بزدور دفن کرنے پر آمادہ ہو گئے اور قریب تھا کہ بنو ہاشم اور بنو امیہ میں تلواریں چلی جائیں کہ اتنے میں مشہور صحابی حضرت ابو ہریرہؓ پہنچ گئے یہ دیکھ کر چلائے کہ ”یہ کیا ستم ہے کہ ابن رسول اللہ کو نانا کے پہلو میں دفن کئے جانے سے روکا جائے؟“ پھر حضرت حسینؓ کو حضرت حسنؓ کی وصیت یاد دلائی۔ کہ اگر خون ریزی کا خطرہ ہو تو بقیع کے قبرستان میں دفن کر دینا۔ اس یاد دہانی پر حضرت حسینؓ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ سعید بن العاص دالی مدینہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اور اقلیم مصالحت کے تاجدار اور حاکم و بربادی کے پیکر کو ان کی والدہ محترمہ حضرت فاطمہؓ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

(استیعاب و اسد الغابہ)



## سوالات

- ۱- حضرت علی رضی کی سیرت و سیانت پر تبصرہ کیجئے۔
- ۲- حضرت علی رضی کو اپنے عہد خلافت میں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور وہ ان مشکلات پر قابو پانے میں کس حد تک کامیاب ہوئے؟
- ۳- جنگِ جمل کے وجوہ و اسباب اور تفصیلات قلمبند کیجئے۔
- ۴- جنگِ صفین اور عمرو بن العاص اور ابو موسیٰ اشعری کی تالیفی کے واقعات و نتائج بیان کیجئے۔
- ۵- جنگِ صفین کے اسباب و واقعات اور نتائج پر سیر حاصل تبصرہ کیجئے۔
- ۶- خوارج کون تھے اور انہوں نے حضرت علی کے خلاف کیوں بغاوت کی؟
- ۷- خوارج کے مذہبی اور سیاسی افکار و عقائد کی تفصیلات بیان کیجئے۔
- ۸- جنگِ نہروان کی تفصیلات بیان کیجئے۔
- ۹- حضرت امام حسن کی سیرت بیان کیجئے اور بتائیے کہ وہ خلافت سے کیوں دست بردار ہوئے۔



# خلافتِ اشدہ بر ایک نظر

لفظِ خلافتِ خَلْفٌ یَخْلَفُ سے مصدر ہے۔ خلافت

کے لغوی معنی "جانشینی" اور "کسی کی جگہ پر اس کے بعد

## خلافت کا مفہوم

بیٹھنے" کے ہیں۔ خلیفہ معیشتین اور نائب کو کہتے ہیں۔ اصطلاحی اعتبار سے خلافت کا لفظ خاص ہے اور صرف قائم الامامین اور المرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت اور جانشینی کے لئے بولا جاتا ہے۔ جب خلافت کے لفظ کے ساتھ اشدہ کی صفت کا اضافہ کیا جاتا ہے تو اس سے مراد تاریخ کا وہ تیسرا سالہ زین دور ہوتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت صدیق کی خلافت سے شروع ہو کر حضرت حسنؓ کی جانشینی پر ختم ہوتا ہے۔ تاریخ کی زبان میں ان کو خلفائے اشدہ (درست رو جانشین) کہا جاتا ہے۔

دیگر الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ دینی اور دنیوی امور کے انقطاعات کے لئے ایک ایسی جمہوری

ریاست قائم کی جائے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اور نیابت ہو۔ اس ریاست کے

رہنمائی کو خلیفہ یعنی رسول کا جانشین اور قائم مقام کہتے ہیں۔ خلیفہ مسلمانوں کے تمام دینی و دنیوی

امور و ضروریات کا کفیل ہوتا ہے۔

حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے صحابہ میں سے چار حضرات یکے بعد دیگرے مستد

خلافت پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہ چاروں اصحاب بصال مات کے تربیت یافتہ تھے جو مکہ نور نبوت

سے براہ راست ہدایت یافتہ تھے اس لئے راشدین کہلاتے اور ان کا عہد حکومت خلافتِ راشدہ کے

نام سے مشہور ہوا۔ خلفائے راشدین نے اس بات کی انتہائی کوشش کی کہ سردر کائنات صلی اللہ

علیہ وسلم کے نقش قدم پر چل کر جمہور مسلمانوں کو اسلامی زندگی کا عادی بنائیں۔ یہ کام عین خدا

تعالیٰ کی رضا جوئی عوام کی فلاح و بہبود اور اشاعہ سنت ان کا مقصد حیات تھا۔

## مشور خلافت

اسلامی حکومت کے اصول و قوانین کا سرچشمہ کتاب و سنت ہے۔ کتاب و سنت کے



احکام ابدی اور ناقابلِ تبدیل ہیں۔ یہاں قانون بنائے نہیں جاتے بلکہ خلیفہ اور حاکم خداوند تعالیٰ کے بنے بنائے قوانین کو دہرایا کرنا ہے۔ اسلام میں قانون سارے حقیقی صرف و ات خداوندی ہے۔ رسولوں کو ان قوانین بنانے کا حق حاصل نہیں۔ البتہ وہ قانون الہی کی تعبیر و تشریح کرتے ہیں۔ علماء و فقہاء کتاب سنت کے دائرہ میں محدود رہ کر مقدمات فیصلہ کرتے ہیں۔ صحیح اسلامی جمہوریت کی مثال ہم کو خلافت راشدہ میں ملتی ہے۔

## مشورے

اسلامی جمہوریت کی بنیاد مشورے پر رکھی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں مسلمانوں کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنے معاملات باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں۔ خلافت راشدہ میں مشورے کی روح کارفرما تھی اور سب اہم امور مشورے کی روشنی میں طے کئے جاتے تھے۔ البتہ اس وقت وہ رسمی ادارے اور تکلفات موجود نہ تھے جو آج کل کی جمہوریت کے لوازم میں سے ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق کے عہدِ خلافت میں مشورے کو بڑا اہم مقام حاصل تھا۔ سب امور خلافت صحابہ کبار کے مشورہ سے انجام پاتے تھے۔ رعایا کے تمام افراد خلیفہ پر تنقید کر سکتے تھے۔ عوام کو عام اجازت تھی کہ جب بھی خلیفہ کو غلطی پر دیکھیں تو بر ملا اپنی رائے کا اظہار کریں۔

## خلیفہ کا انتخاب

خلیفہ کا انتخاب امت کی رضا سے کیا جاتا تھا۔ خلفائے راشدین کے انتخاب میں ہمیں اسلامی جمہوریت کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ دورِ حاضر میں انتخاب کا جو طرز و انداز رائج ہوا ہے وہ اس وقت مفقود تھا۔ اس مبارک عہد میں ہمیں گروہ بندی اور تفرقہ بازی کا نشان تک نظر نہیں آتا۔ کسی خلیفہ نے اپنے کسی عزیز و قریب کو اپنا



جانشین نہیں بنایا تھا۔ حضرت ابو بکر کا انتخاب عوام الناس کی موجودگی میں ہوا۔ حضرت عمر کا نام اگرچہ حضرت ابو بکر نے پیش کیا تھا مگر سب لوگوں نے باتفاق رائے آپ کو خلیفہ چن لیا۔ حضرت فاروق اعظم نے اپنا جانشین منتخب کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کر دیا تھا۔ اس پر سب کو اعتماد تھا۔ جب اس کمیشن نے حضرت عثمان کے حق میں رائے دی تو سب لوگوں نے آپ کو خلیفہ تسلیم کر لیا اور حضرت علی کو لوگوں نے مخالفت سے بچانے پر مجبور کیا۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اگرچہ خلفائے اربعہ میں سے ہر ایک کا طریقہ انتخاب جداگانہ نوعیت کا تھا۔ تاہم عوام کی رضا اور جمہوریت کی روح ہر انتخاب میں مکمل طور پر کار فرما تھی۔

## نظام حکومت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد رکھی تھی۔ آپ صرف مذہبی اور روحانی پیشوا ہی نہ تھے بلکہ اسلامی حکومت کے مؤسس اور بانی بھی تھے۔ خلفائے راشدین آپ ہی کے نقش قدم پر گامزن رہے۔

خلافت راشدہ میں حکومت کے دو شعبے تھے۔ مرکزی اور صوبائی۔ مرکزی نظام براہ راست خلیفہ کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ صوبوں پر والی مقرر تھے جن کے تحت مختلف محکموں کے افسر کام کرتے تھے۔ والی کا تقرر خلیفہ خود کرتا تھا۔ حضرت ابو بکر کے عہد تک بعض عہدہ دار تنخواہ نہیں لیتے تھے۔ حضرت عمر نے سب کو تنخواہ لینے پر مجبور کیا۔

## مرکزی نظام

حضرت عثمان کے عہد تک مدینہ مرکز خلافت رہا۔ حضرت علی انہ نے بعض مصلحتوں کے پیش نظر کوفہ کو دار الخلافہ قرار دیا۔ مرکزی حکومت کے زیادہ شعبے نہ تھے اس دور میں کاتب کا عہدہ بڑا اہم تھا۔ اس کے بعد قاضی کاتب دیران خزاہی اور صاحب الخراف کے عہدے تھے۔ حضرت عمر نے اپنے عہد خلافت میں جو نظام حکومت بنایا وہ آپ



کے بعد بھی جاری رہا۔ خلیفہ کو سب مسلمان منتخب کرتے تھے۔ اس لئے سب پر اس کی اطاعت فرض تھی۔ البتہ یہ اطاعت اس شرط کے ساتھ بشرط تھی کہ خلیفہ شرعی احکام کی پیروی کرتا رہے اور رعایا کو کوئی غیر شرعی حکم نہ دے۔ خلیفہ آمر مطلق نہیں مانتا تھا۔ بلکہ اس کو مشورہ دینے کے لئے صحابہ کی ایک مجلس بنائی گئی جس کو شورعی کہتے ہیں۔ اس کی مدد سے خلیفہ احکام خداوندی کے مطابق عمل کرتا تھا۔ اس کو آنحضرت کی چادر انگوٹھی اور نہر استعمال کرنے کا حق تھا۔ وہ نماز جمعہ کی امامت کرتا اور خطبہ دیتا تھا۔ خلیفہ کے فرائض اسلام کی اشاعت مفتوحہ علاقوں کا انتظام سرحدوں کی حفاظت امن و امان کا قیام عدالتوں کا بندوبست وغیرہ تھے۔ خلیفہ کے لئے امیر المؤمنین کا لقب پہلی مرتبہ حضرت فاروق اعظم نے اختیار کیا۔

## صوبائی نظام

خلافت راشدہ میں ملک کو کئی صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلے پہل بہت کم صوبے تھے جب اسلامی فتوحات کا دائرہ پھیلا تو صوبوں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ صوبے کا سب سے بڑا افسر والی یا امیر کہلاتا تھا۔ اس کے انتخاب میں حلقے کے راشدین بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ اہلیت و صلاحیت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ حج کے موقع پر خلیفہ سب والیوں کو بلانا اور ان کے خلاف عوام کی شکایات سنتا تھا۔ والیوں کو شرعی حدود کے سوا دیگر معاملات میں لوگوں سے نرمی برتنے کا حکم تھا۔ ہر شخص کو والی کے پاس بلا جھجک آنے کی اجازت تھی۔ والی کی قیام گاہ جسے دارالامارت کہتے تھے مسجد سے ملحق ہوا کرتی تھی۔ وہ مسجد میں نماز پڑھاتا اور وہیں بیٹھ کر لوگوں سے ملاقات کرتا تھا۔



## مالی نظام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی مستقل خزانہ قائم نہیں کیا تھا۔ چنانچہ خلفائے راشدین کے عہد میں بیت المال کی بنیاد رکھی گئی حضرت عمر نے محکمہ مال قائم کیا جو دیوان کہلاتا تھا۔ بیت المال کو مستقل خزانہ کی شکل دی گئی ہے۔ مدینہ میں اس کے دفاتر قائم کئے گئے۔ ہر صوبے میں بیت المال کی شاخیں قائم کی گئیں۔ صوبے کے اخراجات سے جو رستم بچ جاتی تھی، وہ مرکزی بیت المال میں جمع کر دی جاتی تھی۔ آمدنی کے بڑے بڑے ذرائع عشر، زکوٰۃ، خراج، فے، جزیہ اور مال غنیمت ہے۔ خلافت راشدہ میں مالگزاروں کا باقاعدہ بندوبست کیا گیا۔

## فوجی نظام

عہد رسالت میں کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی۔ ہر مسلم مجاہد تھا۔ خلافت راشدہ میں فوج کا مستقل نظام قائم کیا گیا۔ حضرت عمر نے ایک رجسٹر تیار کر کے اس میں فوجیوں کے لائق لوگوں کے نام درج کئے اور ان کی تنخواہیں مقرر کیں۔ فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک باقاعدہ فوج تھی جسے چھاپڈنیوں میں رکھا جاتا تھا۔ دوسری فوج رضا کاروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ یہ لوگ اپنے اپنے گھروں میں رہتے تھے۔ رضا کاروں کی فوج ضرورت کے وقت طلب کی جاتی تھی۔ تمام مفتوحہ علاقوں میں فوجی مراکز قائم کئے گئے۔ اور ان مراکزوں کا نہایت معقول انتظام کیا گیا فوجیوں کی صحت اور آرام و آسائش کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ فوجیوں کو ہدایت کی جاتی تھی کہ مفتوحہ اقوام سے اچھا برتاؤ کریں۔ خلفائے راشدین فوجی امور پر بڑی نگاہ رکھتے تھے۔ حضرت عمر نے حضرت خالد جیسے عظیم فاتح کو مسکدوش کر دیا تھا۔



اسلامی انواع سادگی کی تصویر مورتی تھیں۔ جنگ کے لمحوں میں نزع الحان قاری بلند آواز سے سورہ انفال کی آیات تلاوت کرتے تھے۔ جس کے پرتاثر الفاظ دلوں کو جوش ایمانی سے لہریز کر دیتے تھے۔ غازیوں کی تکبیریں دشمن کی فرج کو لرزہ برانداز کر دیتی تھیں۔ شکلات کے ہجوم سامان کی کمی اور سپاہ کی قلت کے باوجود عربوں نے تاریخ میں پہلی بار بڑی بڑی حکمرانوں کو زیرِ ناکین کیا۔

## مفسورہ علاقوں کی تنظیم

خلافت راشدہ میں جو ممالک فتح کئے گئے تھے۔ خائفے راشدین نے ان کے انتظام کی طرف خاص توجہ دی۔ وہاں کے نظامانہ قوانین کو منسوخ کر کے عادلانہ نظام جاری کیا۔ زمینوں کو ان کے قدیم مالکوں کے پاس ہی رہنے دیا گیا۔ عربوں کو مفتوحہ اترم کی زمینیں خریدنے اور وہاں کاشت کار کی حیثیت سے آباد ہونے کی ممانعت کر دی گئی۔ ان علاقوں میں امن و امان بحال رکھنے کے لئے نوجوان متعین کی گئیں۔

## رفاہ عامہ اور زمینوں سے سلوک

راشدین نے رعایا کے لئے ہر قسم کی سہولتیں مہیا کیں۔ پل بنوائے۔ کنوئیں کھدوائے۔ زراعت کو فروغ دینے کے لئے نہریں نکالیں۔ محرموں کے لئے قید خانے تعمیر کئے گئے۔ بہت سی سڑکیں بنوائیں۔ چوکیاں تعمیر کیں۔ بہت سے شہر آباد کئے۔ اہل طرح لوگوں کی معاشی و معاشرتی حالت کو سنوارنے کے لئے بڑی کوشش کی۔ زمینوں کی جان و مال اور مذہب کی حفاظت حکومت کے فرائض میں شامل تھی۔ اہل ذمہ کو پورے حقوق حاصل تھے۔ ان پر کوئی مسلمان جبر نہیں کر سکتا تھا۔ اہل ذمہ کے باہمی مقدمات کے لئے ان کے اپنے جج ہوتے تھے۔ خلافت راشدہ میں اہل ذمہ کو اہم اور کلیدی عہدے نہیں دیئے جاتے تھے۔



اس لئے کہ ان سے اس وفاداری کو توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ جو مسلمانوں کی طرف سے تھی۔

## اشاعتِ دین

خلافتِ راشدہ میں دعوتِ اسلام اور اسلامی تعلیمات کو عام کرنے اور فروغ دینے کے سلسلے میں بڑا اہتمام کیا گیا تھا۔ خلفائے راشدین اس بات پر کڑی نگاہ رکھتے تھے کہ دین کی روح کمزور نہ ہونے پائے۔ قرآن و حدیث کی خوب اشاعت ہوئی۔ جگہ جگہ مسجدوں کی تعمیر ہوئی۔ دینی تعلیمات کو فروغ دینے کے لئے اطرافِ ملک میں مبلغ بھیجے جاتے تھے خلیفہ اور والی بذاتِ خود جمعہ کا خطبہ دیتا اور لوگوں کو اسلامی تعلیمات سکھاتا تھا۔

## تہذیب و ثقافت

فتوحات کے سلسلہ میں بہت سی عراقی ایرانی شامی مصری اور رومی عورتیں، مسلمانوں کے حرم میں آگئیں۔ اس طرح مختلف نسلوں کی آمیزش سے ایک نئی تہذیب عالم وجود میں آئی۔ فاروقِ اعظمؓ کے عہدِ خلافت میں شاہِ ایران یزدگرد کی چٹہر بیٹیاں قیدی ہو کر مدینہ آئیں تو ایک لڑکی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے نکاح میں آئی اور اس کے بطن سے سالم پیدا ہوئے۔ دوسری لڑکی امام حسینؓ رحمہ اللہ کے حرم میں داخل ہوئی اور اس کے بطن سے امام زین العابدینؓ پیدا ہوئے۔ تیسری لڑکی محمد بن ابی بکر صدیقؓ کے حرم میں شامل ہوئی اور اس سے قاسم پیدا ہوئے۔ اس طرح عجیبی عورتوں کے بطن سے بڑے بڑے اہل علم اور متقی لوگ پیدا ہوئے۔

ملکی فتوحات کے بعد رومی شامی ایرانی اور عراقی لوگ ہزاروں کی تعداد میں حجاز پہنچے قدرتی طور پر حجاز اور دیگر علاقوں میں رومیوں ایرانیوں اور عربوں کا اختلاط بڑھ گیا۔ اس میل جول اور اختلاط کو



نے ایک دوسرے کے اخلاق عادات علم و ادب اور صنعت و حرفت کو اپنا لیا عربوں کا ذریعہ  
 اور زبان یعنی دین اسلام اور عربی زبان مفتوحہ ملکوں پر چھانکے۔ عربوں نے مفتوحہ قوموں  
 کے علوم و آداب کو اپنے ہاں رواج دیا۔

حضرت عمر کے عہد خلافت میں مدینہ میں دولت کی ریل بیل ہو گئی۔ تاہم حکومت کی  
 یہ کوشش رہی کہ لوگ تن آسان اور عشرت کوش نہ ہونے پائیں۔ اسلامی انہماک مفتوحہ  
 اقوام کے خیالات اور طریقہ زندگی پر بہت گہرا اثر پیدا ہوا۔ سادگی کا رجحان پیدا ہوا۔

## اشاعتِ علوم

ظہور اسلام سے قبل عرب جہالت کا گوارہ تھا۔ پڑھے لکھے لوگ انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے  
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت مکہ میں صرف ستر آدمی ایسے تھے جو لکھ پڑھ سکتے تھے۔ اسلام نے پڑھنے  
 پڑھانے پر اس قدر زور دیا کہ عرب کے جاہل بھی زور علم و حکمت سے راستہ ہو کر علمی مجالس کی زینت بننے  
 لگے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اشاعتِ علم کا آغاز ہوا۔ خلافت راشدہ میں اس میں مزید ترقی  
 ہوئی۔ اور جاہلی علمی مراکز قائم کیے گئے۔ حکام و عمال کے فرائض میں ایک فریضہ یہ بھی تھا کہ علم دین کو  
 فروغ دیں۔ فوجی اور اچھے خاصے تعلیم یافتہ ہوا کرتے تھے۔ شہروں میں معلم تھے جو کتاب و سنت کی تعلیم دیتے تھے علم کو  
 طلب و نیا کیے حاصل نہیں کیا جاتا تھا۔ بلکہ حصولِ علم کا مقصد فقط دین اسلام کی فروخت  
 تھی۔ مسجدوں میں مکتب قائم تھے۔ لوگوں کو فقہ حدیث اور قرآن کی تعلیم دی جاتی تھی۔  
 اس دور میں علم کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ لوگ دیکھنا نہ دار اس منتدع عربیہ کو حاصل  
 کرنے کے لئے مصروف سعی و جہد رہتے تھے۔

اس وقت علم کا بیشتر سرمایہ قرآن و سنت کی تعلیمات تھیں۔ فقہ کو بہت زیادہ  
 اہمیت حاصل تھی۔ فقہ حکومت عبادات معاملات اور ذاتی اخلاق و کردار وغیرہ کے بارے  
 میں تمام قوانین و قواعد کے علم کا نام ہے۔ خلفائے راشدین سب بلند پایہ فقیہ تھے۔ اس



دور میں احادیث کو یاد کرنے اور محفوظ رکھنے کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ خلافت راشدہ میں حدیث کے کئی مجموعے لکھے گئے۔ حضرت ابو ہریرہ نے اپنی روایات قلم بند کرنا شروع کر رکھیں۔ یہ حدیث عظیم سرماہ تھا۔ ان کے شاگردوں نے بھی ان کی روایات کے مجموعے تیار کئے جن میں سے ایک مجموعہ صحیفہ تمام تھا۔ ثنیۃ اب بھی لکھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے احادیث نبویہ کو تحریر کرنے کا وسیع پیمانے پر بیڑا اٹھایا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے ایک مجموعہ احادیث تیار کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر کی روایات حضرت سعید بن جبیر نے لکھیں یہ مجموعے کافی ضخیم تھے۔

## اقتصادی اور تمدنی حالت

اسلام کے ابتدائی دور میں اہل عرب کی اقتصادی حالت بہت خراب تھی۔ جوں جوں فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا ان کی حالت بھی تبدیل ہوتی گئی۔ مالِ غنیمت کی فراوانی عراق فارس شام اور مصر جیسے زرخیز ملکوں کے فوج نے مسلمانوں کی اقتصادی زندگی کی کاپا پلٹ دی۔ اب ان کے مکانات عالی شان نفیس سامان زیبائش اعلیٰ ترین لباس اور گھروں میں ایرانی قالین بچھائے جاتے تھے۔ چمچہ مکانات تعمیر کئے جانے لگے۔ غذائیں بہت کچھ تبدیلی آگئی۔ عرب میں عام طور پر جو کی روٹی کھائی جاتی تھی۔ جب مسلمان ختم میں فاتحانہ داخل ہوئے تو میدے کی سفید روٹی اور پزندوں کا گوشت کھانے لگے۔ باریک کپڑا جو ابتدائی دور میں نایاب تھا اب عام استعمال ہونے لگا تھا۔ اسی لئے حضرت عمر اپنے عمال کو ہدایت کیا کرتے تھے کہ باریک کپڑا نہ پہنیں۔ خلافت راشدہ کے عہد میں اقتصادی اور تمدنی ترقی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ بہت سی پڑوسی حکومتوں کے لئے قابل رشک تھی۔

اقتصادی ترقی کی وجہ سے قدرتی طور پر معاشرہ میں تین طبقات  
**معاشرتی حالت**  
 اعلیٰ، اوسط، اور ادنیٰ پیدا ہونے لگی تھی۔ لیکن ابھی ان میں اتنا بعد نہیں پیدا ہوا تھا کہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں۔ لباس بہن سہن اور کھانے پینے میں مختلف طبقات کا فرق نمایاں تھا۔ عام لوگ کمر پچھڑے کی پٹی اداؤنٹ کے بالوں کی دھبلی عبا پہنتے تھے۔ سردوں پر عقاب باندھا جاتا تھا۔ متوسط اور اعلیٰ طبقہ کے لوگ پاجامے پر



لمبا کرتے اور ٹخنوں تک لمبا چونکہ پہن کر اس پر لسنٹی پٹکا لپیٹ لیتے تھے۔ سر پر عمامہ باندھتے۔ کندھوں پر ٹیلیسانی چادر پڑی رہتی تھی۔ عورتوں کا لباس بھی عمامہ اور عباء کے سوا یہی ہوتا تھا۔

حضرت ابو بکر کے عہد سے حضرت عثمان کے ابتدائی دور تک اسلامی ریاست

**سیاسی حالت** برابر وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کی سیاسی قوت کا یہ عالم تھا

کہ روم کی عظیم الشان سلطنت جس کا اقتدار یورپ تک پھیل ہوا تھا۔ ہمیشہ لرزہ اندام رہتی رہتی تھی۔ عہد عثمانی میں جب مسلمانوں کی بڑی بڑی تیار ہو گیا۔ تو ان کی عزت و عظمت کا آفتاب نصف النہار تک پہنچ گیا۔ مشرق میں اسلامی حکومت کا اقتدار روسی ترکستان تک پہنچ چکا تھا۔ افغانستان کے بیشتر علاقے اسلامی علوم کے سامنے سرنگوں تھے۔ مجاہدین کی نگاہیں ہندوستان کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ بدقسمتی سے اس زمانہ میں وہ عظیم فتنہ اٹھا جس نے مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد مسلمان مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ حضرت علی کے سبب خلافت میں مسلمان خانہ جنگی کا شکار ہو کر خود آپس میں بھی قتل و غارت گری کرتے رہے۔ بعد تلوار حضرت عثمان کی شہادت کیلئے بے نیام ہوئی تھی۔ حضرت حسن کی خلافت میں بڑی بڑی جنگ لاکھوں توحید پرستوں کا خون چاٹ گئی۔ اس خانہ جنگی سے مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچا اور امت مسلمہ میں بے تفرقہ پڑ گیا تھا۔ وہ آج تک ختم نہ ہو سکا۔ اگر مسلمانوں کا سیاسی اور مذہبی اتحاد قائم رہتا تو دعوت اسلام کو تمام یورپ اور افریقہ کے جزیبی کونوں تک پہنچا دیتے۔ لیکن خلافت راشدہ کے عہد میں جو فتنہ پیا ہوا اس نے مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا اور اس کے بعد بھی تاریخ اسلام مختلف ادوار میں اپنوں ہی کے خون سے لالہ زار ہوتی رہی۔

غلام احمد حسینی عفا اللہ عنہ

تجدید نظر — یکم نومبر ۱۹۷۱ء